www.KitaboSunnat.com

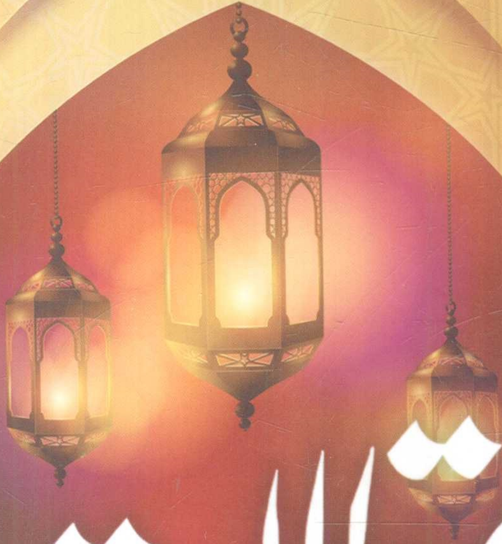

مقالات

مولانا عبدالرحمن کیلانی رحمہ اللہ

مکتبۃ السلام وسن پورہ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

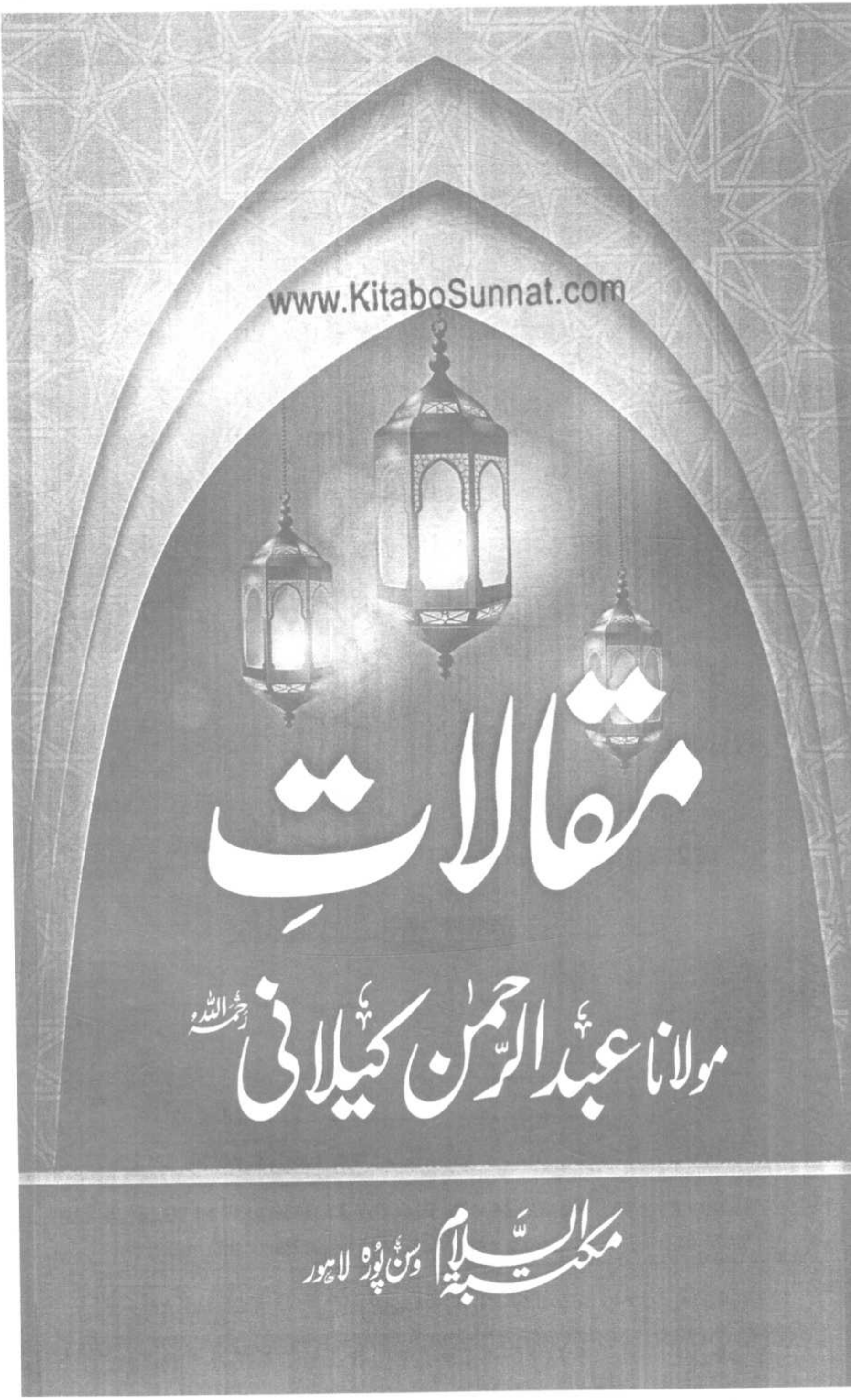

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ھیں

نام کتاب: مقالات عبدالرحمن کیلانی

مصنف: مولانا عبدالرحمان کیلانیؒ

اشاعت اول: محرم 1439ھ

تعداد: 1100

زیر سرپرستی: ڈاکٹر حبیب الرحمان کیلانی

زیر اہتمام: نجیب الرحمان کیلانی فون: 0321-8869902

ناشر: ڈاکٹر حافظ شفیق الرحمان کیلانی۔ انجینئر حافظ عتیق الرحمان کیلانی

کمپوزنگ: محمد راشد مرتضٰی

مطبع: انٹرنیشنل دارالسلام پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت: 350 روپے

ناشر: مکتبۃ السلام جامع مسجد الایمان شاہ فرید آباد
ملتان روڈ لاہور فون: 0321-8869902

ڈسٹری بیوٹر

دارُالسّلام
کتاب وسنّت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض • جدہ • شارجہ • لاہور
لندن • ہیوسٹن • نیویارک

DARUSSALAM

ھیڈ آفس ومرکزی شوروم 36- لوئرمال، سیکرٹریٹ سٹاپ، لاہور

فون: 37240024,37232400,37110081,37111023 فیکس: 37354072

E-mail: info@darussalampk.com Website: www.darussalampk.com

شوروم اردو بازار اقرا سنٹر، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور فون: 37120054 فیکس: 37320703

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

نمبر شمار	مقالات	صفحہ نمبر
۱	پیغمبر اسلام ﷺ بحیثیت داعی امن واخوت	9
۲	شرک اور اس کی مروجہ صورتیں	35
۳	انسانی حقوق اور تعلیمات نبوی ﷺ	67
۴	اسلامی معیشت اور سود	89
۵	احکام وراثت	150
۶	خلفائے راشدین کی شرعی تبدیلیاں	179
۷	فرقہ پرستی	212
۸	مساوات مرد وزن	225
۹	جنت ارضی یا جنت الماویٰ	247
۱۰	نظریہ ارتقاء	259
۱۱	کیا آغا خانی مسلمان ہیں؟	274
۱۲	امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور متصوفین	293
۱۳	طرزِ حکومت پر اسلامی نظریاتی کونسل کے سوالنامہ کا جواب	312
۱۴	یونین سازی کے شرعی اصول	342
	فتاویٰ	
۱۵	نماز تراویح سے متعلق چند مسائل	357

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۶	تطلیق ثلاثہ کے سلسلہ میں ایک سوال اور اس کا جواب	361
۱۷	انسانی پیدائش کے لیے مصنوعی تخم ریزی	365
۱۸	نابالغ لڑکے اور لڑکی کا نکاح	376
۱۹	حلال وحرام	389
۲۰	زکوۃ وعشر کے چند مسائل، ان کے جوابات	397
۲۱	چار متفرق فتاویٰ۔ حسبنا کتاب اللہ، قربانی کی شرعی حیثیت، بنات النبی ﷺ، شرح زکوۃ۔	401

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیش لفظ

اس کتاب کے مقالہ نگار مولانا عبدالرحمن کیلانی رحمہ اللہ کے حالات زندگی مختصر اور تفصیلی طور پر مختلف مقامات پر درج کر دیئے گئے ہیں۔ اب مولانا کی ذات تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ اپنی جوانی کی زندگی میں انہوں نے اپنا آبائی پیشہ کتابت اپنایا۔ اُردو کتابت کی تو بہت اچھے اداروں کے ساتھ منسلک رہے۔ عربی کتابت کی ابتدا کی تو قرآن مجید کی کتابت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ ۱۹۸۰ء کے بعد جب فکر معاش سے قدرے فراغت نصیب ہوئی تو تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی ماشاءاللہ علماء ومصنفین حضرات کی صف میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ مرحوم نے معاشرت، معیشت، سیاست، عقائد اور جدید دینی مسائل پر تحقیق وتنقید کی اور علمی حلقوں میں داد تحسین پائی۔ ابا جان مرحوم کی تصانیف میں سرفہرست ''تیسیر القرآن'' ہے۔ علمائے سلف کے طرز پر لکھی گئی یہ تفسیر گزشتہ تمام تفاسیر ماثورہ کی جامع پہلی مفصل تفسیر بالحدیث ہے۔ جو کسی خاص مسلک یا فقہ کی ترجمانی کے بجائے براہِ راست قرآن کریم، صحاح ستہ کی صحیح اور حسن درجہ کی احادیث، اقوال صحابہ وتابعین پر مبنی ہے۔ ہر حدیث کی ترقیم وتخریج کے ساتھ مکمل حوالہ درج ہے۔ اس تفسیر کا ترجمہ بامحاورہ اور سلیس ہے۔ اتنی واضح اور مفصل تفسیر جو کہ طالب علموں کے ساتھ علماء وخطباء کو بھی دوسری تفاسیر سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ تفسیر قرآن کے ساتھ ساتھ لغت قرآن پر ''مترادفات القرآن'' کے نام سے ان کا یگانہ روز تحقیقی کام موجود ہے۔ اس کے علاوہ جدید مغرب زدہ طبقہ کے پھیلائے شکوک وشبہات اور اعتراضات کا ''آئینہ پرویزیت'' اور ''عقل پرستی اور انکار معجزات'' کے عنوان سے کافی پرزور استدلال کے ساتھ جواب دیا گیا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ بڑے اہم موضوعات پر مصنف کی مندرجہ ذیل کتب موجود ہیں:

۳۔ احکام ستر وحجاب	۴۔ احکام تجارت اور لین دین کے مسائل
۵۔ الشمس والقمر بحسبان	۶۔ اسلام میں دولت کے مصارف
۷۔ خلافت وجمہوریت	۸۔ ایک مجلس کی تین طلاقیں اور ان کا شرعی حل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۹۔ شریعت و طریقت ۱۰۔ روح عذاب قبر اور سماع موتی

۱۱۔ نبی کریم ﷺ بحیثیت سپہ سالار ۱۲۔ محمد ﷺ صبر و ثبات کے پیکرِ اعظم

محترم والد صاحب نے تین دفعہ قومی سیرت کانفرنس میں شرکت کی جبکہ دو دفعہ صدارتی ایوارڈ حاصل کیا۔ یہ مقالے ''اصلاح معاشرہ'' (۱۹۸۸ء)، ''پیغمبر اسلام ﷺ داعی امن واخوت'' (۱۹۸۹ء) کے موضوعات پر تھے۔ جبکہ ۱۹۹۰ء میں ''لسانی اور گروھی اختلافات کا خاتمہ'' قومی سیرت کانفرنس میں پڑھا گیا۔ یہ تینوں مضامین قومی سیرت کانفرنس کے ریکارڈ میں موجود ہیں، مگر شومئی قسمت ''اصلاح معاشرہ'' اور ''لسانی اور گروہی اختلافات کا خاتمہ'' مجھے نہیں مل سکے۔ اگر کسی صاحب کے پاس موجود ہوں تو مجھے ان کی فوٹو کاپی کروادے، ہم ان کے مشکور ہوں گے۔ اور آئندہ ایڈیشن میں ان کی طباعت بھی شامل ہوگی۔ ان شاءاللہ

مرحوم اپنی حیات مستعار میں اتنا کام کر گئے کہ جید علماء جن کے پاس مستقل ادارے اور ملازمین ہیں، حیران ہوتے ہیں کہ مرحوم کس طرح اکیلے یہ سارے کام کر لیتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسی تحقیقی اور معلوماتی کتب تصنیف کیں کہ جن سے آج تک علمی حلقے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

ان کی وفات کے بعد جب ان کے مسودات وغیرہ دیکھے گئے تو کئی ایک غیر مطبوعہ کتب بھی ملیں۔ جواب الحمدللہ طبع ہوگئیں ہیں۔ والد صاحب اپنے تصنیفی دور کے آغاز میں مختلف ماہ ناموں میں اپنے مضامین ارسال کرتے رہے۔ جن میں ماہ نامہ ''محدث''، ''ترجمان القرآن''، ''حرمین، جہلم'' اور سہ ماہی مجلّہ ''منہاج'' شامل ہیں۔

والد صاحب کے دوست احباب، عقیدت مند اکثر پوچھتے رہتے ہیں کہ اب ان کی کونسی کتاب زیورِ طباعت سے مزین ہو رہی ہے۔ پہلے پہل تو میں ان کی غیر مطبوعہ کتابیں باری باری طبع کرواتا رہا۔ اس کے بعد انہی کتابوں کو ہم نے جدید طرز پر کمپوز کروا کے نئے ٹائٹل، مضبوط جلد اور اچھے کاغذ کے ساتھ طبع کیا۔ اب والد صاحب کے متفرق مقالات اور فتاوی جو پہلے معروف ماہناموں میں طبع ہو چکے ہیں۔ بلکہ اکثر مضامین ان کی کتب اور تیسیر القرآن میں بھی آچکے ہیں۔ بہرحال ان مضامین کو یکجا کر کے مفاد عامہ کی خاطر ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے۔ امید ہے آپ لوگوں کو پسند آئیں گے۔ اپنی آراء، تجاویز سے ضرور مطلع فرمائیں۔ دوران مطالعہ اگر کوئی غلطی سامنے آئے تو اس کی بھی ضرور نشان دہی کریں۔ جزاکم اللہ خیراً۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مرحوم ہمیشہ نماز با جماعت کا اہتمام کرتے تھے۔۷۲ سال کی عمر میں گھر سے کافی فاصلے پر واقع مسجد میں حاضر ہو کر نماز ادا کرنا ان کا معمول تھا۔۱۸ دسمبر ۱۹۹۵ء رات کا کھانا کھا کر عشاء کی نماز کے لیے مسجد تشریف لے گئے۔ مسجد میں پہلی صف میں دائیں طرف انہیں جگہ ملی۔ پہلی رکعت کے پہلے سجدہ میں ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ ساتھ والے نمازی نے اپنی نماز توڑ کر ان کو پانی پلانے کی کوشش کی مگر بے سود...... ایسی پر سکون اور اطمینان بخش موت کہ جس کی ہر مسلمان بجا طور پر تمنا کر سکتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے والدین کی قبر کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنائے۔ ہم سب بہن بھائیوں اور ہماری اولادوں کو بھی ان کے نقش قدم پر چلائے۔

ہمارے بڑے بھائی ڈاکٹر حبیب الرحمٰن کیلانی صاحب کی قیادت اور دوسرے سب بہن بھائیوں کے مشورے اور پر خلوص تجاویز کے ساتھ اس کتاب کو مصنف مرحوم اور ہم سب کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین یارب العالمین۔

طالب دعا

نجیب الرحمٰن کیلانی

رمضان المبارک ۱۴۳۸ھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بسم الله الرحمن الرحيم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقالہ: ۱

پیغمبر اسلام ﷺ بحیثیت داعی امن و اُخوت ●

اس حقیقت سے تو غالباً کسی غیر مسلم کو انکار نہیں ہوگا کہ عالم انسانیت پر جس قدر پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت اثر انداز ہوئی ہے۔ دنیا کی کسی دوسری شخصیت نے اتنا گہرا اثر نہیں چھوڑا، انبیاء ہمیشہ ایسے وقتوں میں مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ جب دنیا ظلم و جور سے بھر جاتی ہے، کمزور لوگ بڑے لوگوں کے ظلم واستبداد کی چکی میں پس رہے ہوتے ہیں اور ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا، اگر کوئی شخص اصلاح کی کوشش کرے بھی تو بسا اوقات معاشرتی رسم و رواج کے سامنے مجبور محض اور بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال تھی جب پیغمبر اسلام ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے۔

دوسرے تمام انبیاء کی طرح آپ ﷺ کی دعوت کا آغاز بھی عقیدہ توحید سے ہوا، عقیدۂ توحید کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کا خالق و مالک صرف ایک اللہ تعالیٰ ہے، لہٰذا اپنی مخلوقات میں حکم بھی اُسی کا چلے گا، اس کی حاکمیت میں دوسرا کوئی شخص بھی شریک نہیں ہو سکتا۔ اس عقیدہ توحید کا عملی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمام انسان بحیثیت انسان برابر ہیں کیونکہ وہ ایک ہی اللہ کی مخلوق ہیں۔ یہ معاشرتی مساوات ہوئی۔ پھر چونکہ حاکمیت بھی صرف ایک اللہ کی ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام انسان قانونی لحاظ سے بھی ایک ہی سطح پر ہیں۔ ان میں اگر کچھ فرق ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ جو شخص جس قدر اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار اور اس سے ڈرنے والا ہوگا، اسی قدر وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اور معاشرتی سطح پر بھی معزز ہوگا۔ تاہم اس کی قانونی حیثیت پھر بھی برابر ہی رہے گی۔

ظاہر ہے کہ ایسی تعلیم چوہدری قسم کے لوگوں کے خودساختہ حقوق پر کاری ضرب لگاتی ہے لہٰذا ایسے لوگوں نے ہمیشہ انبیاء کی مخالفت ہی کی ہے۔ اس کے برعکس یہی تعلیم کمزور اور مظلوم طبقہ کے دل کی آواز

● یہ مضمون ''مقالات سیرت'' میں وزارت مذہبی امور، حکومت پاکستان، اسلام آباد کے تحت طبع ہوا اور قومی سیرت کانفرنس ۱۹۸۹ء اسلام آباد میں پڑھا گیا۔ اس مضمون پر مصنف کو پہلی پوزیشن کے ساتھ ساتھ مبلغ -/2500 روپے نقد انعام سے نوازا گیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتی ہے۔ لہٰذا اسی طبقہ کے کچھ باہمت لوگ ابتداءً انبیاء کا ساتھ دیتے ہیں اور بڑے لوگوں کی طرف سے جو دُکھ اور مظالم انبیاء پر ڈھائے جاتے ہیں ان میں وہ انبیاء کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں۔ ایک طویل سفر اور پر مشقت جدوجہد کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے انبیاء کو ان کے مشن میں کامیاب فرماتے ہیں۔ ظالم طبقہ، یعنی چوہدری لوگ، جو تعداد کے لحاظ سے ایک فیصد بھی نہیں ہوتے، سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ سسکتی ہوئی انسانیت پھر سے اطمینان کا سانس لینے لگتی ہے۔

پیغمبر اسلام کے اُسی مشن کا ساتھ دینے کے لیے اللہ تعالیٰ مومنوں سے فرماتے ہیں کہ:

﴿یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ﴾ (الانفال:۲۴)

”اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو، جبکہ رسول اللہ تمہیں ایسے کام کے لیے بلائیں جو تم کو زندگی (جاوداں) بخشتا ہے۔“

اصلاح انسانیت کے اس پُر مشقت سفر میں جو لوگ انبیاء کا ساتھ دیتے ہیں ان کی تربیت ہی اس انداز سے کی جاتی ہے کہ ان کے باہمی اختلاف، رنجشیں اور کدورتیں ازخود ختم ہو جاتی ہیں اور ان میں محبت، ہمدردی اور اخوت جیسی اعلیٰ اقدار فروغ پانے لگتی ہیں۔ قومی، لسانی، وطنی اور خاندانی برتری کے تصورات ازخود ختم ہونے لگتے ہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے رفقاء میں عربی، عجمی سب یکساں طور پر معزز سمجھے جاتے تھے۔ وہاں اگر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جیسے معززین قریش موجود تھے تو حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ، صہیب رومی رضی اللہ عنہ، سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور ابو ذر غفاری بھی موجود تھے۔ یہ سب یکساں محترم تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس اتحاد و اتفاق، باہمی ہمدردی، الفت و محبت کو جو وحی الٰہی اور رسول ﷺ کی تربیت کا نتیجہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

﴿وَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ﴾ (الانفال:۶۳)

”اور (اللہ نے ہی) ان (صحابہ کرام) کے دلوں میں اُلفت پیدا کر دی، اگر آپ ﷺ (اس طریق کار کے علاوہ) دنیا بھر کی دولت خرچ کرتے تب بھی انکے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے۔ مگر اللہ ہی نے ان کے دلوں میں الفت ڈالی۔ بے شک وہ زبردست حکمت والا ہے۔“

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیشتر اس کے کہ ہم یہ دیکھیں کہ رسول اللہ ﷺ یہ انقلاب لانے میں کیسے اور کس حد تک کامیاب ہوئے۔ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کی معاشرتی حالت کا مختصراً جائزہ لے لیا جائے۔

بعثت نبوی سے پہلے عرب معاشرہ کی حالت:

دورِ جاہلیت میں اہل عرب میں جو مفاسد پھیلے ہوئے تھے۔وہ مختصراً درج ذیل ہیں:

ا۔شرک کا فروغ:

اہل عرب اپنے آپ کو دین ابراہیمی علیہ السلام کا متبع قرار دیتے تھے،مگر طویل عرصہ گزرنے کی وجہ سے یہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حقیقی تعلیم ،توحید خالص، سے بہت دور ہٹ چکے تھے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام بت شکن تھے لیکن یہاں صورت حال یہ تھی کہ ہر گھر میں بُت موجود تھا۔پھر ہر ایک قبیلے کا الگ الگ ایک بہت بڑا بت ہوتا تھا،جس کی یہ لوگ جے پکارا کرتے تھے۔حد یہ ہے کہ نبوت کے بیس سال بعد جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح کیا تو توحید کے اس سب سے پہلے اور بڑے مرکز، بیت اللہ شریف میں تین سو ساٹھ بت موجود تھے۔جنہیں آپ نے خود اپنے ہاتھوں سے توڑ کر ان کی خدائی کے طلسم کو پاش پاش کر دیا۔

ان بتوں میں بعض تو ایسے تھے جنہیں خدائی کا مقام حاصل تھا۔جنگ احد میں جب مشرکین مکہ کا پلہ بھاری ہوا تو ان کے سپہ سالار ابوسفیان نے اُعْلُ الهُبَل کہہ کر اپنے قبیلہ قریش کے سب سے بڑے بت ھُبل کی جے پکاری تھی۔ان بڑے بتوں کے نیچے کچھ چھوٹے بت تھے اور یہ سب اللہ کے ہاں سفارشی سمجھے جاتے تھے۔اس عقیدہ سفارش نے مشرکین کو عصیان اور سرکشی کی زندگی پر دلیر بنا دیا تھا۔

۲۔لوٹ مار:

عرب جیسے ریتلے اور بے آب و گیاہ علاقے میں زراعت تو ممکن ہی نہ تھی۔ان لوگوں کا پیشہ بھیڑ بکریاں پال کر گزر اوقات کرنا تھا،کچھ مالدار لوگ تجارت بھی کرتے تھے۔یہ تجارتی قافلے یمن سے ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ شام تک اور پھر ایران کی طرف نکل جاتے تھے۔وحشی قبائل کا پسندیدہ مشغلہ یا تو ان تجارتی قافلوں کو لوٹنا ہوتا تھا یا پھر ایک دوسرے پر حملہ کر کے ان کی بھیڑ بکریاں چھین لیتے تھے۔اسی لیے یہ تجارتی قافلے شخصی ضمانتوں کے تحت اور بالعموم حرمت کے مہینوں میں سفر کرتے تھے۔پھر بھی ڈاکہ اور راہزنی کی وارداتوں نے راہ کے امن و سکون کی زندگی کو تباہ و برباد کر رکھا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۔قتل وغارت:

ویسے تو رہزنی کا پیشہ ہی انسان کو دوسرے انسان کے قتل پر بیباک اور جری بنا دیتا ہے، تاہم کچھ اور اسباب بھی ان میں شامل ہو گئے تھے جن کی وجہ سے ان کی وحشت اور انسانی حقوق کی ارزانی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور وہ اسباب درج ذیل ہیں:

(i) قبائلی نظام:

عرب بھر میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ ہر قبیلے کا سردار بھی الگ اور خدا (بت) بھی الگ ہوتا تھا۔فخر ومباہات بھی ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ انہی وجوہات کی بنا پر دو قبیلوں کے افراد کے درمیان اگر کسی معمولی سی بات پر بھی تنازعہ ہو جاتا۔ تو ہر کوئی اپنے قبیلے کی دہائی دینے لگتا اور آن کی آن میں یہ جھگڑا ایک قبائلی جنگ کی شکل اختیار کر جاتا۔ جو مدت مدید تک ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی، بقول مولانا حالیؔ

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی　　صدی جس میں آدھی انہوں نے گنوائی
قبیلوں کی کر دی تھی جس نے صفائی　　تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی
نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ　　کرشمہ اک ان کی جہالت کا تھا وہ

(ii) جنگجو طبائع:

قبائلی برتری کے تصور اور لوٹ مار کی عادت نے انہیں اس قدر بگاڑ دیا تھا کہ معمولی معمولی باتوں پر ایک دوسرے سے الجھ پڑنا ان کا شعار بن چکا تھا۔ جس طرح کی غیر اہم باتوں پر یہ جھگڑا بپا ہوتا تھا وہ بھی مولانا حالی کی زبان سے سنیئے:

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا　　کہیں گھوڑا پہلے بڑھانے پہ جھگڑا
لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا　　کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں　　یوں ہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں

(iii) ثار کا عقیدہ:

ان لوگوں کے ہاں اس عقیدہ کا مطلب یہ تھا کہ جب تک مقتول کے خون کا بدلہ نہ لیا جائے، اس کی روح پرندہ کی شکل اختیار کر کے مسلسل چیخ وپکار کرتی رہتی ہے کہ میں پیاسی ہوں، میں پیاسی ہوں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اس روح کی یہ پیاس اس وقت تک نہ بجھتی تھی جب تک کہ قاتل یا اس کے قبیلے کے کسی مرد کو قتل کر کے اس چیخنے والی روح کی چپ نہ کرا دیا جائے۔

(iv) نسلی اور علاقائی تفاخر:

اس دور میں قریش کے نسلی تفاخر کا ڈنکا بجتا تھا۔ اور حرم کی پاسبانی اور بعض دوسری خدمات کی بنا پر دوسرے قبائل ان کی سیادت کو تسلیم بھی کرتے تھے۔ مگر قریش کی ذیلی شاخوں کی بھی آپس میں ٹھنی رہتی تھی اور یہی نسلی برتری اور کمتری معاشرتی بگاڑ کو جنم دیتی اور تفرقہ و انتشار کا سبب بن گئی تھی۔

اور علاقائی تفاخر کا یہ حال تھا کہ عرب باقی تمام دنیا کو عجم کہتے تھے۔ یعنی وہ خود تو افصح و افضل تھے جبکہ باقی دنیا ان کے مقابلے میں گونگی اور حقیر تھی۔

معاشرتی ناہمواری کی ایک اور قسم آقا اور غلام کی تقسیم ہے۔ عرب میں غلاموں کی خرید و فروخت کا عام رواج تھا۔ اہل عرب میں جس شخص کے پاس جتنے زیادہ غلام ہوتے اتنا ہی وہ معزز اور سرکردہ سمجھا جاتا تھا۔ غلام، جن کی حیثیت بکاؤ اور متروکہ مال کی تھی، انسان سے بہت کمتر درجہ کی مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ طبقہ اپنے آقاؤں کے سامنے یوں مجبور و بے بس ہوتا تھا۔ جیسے غسال کے ہاتھ میں مُردہ، ان کی داد و فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔

(v) عورت کا مقام:

اس معاشرہ میں عورت کا مقام اگرچہ غلام سے قدرے بلند تھا، تاہم وہ بھی متروکہ مال کی طرح تقسیم ہوتی تھی۔ بیٹے اپنی ماں سے نکاح بھی کر لیتے تھے یا پھر اسے لونڈی بنا لیتے تھے۔ عورت کا وجود اس قدر باعثِ ننگ و عار سمجھا جاتا تھا کہ بچی کے پیدا ہوتے ہی اسے زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ ایک مرد دس دس عورتوں سے نکاح کر کے انہیں اپنے گھر میں ڈال لیتا۔ لونڈیاں مستزاد تھیں۔ پھر وہ ان سے جیسے چاہتا سلوک کرتا۔ عورت کو آباد کرنا یا لٹکائے رکھنا، طلاقیں دیتے جانا مگر رخصت کر کے ان کی خلاصی نہ کرنا، ایسے مسائل تھے جنہوں نے عورت کی زندگی کو موت سے بدتر بنا دیا۔

(vi) شراب نوشی:

شراب ان لوگوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، مرد و زن، چھوٹے بڑے غلام و آقا سب ہی اس کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رسیا تھے۔شراب پی کرفسق وفجور اور عشق معاشقہ کی داستانوں کوفخریہ بیان کرنا،تہمت تراشی،نسلی تفاخر کی بڑ ہانکنا،چھوٹی چھوٹی باتوں پر تیغ پا ہوکر میدان کارزار بپا کردینا سب اسی مذموم عادت کے کرشمے ہیں، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ﴾ (۵:۹۱)

''شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہیں آپس میں دشمنی اور رنجش سے دوچار کر دے۔''

(vii) فحاشی اور زنا کاری:

فحاشی کا رواج اس قدر تھا کہ ایسے واقعات کو برسرِ عام بیان کرنا ایک قابل فخر کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ عرب کے مشہور میلہ عکاظ میں شعراء اور خطیب اپنی اپنی محبوباؤں کا نام لے لے کر اپنی فحاشی اور معاشقہ کی داستانیں مزے لے لے کر سناتے تھے۔جس سے بعض دفعہ حریف قبیلہ جس سے معشوقہ کا تعلق ہوتا،غیرت میں آجاتا اور اسی مقام پر لڑائی کا میدان گرم ہوجاتا۔اور حد یہ ہے کہ بعض حیا باختہ عورتیں خود اس میلہ میں اپنے آشناؤں سے تعلقات کو برسرِ عام بیان کرنے آتی تھیں، یہ کچھ تو برملا ہوتا تھا اور جو کچھ درون خانہ ہوسکتا ہے اس کا آپ خود اندازہ لگا لیجیے، یہ تھے وہ حالات جن میں آپ مبعوث ہوئے اور جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ (۳۰:۴۱)

''خشکی اور تری (ہر جگہ) لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا۔''

اگر مندرجہ بالا اسباب کے نتائج پر غور کیا جائے تو نتیجتاً دو ہی باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ بدامنی کا ملک بھر میں دور دورہ تھا، راستے پُرخطر تھے، کوئی بھی اجتماع لڑائی اور ہنگامہ کے خطرہ سے خالی نہ ہوتا تھا۔اور جب لڑائی چھڑ جاتی تو ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔

۲۔ اور اس بدامنی کی بڑی وجہ ان لوگوں کی آپس میں رنجشیں، رقابتیں اور عداوتیں تھیں جن کے کئی اسباب تھے اور انہیں باتوں کی اصلاح کے لیے آپ ﷺ مبعوث ہوئے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حرب فجار اور حلف الفضول:

آپ کی بعثت سے چند سال پہلے اہل مکہ ایسی ہی قبائلی جنگ کی زد میں آئے ہوئے تھے۔ لڑائیوں کے اس متواتر سلسلہ نے سینکڑوں گھرانے برباد کردیئے تھے۔ قتل اور سفا کی موروثی اخلاق بن گئے تھے۔ حرب فجار، جو قیس اور قریش کے درمیان ہوئی اور اس نام سے اس لیے موسوم ہوئی کہ یہ حرمت والے مہینوں میں بھی جاری رہی۔ اس کے خاتمہ پر بعض طبیعتوں میں اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ خود بھی (قبل از بعثت) اس لڑائی میں شریک ہوئے کیونکہ اس جنگ میں قریش ہی حق پر تھے، تاہم آپ نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ قریش کے چند معززین عبداللہ بن جدعان کے گھر جمع ہوئے اور معاہدہ ہوا کہ ہم میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا۔ اس معاہدہ کو حلف الفضول کہا جاتا ہے، اس نام کی وجہ یہ تھی کہ ابتداءً جن لوگوں کو ایسے معاہدہ کا خیال آیا ان کے ناموں میں فضل کا مادہ بطور قدرِ مشترک شامل تھا۔ یعنی فضیل بن حرث، فضیل بن وداعہ اور مفضل۔

اس معاہدہ کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا کیونکہ اس وقت کوئی ایسی قوت موجود نہ تھی جو قبائلی عصبیتوں کا خاتمہ کرسکتی۔ آپ ﷺ اپنے عہدِ نبوت میں فرمایا کرتے تھے کہ:

''اگر اس معاہدہ کے مقابلے میں مجھے سرخ اونٹ ...... جو عربوں کے نزدیک بہت قیمتی چیز سمجھی جاتی تھی، بھی دیئے جاتے تو میں نہ بدلتا اور آج بھی اسے معاہدے کے لیے مجھے کوئی بلائے تو میں حاضر ہوں۔'' (سیرت النبی، ج۱ص۱۸۴۔۱۸۵، شبلی نعمانی)

قیام امن کی شرعی بنیادیں:

قیام امن کے لیے سب سے بڑی بنیاد عقیدہ توحید کا راسخ ہونا، روزِ آخرت پر ایمان اور اپنے ہر اچھے یا بُرے فعل کے لیے اللہ کی بارگاہ میں جواب دہی کا تصور ہے۔ چنانچہ بعثت کے بعد ابتدائی دور میں مکہ میں جتنی سورتیں نازل ہوئی، ان میں سب سے زیادہ انہیں امور کی وضاحت کی گئی ہے۔ اسی سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے جو انسان کو ہر طرح کی برائی کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے۔ اس عقیدہ میں اتنی قوت موجود ہے کہ سلیم الطبع انسان ہر طرح کی بُری حرکات وعادات سے باز آجائیں لیکن معاشرہ میں سب لوگ سلیم الطبع نہیں ہوتے کچھ لاتوں کے بھوت بھی ہوتے ہیں۔ جن کے لیے قانون کے سہارا کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضرورت ہوتی ہے، اس سلسلہ میں شریعت نے جو احکام دیئے ہیں وہ مختصراً درج ذیل ہیں:

جان کی حفاظت:

قتل کو شدید ترین اور نا قابل معافی جرم قرار دیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ (۲:۱۷۹)

''اور اے اہل عقل! قصاص لینے میں تمہارے لیے زندگانی ہے۔''

اور یہ قصاص محض قتل میں نہیں بلکہ اعضاء و جوارح میں بھی قصاص ہے، جس کی تفصیل احادیث میں موجود ہے۔

(i) مسلم کے قتل عمد کی سزا قصاص کے علاوہ ابدی جہنم ہے۔ اللہ کا غضب اور لعنت مستزاد ہیں۔(۴:۹۳)

(ii) مسلمان کے قتل بالخطا کی سزا ایک غلام آزاد کرنا اور مقتول کی وارثوں کو خون بہا دینا ہے۔(۴:۹۲)

(iii) مقتول اگر وہ معاہد قوم سے تعلق رکھتا ہے تو غلام آزاد کرانا اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا دینا اور اگر دشمن قوم سے تعلق رکھتا ہو تو غلام آزاد کرانا ہے۔(۴:۹۲)

(iv) نوزائیدہ بچیوں کو زندہ درگور کرنے کو بھی قتل ہی قرار دیا گیا۔(۸۱:۸)

(v) قتل کی ہلکی سے ہلکی سزا یہ ہے کہ اگر مقتول کے وارث دیت پر راضی ہو جائیں تو یہ ان کی مہربانی ہے، دیت کی مقدار سو اونٹ ہے جو دورِ جاہلیت میں مروج تھی۔ شریعت نے اسے ہی بحال رکھا ہے۔

مال کی حفاظت:

(i) چوری کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔

(ii) رہزن کے لیے چار سزائیں ہیں۔ (۱) قتل، (۲) سولی، (۳) آمنے سامنے کے ہاتھ پاؤں کاٹنا اور (۴) جلاوطنی، قاضی کو یہ اختیار ہے کہ ان میں سے کوئی ایک یا کئی ایک سزائیں حالات کے تقاضا کے مطابق دے دے۔

(iii) باطل کے تمام طریقوں سے ایک دوسرے کا مال لینا حرام قرار دیا گیا اور صرف فریقین کی باہمی رضامندی کی تجارت کو حلال کیا گیا۔ ان باطل طریقوں میں سود، جوا، دھوکے کی بیع، اندھے سودے، رشوت، حرام چیزوں کی خرید وفروخت سب کچھ آجاتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آبرو کی حفاظت:

(i) آبروریزی یعنی زنا کی حد غیر شادی شدہ کے لیے سو کوڑے مقرر ہے (۲:۲۴) اور شادی شدہ کے لیے رجم ہے۔ (بخاری۔ کتاب استتابة المرتدین)

(ii) تہمت لگانے کی سزا ۸۰ دُرّے ہیں اور توبہ سے قبل قانون کی گواہی نامقبول ہے۔ (۴:۲۴)

(iii) شراب نوشی کی سزا جرم کی نوعیت کے مطابق ۴۰ کوڑے یا ۸۰ کوڑے ہے۔ (بخاری۔ کتاب الحدود)

اب جان و مال اور آبرو کی حفاظت کے متعلق ارشادات نبوی ﷺ بھی ملاحظہ فرمایئے، آپ ﷺ نے فرمایا:

۱۔ ہر مسلمان پر کسی بھی مسلمان کا خون اور اس کا مال اور اس کی عزت (بے عزتی کرنا) حرام ہے۔" (مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب تحریم ظلم المسلم)

۲۔ مسلمان پر لعنت کرنا اس کو قتل کرنے کی مانند ہے۔ (مسلم کتاب الایمان۔ باب بیان غلظ تحریم)

۳۔ کسی شخص کے لیے اتنی ہی برائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ (مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب، باب تحریم ظلم المسلم)

۴۔ مسلمان کو گالی دینا گناہ ہے اور اسے قتل کرنا کفر ہے۔ (بخاری کتاب الایمان، باب خوف المومن...... مسلم۔ کتاب الایمان...... عنوان باب)

۵۔ کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ بھی نہ کرے۔ (مسلم)

۶۔ جس شخص نے ہم پر ہتھیار اٹھایا، وہ ہم سے نہیں، (ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں)۔ (مسلم، کتاب الایمان عنوان باب)

۷۔ سب سے بُرا اللہ کے نزدیک وہ شخص ہے جو بڑا لڑاکا جھگڑالو ہو (مسلم، حدیث ۲۶۶۸، کتاب العلم، باب فی الالد الخصم)

علاوہ ازیں کتاب وسنت میں بے شمار ایسے احکام موجود ہیں جن میں معاشرہ کے ہر طبقہ کے حقوق ومفادات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امن کی ضمانت:

رسول اللہ کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ جو دعوت وہ لے کر اُٹھے ہیں اس سے قبائلی جنگوں کے لا متناہی سلسلہ کا خاتمہ ہو کر امن قائم ہو کے رہے گا اور یہ اسلام کی بالادستی اور معاشی خوشحالی کا دور ہوگا۔
عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ:

''ایک بار میں نبی ﷺ کے پاس بیٹھا تھا، اتنے میں ایک آدمی آیا اور اس نے فقر و فاقہ کی شکایت کی پھر ایک اور آدمی آیا اور اس نے راہ کی بے امنی (رہزنی) کی شکایت کی، آپ ﷺ نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''عدی! تم نے حیرہ دیکھا ہے؟'' میں نے کہا ''نہیں، لیکن اس کا نام سنا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تو زندہ رہا تو دیکھ لے گا کہ ایک اکیلی عورت اونٹ پر سوار ہو کر حیرہ سے چلے گی اور مکہ پہنچ کر کعبہ کا طواف کرے گی اور اس کو اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا۔'' میں نے اپنے دل میں کہا کہ بنی طے کے ڈاکو کہاں جائیں گے جنہوں نے شہروں کو تباہ کر دیا...... عدی کہتے ہیں کہ جیسا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا میں نے اپنی زندگی میں دیکھ لیا کہ ایک عورت حیرہ سے اونٹ پر سوار ہو کر کعبہ کا طواف کرتی ہے اور اسے اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔ (بخاری کتاب المناقب، باب علامات النبوة فی الاسلام)

یہ تو خیر مدنی دور کا قصہ ہے جب اسلامی ریاست قائم ہو چکی تھی، آپ ﷺ کو اس وقت بھی اس بات کا اتنا ہی یقین تھا۔ جب مکہ میں اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ شدید مخالفت اور تکالیف کے دور سے گزر رہے تھے اور کسی کو یہ گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ اسلام اور اہل اسلام پر کبھی ایسا پُر امن دور بھی آ سکتا ہے۔ سیدنا خباب بن ارت رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ:

''میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ آپ اس وقت کعبہ کے سایہ میں چادر پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ اس زمانہ میں ہم مشرک لوگوں سے سخت تکلیفیں اٹھا رہے تھے۔ میں نے آپ سے عرض کیا: ''آپ ﷺ اللہ سے بددعا کیوں نہیں کرتے، یہ سن کر آپ تکیہ چھوڑ کر سیدھے بیٹھ گئے، آپ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا، آپ نے فرمایا! ''تم سے پہلے تو ایسے لوگ گزر چکے ہیں جن کے گوشت اور پٹھوں میں ہڈیوں تک لوہے کی کنگھیاں چلائی جاتی تھیں ان کے سر پر آرا چلا کر ان کے دو ٹکڑے کر دیئے جاتے، مگر وہ اپنے سچے دین سے نہیں پھرتے تھے اور اللہ تعالیٰ ایک دن اپنے اس دین کو ضرور پورا کرے گا۔ یہاں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تک کہ ایک شخص صنعاء سے سوار ہو کر حضر موت تک چلا جائے گا اور اللہ کے سوا اس کو کسی کا ڈر نہ ہوگا۔ (اور ایک روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں کہ آپ نے حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ سے فرمایا!لیکن تم لوگ تو جلدی کرتے ہو۔ (بخاری کتاب المناقب، باب مالقی النبی ﷺ و اصحابه من المشرکین بمکة)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنا وہ وعدہ پورا فرما دیا، جو اس نے اپنے نیک بندوں سے فرمایا، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا﴾ (۲۴:۵۵)

”تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے، ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انہیں ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے۔ مستحکم و پائیدار کر دے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا۔“

قانونی مساوات اور عدلیہ کی بالادستی

ہر ریاست اپنے علاقے میں قیام امن کے لیے عدالتیں قائم کرتی ہے تا کہ وہ ریاست میں اس کے دستور کے مطابق عدل وانصاف کریں، اسلام میں یہ دستورِ شریعت ہے جو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہے۔ اسلامی عدالتیں اسی کے مطابق انصاف کرنے کی پابند ہوتی ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰكَ اللّٰهُ﴾ (۴:۱۰۵)

”اے پیغمبر ﷺ! ہم نے آپ ﷺ پر سچی کتاب نازل کی ہے تا کہ آپ اللہ کی ہدایات کے مطابق لوگوں کے مقدمات فیصل کریں۔“

اسلام میں حاکمیت، جسے آج کی سیاسی زبان میں اقتدارِ اعلیٰ (Sovereignty) کہتے ہیں، بھی اللہ تعالیٰ کی ہے اور قانون ساز بھی اللہ تعالیٰ ہے۔ جس کی نظروں میں شاہ وگدا، امیر وغریب، آقا و غلام سب برابر ہیں۔ لہٰذا شرعی قانون سب پر ایک ہی جیسا لاگو ہے اور اسلام میں یہی وہ صفت ہے جو اسے دوسرے تمام نظام ہائے سیاست سے ممتاز کر دیتی ہے۔ وجہ یہ ہے دوسرے تمام نظاموں میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حاکمیت یا تو کسی ایک انسان کی ہوتی ہے یا کسی ادارہ یا پارلیمنٹ کی۔ ایسے حاکم یا قانون ساز ادارے خود کو بہر حال قانون کی گرفت سے بچائے رکھتے ہیں۔

غیر اسلامی حکومتوں میں عدلیہ کی بے بسی:

کہنے کو تو سب حکومتیں عدلیہ کی بالا دستی کا ڈھنڈورا پیٹتی ہیں مگر اسلام نے عدلیہ کی بالا دستی کا جو تصور پیش کیا ہے، وہ اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ کسی بھی طرز حکومت میں جس کی حاکمیت ہوگی، بالا دستی بھی اُسی کی ہوگی۔ ملوکیت یا آمریت میں مقتدر اعلیٰ خود بادشاہ کی ذات ہوتی ہے۔ اس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ اس کا حکم ہے اور وہی اس ریاست کا قانون ہے، اس کے حکم کے مقابلے میں کسی کا کوئی حق نہیں ہوتا۔

جمہوریت میں قانونی حاکمیت تو پارلیمنٹ کے پاس ہوتی ہے اور سیاسی حاکمیت عوام کے پاس عدلیہ محض پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق فیصلے کرنے کی پابند ہوتی ہے۔ اگر صدرِ مملکت یا وزیر اعظم یا انتظامیہ کے دیگر معزز ارکان کو اپنے مفادات کے خلاف عدالت کی طرف سے فیصلہ ہونے کا خطرہ لاحق ہو تو پارلیمنٹ فوراً نیا قانون بنا کر یا پہلے قانون میں ترمیم کر کے یا عدالتوں پر دباؤ ڈال کر اُسے بے بس بنا دیتی ہے۔

دُور کیوں جایئے ہم اپنے پاکستان کی بات کرتے ہیں۔ اس کے دستور ۱۹۷۳ء میں اب تک ایسی دفعات موجود ہیں جن کی رُو سے صدرِ مملکت، وزیر اعظم، گورنر اور وزرائے اعلیٰ پر نہ کوئی فوجداری مقدمہ دائر ہو سکتا ہے، نہ عدالت انہیں ایسے مقدمات میں ملوث قرار دے سکتی ہے اور نہ ہی کوئی بڑی سے بڑی عدالت انہیں اپنے ہاں طلب کر سکتی ہے...... ہمارے قومی اسمبلی کے ارکان کو اجلاس کی کاروائی سے ۱۴ دن پہلے اور ۱۴ دن بعد تک کوئی دیوانی یا محصولاتی عدالت یا انتخابی ٹریبونل طلب نہیں کر سکتے۔ نہ ہی ایسی کارروائی کر سکتے ہیں جس میں کوئی رکن اسمبلی فریق ہو۔ (دستورِ پاکستان، ص ۴۵۳ از فاروق اختر نجیب) ''اسمبلی کی کارروائی کو عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔'' (تحریک آزادی اور دستورِ پاکستان، ص ۴۵۲، از فاروق اختر نجیب)

''اسمبلی کے ارکان کی تقاریر پر عدلیہ باز پرس نہیں کر سکتی۔'' (آئین پاکستان، دفعہ ۱۱۱)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غور فرمایئے جہاں بڑوں اور چھوٹوں میں قانونی طور پر ہی اتنا فرق تسلیم کر لیا جائے وہاں عدلیہ کی بالادستی کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے!

اسلامی عدلیہ:

اب ذرا اسلامی عدلیہ کی طرف آیئے۔ عدالت کے پاس بھی وہی دستور ہے جسے ریاست کا ایک ایک فرد جانتا ہے پھر اس دستور میں ترمیم و تنسیخ کا بھی کسی کو اختیار نہیں اس نظام میں ہر چھوٹی بڑی عدالت خلیفہ تک کو طلب کر سکتی ہے اور وہ اس بات کا پابند ہے کہ عدالت کی طلبی پر بلا چوں و چرا عدالت میں حاضر ہو، کیا دنیا کی تاریخ میں ایسی مثال مل سکتی ہے کہ خود سربراہِ مملکت بلا جبر و کراہ اپنے آپ کو قصاص کے لیے عوام کی عدالت میں پیش کرے؟ یہ صرف اسلامی نظام کی برکات ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ خود کو اپنی وفات سے پیشتر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بھرے مجمع میں پیش کر کے برملا یہ اعلان کرتے ہیں کہ اگر کسی شخص پر مجھ سے کوئی زیادتی ہوگئی ہو تو وہ مجھ سے بدلہ لے سکتا ہے۔

فاطمہ مخزومیہ (قریشیہ) نے چوری کی تو اہل قبیلہ نے ہاتھ کٹنے کی بدنامی کے ڈر سے سفارش کی راہیں تلاش کرنا شروع کیں، بالآخر آپ ﷺ کے محبوب، سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ بن زید کو اس مقصد کے لیے وسیلہ بنایا گیا۔ جب سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ نے سفارش کی تو آپ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا، آپ ﷺ نے فرمایا:

”تم سے پہلی اُمتیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ وہ کمزور کو تو سزا دیتے مگر معزز کو چھوڑ دیتے تھے۔ اس اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے، اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔“ (بخاری کتاب الحدود، باب اقامۃ الحدود......)

اور یہی وہ بات ہے جسے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مختلف انداز سے بار بار اپنے خطبوں میں دہرایا کرتے تھے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بارہا خود عدالت میں حاضر ہوئے، ایک دفعہ آپ رضی اللہ عنہ سیدنا زید رضی اللہ عنہ بن ثابت کی عدالت میں پیش ہوئے وہ ازراہِ تکریم اٹھ کھڑے ہوئے تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، یہ تمہاری پہلی غلطی ہے، اس کے بعد سیدنا زید رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنے پاس بٹھانا چاہا تو پھر انہیں کہا، یہ تمہاری دوسری غلطی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔'' پھر خود ہی مدعی کے ساتھ بالمقابل کھڑے ہوئے کیونکہ شرعی قانون کا یہی تقاضا تھا۔لطف کی بات یہ ہے کہ یہ عدالت بھی کوئی اونچی سطح کی سرکاری عدالت نہ تھی بلکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے درمیان جھگڑا تھا۔جس میں فریقین نے سیدنا زید رضی اللہ عنہ کو ثالث تسلیم کیا تھا۔اس مقدمہ میں فیصلہ بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف صادر ہوا۔(الفاروق ،ص:۲۲۴، شبلی نعمانی)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اپنے دورِ خلافت میں ان کی اپنی زرہ چوری ہوگئی جو آپ رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی کے پاس دیکھ لی، آپ کو پوری قدرت حاصل تھی کہ آپ اس سے واپس لے لیتے۔مگر آپ نے ایسا نہیں کیا بلکہ قاضی شریح کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا،سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس بطور گواہ ان کے بیٹے حسن اور ان کا اپنا غلام تھا، قاضی شریح نے آپ کا مقدمہ صرف اس بنا پر خارج کرایا کہ بیٹے کی شہادت باپ کے حق میں غلام کی شہادت آقا کے حق میں مقبول نہیں حالانکہ عدالت کو یہ خوب معلوم تھا کہ مدعی اور گواہ سب عادل اور ثقہ ہیں اور مدعی خود خلیفہ ہے لیکن عدالت نے اسلامی قانون کے تقاضے پورے کیے اور مقدمہ خارج کردیا، یہودی نے جب اسلامی قانونِ عدل اور قانونی مساوات کی یہ بلندی دیکھی تو زرہ واپس کردی اور خود بھی مسلمان ہوگیا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ رومیوں کے ہاں سفیر بن کر گئے تو دورانِ گفتگو بادشاہ اور اس کے اختیارات کا ذکر چھڑ گیا۔سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کہنے لگے ''تمہیں اس بات پر ناز ہے کہ تم ایسے شہنشاہ کی رعایا ہو، جس کو تمہاری جان اور مال کا اختیار ہے۔لیکن ہم نے جس کو اپنا سربراہ بنا رکھا ہے، وہ کسی بات میں اپنے آپ کو ہم پر ترجیح نہیں دے سکتا وہ اگر زنا کرے تو اسے کوڑے لگائے جائیں۔ چوری کرے تو ہاتھ کاٹے جائیں، وہ پردے میں نہیں بیٹھتا، اپنے آپ کو ہم سے بڑا نہیں سمجھتا، مال و دولت میں اس کو ہم پر ترجیح نہیں۔'' (الفاروق از شبلی نعمانی ص ۱۲۵، مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور)

انہیں سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب رسول اللہ ﷺ نے یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے کے سلسلہ میں آپ ﷺ نے انہیں جو ہدایت فرمائی وہ سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

(اتق دعوة المظلوم فان ليس بينه و بين الله حجاب) (متفق علیہ)

''مظلوم کی بد دُعا سے بچنا، کیونکہ اس کی بد دعا اور اللہ کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غور فرمایئے جہاں عدل وانصاف کی سطح اتنی بلند ہو، وہاں بدامنی رہ سکتی ہے؟

عالمی امن صرف اسلام سے قائم ہوسکتا ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں جب سائنسی ترقی کے نتیجہ میں وسائل ابلاغ میں وسعت اور ذرائع نقل وحرکت میں آسانی اور تیز رفتاری پیدا ہوئی تو تمام دنیا کو ایک عالمی برادری کا احساس پیدا ہوا۔ ابھی اس کی طرف کچھ پیش رفت نہ ہوئی تھی کہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم اول شروع ہوگئی۔

اسلام اور اُخوت:

رسول اللہ ﷺ اللہ کے پیغمبر تھے۔ ان کے احوال کو وحی الٰہی کے ذریعہ پیشین گوئی پر محمول کیا جاسکتا ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ بعض اہل بصیرت لوگ خود بھی یہ اندازہ لگا لیتے تھے کہ جو تعلیم رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں، اسی میں انسان کے دکھوں کی نجات ہے، اگر قبائلی آویزشوں، عداوتوں اور جنگوں سے چھٹکارا حاصل ہوسکتا ہے تو صرف آپ ﷺ کی تعلیمات کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہجرت نبوی سے پیشتر مدینہ میں دو قومیں آباد تھیں، ایک یہود، دوسرے مشرکین جو بعد میں انصار کے نام سے مشہور ہوئے، یہود گو تعداد میں کم تھے مگر اپنے علم اور معاشی برتری کی بنا پر انصار پر چھائے ہوئے تھے، انصار پھر دو قبائل، اوس اور خزرج میں بٹے ہوئے تھے، یہود کا کام یہ تھا کہ اوس اور خزرج کو آپس میں لڑا بھڑا کر انہیں کمزور کرتے رہتے اور خود کسی ایک قبیلہ کے حلیف بن کر انہیں لڑائی میں الجھا کر اپنی بالادستی قائم رکھتے تھے۔ اس صورتِ حال سے انصار بہت پریشان تھے۔ ۱۰ نبوی میں قبیلہ اوس کا ایک چھ رکنی وفد قریش مکہ کے پاس اس غرض سے آیا، کہ خزرج کے خلاف قریش کا حلف وتعاون حاصل کرے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس وفد کی آمد کا علم ہوا تو آپ قریش سے وفد کی ملاقات سے پیشتر ہی ان سے ملے۔ اور ان پر قرآنی آیات پیش کیں، اوس وخزرج کے درمیان اس وقت عداوت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اس وفد کے ایک رکن ایاس بن معاذ نے جب آپ کا پیغام سنا تو کہنے لگے۔ اے قوم! ''واللہ یہ کام اس کام سے بہتر ہے جس کے لیے آپ یہاں تشریف لائے ہیں۔'' مگر امیر وفد ابوالحسیر کہنے لگا، ہم یہاں اس کے بجائے کسی دوسرے مقصد کے لیے آئے ہیں اور اتفاق کی بات کہ اس وفد کا وہ مقصد بھی پورا نہ ہوا اور وہ قریش کے ساتھ حلف وتعاون کا معاہدہ کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جنگ بعاث:

بالآخر اوس وخزرج کے درمیان وہ خطرناک جنگ ہوئی جسے مدینہ کی تاریخ میں جنگ بعاث کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس جنگ نے دونوں قبیلوں کو چکنا چور کر دیا تھا اور اہل دانش لوگ اس صورت حال سے سخت پریشان اور اس کا حل تلاش کرنے کی فکر میں تھے۔ اگلے سال ۱۱ نبوی میں انصار کے چھ معززین بسلسلہ حج مکہ تشریف لائے۔ رسول اللہ ﷺ حسب معمول ان کے پاس گئے اور انہیں اسلام کی دعوت دی اور تلاوتِ قرآن فرمائی۔ ان لوگوں نے اپنی تکلیف کا مداوا بھانپ لیا، وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ دیکھو! یہ تو وہی نبی معلوم ہوتے ہیں جن کا حوالہ دے کر یہود تمہیں دھمکیاں دیا کرتے تھے۔ لہٰذا تم پر یہود سبقت نہ کرنے پائیں۔ اس کے بعد وہ فوراً مسلمان ہو گئے اور کہنے لگے کہ! ''ہم اپنی قوم کو اس حالت میں چھوڑ کر آئے ہیں کہ کسی اور قوم میں ان جیسی عداوت اور دشمنی نہیں پائی جاتی۔ ہمیں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کے ذریعہ انہیں یک جا کر دے گا۔ ہم آپ کی دعوت ان پر بھی پیش کریں گے اور اگر اللہ نے آپ پر ان کو یکجا کر دیا تو پھر آپ سے بڑھ کر کوئی اور معزز نہ ہوگا۔'' [1]

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو یہ آرزو پوری کر دی، اسلام لانے کے بعد اوس وخزرج کی سب دیرینہ رقابتیں اور عداوتیں ختم ہوگئیں اور وہ آپس میں شیر و شکر بن کے رہنے لگے۔

سلسلہ مواخات:

مہاجرین مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے بے سروسامان آئے تھے اگرچہ ان میں چند ایک دولت مند اور خوشحال بھی تھے۔ مگر کفار سے چھپ کر نکلنے کی وجہ سے اپنے ساتھ کچھ نہ لا سکے تھے ان مہاجرین کے لیے انصار کا گھر مہمان خانہ عام تھا۔ جب رسول ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو تعمیر مسجد نبوی کے بعد آپ ﷺ نے سب سے پہلے مہاجرین کی مستقل آبادکاری اور ان کے ذریعہ معاش کی طرف توجہ مبذول فرمائی۔ اس سلسلہ میں انصار کے تعاون کی شدید ضرورت تھی۔ آپ ﷺ نے سب مہاجرین اور انصار کو سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے گھر پر جمع فرمایا، مہاجرین اس وقت تعداد میں پینتالیس تھے۔ آپ ﷺ نے انصار کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''یہ تمہارے بھائی ہیں۔'' پھر مہاجرین اور انصار میں سے دو، دو شخص بلا کر فرماتے گئے، ''کہ یہ اور تم بھائی بھائی ہو'' انصار نے آپ ﷺ کے اس ارشاد کی فوراً

---

[1] الرحیق المختوم ص ۲۱۴۔۲۱۵

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعمیل کی اور اپنے مہاجر بھائی کو ساتھ لے جا کر گھر کی ایک ایک چیز کا نصف اس کے حوالے کر دیا۔

گھریلو اشیاء کے بعد اب جائیداد کا مسئلہ آیا، انصار کی اصل جائیداد نخلستان ہی تھے۔ انہوں نے درخواست کی کہ یہ نخلستان ہمارے اور ہمارے مہاجر بھائیوں میں برابر برابر تقسیم کر دیئے جائیں۔ لیکن مہاجرین نے انصار کے اتنے بڑے ایثار کو ازراہِ غیرت قبول نہ کیا۔ پھر انصار نے کہا، تب آپ لوگ ہمارا کام کر دیا کریں اور ہم پھل میں آپ لوگوں کو شریک رکھیں گے۔ اس بات کو مہاجرین نے بخوشی قبول کر لیا۔"[1] اس رشتۂ اخوت کی مزید توثیق یوں ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان بھائیوں کو ایک دوسرے کا وارث قرار دے دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ﴾ (الانفال:۷۲)

"جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے ان لوگوں کو پناہ دی اور ان کی مدد کی۔ تو یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے ولی (وارث ہیں)۔"

دو سال تک مہاجرین اور انصار اسی بھائی چارہ کی رُو سے ایک دوسرے کے وارث بنے پھر جب مہاجرین کو انصار کی اعانت کی ضرورت نہ رہی تو جنگ بدر کے بعد ایسی وراثت کا سلسلہ درج ذیل آیت کی رو سے ختم کر دیا گیا، تاہم بھائی چارے کا عہد باقی رہا۔

﴿وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ﴾ (۸:۷۵)

"قرابت دار ہی ایک دوسرے (کی وراثت) کے زیادہ حقدار ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ جہاں یہ بھائی چارہ ایک حکیمانہ سیاست اور مسلمانوں کو درپیش بہت سے مسائل کا بہترین حل تھا وہاں اس بھائی چارہ نے مسلمانوں میں اخوت و ہمدردی اور الفت و محبت کی جو فضا پیدا کی وہ حقیقی بھائیوں سے بھی بڑھ کر تھی۔ یہی وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت تھی جس کا ذکر قرآن کریم میں ان الفاظ میں آیا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب إخاء النبی ﷺ بین المهاجرین والانصار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا﴾ (آل عمران:۱۰۳)

''اور سب مل کر اللہ (کی ہدایت) کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور اللہ کی اس مہربانی کو یاد کرو۔ جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ تو اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اللہ کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر پہنچ چکے تھے کہ اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔''

اخوت کی شرعی بنیادیں

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اسلام کی وہ کون سی تعلیمات ہیں، جن پر عمل کرنے سے معاشرہ میں ایسی اخوت و ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے۔ اس بحث کو ہم چند ذیلی عنوانات میں تقسیم کریں گے۔

ا۔ عقائد و عبادات میں یگانگت:

معاشرہ کے افراد کو مربوط اور مستحکم بنانے اور ان میں اخوت پیدا کرنے کے لیے عقائد و عبادات میں یگانگت بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ ایک ایسی وحدت فکر و عمل ہے جو کسی دوسرے معاشرے میں نہیں پائی جاتی۔ کائنات ارضی کے تمام مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی کونے میں رہتے ہوں کوئی زبان بولتے ہوں۔ کسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔ عقائد و نظریات میں متحد ہوتے ہیں۔ ہر مسلمان اللہ پر، اس کے رسول پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ یہی وحدت فکر افراد کو تہہ دل سے ایک دوسرے کے قریب لانے میں موثر کردار ادا کرتی ہے اسی وحدتِ فکر و عمل کا نتیجہ ہے کہ آج کے گئے گزرے دور میں ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک کے مسلمانوں سے قلبی لگاؤ رکھتے ہیں۔

۲۔ عبادات:

عبادات میں سب سے پہلا نمبر نماز کا ہے نماز صرف خدا کی خوشنودی اور برے کاموں سے روکنے کا ہی ذریعہ نہیں اس میں اور بھی بہت سی مصلحتیں ہیں۔ نماز عدم مساوات کو ختم کرتی تنظیم کا سبق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیتی اور وقت کی پابندی سکھلاتی ہے، افراد میں ہمدردی، اخوت اور ربط قائم کر کے اسلامی معاشرہ کا ایک چھوٹے پیمانہ پر نمونہ قائم کرتی ہے۔

زکوٰۃ: صرف طبقاتی تقسیم کا علاج ہی نہیں بلکہ امیر وغریب کے درمیان محبت وموانست بھی پیدا کرتی ہے، یہی حال روزہ اور حج کا بھی ہے ان کی ادائیگی میں مسلمانوں میں تنظیم، مساوات ایک دوسرے کی ضروریات کا احساس، تکالیف میں برداشت اور ایک دوسرے سے ہمدردی اور محبت کے سبق ملتے ہیں۔

مسلمانوں کی اجتماعیت اور اتحاد واتفاق اسلام کی نظروں میں اتنا پسندیدہ ہے کہ نماز کا اجتماع دن میں پانچ بار فرض کیا گیا ہے۔ جہاں افرادِ ملت آپس میں مل بیٹھتے، ایک دوسرے کے حالات سے باخبر رہتے اور اپنے ہر طرح کے مسائل کا حل سوچتے ہیں۔ پھر اس کے بعد جمعہ کے دن کا ہفتہ وار اجتماع ہے اس کے مقاصد بھی وہی ہیں۔ پھر سال میں دو مقامی اجتماع عیدین کے موقع پر ہوتے ہیں جن میں عورتوں کے شامل ہونے کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ پھر اہل استطاعت لوگوں پر حج فرض ہے جو مسلمانوں کا سالانہ عالمگیر اجتماع ہے اگر آج کا مسلمان ان فرائض کی ادائیگی ٹھیک طور پر بجالائے اور ان کے مقاصد سے پوری طرح باخبر ہو تو ان کے فوائد کو یقینی طور پر حاصل کر سکتا ہے۔

۳۔ حقوق وفرائض:

حقوق وفرائض کی ابتدا گھر سے ہوتی ہے۔ جیسے حقوق مرد کے عورت پر ہیں، ویسے ہی عورت کے مرد پر بھی ہیں۔ ازدواجی زندگی کی اصل روح مودت، موانست اور ایک دوسرے پر مہربانی ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَ جَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً﴾ (الروم:۲۱)

''اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس کی عورتیں پیدا کیں تا کہ ان کی طرف (مائل ہو کر) آرام حاصل کرو۔ اور تم میں محبت اور مہربانی پیدا کر دی۔''

اگر مرد کے ناظم خانہ ہونے کی بنا پر عورت کو اس کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے تو مرد کو بھی عورت سے حسن سلوک کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ زوجین میں ناچاقی کی صورت میں اگرچہ طلاق جائز ہے تاہم یہ اللہ کے ہاں سخت ناپسندیدہ چیز ہے۔ (ابوداود، کتاب الطلاق)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رشتہ داروں کے حقوق:

زوجین کے بعد قریبی رشتہ داروں کی باری آتی ہے۔ جن سے حسنِ سلوک اور الفت و محبت کی قرآن مجید میں سخت تاکید آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَ الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ﴾ (۲۱:۱۳)

''اور جن قریبی رشتوں کو اللہ نے جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے، انہیں جوڑے رکھتے ہیں۔''

اور دو مقامات پر قریبی رشتہ داروں سے بگاڑ پیدا کرنے والوں کو سخت تنبیہ کی گی ہے، فرمایا:

۱۔﴿وَ یَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ (۲:۲۷)

''اور جن قریبی رشتوں کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں قطع کرتے ہیں اور زمین میں خرابی کرتے ہیں تو یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔''

۲۔﴿وَ یَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ اُولٰٓئِکَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ﴾ (الرعد:۲۵)

''اور جن قریبی رشتہ داروں کو اللہ نے جوڑے رکھنے کا حکم ہے۔ انہیں قطع کرتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے لیے لعنت ہے اور ان کے لیے گھر بھی بُرا ہے۔''

قریبی رشتہ داروں کے بعد دوسرے رشتہ داروں کا درجہ آتا ہے۔ ان سب سے بہتر تعلقات استوار رکھنے اور انہیں جوڑے رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ غیروں سے بھی حسن سلوک کا حکم ضرور ہے مگر ان سے تعلقات استوار رکھنے اور نباہنے کی تاکید نہیں۔ یہ اپنوں کا ہی حق ہے اور اگر یہ حق غیروں کو دیا جائے جیسا کہ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ اپنوں سے تو بیگانے اچھے ہوتے ہیں اور اپنوں کو چھوڑ کر دوسروں سے تعلقات استوار رکھے جائیں تو اسی چیز کا نام ظلم ہے۔ اب اس سلسلہ میں رسول ﷺ کے چند ارشاداتِ مبارک بھی ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ کسی شخص کا یہ کمال نہیں کہ وہ حسن سلوک کا جواب حسن سلوک سے دے بلکہ کمال یہ ہے کہ اس کے رشتہ دار اس سے بدسلوکی کریں اور وہ ان سے حسن سلوک سے پیش آئے۔ (بخاری، کتاب الادب، باب لیس الواصل بالمکافئ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے مجھے وصیت کی کہ تم رشتہ داروں کے حقوق پوری طرح ادا کرو، خواہ وہ تم سے بدسلوکی سے پیش آئیں۔ (بخاری، ایضاً)

۳۔ جو شخص عام غریبوں کو صدقہ دے گا تو اسے ایک درجہ اجر ملے گا لیکن جو اپنے قرابت داروں کی امداد کرے گا اسے دوہرا اجر ملے گا۔ (بخاری، ایضاً)

۴۔ سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا، جو شخص صلہ رحمی کا حق ادا نہ کرے گا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ (بخاری، کتاب الادب، باب اثم القاطع)

۵۔ جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے رزق میں فراخی ہو اور اس کی عمر دراز ہو تو وہ صلہ رحمی کرے۔ (بخاری، کتاب الادب، باب اثم القاطع)، (مسلم کتاب البر والصلۃ، باب صلۃ الرحم و تحریم قطیعتھا)

ہمسایہ کے حقوق:

رشتہ داروں کے بعد ہمسائے حسن وسلوک اور الفت ومحبت کے مستحق ہوتے ہیں اور وہ تین طرح کے ہوتے ہیں: (۱) رشتہ دار ہمسایہ، (۲) رفیق ہمسایہ، (۳) اجنبی ہمسایہ اسی نسبت سے ان کا خیال رکھنا چاہیے۔

ہمسایوں کے حقوق سے متعلق رسول اللہ ﷺ نے ایک بار یوں ارشاد فرمایا:

(ما زال جبریل یوصینی بالجار حتی ظننت ان سیورثہ) (بخاری کتاب الادب، باب الوصاۃ بالجار)

''جبریل علیہ السلام مجھے ہمسایہ کے متعلق تاکید کرتے ہی گئے یہاں تک کہ میں خیال کرنے لگا کہ وہ اسے وراثت میں حقدار بنادے گا۔''

ایک بار آپ ﷺ نے یوں فرمایا:

''وہ شخص مومن نہیں جو خود تو پیٹ بھر کر کھائے مگر اس کا ہمسایہ اس کے پہلو میں بھوکا ہو۔'' (شعب الایمان للبیہقی)

ایک بار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے ہمسایہ کے حق میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا!

''اگر وہ تجھ سے قرض مانگے تو تُو اسے قرض دے، تجھ سے مدد چاہے تو اس کی مدد کر، بیمار ہو تو اس کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عیادت کر محتاج ہو تو اس کی حاجت پوری کر، اسے کوئی بھلائی ملے تو مبارک باد دے اور اگر کوئی مصیبت آئے تو اظہارِ ہمدردی کر، مرجائے تو اس کے جنازہ میں شریک ہو، اس کے گھر سے اپنے گھر کو اتنا اونچا نہ کر کہ اس کی ہوا رُک جائے تا کہ وہ خود اس پر راضی ہو۔ اپنے کھانے کی خوشبو سے اُسے تکلیف نہ دے ورنہ تھوڑا سا اس کے گھر میں بھیج اور پھل لائے تو اس کے گھر بھی بھیج دے یا اُسے چھپا کر کھا۔ اور تیرے بچے اسے لے کر باہر نہ جائیں تا کہ ہمسایہ کا بچہ اُسے نہ ستائے۔" (طبرانی، بحوالہ ترجمان القرآن زیرِ مضمون اسلام کا معاشرتی نظام از ابوالاعلیٰ مودودی، جون ۱۹۴۸ء، ص ۸۵)

ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا: "وہ شخص مومن نہیں جس کا ہمسایہ اس کی شرارتوں سے امن میں نہ ہو۔" (بخاری، کتاب الادب، باب اثم من لا یامَن جاره بوائقَهُ)

اور ایک دفعہ یوں فرمایا! اگر تیرے ہمسائے تجھے اچھا سمجھتے ہیں تو تُو واقعی اچھا آدمی ہے اور اگر بُرا سمجھتے ہیں تو تُو واقعی بُرا آدمی ہے۔ (ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی حق الجوار)

ایک مرتبہ آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ ایک عورت خوب نمازیں، نوافل پڑھتی ہے، کثرت سے روزے رکھتی ہے اور خوب خیرات کرتی ہے مگر اس کے ہمسائے اس کی بدزبانی سے عاجز ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا! "وہ جہنمی ہے" صحابہ نے عرض کیا کہ ایک دوسری عورت میں یہ خوبیاں تو نہیں صرف فرائض ہی بجالاتی ہے مگر وہ پڑوسیوں کو تکلیف نہیں دیتی، فرمایا! وہ جنتی ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب البر والشفقه علی الخلق، فصل ثالث)

عام معاشرہ کے حقوق:

ہمسایوں کے بعد عام معاشرہ کا درجہ ہے۔ معاشرہ میں الفت و محبت کے جذبہ کو فروغ دینے کے لیے شریعت نے جو ہدایات دی ہیں وہ مختصراً درج ذیل ہیں، ارشادِ باری ہے:

۱۔ ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ﴾ (۱۰:۴۹) "مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں تو اپنے دو بھائیوں میں صلح کرادیا کرو۔"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ ﴾ (۴۹:۱۱)

’’اے ایمان والو! کوئی قوم دوسری سے تمسخر نہ کرے، ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں، اور نہ ہی عورتیں، دوسری عورتوں کا تمسخر اڑائیں، ممکن ہے کہ وہ ان سے اچھی ہوں اور اپنے مومن بھائیوں کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ہی ایک دوسرے کا برُا نام رکھو۔ ایمان لانے کے بعد برُا نام رکھنا گناہ ہے۔‘‘

۳۔﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ﴾ (الحجرات:۱۲)

’’اے ایمان والو! زیادہ گمان کرنے سے بچو کیونکہ اکثر گمان گناہ ہیں اور ایک دوسرے کے حالات کی ٹوہ میں نہ رہو۔ نہ ہی کوئی کسی دوسرے کی غیبت کرے، کیا کوئی تم میں سے اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے، اس سے تو تم ضرور نفرت کرو گے۔‘‘

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

۱۔ تمام مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں جب جسم کا ایک عضو تکلیف میں ہوتا ہے تو سارا جسم کرب و اضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ (بخاری کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم)

گویا ہر مسلمان کو دوسرے کے دکھ درد میں یوں شریک ہونا چاہیے جیسے وہ دکھ درد اُسے خود لاحق ہوا ہے۔

۲۔ مسلمان ایک عمارت کی طرح ہیں جس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے۔ (بخاری، کتاب الادب، باب تعاون المؤمنین)

۳۔ الدین النصیحة، یعنی دین خیر خواہی کا نام ہے، آپ ﷺ سے پوچھا گیا، کس سے خیر خواہی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ سے خیر خواہی، اس کے رسول سے خیر خواہی اور تمام مومنوں سے خیر خواہی۔ (مسلم کتاب الایمان، باب بیان ان الدین النصیحة)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یعنی جب تک ایک مسلمان دوسرے کا حقیقی طور پر خیر خواہ نہ ہو، اس کا دین مکمل نہیں۔

۴۔ کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہی کچھ پسند کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔ (بخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لاخیه مایحب لنفسه)

۵۔ جو شخص دوسروں پر رحم نہیں کرتا اللہ بھی اس پر رحم نہیں کرتا۔ (بخاری کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم)

۶۔ مسلمان بھائی کے لیے حلال نہیں کہ وہ مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ تعلقات منقطع رکھے۔ (بخاری، کتاب الادب، باب ما ینهی عن التحاسد والتدابر)

۷۔ مسلمان وہ ہوتا ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان کو تکلیف نہ پہنچے۔ (بخاری کتاب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده)

۸۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو السلام علیکم کہے، خواہ اس سے پہچان ہو یا نہ ہو۔ (بخاری کتاب الاستیذان، باب افشاء السلام)

۹۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے جو اس پر نہ ظلم کرتا ہے اور نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے۔ (مسلم کتاب البر والصلہ باب تحریم ظلم المسلم)، (بخاری کتاب الاکراہ، باب یمین الرجل لصاحبه)

۱۰۔ جو شخص اپنے بھائی کی حاجت روائی میں لگا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی حاجت روائی میں لگا ہوتا ہے۔ (بخاری، ایضاً)

۱۱۔ بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی بڑا جھوٹ ہے کسی کی باتوں پر کان مت لگاؤ اور نہ ہی کسی کی ٹوہ میں رہو اور دنیا کے لیے ریس نہ کرو اور نہ ایک دوسرے سے حسد کرو نہ دشمنی کرو، اور بھائی بھائی بن کر اللہ کے بندے بن جاؤ۔" (مسلم کتاب البر والصلۃ، باب تحریم الظن)

۱۲۔ چغل خور جنت میں داخل نہ ہوگا۔ (مسلم۔ حوالہ ایضاً، بخاری، کتاب الادب، باب مایکره من النميمة)

۱۳۔ جو شخص دنیا میں کسی بندے کا عیب چھپائے گا، قیامت کے دن اللہ اس کا عیب چھپائے گا۔ (مسلم کتاب البر والصلہ، باب تحریم الغيبة)

۱۴۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس سے خیانت نہیں کرتا، اس سے جھوٹ نہیں بولتا اور نہ تکلیف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے وقت ساتھ چھوڑتا ہے، ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا مال، جان اور آبرو حرام ہے۔'' (مسلم، کتاب القصاص والدیات، باب تغلیظ تحریم الدماء والاعراض و الاموال)

۱۵۔ خطبۂ حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے فرمایا! اے لوگو میری بات سنو، اچھی طرح جان لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ سب مسلمان ایک برادری ہیں، کسی شخص پر اس کے بھائی کا مال حلال نہیں جب تک وہ خود اپنی خوشی سے نہ دے، ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا۔'' (ترمذی، ابواب الحدود، باب ماجاء فی السر علی المسلم، ابن ماجہ، کتاب الحج، خطبۂ حجۃ الوداع)

۴۔ معاشرتی مساوات:

حقوق وفرائض کے تعین کے بعد مساوات کا ایک عام اصول جو شریعت نے بتلایا ہے، وہ معاشرتی مساوات ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ (۴۹:۱۳)

''اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، اور اللہ کے ہاں تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔''

اور رسول اللہ ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر بھرے مجمع میں ارشاد فرمایا:

کسی عربی کو عجمی پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔''

معاشرتی مساوات کا یہ اصول ہر طرح کی علاقائی، کونی، لسانی، طبقاتی اور قومی برتری کی جڑ کاٹ کر سب انسانوں کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کرتا ہے اور ان کے درمیان محبت واخوت کی فضا پیدا کرتا ہے۔

یہ تھیں وہ الٰہی تعلیمات اور رسول اللہ ﷺ کی عملی تربیت، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی آپس میں الفت ومحبت حقیقی بھائیوں سے بھی بڑھ گئی تھی۔ اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا﴾ (آل عمران:۱۰۳)

''اور اللہ کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت دی اور تم اللہ کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر پہنچ چکے تھے کہ اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔''

اور یہی وہ تعلیمات ہیں جنہوں نے بدامنی کو امن میں اور دشمنی کو اخوت میں تبدیل کر کے نوع انسانی میں ایک حیات بخش انقلاب پیدا کر دیا اور اللہ تعالیٰ مومنوں کو یہی حکم دے رہے ہیں کہ جب اللہ کا رسول تمہیں زندگی بخش امور کے لیے بلائے تو فوراً اس کی بات مانا کرو۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ﴾ (۸:۲۴)

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم مانو جبکہ رسول اللہ تمہیں ایسے کام کے لیے بلائیں جو تم کو زندگی (جاوداں) بخشتا ہے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقالہ:۲

شرک اور اس کی مختلف مروجہ صورتیں ●

یہی توحید تھی، جس کو نہ تو سمجھا، نہ میں سمجھا!

توحید:

''توحید'' کا لغوی معنی کسی چیز کو ایک بنانا اور اس کا شرعی مفہوم، اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات وصفات میں یکتا سمجھنا ہے۔ توحید کی ضد الاشراک باللہ یعنی اللہ کی ذات وصفات میں کسی دوسرے کو بھی حصہ دار سمجھنا ہے۔ 'الاشراک باللہ' کو مختصر الفاظ میں ''شرک'' بھی کہا جاتا ہے۔ توحید کے اثبات سے شرک کا ردّ از خود ہو جاتا ہے۔ شرک کی جملہ اقسام سے اجتناب سے ہی عقیدۂ توحید میں پختگی اور استحکام پیدا ہوتا ہے۔

قرآن میں توحید کا لفظ نہیں آیا مگر احادیث میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تو اپنی صحیح میں ایک مستقل کتاب کا نام ہی ''کتاب التوحید'' رکھا ہے۔ قرآن مجید میں توحید کے بجائے اللہ کے لیے ''احد'' اور ''واحد'' کے الفاظ بکثرت استعمال ہوئے ہیں یا پھر شرک اور اس کی معروف اقسام کا ذکر کیا گیا ہے۔

توحید کی اہمیت:

اس موضوع کی اہمیت کا اندازہ ان باتوں سے ہوتا ہے کہ:

☆ تمام انبیائے کرام نے سب سے پہلے اپنی قوم کو توحید کا سبق دیا۔

☆ توحید ہی وہ نسخہ کیمیا ہے جس سے انبیاء نے ایک بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح کا آغاز کیا۔

☆ توحید ہی وہ بنیادی عقیدہ ہے جس کے اقرار پر کوئی شخص اسلام کے حصار میں داخل ہوتا ہے۔

☆ توحید ہی وہ اہم موضوع ہے جس کا ذکر صراحتاً یا اشارۃً قرآن کریم کے ہر صفحہ میں ملتا ہے۔ پھر اس کی تفصیلات احادیث میں بکثرت مذکور ہیں۔

● یہ مضمون ماہنامہ ''محدث'' جنوری ۲۰۰۲ء میں طبع ہوا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

☆ اسی موضوع پر علمائے حق اور مفکرین اسلام ہر دور میں زبان وقلم سے جہاد کرتے رہے اور آئندہ بھی ان شاءاللہ کرتے رہیں گے۔

☆ ساتھ ہی ساتھ یہ عقیدۂ توحید ہی ایسا نازک موضوع ہے کہ اس میں تھوڑی سی کمی بیشی سے انسان ایسا مشرک ٹھہرتا ہے جس کی نجات اُخروی کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ (۴:۴۸)

''اللہ تعالیٰ یہ گناہ کبھی نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنایا جائے اور اس کے علاوہ (اور گناہ) جس کو چاہے گا بخش دے گا۔''

انہی وجوہات کی بنا پر عقیدۂ توحید شیطان کا اصل ہدف ہے۔ وہ اس میں طرح طرح سے رخنہ اندازیاں کر کے خیالات کا رخ موڑتا اور ایک ہدایت یافتہ انسان کو پھر سے شرکیہ افعال میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انبیاء کے رخصت ہونے کے بعد ان پر ایمان لانے والوں میں سے بھی اکثر لوگ مشرک ہی رہتے یا بن جاتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾ (۱۲:۱۰۶)

''اور ان میں سے اکثر لوگ نہیں ایمان لاتے مگر اللہ کے ساتھ شرک بھی کرتے ہیں۔''

عقیدہ توحید میں پختگی سے نجاتِ اُخروی تو قرآن کریم کی بہت سی آیات سے ثابت ہے۔ یہ فائدہ مسلم، لیکن کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ اس عقیدۂ توحید کے انسانی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ ایک مشرک کی زندگی اور ایک مؤحد کی زندگی میں کیا فرق ہے؟ اس عقیدہ سے بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح کیونکر ہوتی ہے۔ نیز یہ عقیدہ عالمی قیام امن کے سلسلہ میں کیا کردار ادا کرتا ہے؟ یہ اور اس جیسے دوسرے سوالات کا جواب دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیں۔

شرک کی بنیاد توہم پرستی ہے!

انسان فطرتاً توہم پرست واقع ہوا ہے۔ اور اس توہم پرستی کا ٹھیک علاج عقیدۂ توحید ہے۔ شیطان کا انسان کو گمراہ کرنے اور مشرک بنانے کا سب سے موثر حربہ یہ ہے کہ وہ انسان کی اس توہم پرستی کو ہوا دیتا ہے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اس توہم پرستی کی وجہ سے انسان خوفِ غیر اللہ میں مبتلا ہو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاتا ہے۔ اللہ کے سوا دوسری چیزوں سے اپنے فائدہ کی توقعات وابستہ کرنے لگتا ہے۔ بس یہی دو چیزیں یعنی دفع مضرت اور جلبِ منفعت یا نقصان اور تکلیف کا ڈر اور کسی بھلائی اور فائدہ کی توقع ہیں جو انسان کو شرک کی بے شمار قسم کی خارزار وادیوں میں کھینچ لاتی ہیں۔ مثلاً مظاہر پرستی، کواکب پرستی، بت پرستی، ملائکہ پرستی، جنات پرستی، عقل پرستی، ذہن پرستی، اولیاء پرستی، قبر پرستی، آباء پرستی، احبار پرستی، حتیٰ کہ خود پرستی سب شرک ہی کی شاخیں ہیں۔ پھر یہ شاخیں اور کئی چھوٹی شاخوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ ان سب شاخوں کا اگر تجزیہ کیا جائے تو بالآخر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کا جذبہ محرکہ یہی مذکورہ دونوں باتیں یا ان میں سے کوئی ایک ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ مشرکین کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

﴿قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا﴾ (۵:۷۶)

"(اے پیغمبر ﷺ) ان سے کہہ دو کہ تم ایسی چیزوں کی پرستش کیوں کرتے ہو جنہیں تمہارے نفع ونقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں۔"

اور مشرکین کی اس توہم پرستی کا عقلی اور مشاہداتی جواب یہ دیا کہ اللہ کے سوا باقی چیزیں جنہیں تم اپنا مددگار سمجھتے ہو وہ تو خود اپنے نفع ونقصان کی بھی مالک نہیں تو پھر وہ تمہارا کیا بگاڑ یا سنوار سکتی ہیں۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا﴾ (۱۳:۱۶)

"(اے پیغمبر ﷺ) ان سے کہہ دو کہ اللہ کے سوا جن کو تم نے اپنا مددگار بنا رکھا ہے، وہ تو اپنے بھی نفع ونقصان کا کچھ اختیار نہیں رکھتے۔"

اس دنیا میں اگر کوئی سب سے بلند مقام ہستی ہو سکتی ہے تو وہ اللہ کا رسول ہی ہو سکتا ہے، جس کا اللہ تعالیٰ سے براہِ راست بھی تعلق ہوتا ہے اور جبریل کے واسطہ سے بھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسی بلند ہستی بھی نہ اپنے نفع ونقصان کی خود مالک ہوتی ہے، نہ ہی کسی دوسرے کو کچھ فائدہ یا نقصان پہنچا سکتی ہے۔ تو پھر دوسری چیزوں کا ذکر ہی کیا۔ اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ سے فرماتے ہیں:

﴿قُلْ اِنِّيْ لَاۤ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا رَشَدًا﴾ (۷۲:۲۱)

"ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں تمہارے حق میں نقصان یا بھلائی کا کچھ اختیار نہیں رکھتا۔"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

توحید و شرک سے متعلق چند شرعی اصطلاحات:

مناسب ہوگا کہ شرک کی مختلف اقسام بیان کرنے سے پیشتر ان چند الفاظ کا لغوی مفہوم بیان کر دیا جائے جو شرک کے بیان میں تکرار سے آتے ہیں اور شرعی اصطلاح کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں اور وہ ہیں: عبد اور عبادت...... دین...... رب...... الٰہ...... اللہ...... جنت...... طاغوت...... حنیف

ا۔ عبد: بمعنی بندہ، غلام، محکوم (عباد اور عبید) اور عبادت کا لفظ عموماً تین معنوں میں قرآن میں آیا ہے:

(ا) بمعنی بندگی، غلامی اور محکومی...... جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَقَالُوٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ﴾ (۲۳:۴۷) ''فرعون کے درباری کہنے لگے: بھلا ہم ایسے دو آدمیوں (موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام) پر ایمان لائیں جن کی قوم ہماری غلام ہے۔''

اب یہ تو ظاہر ہے کہ آج تک شیطان کی کسی نے پوجا پاٹ نہیں کی، نہ ہی اسے کسی نے کبھی آقا سمجھا، لہٰذا یہاں مفہوم، شیطانی وساوس کی پیروی ہی ہو سکتی ہے۔

اور عَبَّدَ بمعنی کسی دوسرے کو محکوم اور غلام بنانا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو مخاطب کر کے فرمایا:

﴿وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ﴾ (۲۶:۲۲) ''اور (کیا) یہی احسان ہے جو تو مجھ پر رکھتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے۔''

(۲) بمعنی سر عجز و نیاز خم کرنا...... معروف معنوں میں پوجا پاٹ اور پرستش کے وہ طریقے جو مشہور ہیں۔ (عبادت، جمع عبادات) خواہ یہ اللہ کی ہو یا کسی دوسرے کی۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ﴾ (۲۶:۷۱) ''ابراہیم کی قوم کہنے لگی کہ ہم تو بتوں کو پوجتے ہیں اور ان (کی پوجا) پر قائم ہیں۔''

(۳) بمعنی محض اطاعت اور فرمانبرداری جیسے ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے فرمایا:

﴿يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ﴾ (۱۹:۴۴) ''اے میرے والد! شیطان کی اطاعت نہ کیجیے۔''

۲۔ دین: دین کا لفظ چار معنوں میں مستعمل ہوتا ہے اور یہ لغتِ اضداد سے بھی ہے۔

دین کا معنی (ا) مکمل حاکمیت بھی ہے اور (۲) مکمل عبودیت بھی۔ ارشادِ باری ہے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ﴾ (الزمر:۳) ''غور سے سن لو کہ خالص عبادت صرف اللہ ہی کو زیبا ہے۔''

اس آیت میں دین کا لفظ دونوں معنوں میں آیا ہے جو آپس میں متضاد ہیں۔اس آیت کا اگر یوں ترجمہ کیا جائے کہ مکمل حاکمیت اللہ ہی کے لیے ہے،تو بھی مفہوم وہی نکلتا ہے یعنی اس کے بندے اس کی مکمل حاکمیت سمجھیں اور اس کی مکمل اطاعت وعبادت کریں۔

(۳) قانونِ جزاوسزا جیسے سورۂ یوسف میں فرمایا:

﴿مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِيْنِ الْمَلِكِ﴾ (یوسف:۷٦) ''شاہی قانون کے لحاظ سے یہ ناممکن تھا کہ یوسف علیہ السلام اپنے بھائی کو اپنے ہاں روک لیتے۔''

(۴) مکافاتِ عمل......یعنی قانونِ جزاوسزا کے مطابق اس کا عملی نفاذ۔جیسے فرمایا:

﴿فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ٥ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (الواقعہ:۸٦،۸۷) ''پھر اگر تم سچے ہو اور تم پر ہمارا قانون جزاوسزا لاگو نہیں ہوسکتا تو تم اس (مرنے والے کی روح کو) واپس پھیر کیوں نہیں لیتے۔''

درج ذیل آیت میں دین کا لفظ یہ دونوں مفہوم ادا کر رہا ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

گویا دین کا لفظ ایک مکمل نظام کی نمائندگی کرتا ہے اور مذکورہ بالا چاروں معانی اس کے اجزائے ترکیبی ہیں یعنی (۱) مکمل حاکمیت یا اقتدارِ اعلیٰ (۲) حاکمیت کے مقابلہ میں مکمل تسلیم واطاعت (۳) وہ نظامِ فکر وعمل جو اس حاکمیت کے زیرِ اثر بنے اور (۴) وہ جزاوسزا جو حاکمِ اعلیٰ کی طرف سے اطاعت کے صلہ یا سرکشی کی پاداش میں دی جائے،اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

۳۔رب: کا لفظ چار معنوں میں آیا ہے:

(۱) ربّ (مصدر) بمعنی کسی کو پرورش کر کے حدِ کمال تک پہنچانا اور اس کی جملہ ضرورتوں کا خیال رکھنا (مفردات)۔مگر یہ لفظ عموماً بطورِ اسم فاعل ہی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (الفاتحہ:۱) ''سب تعریف اللہ ہی کو سزاوار ہے جو تمام جہانوں کا پرورش کنندہ ہے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس لحاظ سے الـربّ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہوسکتا ہے اور اس لفظ کا مصدر ربوبیۃ آتا ہے۔ اور اس کی جمع نہیں آتی۔

(۲) یعنی آقا و مالک جو کسی کی تربیت کا ذمہ دار ہو۔ ان معنوں میں اس کا مصدر ربـــوبیۃ کے بجائے ربابیۃ آتا ہے۔ جمع أرباب (المفردات) قرآن میں ہے:

﴿یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُکُمَا فَیَسْقِیْ رَبَّهٗ خَمْرًا﴾ (۴۱:۱۲) ''(یوسف نے کہا) اے میرے جیل کے رفیقو! تم میں سے ایک تو اپنے آقا کو شراب پلائے گا۔''

(۳) بمعنی صرف مالک جسے اپنی مملوکہ چیز میں تصرف کا پورا پورا اختیار ہو۔ جیسے رب الناقۃ بمعنی اونٹنی کا مالک۔ ربّ الکعبۃ بمعنی بیت اللہ کا مالک ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ درج ذیل آیت میں مستعمل ہوا ہے:

﴿فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ ھٰذَا الْبَیْتِ﴾ (۳:۱۰۶) ''تو لوگوں کو چاہیے کہ وہ (اس نعمت کے شکر میں) اس گھر (کعبہ) کے مالک کی عبادت کریں۔''

(۴) چوتھا معنی ''قانون دہندہ'' اس کی پوری تصریح ایک حدیث میں مذکور ہے۔ عدی بن حاتم جو پہلے عیسائی تھے، ۹ ہجری میں اسلام لائے۔ ان کے اسلام لانے کے بعد جب سورۂ توبہ کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَ رُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ (۳۱:۹) ''ان (عیسائیوں) نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کے علاوہ اپنا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم علیہ السلام کو بھی حالانکہ انہیں حکم یہ دیا گیا تھا کہ اللہ واحد کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔''

تو عدی بن حاتم نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ وہ لوگ (عیسائی) اپنے علماء و مشائخ کی عبادت تو نہیں کرتے، آپ ﷺ نے فرمایا:

(بلی انهم حرموا علیهم الحلال وأحلوا لهم الحرام فاتبعوهم فذلک عبادتهم ایاهم) (ترمذی، ابواب التفسیر) ''کیوں نہیں، وہ علماء و مشائخ ان کے لیے حلال کو حرام قرار دیتے اور حرام کو حلال۔ پھر وہ ان کی پیروی کرتے بس یہی چیز ان کی عبادت ہے۔''

اور یہ واضح ہے کہ حرام کو حلال کرنے اور حلال کو حرام کرنے کا مسئلہ خالصتاً تشریعی امور سے تعلق رکھتا ہے۔ تشریع اسلامی قانون کو کہا جاتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۔ اِلٰہ: اِلٰہ کا لفظ ہر معبود پر بولا جاتا ہے۔ خواہ وہ معبود برحق ہو یا باطل۔ چنانچہ اللہ کے لیے بھی یہ لفظ قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے اور دوسرے ہر طرح کے معبودانِ باطل کے لیے بھی۔ اور اہل عرب سورج کو اِلٰهَة کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ انہوں نے سورج کو معبود بنا رکھا تھا۔ (مفردات از امام راغب)۔ سورج عربی زبان میں بطورِ مونث استعمال ہوتا ہے اور اِلٰہ کی مونث اِلَاهَة آتی ہے۔

اب اس لفظ اِلٰہ کی لغوی لحاظ سے خصوصیات درج ذیل ہیں:

(۱) اَلِهَ اَلَهًا سرگشتہ شد (حیران ہوا)

(۲) اَلِهَ اِلَيْهِ ترسید و پناہ گرفت (اس سے ڈرا اور اس کی طرف پناہ پکڑی)

(۳) اَلَهَهُ امان و زنہار داد (اس نے اسے امان اور حفاظت دی)

(۴) اَلِهَ اِلَاهَةً پرستید (اس کی پرستش کی) (منتہی الارب)

(۵) بعض کے نزدیک لفظ اِلٰہ دراصل وِلَاهٌ تھا، ہمزہ کو واؤ سے بدل کر اِلٰہ بنالیا اور وَلِہَ بمعنی عشق و محبت میں وارفتہ اور بے خود ہونا (اُردو زبان میں لفظ والہانہ محبت مشہور ہے)۔ اور چونکہ مخلوق کو اپنے اِلٰہ سے بہت محبت ہوتی ہے۔ اس لیے اسے اِلٰہ کہا گیا (مفردات)

(۶) بعض کے نزدیک لفظ اِلٰہ لَاهَ يَلُوْهُ لِيَاهًا سے ہے بمعنی پردہ میں چھپ جانا (مفردات)

ان سب معانی کو سامنے رکھا جائے تو ایک معبود (اِلٰہ) میں درج ذیل صفات کا ہونا ضروری ہے:

(۱) اتنی طاقت رکھتا ہو کہ شر سے پناہ دے سکے، گویا وہ کوئی بالا دست ہستی ہی ہو سکتی ہے۔

(۲) اس کی اس مشکل کشائی اور پناہ دہندگی ظاہری اسباب و علل پر منحصر نہ ہو بلکہ مستور و محجوب ہو۔ گویا یہ پناہ دہندگی یا حجت براری حیران کن طریقہ سے ہو۔

(۳) پھر ایسی ہستی سے اس کے طالب کا اشتیاق و محبت تو ویسے ہی ایک ناگزیر امر بن جاتا ہے۔

(۴) تخلیق کرنے کی صلاحیت۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ﴾ (۲۲:۷۳)

''جن لوگوں کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اگرچہ اس کے لیے سب مجتمع ہو جائیں۔''

(۵) جو خود مخلوق ہو وہ اِلٰہ نہیں ہو سکتا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿اَیُشْرِکُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْئًا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ﴾ (۷:۱۹۱)

''کیا وہ ایسی چیزوں کو شریک بناتے ہیں جو کچھ بھی پیدا نہیں سکتے بلکہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں۔''

(۲) جو کھانا کھاتا ہو، وہ الٰہ نہیں ہو سکتا۔

﴿مَا الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَ اُمُّهٗ صِدِّیْقَةٌ کَانَا یَاْکُلٰنِ الطَّعَامَ﴾ (۵:۷۵)

''مسیح بن مریم کچھ نہیں سوائے اللہ کے پیغمبر کے، ان سے پہلے بھی رسول گزرے۔ ان کی ماں صدیقہ تھیں۔ وہ دونوں تو کھانا کھاتے تھے۔''

گویا اللہ تعالیٰ رب بھی ہے اور اِلٰــہ بھی۔ ربّ: اس لحاظ سے وہ کائنات کی جملہ اشیاء کا پروردگار بھی ہے اور مالک بھی اور ان اشیاء میں ہر طرح کے تصرف کا پورا اختیار رکھتا ہے۔ اور اِلٰــہ: اس لحاظ سے کہ حقیقتاً وہ ہی حاجت روائی اور مشکل کشائی کی طاقت رکھتا ہے کیونکہ اُمورِ کائنات میں تصرف کا اختیار صرف اسی کو حاصل ہے۔ پھر اَحکم الحاکمین بھی وہی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ قانون سازی کے جملہ اختیارات بھی اسی کو حاصل ہیں اور حاکمیت اعلیٰ بھی اسی کو سزاوار ہے۔

۵۔ اللہ: بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ لفظ اللّٰه، اِلٰهٌ سے ہی بنا ہے۔ وہ یوں کہ پہلا ہمزۂ وصل حذف کر کے اس پر ''اَل'' تعریف کا داخل کر کے لفظ ''اللہ'' بنا ہے۔ ''اِلٰــہ'' اسم نکرہ ہے جس کے معنی ہیں کوئی سا معبود۔ اور ''اللہ'' اسم معرفہ ہے جس کے معنی ہوئے خاص معبود یا حقیقی معبود۔ اس خیال کے مطابق اکثر اہل لغت اسے ''ا ل ہ'' کے تحت لائے ہیں۔

اس کے برعکس بعض علماء اس خیال کے سخت مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اِلٰــہ پر ''اَل'' داخل کرنے سے سینکڑوں ہزاروں ''الٰهون'' میں سے کون سے الٰــه پر زور دینا مقصود ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اللہ'' ایک ایسا کلمہ ہے جو شروع ہی سے عربی زبان میں موجود تھا۔ نہ یہ کسی لفظ سے مشتق ہے، نہ اس سے کوئی دوسرا لفظ مشتق ہے۔ گویا ''اللہ'' اسم مُرتَجل ہے، عَلَم ہے اور جامد للفرد۔ عربوں کا اللہ کے متعلق تصور یہ تھا کہ وہ ہی معبود برحق ہے۔ وہی کائنات کا خالق، مالک اور رازق ہے۔ وہی دعا اور پرستش کا اصل مستحق اور نفع و ضرر کا مالک ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ان کے ان معتقدات کا ذکر کئی مقامات پر دہرایا گیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٦۔جبت: جِبت کے معنی صاحب ''منتہی الارب'' نے یوں لکھے ہیں: ''بت و کاہن و فال گری و جادو و جادوگر، وآنکہ دراں خیر نباشد از ہر چیز غیر باری تعالیٰ کہ آں را پرستش نمایند'' یعنی بت اور ہر وہ چیز جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے۔ نیز کہانت، جادو، فال گیری اور ہر وہ چیز جس میں خیر نہ ہو۔ یہ لفظ دراصل اوہام وخرافات کے لیے ایک جامع لفظ ہے جس میں جادو، ٹونے، ٹوٹکے، جنتر منتر، سیاروں کی تاثیرات، سعد ونحس کے تصورات وتوہمات اور گنڈے، تعویذ اور نقش وغیرہ سب کچھ شامل ہے۔

٧۔طاغوت: بمعنی ''لات وعزیٰ و جادو و جادوگر، کاہن و دیو و ہر باطل و بت و ہر چہ بدی را سرشا یک و ہر چہ جز خدا است کہ اورا پرستند وسرکش'' (منتہی الارب) گویا طاغوت ہر وہ باطل یا سرکش طاقت ہے جس نے خدا کے مقابلہ میں سرکشی اختیار کی ہو اور بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خداوندی علم بلند کیا ہو، خواہ یہ کوئی ایک شخص ہو یا گروہ یا ادارہ یا حکومت ہو۔ ارشادِ باری ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ﴾ (٥١:٤)

''کیا تم نے ان لوگوں پر غور کیا جنہیں کتاب اللہ کا ایک حصہ ملا ہے لیکن وہ جبت اور طاغوت کو مان رہے ہیں۔''

اس آیت میں ''کتاب اللہ'' کے ایک حصہ سے مراد وہ حصہ ہے جو تمدنی، اخلاقی، معاشی اور سیاسی احکام پر مشتمل ہے۔

٨۔حنیف: حنف (ضد جنف، طرفداری کرنا) بمعنی دوسرے راستے چھوڑ کر یکسو ہو کر دین کی راہ اختیار کرنا (جمع، حنفاء) اور اس سے مراد وہ شخص ہے جو نہ تو اللہ کے سوا کسی کو اِلٰہ مانتا ہو نہ رب، نہ جبت کو تسلیم کرتا اور ایمان رکھتا ہو اور نہ طاغوت کے آگے جھکے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ﴾ (٥:٩٨)

''اور انہیں تو صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ یکسو ہو کر دین کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے اس کی بندگی کریں۔''

شرک کی تعریف اور اقسام:

شرک کی مختصر الفاظ میں جو تعریف کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں کسی کو حصہ دار بنایا جائے۔'' لیکن یہ تعریف اتنی مختصر ہے کہ اس کو پھر کئی عنوانوں میں تقسیم کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً ذات میں شرک، عبادات میں شرک، تعریف میں شرک، علم میں شرک، عادات میں شرک۔ لیکن اس کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بعد بھی شرک کے کئی ایسے گوشے باقی رہ جاتے ہیں جو ان عنوانات کے تحت نہیں آتے، حالانکہ وہ کتاب و سنت سے ثابت ہیں۔

شرک کی ایک تعریف جو قرآن کے مفہوم کو بہت حد تک ادا کر دیتی ہے، یہ ہے کہ

''انسان اپنے کسی بھی طرح کے فائدے کے حصول یا تکلیف کے دفیعہ کے لیے اللہ کے سوا کسی بھی چیز کو...... خواہ وہ چیز جاندار ہو یا بے جان، حاضر ہو یا غایب، مردہ ہو یا زندہ ...... پکارے، اس کی طرف رجوع کرے اور اس سے توقعات وابستہ رکھے، جب کہ اس کے ظاہری اسباب معدوم ہوں۔''

(۱) کواکب پرستی اور مظاہر پرستی

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک کی مشہور اقسام میں سے مظاہر پرستی اور کواکب پرستی کا آغاز سب سے پہلے ہوا اور اس کی ابتدا عراق سے ہوئی۔ عراق میں اکثر مطلع صاف رہتا تھا۔ اکثر لوگ رات کو سیاروں کی چال اور حرکات کا مطالعہ کرتے اور اس میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے ہزارہا سال پیشتر یہ دریافت کر لیا تھا کہ سورج اور چاند کی طرح اور بھی بہت سے سیارے مشرق سے مغرب کی طرف مصروف سفر رہتے ہیں۔ پانچ مشہور سیارے یعنی عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل جنہیں ''خمسہ متحیرہ'' بھی کہتے ہیں، ان کے علم میں آ چکے تھے۔ وہ ان سیاروں کی چال سے رات کے اوقات کا صحیح صحیح تعین بھی کر لیتے تھے اور سمت کا تعین کرنے کے بھی قابل ہو چکے تھے۔ اس کے ساتھ وہ ان اجرام کے بعض دیگر اثرات سے بھی واقف تھے مثلاً سورج کی وجہ سے دن رات پیدا ہوتے اور چاروں موسم وجود میں آتے ہیں جن سے طرح طرح کی فصلیں اور پھل پکتے ہیں۔ زندگی کے لیے روشنی اور حرارت نہایت ضروری ہے جو سورج سے حاصل ہوتی ہے۔ رات کو ہم چاند اور ستاروں سے روشنی حاصل کرتے، رات کا تعین کرتے اور رات کو دورانِ سفر سمت معلوم کرتے ہیں۔

نیز جن دنوں میں چاند زائد النور ہوتا ہے، پھلوں میں رس تیزی سے بڑھتا ہے اور جب ناقص النور ہوتا ہے تو یہ رفتار سست پڑ جاتی ہے۔ یہ اثرات تو بالکل واضح تھے۔ لیکن انسان نے بعض توہمات کی بنا پر ان سیاروں کے انسان کی انفرادی زندگی پر بھی طرح طرح کے اثرات تسلیم کرنا شروع کر دیئے۔ وہ اپنی زندگی اور موت، مرض اور صحت، رزق کی وسعت اور تنگی اور ایسے ہی کئی دوسرے اُمور کو بھی سیاروں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی چال سے منسوب کرنے لگا۔جس کا لازمی تصور یہ نکلا کہ انسان نے ان سیاروں کی تعظیم شروع کر دی اور ان کے لیے ازراہِ عجز و نیاز اپنا سر تسلیم خم کر دیا۔

سیدنا ادریس علیہ السلام اور کواکب پرستی:

ان توہمات اور گمراہیوں کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی بذریعہ وحی رہنمائی فرمائی اور اسی دور میں سیدنا ادریس علیہ السلام (اصل نام اخنوخ ۳۵۰۰ ق م) کو مبعوث فرمایا۔ چونکہ یہ ابتدائے آفرینش کا دور تھا، لوگوں کے علم نے ابھی کچھ ترقی نہ کی تھی، لہٰذا ادریس علیہ السلام کو بذریعہ وحی چند علوم سکھلائے گئے۔ چنانچہ کپڑا بننے اور کتابت کے موجد اور اُستادِ اول آپ ہی ہیں۔ آپ علم ہندسہ اور علم حساب کے بھی ماہر تھے۔ من جملہ دیگر علوم کے آپ کو علم نجوم کی پوری ماہیت، سیاروں کی گردش اور کشش وغیرہ کا علم بھی عطا کیا گیا تھا۔ ان علوم کے ساتھ ساتھ آپ فصاحت، علم لغت اور فن تقریر میں اتنے ماہر تھے کہ انہیں ''ہرمس الہرامسہ'' [1] کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ نے سیاروں کی اس قسم کی تاثیر سے متعلق لوگوں کے عقائد باطلہ کی پرزور تردید کی اور انہیں سمجھایا کہ یہ اجرام تو محض بنی نوع انسان کی خدمت پر مامور ہیں، انسان ان کا خادم نہیں ہے۔ اصل مقصودِ کائنات انسان ہے، نہ کہ اجرامِ فلکی۔ یہ اجرامِ فلکی تو انسانی زندگی سے بہت پہلے اپنے فرائض کی بجا آوری پر اس طرح مجبور اور بے بس تھے جس طرح آج ہیں۔ بھلا ان سیاروں کی حرکات کا انسان کے بگاڑ اور سنوار سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ گویا انسان کو اس کی عظمت ذہن نشین کرا کے ایسے حقیر توہمات سے نجات دلائی۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ:

جب سیدنا ادریس علیہ السلام کی رحلت کو کچھ عرصہ گزر گیا تو سیاروں کی گردش کے انسانی زندگی پر اثرات کے توہمات پھر انسانی ذہن میں راہ پانے لگے۔ اب کی بار انسان پر شیطان کا یہ حملہ پہلے سے شدید تر اور سہ گونہ تھا۔ ایک تو یہ کہ ان توہمات نے عراق کے علاوہ مصر، یونان اور ہندوستان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور دوسرے یہ کہ ان توہمات کو باقاعدہ ایک نظام کی شکل دے دی گئی۔ ہر سیارے کے لیے ایک

---

[1] ہرمس ایک عظیم فلاسفر اور حکیم تھا اور سکندر کی مجلس علمی کا قائد تھا۔ جب وہ دربار میں کھڑے ہو کر اس مجلس کے سامنے تقریر کرتا تو ایسے رموز و نکات بیان کرتا کہ اہل مجلس اس کی عقل و دانش پر مبہوت رہ جاتے تھے۔ یونانی حکماء اس پر بہت رشک کیا کرتے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الگ دیوتا God یعنی چھوٹا خدا تجویز ہوا جو بڑے خدا کا مددگار سمجھا جاتا تھا۔ پھر ان کی شکلیں تجویز کی گئیں اور ان کے مجسمے تیار کیے گئے جو گاڑے بھی جاسکتے تھے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل بھی کیے جا سکتے تھے۔ خواہ یہ پتھر کے ہوں یا کسی دوسری دھات یا لکڑی کے اور تیسرے یہ کہ اب ان دیوتاؤں کے آگے صرف سر تسلیم ہی خم نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ان کے حضور چڑھاوے بھی چڑھائے جانے لگے اور قربانیاں بھی پیش کی جانے لگیں۔ جن کا خون ان دیوتاؤں کے مجسموں یا بتوں پر مل دیا جاتا تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ اس طرح ان کے یہ دیوتا خوش ہوں گے اور ہمیں کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچائیں گے۔ ان بتوں کی اس ایذا رسانی کے عقیدے کو قرآن کریم نے درج ذیل آیت میں بیان فرمایا ہے:

﴿اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ﴾ (ھود:۵۴)

"(قوم ہود نے کہا: اے ہود!) ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے کسی معبود نے تمہیں آسیب پہنچا (کر دیوانہ کر) دیا ہے۔"

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی بعثت:

اس نجوم پرستی کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسی قدر جلیل القدر پیغمبر سیدنا ابراہیم (۲۰۰۰ ق م) کو اسی علاقہ بابل میں مبعوث فرمایا۔ اس وقت عراق کا پایۂ تخت بابل اور نمرود حکمران تھا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ حکمت تھی کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اس سلطنت کے سب سے بڑے شاہی پروہت، نجوم پرست اور بت تراش "آزر" کے ہاں پیدا ہوئے۔ آزر کا اصلی نام تارخ تھا لیکن بت گری اور بت فروشی کی وجہ سے آزر مشہور ہو گیا تھا۔ ان دنوں مندروں میں سیاروں کے دیوتاؤں کے موہوم شکلوں کے مجسمے رکھے جاتے۔ نیز ان کے علاوہ دیگر مظاہر قدرت مثلاً آگ، پانی، بادل وغیرہ کے دیوتاؤں کے مجسمے بھی موجود تھے۔ اور ان کے لیے ایسی تمام رسوم بجالائی جاتی تھیں جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے سزاوار ہیں۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام بچپن ہی سے قوم کی اس نجوم پرستی اور بت پرستی سے بیزار تھے۔ سیاروں کے ایسے اثرات تسلیم کرنے کے لیے آپ کی طبیعت قطعاً آمادہ نہ ہوتی تھی۔ آپ علیہ السلام نے پہلے کسی ایک سیارے کا بغور مطالعہ اور مشاہدہ کیا۔ پھر چاند اور اس کے بعد سورج کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اس مطالعہ نے آپ کو سیاروں کے اثرات سے بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ آپ نے دیکھا کہ یہ اجرام خواہ چھوٹے ہوں یا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بڑے، اپنے فرض کی ادائیگی میں مجبور و بے بس ہیں۔ان کا اپنا ذرّہ بھر بھی اختیار نہیں ہے۔آپ سوچتے تھے کہ بھلا ایسی مجبور و بے بس اشیاء خدائی اختیارت کی حامل کیسے ہو سکتی ہیں اور میرا کیا بگاڑ سکتی ہیں۔ آپ کی طبیعت اس جستجو میں رہتی کہ ایسی ذات کا پتہ لگائیں جو ان اجرامِ فلکی کی اور خود ہماری بھی نگران اور مربی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت عطا فرمائی اور بذریعہ وحی اس اضطراب کو دور کر کے یقینی علم عطا فرمایا۔ بقول ارشادِ باری تعالیٰ:

﴿وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ﴾(۶:۷۵)

’’اسی طرح ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو کائنات کے عجائبات دکھلا دیئے تا کہ اسے یقینی علم حاصل ہو۔‘‘

کواکب پرستی کے خلاف جہاد:

چنانچہ آپ نے علی الاعلان نجوم پرستی اور ان عقائد باطلہ کی تردید اور مخالفت شروع کر دی۔ جس کے ردعمل کے طور پر باپ نے آپ کو گھر سے نکال دیا اور قوم نے ملک بدر کر دیا۔ مگر آپ جہاں کہیں بھی گئے، اپنا مشن اور توحید کا درس جاری رکھا۔ ہجرت کے علاوہ بھی آپ کو اس مشن کے نتیجہ کے طور پر ایک دفعہ بہت بھاری قیمت یعنی جان کی قربانی بھی ادا کرنا پڑی۔ جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ آپ کی قوم میں ’’انفرادی زندگی پر سیاروں کے اثرات کا عقیدہ‘‘ راسخ ہو چکا تھا اور وہ ہر کام میں سیاروں کی چال ملاحظہ کر کے ان سے اچھے اور بُرے نتائج اخذ کرتے اور ان پر عمل کرتے تھے۔ ایک دفعہ قوم نے نو روز کے دن (جو اُن کے ہاں بڑا متبرک دن تھا جبکہ سورج برج حمل میں داخل ہوتا ہے) ان بتوں کے حضور نذر و نیاز پیش کرنے کے بعد ایک میلہ پر تفریحی تقریبات منانے کا پروگرام بنایا۔ یہ لوگ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو پیچھے نہ چھوڑنا چاہتے تھے، کیونکہ ان کی طرف سے انہیں کچھ ’’خطرہ‘‘ بھی تھا۔ جب ان لوگوں نے آپ کو ساتھ چلنے پر مجبور کیا تو آپ کو ایک عجیب ترکیب سوجھ گئی جو ان لوگوں کے عقیدے کے عین مطابق تھی۔ آپ نے فوراً سیاروں کی طرف توجہ کی اور کہا کہ ’’میں تو عنقریب بیمار ہونے والا ہوں‘‘ تمہارے رنگ میں بھنگ پڑ جائے گا، لہٰذا مجھے جانے پر مجبور نہ کرو۔ آپ کی یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی اور وہ لوگ آپ کو پیچھے چھوڑ کر میلہ پر چلے گئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بعد میں وہی ہوا جس کا انہیں خطرہ تھا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے تبر (کلہاڑا) لے کر ان کے سب دیوتاؤں کو پاش پاش کر دیا۔ البتہ سب سے بڑے ''خدا'' کو چھوڑ دیا اور تبر اس کے کندھے پر رکھ کر چلے گئے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ گویا اس بڑے خدا نے دوسرے سب چھوٹے خداؤں کا کام تمام کیا ہے۔ اور یہ تمام خدا سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا یہ کارنامہ پوری قوم اور ان سب خداؤں کے لیے کھلا ہوا چیلنج تھا۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ کارنامہ سیدنا ابراہیم ہی کا ہو سکتا ہے۔ انہیں بر سر عام بلوایا گیا تو آپ نے برملا کہہ دیا کہ یہ سب ماجرا اس بڑے خدا سے پوچھ لو۔ وہ سوچ میں پڑ گئے کہ اب کیا کہیں؟ آخر بولے: ''ابراہیم علیہ السلام یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ یہ خدا بولتے نہیں۔'' یہ جواب گویا قوم کی ذہنی شکست تھی۔ تاہم انہوں نے اپنے دیوتاؤں کی وکالت کی خاطر ابراہیم علیہ السلام کو اس جرم کی پاداش میں آگ میں زندہ جلا دینے کا فیصلہ کیا۔ اور ایک بڑا الاؤ تیار کر کے اس میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو پھینک دیا گیا۔ لیکن اس اللہ نے، جس پر آپ ایمان رکھتے تھے، آپ کو زندہ سلامت آگ سے نکال لیا۔ آپ کے آگ سے زندہ سلامت بچ نکلنے کا واقعہ قوم کے لیے دوسرا بڑا چیلنج تھا۔ لیکن ان کی بے بسی نے ان کو دوبارہ نگونسار کر دیا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے قول و عمل سے بت پرستی اور نجوم پرستی کے خلاف جو تحریک چلائی تھی، وہ کامیاب رہی۔ بہت سے لوگ حقیقت کو پا گئے اور ایسے عقائد ایک طویل مدت کے لیے سرد پڑ گئے۔

سیدنا سلیمان علیہ السلام:

(۹۵۰ ق م) آپ فلسطین و شام کے فرمانروا بھی تھے اور نبی بھی۔ آپ علیہ السلام کی حکومت عقبہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان ایام میں یمن کے علاقہ سبا میں ایک عورت (جس کا نام بلقیس بیان کیا جاتا ہے) حکمرانی کرتی تھی۔ یہ ملکہ اور اس کی رعایا تمام کے تمام سورج پرست تھے۔ اس قوم کے مورثِ اعلیٰ کا نام عبدِ شمس (بندۂ آفتاب یا سورج کا پرستار) تھا اور لقب سبا تھا۔ بنی اسرائیل کی روایات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب ہد ہد سلیمان علیہ السلام کا خط لے کر پہنچا تو ملکہ سبا سورج دیوتا کی پرستش کے لیے جا رہی تھی۔ سلیمان علیہ السلام نے اس مشرک قوم کے خلاف جہاد کا ارادہ کیا، لیکن یہ ملکہ کی دانشمندی تھی کہ وہ خود ہی مطیع و منقاد (فرمانبردار) ہو کر سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہو گئی۔ اس کے بعد وہ خود اور اس کی قوم سب اس مشرکانہ فعل سے تائب ہو کر اسلام میں داخل ہو گئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مجوس:

دورِ نبوی میں بھی ایک اور مستقل فرقہ یا مذہب کا وجود ملتا ہے جو خود تو اپنے آپ کو ''زرتشت'' کہتے ہیں، لیکن قرآن نے انہیں ''مجوس'' کے لفظ سے پکارا ہے۔ یہ فرقہ ایران وعراق کے علاقہ سے تعلق رکھتا تھا اور یہ لوگ اپنے آپ کو سیدنا نوح علیہ السلام کا مرید بتلاتے ہیں اور نوح علیہ السلام کے علاوہ دیگر انبیاء کے دشمن ہیں۔ اس فرقہ کے رہنما مانی اور متروک تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ خدا ایک نہیں بلکہ دو ہیں۔ ایک نور یا روشنی کا خدا جسے وہ ''یزدان'' کہتے تھے اور نیکی اور بھلائی کے تمام امور و افعال اس کی طرف منسوب کرتے تھے۔ دوسرا تاریکی یا ظلمت کا خدا جسے وہ ''اہرمن'' کہتے تھے اور برائی کے تمام امور و افعال اس کی طرف منسوب کرتے تھے۔ ان کی الہامی کتابوں کا نام ''زند'' اور ''اوستا'' ہے۔ یہ لوگ سورج اور آگ کی پرستش کرتے تھے۔ آگ کے بڑے بڑے الاؤ تیار کرتے اور اسے بجھنے نہیں دیتے تھے۔

ان زرتشتیوں کے ایک ضمنی فرقے کا عقیدہ یہ تھا کہ یزدان اور اہرمن دونوں خدا ہم مرتبہ ہیں لیکن یہ دونوں ایک الٰہ اعلیٰ کے ماتحت ہیں جس نے سب سے پہلے انہیں پیدا کیا۔

دورِ فاروقی میں جب یہ علاقہ اسلام کے زیر نگین آ گیا تو اس مذہب کا زور ختم ہو گیا لیکن کچھ نہ کچھ اثرات باقی چھوڑ گیا۔ خلیفہ مامون الرشید عباسی کے دور میں شیعہ مذہب کے چند غالی فرقے ایسے عقائد کا شکار ہو گئے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ میں مغل بادشاہ ''اکبر'' جس نے دین الٰہی رائج کیا، پکا سورج پرست تھا جو دن میں چار دفعہ سورج کی پرستش کرتا تھا۔ اکبر ہندو عقائد کو اکب پرستی سے سخت متاثر تھا، کیونکہ اس نے کئی ہندو عورتوں سے شادی کی تھی۔

نجوم پرستی کا نیا دور:

لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ ایسے عقائد نے پھر سے راہ پائی بلکہ شیطان نے اس مشرکانہ نظام کو منظم کرنے کے نئے گوشے بھی تلاش کر لیے۔ نجوم پرستی یا علم جوتش کا علم نجوم، علم ہیئت سے گہرا تعلق ہے۔

۵۹۰ ق م میں یونان کے ایک حکیم فیثاغورث نے یہ نظریہ پیش کیا کہ سورج متحرک نہیں بلکہ ساکن ہے۔ اور زمین ساکن نہیں بلکہ کئی سیاروں سمیت سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ لیکن اس کے دو صدی بعد یعنی چوتھی صدی ق م میں بطلیموس فلاسفر نے یہ نظریہ پیش کیا کہ زمین ساکن اور سورج متحرک ہے۔ اس نظام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں زمین کو صرف ساکن ہی نہیں بلکہ جملہ سیارگان کا مرکز عام قرار دیا گیا ہے۔ اس نظام میں ۱۳ کرے مقرر کیے گئے ہیں۔ پہلا کرہ آب جو زمین کے ۳/۴ حصہ کو محیط ہے۔ دوسرا کرہ ہوا، تیسرا فضا کا اور چوتھا حرارت کا کرہ ہے۔ اس کے بعد ۹ فلک آتے ہیں۔ پہلے فلک پر چاند، دوسرے پر عطارد، تیسرے پر زہرہ، چوتھے پر سورج، پانچویں پر مریخ، چھٹے پر مشتری اور ساتویں پر زحل ہے۔ آٹھویں فلک کو فلکِ ثوابت اور فلک البروج بھی کہتے ہیں۔ اسی فلک کو ۱۲ حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ کو ایک برج قرار دیا گیا اور فلک نہم کو فلکِ اطلس کہتے ہیں۔ اس نظام کی رو سے آٹھوں افلاک اور ساتوں سیارے، اگرچہ اپنی الگ الگ حرکت بھی رکھتے ہیں تاہم فلک نہم کی حرکت وضعی سے وابستہ ہیں اور ساتوں سیاروں کی حرکت سالانہ ہر ایک فلکِ خاص کی حرکت سے تعلق رکھتی ہے۔

بطلیموس کا یہ نظریہ جو اس نے اپنے استادوں اور پیشرؤوں ارسطو اور برخس کی مدد سے مرتب کیا تھا، چار دانگ عالم میں بہت مقبول ہوا۔ مصر، یونان، ہند وغیرہ سب ممالک میں اس نظریہ کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ یورپ میں ۱۵۰۰ء تک اسی نظریہ کی تعلیم دی جاتی رہی ہے اور ہندوستان میں آج تک جنتریاں وغیرہ اس نظام کے مطابق مرتب ہوتی ہیں۔

سیارے اور ہفتہ کے دن:

یہ نظریہ پہلے سے بھی بڑھ کر مشرکانہ عقائد اپنے ساتھ لایا۔ افلاک اور سیاروں کے ایسے مخصوص اثرات تسلیم کر لیے گئے جو انسانی زندگی پر ہر وقت پڑتے ہیں۔ ہفتہ کے سات دنوں کے نام اظہارِ عقیدت کے طور پر انہیں سات سیاروں یا ان کے دیوتاؤں کے نام پر رکھے گئے۔ اہل یونان و روم ان معتقدات میں پیش پیش تھے۔ ان کے ہاں دنوں کے ناموں کی سیاروں سے مناسبت کچھ اس طرح ہے۔ انگریزی زبان میں:

۱۔ سورج کو اور اسی طرح اس کے دیوتا کو ''سن'' (Sun) اور اتوار کو (Sunday) کہا جاتا ہے۔ یعنی سورج دیوتا کا دن۔

۲۔ چاند کو اور اسی طرح اس کے دیوتا کو ''مون'' (Moon) اور سوموار کو (Monday) کہا جاتا ہے یعنی چاند دیوتا کا دن۔

۳۔ مریخ کو (Mars) لیکن اس کے دیوتا کو ''ٹو'' (Tiw) لہٰذا منگل کو (Tuesday) کہا جاتا ہے یعنی مریخ دیوتا کا دن۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۔ عطارد کو اور اس کے دیوتا کو بھی ''ویڈن'' (Weden) اور بدھ کو (Wednesday) کہا جاتا ہے یعنی عطارد دیوتا کا دن۔

۵۔ اسی Weden دیوتا کا ایک بیٹا تھار (Thor) تسلیم کیا گیا جو گرج یا رعد کا دیوتا بنا۔ اسے مشتری کا دیوتا بھی قرار دیا گیا۔ اسی نسبت سے جمعرات کو (Thursday) کہتے ہیں۔

۶۔ اور اسی Weden دیوتا کی بیوی کا نام فرگ (Frigg) یا فرگا (Frigga) تجویز ہوا، اسے جونو (Jono) کہتے ہیں۔ یہ زہرہ سیارہ کی دیوی تھی اور اسی نسبت سے جمعہ کے دن کو (Friday) کہتے ہیں۔ زہرہ کا مالک دیوتا کی بجائے دیوی تجویز کرنے کی شاید یہ وجہ ہو کہ اس کو ایک خوبصورت سیارہ تصور کیا جاتا ہے۔

سیاروں کے ہمہ گیر اثرات:

ہند کے لوگ ان معتقدات میں اہل مغرب سے بھی کچھ آگے بڑھ گئے تھے۔ انہوں نے دنوں کے نام سیاروں کی نسبت سے تجویز کرنے کے علاوہ ان میں سعد ونحس کی تمیز بھی قائم کر دی۔ مثلاً زحل کو ہندی میں سنیچر کہتے ہیں، اسی نسبت سے ہفتہ کا نام سنیچر وار تجویز ہوا۔ اس سیارہ کو منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ پھر ہر انسان کے نام کی کسی مخصوص سیارہ سے نسبت قائم کی گئی۔ گویا اس انسان پر اس منسوب سیارہ کے اثرات دوسرے سیاروں کی نسبت زیادہ تسلیم کیے گئے۔ اس طرح زہرہ کو ہندی میں شکر کہتے ہیں، لہٰذا جمعہ کا نام شکر وار تجویز ہوا۔ مشتری کو برہسپت کہتے ہیں۔ جمعرات کا دن اس سیارہ کا تسلیم کیا گیا اور اسے برہسپت وار یا ویروار کہتے تھے۔ یہ سیارہ سعدِ اکبر تسلیم کیا جاتا ہے۔ گویا جس شخص کی اس سیارہ سے نسبت ہو، وہ بہت نیک بخت ہوگا۔ عطارد کو ہندی میں بدھ اور اس سے منسوب دن کو بدھوار کہتے ہیں اور اس سیارہ سے تعلق رکھنے والا انسان علم و دانش سے بہرہ ور ہوگا۔ مریخ کو ہندی میں منگل کہتے ہیں اور منگل کا دن اسی سے منسوب ہے۔ مریخ کو منحوس تصور کیا جاتا ہے۔ سوموار کا دن چاند سے منسوب ہے اور اس سے نسبت رکھنے والے شخص میں نرمی اور جمال پایا جاتا ہے۔ اتوار سورج کا دن ہے اور اس سیارہ سے تعلق رکھنے والا شخص عموماً بہادر اور پر شکوہ ہوتا ہے۔

مزید ستم یہ ہوا کہ انفرادی اثرات کے علاوہ ان سیاروں کے زمین اور اہل زمین پر مجموعی اثرات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی معتقدات میں شامل ہو گئے۔ مثلاً دولت، زراعت، معدنیات اور کپڑے کا مالک سورج کو تسلیم کیا گیا، حالانکہ ان کی الگ الگ دیویاں بھی موجود ہیں۔ (1) مشتری کو یعنی برہسپت کو سیلاب اور بادلوں کا مالک۔ مریخ یعنی منگل کو پھلوں کے رسوں کا مالک، زحل یا سینیچر کو غذا کا مالک اور عطارد کو تمام پھلدار درختوں اور پودوں کا مالک سمجھا جانے لگا۔ ان معتقدات کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم ہیئت یا علم نجوم سے زیادہ ایک دوسرا علم یعنی علم جوتش یا ''علم اثراتِ نجوم'' فروغ پا گیا۔ بادشاہ اور حکمران لوگ کسی بھی مہم یا سفر پر روانہ ہونے سے پیشتر نجومیوں سے زائچے تیار کروا کے یہ معلوم کرتے تھے کہ ان کا یہ سفر یا مہم کن حالات پر منتج ہو گی۔

لوگوں کی دلچسپی بڑھتی گئی تو اس کے نتیجہ میں پیشہ ور نجومیوں کی ایک فوج ظفر موج معرضِ وجود میں آ گئی جو لوگوں کے زائچے تیار کر کے انہیں غیب کی خبریں مہیا کرنے لگی۔ آج کل بھی ہماری اُردو زبان میں ایسے بے شمار محاورات زبان زد ہیں جو ان معتقدات کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً ''ستارۂ قسمت کا گردش میں ہونا'' یا ''فلک کے رفتار کی چیرہ دستی'' وغیرہ۔ حتیٰ کہ ہمارے شعر و ادب میں بھی یہ تصورات نفوذ کر گئے۔ بقولِ غالب

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان
ہو کر رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اسلام اور کواکب پرستی

جب اسلام آیا تو اہل عرب دوسرے دیوتاؤں اور دیویوں کے علاوہ سیاروں سے منسوب دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش بھی کرتے تھے۔ سورج کو عربی میں شمس کہتے ہیں اور یہ لفظ بطورِ مؤنث استعمال ہوتا ہے چنانچہ اہل عرب سورج کے دیوتا کو دیوی ''الاہہ'' (جو کہ الٰہ کی مونث ہے) کہتے تھے۔ اسی طرح ستارہ ''شعریٰ'' کا ذکر بھی قرآن کریم میں موجود ہے جس کی پرستش کی جاتی تھی۔ اسلام نے سیاروں سے منسوب جملہ معتقدات پر کاری ضرب لگائی۔ چند معروف پہلو درج ذیل ہیں:

---

(1) مثلاً دولت کی الگ دیوی ہے جسے ''لکشمی'' کہتے ہیں۔ پھر دیوتاؤں کی بیٹیاں، بیٹے اور بیویاں بھی تجویز ہوئیں۔ اسی طرح ہند، مصر اور یونان میں ان چھوٹے خداؤں یعنی دیوتاؤں (Gods) اور دیویوں (Godesses) کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۱) سیاروں کی خدائی: www.KitaboSunnat.com

اسلام نے انسان کو تمام کائنات سے اشرف تسلیم کرتے ہوئے بلند ترین مقام بخشا ہے۔ ان سیاروں کی خدائی یا دیوتائی تو درکنار وہ تو ان اجرام فلکی کو انسان کا خادم قرار دیتا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ﴾ (الجرٰ:۳۳)

''اور اللہ تعالیٰ نے چاند اور سورج کو تمہاری خدمت پر مامور کر دیا ہے جو ایک دستور پر چل رہے ہیں۔ اسی طرح دن اور رات کو تمہاری خدمت کے لیے لگا دیا گیا ہے۔''

ایک دوسرے مقام پر فرمایا کہ صرف ان اجرام فلکی ہی کی کیا بات ہے، ہم نے تو آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، تمہاری ہی خدمت پر مامور کیا ہے:

﴿اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ﴾ (لقمان:۲۰)

''تم دیکھتے نہیں کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کو اللہ نے تمہارے کام میں لگا دیا ہے۔''

(۲) سیاروں کی تاثیر تسلیم کرنا واضح شرک ہے:

دورِ نبوی ﷺ کا واقعہ ہے کہ ایک رات بارش ہوئی جو عرب جیسے بے آب و گیاہ ملک میں ایک عظیم نعمت متصور ہوتی تو صبح آپ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں (حدیثِ قدسی)

(وأصبح من عبادي مؤمن بي و كافر بالكواكب، فأما من قال: مُطِرنا بفضل الله ورحمته فذلك مؤمن بي و كافر بالكواكب وأما من قال مُطِرنا بنوء كذا و كذا فذلك كافر بي و مؤمن بالكواكب) (متفق علیہ)

''میرے بندوں میں کچھ لوگ مجھ پر ایمان لائے اور سیاروں (کی تاثیرات) سے منکر یا کافر ہوئے یعنی جس شخص نے یہ کہا کہ ہم پر یہ بارش اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہوئی تو وہ مجھ پر ایمان لایا اور سیاروں کا منکر ہوا اور جس نے یہ کہا کہ ہم پر یہ بارش فلاں سیارے کے فلاں برج میں داخل ہونے سے ہوئی تو وہ میرا منکر ہوا اور سیاروں پر ایمان لایا۔'' (بخاری و مسلم)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گویا سیاروں کے اثرات کو تسلیم کرنا اور خدا پر ایمان لانا دو مخالف اور متضاد چیزیں ہیں جن میں سے صرف ایک ہی چیز قبول کی جا سکتی ہے۔ جو مسلمان ہے وہ سیاروں کے اثرات کو تسلیم نہیں کر سکتا اور جو سیاروں کے اثرات کو تسلیم کرتا ہے، وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ آج ہمارے اسلامی معاشرہ میں یہ مشرکانہ رسم عام ہو چکی ہے اور اب تو اچھے خاصے دین دار افراد بھی یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ

''میرا اسٹار چونکہ فلاں ہے، اس لیے مجھ میں فلاں خاصیت پائی جاتی ہے۔''

یہ بھی انسانی زندگی میں ستاروں کے اثرات تسلیم کرنے کا واضح مظہر ہے، جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔

(۳) علم نجوم اور علم غیب:

علم غیب صرف اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے، اللہ کے سوا دوسروں کے لیے علم غیب کی تردید قرآن کریم میں بہت سی آیات سے ثابت ہے وہ ﴿لَا یَعْلَمُ الْغَیْبَ اِلَّا ھُوَ﴾ کہہ کر غیب کی خبریں بتلانے والے سب علوم (جیسے رَمل، جفر، جوتش، کہانت) کو وہمی اور باطل قرار دیتا ہے اور قرآن نے عقلی دلیل یہ پیش کی ہے کہ جو شخص غیب جانتا ہو، اسے تلاشِ معاش کے لیے دَر دَر کی ٹھوکریں کھانے کی اور محنت و مشقت کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم سے فرمایا کہ آپ ﷺ اعلان کر دیجیے۔

﴿وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ وَ مَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ﴾ (۷:۱۸۸)

''(اے پیغمبر ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ اگر میں غیب جانتا ہوتا تو میں بہت سا مال و دولت اکٹھا کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی گزند نہ پہنچتا۔''

اس آیت میں علم غیب کے دو فائدے بتلائے گئے ہیں: (۱) حصولِ رزق کے لیے محنت و مشقت کی ضرورت نہیں رہتی اور (۲) یہ کہ ایسے شخص کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، کیونکہ وہ اس کا تدارک پہلے ہی سوچ لیتا ہے۔ گویا قرآن نے غیب دانی کے لیے ایک معیار بتلا دیا ہے۔

کہانت، رمل، جفر اور غیب دانی کے مدعی دوسرے علوم: اسی معیار کے لحاظ سے غیب دانی کا دعویٰ کرنے والے دوسرے علوم مثلاً جفر، رمل، کہانت اور فال گیری وغیرہ سب باطل ٹھہرتے ہیں کیونکہ یہ علوم جاننے والے عموماً فٹ پاتھ پر بیٹھ کر زائچے بنا کر پیسے کماتے، انگوٹھیاں اور تعویذ بیچتے ہی نظر آتے ہیں۔ اگر ان علوم میں کچھ صداقت ہوتی تو یہ لوگ ایسے مفلوک الحال نظر نہ آتے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور شرعی لحاظ سے یہ علوم اس لیے باطل ہیں کہ ان کا تعلق یا غیب دانی سے ہوتا ہے یا بعض اشیاء کی تاثیرات سے اور یہ دونوں باتیں شرعی نقطہ نظر سے غلط ہیں۔ قرآن ایسے ہی علوم کو جِبت سے تعبیر کرتا اور ان پر یقین رکھنے کو کفر و شرک بتلاتا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ ان علوم کے اثرات بعض دفعہ واضح طور پر ظہور پذیر ہو جاتے ہیں جیسے کاہن کی خبریں کبھی سچی بھی نکل آتی ہیں ورنہ یہ پیشے دنیا سے معدوم ہو جاتے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بعض دفعہ سچی ہوتیں ہیں تو بسا اوقات غلط بھی ثابت ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا ان علوم کا اعتبار کیا رہا اور دوسرا جواب یہ ہے کہ کسی چیز کا ثابت ہونا اور چیز ہے اور اس کا شرعی نقطہ نظر سے جائز ہونا اور چیز۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ جادو یا دیگر شیطانی تصرفات سے کسی کو بھی انکار نہیں، لیکن ان کے جواز کا کوئی بھی قائل نہیں۔

(۴) ہفتہ کے دنوں کے نام:

ہندی یا بکرمی تقویم اور یورپی یا عیسوی تقویم دونوں میں ہفتہ کے دنوں کے نام دیوتاؤں اور سیاروں کی فرمانروائی کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں جبکہ اسلامی یا ہجری تقویم میں ہفتہ کے ناموں میں شرک، نجوم پرستی یا بت پرستی کا شائبہ نہیں پایا جاتا۔ اس تقویم میں ہفتہ کے دنوں کے نام یہ ہیں:

یوم الجمعة	یوم السبت	یوم الأحد	یوم الاثنین	یوم الثلاثاء
جمعہ	ہفتہ	پہلا دن	دوسرا دن	تیسرا دن
یوم الاربعاء	یوم الخمیس			
چوتھا دن	پانچواں دن			

اگرچہ موجودہ سائنسی دور نے بھی ستاروں کی تاثیرات اور اس جیسے دوسرے توہمات کو باطل قرار دیا ہے، تاہم ابھی تک ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے مضامین سے پر جنتریاں ابھی تک چھپتی ہیں اور جوتشی، نجومی وغیرہ بھی اپنی دکانیں سجائے اکثر نظر آتے ہیں۔

(۲) اولیاء پرستی اور قبر پرستی

ان تاریخی ذرائع سے جو انسان کے علم میں آئے ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام سے ساتویں پشت پر سیدنا ادریس علیہ السلام کا زمانہ ہے اور ان انبیاء کے درمیان تقریباً ساڑھے تین ہزار سال کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فاصلہ ہے اور سیدنا نوح علیہ السلام، سیدنا آدم علیہ السلام سے دسویں پشت پر ہیں اور سیدنا ادریس علیہ السلام اور سیدنا نوح علیہ السلام کے درمیان وقفہ تقریباً دو ہزار سال ہے۔ سیدنا نوح علیہ السلام کی اپنی عمر (ہزار سال) قرآن کریم سے ثابت ہے۔

کواکب پرستی اور مظاہر پرستی کا آغاز تو سیدنا ادریس علیہ السلام کی بعثت سے پہلے ہوتا ہے جبکہ اولیاء پرستی کے آغاز کا سراغ سیدنا نوح علیہ السلام کی بعثت سے بہت پہلے ہوا تھا۔ چنانچہ جب نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو بت پرستی سے روکا تو انہوں نے کہا کہ

﴿وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا﴾ (نوح:۲۳)

''اور کہنے لگے کہ اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور ودّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو کبھی ترک نہ کرنا''

اس آیت کی تفسیر میں امام بخاری ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں (علاوہ ازیں یہ روایت مسلم، نسائی اور احمد میں بھی مذکور ہے) کہ

(ان هؤلاء صالحين في قوم نوح فلمّا ماتوا عكفوا على قبورهم ثم صوروا تماثيلهم فعبدوهم ثم صارت هذه الأوثان في قبائل العرب) (بخاری، کتاب التفسیر)

''یہ سب (پانچوں بزرگ) قوم نوح کے نیک لوگ تھے۔ جب وہ مر گئے تو لوگ ان کی قبروں پر مراقبے کرنے لگے۔ پھر ان کے مجسمے بنائے اور عبادت کرنے لگے۔ پھر یہی بت عرب کے قبائل میں پھیل گئے۔''

اور کتب تفاسیر میں ان کی مزید تشریح یوں ملتی ہے کہ یہ لوگ سیدنا نوح علیہ السلام کے آباؤ اجداد میں سے تھے اور اتنے نیک تھے کہ انہیں دیکھ کر خدا یاد آتا تھا اور ذوق عبادت بڑھتا تھا۔ جب وہ یکے بعد دیگرے فوت ہو گئے تو لوگوں کو اس کا بہت افسوس ہوا۔ وہ اکثر ان کی قبروں پر جاتے اور وہاں بیٹھ کر ان کی یاد تازہ کرتے تھے۔ بعد میں ان کی قبروں پر اعتکاف بیٹھنے کی رسم جاری ہو گئی۔ آخر میں شیطان نے ان کو یہ پٹی پڑھائی کہ ان کی قبروں پر جانے کی زحمت بھی کیوں گوارا کرتے ہو، ان کی مورتیاں بنالو جس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ان مورتیوں کو دیکھ کر تم میں وہی ذوقِ عبادت پیدا ہوگا، جو تمہیں ان کو زندگی کی حالت میں دیکھنے سے پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ قوم اس چال پر لگ گئی۔ انہوں نے ان بزرگوں کی مورتیاں بنا کر اپنی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مساجد میں رکھ لیں اور انہیں دیکھ کر محوِ عبادت رہتے، پھر بعد کے آنے والے لوگوں نے ان مورتیوں ہی کو پوجنا شروع کر دیا۔

ان تصریحات سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ یہ ''اولیاء اللہ'' نوح علیہ السلام کی بعثت سے صدیوں پہلے فوت ہو چکے تھے اور جب نوح علیہ السلام مبعوث ہوئے تو اس وقت یہ قوم ان کے بتوں کی عبادت کرتی اور اپنے ان معتقدات پر راسخ ہو چکی تھی۔

۲۔ شیطان نے جب کبھی شرک یا کسی دوسری برائی کی راہ انسان کو سجھائی ہے تو اس کا کوئی پہلو خوبصورت بنا کر اسے اپنے دامِ تزویر میں پھنسایا ہے۔

۳۔ مظاہر پرستی کی دو شکلیں ہیں: ایک، براہِ راست اس چیز کے سامنے سر عجز و نیاز خم کیا جائے جیسے سورج، آگ، کسی خاص درخت یا حیوان (مثلاً گائے) کے سامنے، اس کا بت بنا کر اس کے سامنے تعظیم و آداب بجا لائے جائیں جیسے سورج، دیوتا، لکشمی دیوی وغیرہ۔ اسی طرح اولیاء پرستی کی دو قسمیں ہیں: ایک قبر پرستی، دوسرے بت پرستی۔ گویا بت پرستی ان دونوں میں قدرِ مشترک ہے۔

مظاہر (کواکب) پرستی اور اولیاء پرستی میں مشترک اقدار

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک کی ان مختلف اقسام میں چند باتیں ایسی ہیں جو ہر قسم کے مشرکوں کے عقائد میں داخل ہیں اور وہ یہ ہیں:

۱۔ روح کا تعلق:

ایک مظاہر پرست جب کسی بت کی پوجا کرتا ہے تو اس اعتقاد کے ساتھ کرتا ہے کہ یہ بت تو صرف پتھر یا دھات کا بت ہے۔ اس کی بذاتِ خود کوئی حیثیت نہیں۔ البتہ جس چیز یا دیوتا کا یہ بت ہے، اس کی روح کا تعلق اس بت سے بدستور قائم ہوتا ہے۔ اور جب بھی کوئی نیا بت اس دیوتا کی مخصوص شکل کے مطابق بنایا جاتا ہے تو اس نئے بت سے بھی اس دیوتا کی روح کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جب ہم اس بت کو پکارتے ہیں تو اس دیوتا کی روح قریب سے ہماری آواز سنتی ہے، پھر اس کا مداوا کرتی ہے۔ بعینہ اس طرح کا عقیدہ ایک قبر پرست کا ہوتا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ فوت شدہ بزرگ کی روح کا تعلق اس کی قبر سے بدستور قائم رہتا ہے۔ اور جب ہم ان کی قبر پر حاضری دیتے ہیں تو ان کی روح ہم سے خوش ہوتی ہے اور جب انہیں پکارتے ہیں تو وہ اس کا مداوا کرتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرآن ان دونوں قسم کے نظریات کو باطل قرار دیتا ہے۔ مظاہر کا اس لیے کہ وہ بے جان اور انسان کے خادم ہیں۔ ان میں زندگی یا روح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سورج اگر ہمیں حرارت بخشتا ہے اور اس سے فصل پکتے یا بعض دوسرے فوائد حاصل ہوتے ہیں تو اس میں اس کا اپنا کچھ کمال نہیں کیونکہ یہ تاثیریں اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہیں۔ جیسے زہر انسان کو ہلاک کرتا ہے یا شہد شفا بخشتا ہے تو اس میں زہر یا شہد کا اپنا کچھ کمال نہیں۔

اور اولیاء اللہ کی روحیں تو ہوتی ہیں مگر وہ مرنے کے بعد اعلیٰ علیین میں پہنچ چکی ہوتی ہیں۔ ان کا اپنی قبر سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ لہٰذا قبر پرست جو انہیں پکارتے ہیں، وہ تو ان کی پکار کو سن بھی نہیں سکتے۔ چہ جائیکہ ان کا جواب دیں یا تکلیف کا مداوا کریں۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے:

﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ﴾
(الاحقاف:۵،۶)

''اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو سکتا ہے جو ایسے کو پکارے جو قیامت تک اس کا جواب نہ دے سکے اور انہیں ان کے پکارنے کی خبر بھی نہ ہو۔ اور جب لوگ (قیامت کو) اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی پرستش سے انکار کر دیں گے۔''

اس آیت سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ یہاں من دون اللہ سے مراد صرف ''فوت شدہ بزرگ'' ہی لیے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ مظاہر قدرت سورج، چاند، آگ، درختوں وغیرہ کا حشر ونشر سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ ہی ان کی دشمنی کا کچھ نقصان پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی دوستی کا کچھ فائدہ۔

۲۔ یہ ''فوت شدہ بزرگ'' پکارنے والے کی پکار کو قیامت تک نہیں سن سکتے تو پھر بھلا اس کا مداوا کیا کریں گے؟

۳۔ ان ''فوت شدہ بزرگوں'' کو پکارنے والا گمراہ ترین انسان ہوتا ہے۔

۴۔ قرآن کریم نے اس پکار یا دعا کو عبادت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ان کو پکارنا ''شرک'' ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔نظامِ کائنات:

ان دیوتاؤں، جھوٹے خداؤں یا اولیاؤں کے جواز میں مشرکین کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ جس طرح ایک بادشاہ کو اپنی مملکت کا نظام چلانے کے لیے امیروں وزیروں کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے بغیر نظامِ حکومت چل ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی اس نظام کائنات کو چلانے کے لیے اپنے ماتحت مختلف ہستیوں کو مقرر کر رکھا ہے اور انہیں کچھ نہ کچھ اختیارات تفویض کر رکھے ہیں۔ جو مختلف امورِ کائنات کی نگرانی کا کام سرانجام دیتے ہیں۔

خدا تعالیٰ نے مشرکین کی اس دلیل کو بھی باطل قرار دیا ہے۔ کیونکہ ایک بادشاہ آخر ایک کمزور سا انسان ہوتا ہے اور اکیلے نظامِ مملکت چلانا اس کے لیے ناگزیر ہے۔ وہ نہ تو ہر کسی کی بات سن سکتا ہے، نہ اس کا مداوا کر سکتا ہے، نہ ہی اپنی مملکت کے ہر کونے میں بذاتِ خود پہنچ سکتا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ ایسے تمام نقائص سے پاک ہے۔ وہ خالق ہے مخلوق نہیں۔ وہ مقتدرِ اعلیٰ ہے کمزور نہیں۔ لہٰذا اس نظام مملکت کے چلانے کے لیے کسی مددگار کی بھی ضرورت نہیں، وہ ہر جگہ حاضر بھی ہے اور ناظر بھی۔ ہر ایک کی ہر جگہ سے پکار سن بھی سکتا ہے اور اس کا مداوا کرنے کا بھی اسے مکمل اختیار ہے۔ لہٰذا اسے ماتحت افسران کی کوئی ضرورت نہیں۔ ارشادِ باری ہے:

﴿وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا﴾ (بنی اسرائیل:۱۱۱)

''اور کہو کہ سب تعریف اللہ ہی کو ہے جس نے نہ تو کسی کو بیٹا بنایا ہے، نہ ہی اس کی بادشاہی میں کوئی شریک ہے، اور نہ ہی وہ عاجز وناتواں ہے کہ اس کا کوئی مددگار رہے، اور اس کو بڑا جان کر اس کی بڑائی کرتے رہو۔''

۳۔توسل:

نظامِ کائنات سے متعلق یہ تصور قائم کرنے کے بعد شیطان نے ان مشرکوں کو یہ راہ سجھائی کہ جس طرح ایک بادشاہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اپنے قریبی افسروں سے تعلق پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے، اسی طرح اللہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ان چھوٹے خداؤں (نبیوں یا اولیاؤں) سے رابطہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قائم رکھنا ضروری ہے تا کہ ہماری ضروریات باضابطہ طور پر (Through Proper Channel) شرفِ پذیرائی حاصل کر سکیں اور ہم اللہ کے قریب ہو سکیں۔ مشرکین کے اس عقیدہ کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

﴿وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ﴾ (۳:۳۹)

''اور وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے سوا دوست بنا رکھے ہیں (وہ کہتے ہیں)، ہم تو ان کی صرف اس لیے عبادت کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے قریب کر دیں۔''

ایسے ہی درمیانی رابطہ کو جو کسی کے لیے ذریعہ قرب بن سکے، عربی زبان میں ''وسیلہ'' کہتے ہیں۔ اور توسل بھی قرب کا ذریعہ تلاش کرنا ہے۔ مشرکین مکہ بھی وسیلہ سے یہی چھوٹے خداؤں کا درمیانی رابطہ مراد لیتے تھے۔ دورانِ حج وہ تلبیہ اس طرح پڑھا کرتے تھے:

(لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ لَبَّيْكَ. إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ) (بخاری:۱۵۴۹)

یعنی وہ حقیقی معبود اللہ تعالیٰ کو سمجھتے تھے۔ صرف اس قسم کے ''توسل'' کی بنا پر انہیں مشرک قرار دیا گیا۔ مشرکین کی اس دلیل کا ردّ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کا مثبت جواب یہ دیا کہ تمہاری دعا و فریاد سننے کے لیے بھی کسی درمیانی واسطہ کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کیونکہ میں تو تمہاری رگِ جان سے بھی تم سے نزدیک تر ہوں۔ ارشادِ باری ہے:

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾ (۱۸۶:۲)

''اور (اے پیغمبر ﷺ) جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق سوال کریں تو ان سے کہہ دو کہ میں قریب ہی ہوں جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔''

اللہ تعالیٰ سے کی ہوئی دعا بعض دفعہ قبول ہو جاتی ہے اور بعض دفعہ نہیں بھی ہوتی۔ دعا کے قبول نہ ہونے کے بھی کئی اسباب ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ دعا قبول ہو یا نہ ہو، ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر ایک جوتی کا تسمہ بھی مانگیں تو اسی اللہ سے مانگیں۔ اس قسم کا توسل بہرحال اللہ تعالیٰ کو سخت ناگوار ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور وسیلہ کی جائز اور صحیح تر صورت یہ ہے کہ اپنے نیک اعمال کو وسیلہ بنایا جائے۔ یعنی اگر ہم نیک عمل کریں گے تو خود بخود اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا جائے گا۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَ ابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَ جَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (۳۵:۵)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور اس کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ تلاش کرتے رہو اور اس کے رستے میں جہاد کرو تا کہ نجات پاؤ۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جوں جوں انسان تقویٰ اختیار کرتا جاتا ہے، اللہ کا قرب حاصل کرتا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے اور نجات پانے کا بہترین ذریعہ تو ''جہاد'' (دین کو غالب کرنے کی محنت) ہے۔

۴۔ سفارش:

تمام مشرکین میں چوتھی قدرِ مشترک سفارش یا شفاعت ہے جو ان کے نظامِ کائنات والے مزعومہ عقیدہ کی ایک کڑی ہے۔ شفاعت کا اطلاق عام طور پر دفع مضرت کے لیے درمیانی رابطہ تلاش کرنے پر ہوتا ہے۔ ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جس طرح ایک مجرم انسان کو تھانے یا عدالت میں پیش ہونے سے پہلے اپنے بچاؤ کے لیے کسی سفارش کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح ہم جیسے گنہگاروں کو اس حقیقی معبود کی عدالت میں حاضر ہونے سے پیشتر ان چھوٹے خداؤں (یعنی دیوتاؤں یا اولیاؤں) کی سفارش بھی ضروری ہے۔ اسی ضرورت کے تحت ان معبودوں کے آگے سر عجز و نیاز خم کرتے ہیں، چڑھاوے چڑھاتے اور قربانیاں پیش کرتے ہیں۔ اور ہر وہ کام کرتے ہیں جو معبودِ حقیقی کے لیے سزاوار ہیں تا کہ یہ معبود ہم سے خوش رہیں اور ہماری سفارش کر دیں۔ مشرکین کے اس عقیدہ کو اللہ نے ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے:

﴿وَ يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُولُونَ هٰٓؤُلَاءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْأَرْضِ﴾ (یونس:۱۸)

''اور یہ لوگ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں، جو نہ تو ان کا کچھ بگاڑ سکتی ہیں اور نہ سنوار سکتی ہیں۔ پھر کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ ان سے کہہ دو: کیا تم اللہ کو ایسی بات کی خبر دیتے ہو، اس کے علم میں آسمانوں اور زمین میں جس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آیتِ بالا سے معلوم ہوا کہ مشرکین کا یہ عقیدۂ شفاعت سرتاپا باطل ہی باطل ہے۔جس میں ذرّہ بھر بھی حقیقت نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ دوسرے مقام پر فرماتا ہے:

﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ (۲:۲۵۵) ''کسی کی مجال ہے کہ وہ اللہ کے ہاں کسی کی سفارش کر سکے، الا یہ کہ اللہ کو خود منظور ہو۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایسے عقیدۂ شفاعت پر تکیہ کرنا باطل اور عبث ہے۔ کیونکہ جس ''بزرگ'' سے ایسی توقع وابستہ کی جارہی ہے، اسے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا اپنا انجام کیا ہوگا؟ پھر وہ دوسروں کو کیا ضمانت دے سکتا ہے یا دوسرے اس سے کیا توقع رکھ سکتے ہیں؟ البتہ اس آیت میں اِلَّا بِاِذْنِهٖ کے الفاظ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس ''کلیۂ'' میں کچھ گنجائش موجود ہے۔یعنی کسی خاص بزرگ کی کسی خاص گنہگار کے حق میں سفارش قبول بھی ہوسکتی ہے اور اس کی شرائط درج ذیل ہیں:

۱۔ سفارش کنندہ کو روزِ قیامت اپنی نجات اور خدا کی خوشنودی کا یقین ہو چکا ہو۔

۲۔ جس کی سفارش کی جارہی ہے، وہ نہ تو مشرک ہو اور نہ ہی عادی مجرم۔

۳۔ ایسی سفارش بھی کسی زور یا دباؤ کے تحت قبول نہیں ہوسکتی کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کسی کا زور نہیں۔ وہ سب سے زیادہ زور آور اور غالب ہے۔ یہ سفارش بھی سفارش کی التجا اور اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کے نتیجہ کے طور پر مقبول ہوسکتی ہے اور یہی ﴿اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ کا مطلب ہے اور اسی طرح کی سفارش انبیاء اور صالحین کریں گے جو مقبول ہوگی۔

دورِ نبوی ﷺ کا ایک واقعہ ہے، قحط سالی کا دور تھا۔ایک گنوار رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا اور بارش کے لیے دعا کرنے کی التجا کی اور کہا کہ **انا نستشفع بک علی الله و نستشفع بالله علیک۔**

یعنی ''ہم آپ کی اللہ کے ہاں سفارش چاہتے ہیں اور اللہ کی سفارش آپ کے ہاں۔''

گنوار کی اس بات پر آپ لرزہ براندام ہوگئے اور سبحان اللہ، سبحان اللہ کہنے لگے۔ مشیتِ الٰہی کے آثار آپ کے چہرہ سے واضح طور معلوم ہونے لگے۔ پھر آپ نے اس گنوار کو کہا کہ تم کیسے بیوقوف ہو اور اللہ کو کسی کے ہاں سفارشی نہیں بناتے، تم اس کی عظمت کو کیا جانو۔ اس کی شان بہت بڑی ہے۔ اس کا عرش اس کے آسمانوں پر ہے۔ اور اپنے ہاتھ کو قبے کی شکل بنا کر سمجھایا اور کہا کہ اس کا عرش اللہ کی عظمت کی وجہ یوں چرچر بولتا ہے جیسے اونٹ کا پالان سوار کے بوجھ سے'' (سنن ابوداؤد: حدیث ۴۱۰۱)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس حدیث کی روشنی میں آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ روزِ قیامت سفارش کون کر سکے گا اور کس صورت میں کر سکے گا؟

(۴) ملائکہ پرستی

فرشتے اللہ تعالیٰ کی ایک غیر مرئی اور نوری جاندار مخلوق ہے جن پر ایمان لانا ''ایمان بالغیب'' کا ایک حصہ ہے۔ اور یہ ایمان لانا صرف ہم مسلمانوں پر ہی فرض نہیں بلکہ پہلی امتوں پر بھی فرض تھا کیونکہ اس کا ذکر تمام سابقہ الہامی کتابوں میں ملتا ہے۔

فرشتے بھی جسم رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض دو پروں والے، بعض چار پروں والے، بعض چھ پروں والے اور بعض کے پر اس سے بھی زیادہ ہیں۔ وہ آسمانوں کی طرف چڑھتے بھی ہیں اور آسمانوں سے زمین کی طرف اُترتے بھی ہیں۔ ان میں عقل وشعور تو ہے مگر ارادہ واختیار نہیں۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل پر ایسے ہی مجبور و بے بس ہیں جیسے سورج اور چاند وغیرہ۔ گویا ان کی اطاعت تسخیری ہے اختیاری نہیں۔ وہ نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں، نہ ہی ان میں نسل کشی یا توالد وتناسل کا سلسلہ قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں ہر ایک کو الگ الگ ہی پیدا کیا ہے۔ ان کی تعداد بے حد وحساب ہے۔ یہ فرشتے اپنا الگ الگ تشخص اور نام بھی رکھتے ہیں۔

ان فرشتوں کا کام تدبیر اُمورِ کائنات ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نہ سر مو تجاوز کر سکتے ہیں نہ تقصیر، یہی ان کی عبادت ہے۔ بلکہ کام کی نوعیت کے لحاظ سے بعض فرشتے دوسروں سے افضل ہیں۔ سیدنا جبرئیل علیہ السلام کے ذمہ ایک اضافی ڈیوٹی یہ بھی تھی کہ وہ انبیاء ورسل تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے تھے۔ عزرائیل علیہ السلام جاندار مخلوق کی اَرواح قبض کرنے پر مامور ہیں۔ میکائیل علیہ السلام بادلوں پر مامور ہیں۔ جس وقت اور جس مقام پر اور جتنی اللہ تعالیٰ چاہے، وہاں اتنی ہی بارش ہوتی ہے۔ سیدنا اسرافیل کی ایک اضافی ڈیوٹی یہ ہے کہ وہ پہلی دفعہ صور میں پھونکیں گے تو روئے زمین پر کوئی جاندار مخلوق باقی نہ رہے گی اور دوسری دفعہ اس وقت پھونکیں گے جب میدانِ حشر قائم ہوگا۔ ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے بدستور لگے رہتے ہیں جو ان کے نیک اور برے اعمال کا ریکارڈ رکھتے ہیں۔ دوزخ پر بھی تندخو قسم کے فرشتے مقرر ہیں۔ قیامت کے دن بھی اللہ تعالیٰ کے عرش کو آٹھ فرشتے اُٹھائے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے ان کی بھی کئی قسم کی ذمہ داریوں کا پتہ چلتا ہے۔ فرشتے یہ کام کیسے سرانجام دیتے ہیں؟ یہ ہمیں معلوم نہیں، نہ ہم یہ جاننے کے مکلّف ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندی، مصری اور یونانی تہذیب میں دیوتاؤں اور دیویوں کا عقیدہ اسی عقیدۂ ملائکہ سے ماخوذ ہے جو کئی لحاظ سے غلط ہے، مثلاً:

۱۔ دیوی دیوتاؤں میں نر و مادہ کا سلسلہ موجود ہے، لیکن فرشتوں میں نر و مادہ کی سرے سے کوئی تمیز ہی نہیں۔

۲۔ دیوی دیوتاؤں میں توالد و تناسل کا سلسلہ بھی موجود ہے جیسا کہ ویدن (Weden) کی ایک بیوی تسلیم کی جاتی ہے جس کا نام فرگ (Frigg) یا فرگا (Frigga) ہے۔ اور ان کے بیٹے کا نام تھار (Thor) لیکن فرشتوں میں توالد و تناسل کا کوئی سلسلہ نہیں۔

۳۔ دیوی دیوتاؤں کو صاحبِ اختیار و ارادہ مخلوق تسلیم کیا گیا ہے جو ایک دوسرے سے الجھتے، لڑ پڑتے، ایک دوسرے پر غالب ہوتے ہیں لیکن فرشتے ان باتوں سے پاک ہیں۔

۴۔ دیوی دیوتا اپنے پجاریوں کی عبادت سے خوش ہوتے ہیں اور ان کی مشکل کشائی اور حاجت روائی کی طاقت رکھتے ہیں کیونکہ صاحبِ اختیار و ارادہ ہیں۔ لیکن فرشتے تو صاحبِ اختیار و ارادہ ہیں ہی نہیں، لہٰذا اُن سے ایسی توقعات عبث ہیں۔

غالباً انہی وجوہ کی بنا پر مسلمانوں کے ایک عقل پرست فرقہ نے ملائکہ سے کائنات کی تسخیری قوتیں مراد لی ہیں لیکن یہ تعبیر بھی غلط ہے کیونکہ صریح نصوص کے خلاف ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ایسی مقتدرِ اعلیٰ ہستی ہے جیسا کہ اس کی صفات بیان کی جاتی ہیں تو اسے تدبیرِ اُمورِ کائنات میں فرشتوں سے بھی مدد لینے کی کیا ضرورت تھی؟ نیز یہ کہ اگر نظامِ کائنات ایسے ہی چل رہا ہے تو پھر ملائکہ کے بجائے دیوتاؤں کا نام لے لینے سے کیا فرق پڑ جاتا ہے؟ تو ان سوالوں کا جواب یہ ہے کہ لفظ ''شریک'' کا اطلاق صرف اس وقت ہوتا ہے جب وہ ''مشرک'' صاحبِ ارادہ بھی ہو۔ میں اگر قلم اور دوات سے کچھ لکھتا ہوں تو یہ قلم اور دوات میرے شریک نہیں بلکہ آلہ کار ہیں۔ اسی طرح ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کے آلہ کار کی حیثیت تو دی جا سکتی ہے، شریک کی نہیں۔ اس کے برعکس دیوی دیوتا چونکہ صاحبِ اختیار و ارادہ تسلیم کیے گئے ہیں، اس لیے ان کی حیثیت شریک کار کی ہے نہ کہ آلہ کار کی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس صریح فرق کے باوجود انبیائے سابقہ کی اُمتوں پر اسی یونانی، مصری اور ہندی تہذیبوں کا اتنا اثر پڑا کہ وہ ملائکہ کو بھی وہی کچھ کہنے لگا جو دیوی دیوتاؤں سے سمجھا جاتا تھا۔ ان فرشتوں میں نسلی امتیاز بھی قائم کیا گیا اور انہیں اللہ تعالیٰ کی اولاد سمجھا جانے لگا۔ مزید ستم یہ کہ وہ ان فرشتوں کو زیادہ بیٹیاں یا بیویاں ہی قرار دیتے تھے۔ اور یہی ''فرشتیاں'' ان کے معبود تھے۔ قرآن کریم نے ان مشرکین عرب کے اس عقیدہ کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

﴿وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا﴾ (۱۹:۴۳) ''ان لوگوں نے فرشتوں کو، جو دراصل رحمٰن کے بندے ہیں، دیویاں بنا رکھا ہے۔''

ان مشرکین کا ایک دیوتا ''ہبل'' تھا۔ ابوسفیان سپہ سالارِ مشرکین مکہ نے جنگ اُحد کے اختتام پر اُعْلُ الھبل کہہ کر اس کے نام کا نعرہ لگایا تھا لیکن زیادہ تر ان کی دیویوں کی ہی پرستش ہوتی تھی۔ ایک دیوی کا نام ''لات'' (الٰہ کا مونث) تھا جسے اللہ تعالیٰ کی بیوی سمجھا جاتا تھا۔ دوسری دیوی کا نام ''عزیٰ'' (عزیز کی مونث) اور تیسری کا نام ''منات'' تھا جو غالباً اللہ تعالیٰ کی لڑکی سمجھی جاتی تھی۔

لات کا استھان طائف میں تھا اور بنوثقیف اس کے پجاری اور اس حد تک معتقد تھے کہ عام الفیل میں جب ابرہہ ہاتھیوں کی فوج لے کر مکہ پر چڑھائی کرنے آیا تو ان ظالموں نے محض آستانہ لات کو بچانے کی خاطر اور مکہ کا رستہ بتلانے کے لیے اپنے آدمی فراہم کیے حالانکہ باقی اہل عرب کی طرح اہل ثقیف بھی یہ مانتے تھے کہ کعبہ اللہ کا گھر ہے۔

عزیٰ قریش کی خاص دیوی تھی اور اس کا استھان مکہ اور طائف کے درمیان وادی نخلہ میں تھا۔ قریش اور دوسرے قبائل عرب اس کی زیارت کو آتے، نذریں چڑھاتے اور اس کے لیے قربانیاں کرتے تھے۔ کعبہ کی طرح اس کی طرف بھی قربانی کے جانور لے جائے جاتے اور تمام بتوں سے بڑھ کر اس کی عزت کی جاتی تھی۔

''منات'' کا استھان مکہ اور مدینہ کے درمیان بحر احمر کے کنارے ''قدید'' کے مقام پر واقع تھا۔ بنوخزاعہ اور اوس و خزرج کے لوگ اس کے بہت معتقد تھے۔ اس کا حج اور طواف کیا جاتا اور قربانیاں چڑھائی جاتیں۔ بیت اللہ کا حج کرنے والے جب طواف بیت اللہ اور عرفات اور منیٰ سے فارغ ہو جاتے تو وہیں سے ''منات'' کی زیارت کے لیے لبیک پکارنا شروع کر دیتے۔ اس طرح اس ''دوسرے حج'' کرنے والوں کو صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے انہیں شرکیہ عقائد وافعال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى﴾ (النجم: ۱۹تا۲۲)

''بھلا تم نے اس لات اور عزیٰ اور تیسری منات دیوی پر بھی کچھ غور کیا۔ کیا بیٹے تمہارے لیے ہیں اور بیٹیاں اللہ کے لیے؟ یہ تو سخت ناانصافی کی بات ہوئی۔''

ان آیات کی رو سے مشرکین عرب تین کبیرہ گناہوں کے مرتکب تھے: (۱) غیر اللہ کی پرستش جو کہ قطعاً ناقابل معافی گناہ ہے۔ (۲) اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد ٹھہرانا، جو شرک کی سب سے بڑی قسم ہے۔ (۳) اور اولاد بھی وہ جسے وہ اپنے لیے قطعاً پسند نہیں کرتے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقالہ:۳

انسانی حقوق اور تعلیماتِ نبوی ﷺ ❶

معاشرہ سے فتنہ و فساد کے خاتمہ اور امن و امان کے قیام کے لیے معاشرہ کے افراد کے حقوق و فرائض کی تعیین نہایت ضروری چیز ہے، اور یہ تعیین دو طرح سے ہوتی ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ معاشرہ کے کچھ سمجھدار لوگ اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں ایسے حقوق و فرائض باہمی مشورہ سے طے کر لیتے ہیں۔ ایسی تعیین کبھی تو درست ثابت ہوتی ہے اور کبھی غلط، کیونکہ انسان کی عقل بھی محدود ہے اور علم بھی۔ لہٰذا ایسی تعیین ہمیشہ تجربات کے دور سے گزرتی اور تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

دوسری قسم کی تعیین وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی راہنمائی کے لیے خود ہی تجویز فرمایا ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کو بذریعہ وحی ایسی ہدایات و احکامات دے دیئے جاتے ہیں جنہیں عوام الناس تک پہنچانا ان کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان تھے، تو ساتھ ہی نبی بھی تھے۔ انہی سے اس سلسلہ کی ابتدا ہوئی، جبکہ انتہا رسول اللہ ﷺ پر ہوئی۔ گویا تعیین الٰہیہ اور تعیین انسانی میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر غیر متبدل ہے اور لوگوں کو اپنے پیچھے چلنے کی دعوت دیتی ہے۔ جب کہ ثانی الذکر، جو لوگوں کے تجربات و مشاہدات اور خواہشات کے نتیجہ میں معرض وجود میں آتی ہے، ہمیشہ تغیر و تبدل کی زد میں رہتی ہے۔ بالفاظِ دیگر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اول الذکر خود متبوع، اور عوام اس کے تابع ہوتے ہیں۔ جبکہ ثانی الذکر تعیین خود لوگوں کی خواہشات کے تابع ہوتی ہے۔

ہماری شریعت کا ایک کثیر حصہ ایسے احکامات و ارشادات پر مشتمل ہے جو انسانی حقوق سے متعلق ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنی وفات سے صرف تین چار ماہ پیشتر فریضۂ حج ادا فرمایا۔ ہجرت کے بعد یہ آپ ﷺ کا پہلا اور آخری حج تھا۔ اس موقعہ پر آپ ﷺ نے تقریباً سوا لاکھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مجمع سے ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا، جو خطبہ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔

❶ یہ مضمون ماہنامہ ''حرمین'' جون، جولائی ۱۹۹۲ء میں طبع ہوا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نیز اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی تھی:

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ (المائدہ:۳)

''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا، تم پر اپنی نعمتیں پوری کر دیں اور تمہارے لیے اسلام کو بحیثیت دین پسند کر لیا ہے۔''

اس آیت کے نازل ہونے سے آپ ﷺ کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ اب آپ ﷺ کی زندگی کا مشن پورا ہو چکا ہے، نیز یہ کہ اب آپ ﷺ اپنی زندگی کی آخری منازل طے فرما رہے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے خطبہ کا آغاز ہی ان الفاظ سے فرمایا:

(ایها الناس اسمعوا قولي فاني لا ادري لعلي القاكم بعد عامي هذا بهذا الموقف ابداً)

''لوگو! میری باتیں غور سے سن لو، شاید اس سال کے بعد، اس مقام پر میں پھر تم سے نہ مل سکوں۔''

اس خطبہ کی حیثیت گویا آپ ﷺ کی وصیت کی تھی۔ لہٰذا آپ ﷺ نے اس موقع پر صرف اُن اُمور کی تاکید فرمائی، جنہیں آپ ﷺ انسانی فلاح و بہبود کے لیے نہایت اہم خیال فرماتے تھے۔ نیز یہ خطبہ دراصل پہلے سے نازل شدہ بہت سے احکامات کا خلاصہ تھا۔ اس خطبہ کا اکثر حصہ چونکہ انسانی حقوق کی تعیین پر مشتمل ہے۔ لہٰذا اگر اسے انسانی حقوق کے سب سے پہلے چارٹر کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ اس خطبہ کا کثیر حصہ تو آپ ﷺ نے اونٹنی پر سوار ہو کر عرفہ کے دن میدانِ عرفات میں ارشاد فرمایا اور کچھ تھوڑا سا حصہ واپسی پر منیٰ میں ارشاد فرمایا تھا۔ صورتِ حال یوں تھی کہ آپ ﷺ یہ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اور آپ ﷺ کے الفاظ کو درمیان میں کھڑے لوگ پچھلوں تک پہنچانے کا فریضہ ادا کر رہے تھے۔ بعض باتیں آپ ﷺ دو تین بار دہراتے۔ اس خطبہ کے آغاز میں ہی آپ ﷺ نے سب سے اہم تین بنیادی حقوق ...... جان و مال اور آبرو کی حفاظت ...... کا ذکر فرمایا۔ اور جس بلیغ انداز سے ان کا ذکر فرمایا، اسی سے ان کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آپ ﷺ کے تمام تر خطبہ کا انداز یہ تھا کہ جب آپ ﷺ ایک بات بیان فرما لیتے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھتے کہ کیا میں نے یہ بات پہنچا دی؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب یہ جواب دیتے کہ ہاں آپ ﷺ نے پہنچا دی تو ''اللهم اشهد!'' فرماتے۔ یعنی ''اے اللہ! اس بات پر گواہ رہنا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ جماعت اس کا بات کا اقرار کر رہی ہے کہ میں نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تیرا پیغام انہیں پہنچا دیا ہے۔''

جان، مال اور آبرو کی حفاظت کی اہمیت کو اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے لیے آپ ﷺ نے جو انداز اختیار فرمایا، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ہم سے پوچھا:

(ای شھرٍ ھذا؟ قلنا الله و رسولهٗ اعلم. فسکت حتی ظننا انهٗ سیسمّیه بغیر اسمه، فقال: الیس ذا الحجة؟ قلنا بلیٰ قال ای بلدٍ ھذا؟ قلنا الله و رسوله اعلم. فسکت حتیٰ ظننا انه سیسمّیه بغیر اسمهٖ، قال: الیس البلدة؟ قلنا بلی. قال فای یوم ھذا؟ قلنا الله و رسولهٗ اعلم. فسکت حتی ظننا انه سیسمّیه بغیر اسمه قال: الیس یوم النحر؟ قلنا بلیٰ. قال فان دماءَ کم واموالکم واعراضکم علیکم حرامٌ کحرمة یومکم ھذا فی بلدکم ھذا فی شھرکم ھذا و ستلقون ربکم فیسالکم عن اعمالکم، الا فلا

یہ کون سا مہینہ ہے؟'' ہم نے عرض کی۔ ''اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔'' آپ ﷺ خاموش ہو گئے، تا آنکہ ہمیں گمان ہونے لگا کہ آپ ﷺ اس مہینہ کا کوئی اور نام تجویز فرمائیں گے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا یہ ذوالحجہ نہیں؟'' ہم نے عرض کی ''جی ہاں!'' پھر آپ ﷺ نے پوچھا ''یہ شہر کونسا ہے؟'' ہم نے کہا ''اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔'' آپ ﷺ خاموش ہو گئے، تا آنکہ ہمیں گمان ہونے لگا کہ آپ ﷺ اس کا کوئی اور نام تجویز فرمائیں گے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا ''کیا یہ البلدۃ (مکہ) نہیں؟'' ہم نے کہا ''جی ہاں'' پھر آپ ﷺ نے پوچھا: ''یہ کونسا دن ہے؟'' ہم نے کہا: ''اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔'' آپ ﷺ خاموش ہو گئے، تا آنکہ ہمیں گمان ہونے لگا کہ آپ ﷺ اس کا کوئی اور نام تجویز فرمائیں گے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا یہ قربانی کا دن نہیں ہے؟'' ہم نے کہا ''جی ہاں''۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا ''بلاشبہ تم پر تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں اسی طرح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجعوا بعدی ضلالاً یضرب بعضکم رقاب بعض. الاھل بلغت؟ قالوا نعم. قال اللھم اشھد. فلیبلّغ الشاھد الغائب فرُبّ مبلغ اوعیٰ من سامعٍ)(متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب الحج۔ خطبہ یوم النحر، الفصل الاول)

حرام ہیں، جس طرح اس مہینہ کی، اس شہر مکہ میں اور اس قربانی کے دن میں حرمت ہے۔ اور بلاشبہ تم عنقریب اپنے رب سے ملو گے تو وہ تم سے تمہارے اعمال کے متعلق پوچھے گا۔ خبردار! میرے بعد گمراہ ہو کر ایک دوسرے کی گردنیں نہ کاٹنے لگنا۔'' پھر آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا، ''کیا میں نے تمہیں یہ بات پہنچا دی؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی، ''جی ہاں''۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ''اے اللہ! گواہ رہنا۔'' پھر آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص یہاں موجود ہے، اُسے چاہیے کہ وہ یہ بات اس شخص تک پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں۔ کیونکہ بسا اوقات سننے والے سے وہ شخص زیادہ نگہداشت رکھنے والا ہوتا ہے، جس کو بات پہنچائی جائے گی۔''

غور فرمایئے! اس ارشاد مبارک میں تین قسم کی اور تہری حرمت بیان کرنے کے بعد جان، مال اور آبرو کی حرمت کو اس تہری حرمت کے مانند قرار دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی آپ ﷺ نے یہ تاکید بھی فرما دی کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں، ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ بات ان لوگوں تک پہنچا دیں، جو یہاں موجود نہیں۔ تاکہ یہ پیغام دنیا بھر کے لوگوں تک اور قیامت تک کے لوگوں کو پہنچ سکے۔

جان، مال اور آبرو کی حفاظت سے متعلق آپ ﷺ کے اس مختصر مگر جامع ارشاد سے پہلے جو احکام نازل ہو چکے تھے، مختصراً درج ذیل ہیں:

ا۔ جان کی حفاظت:

قتل ناحق کو شدید ترین اور ناقابل معافی جرم قرار دیا گیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ا۔ (وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ)(البقرۃ:۱۷۹) ''اے عقل والو! قصاص میں تمہارے لیے زندگانی ہے۔''

۲۔ یہ قصاص محض قتل میں نہیں، بلکہ اعضاء و جوارح میں بھی قصاص ہے، جس کی تفصیل احادیث میں موجود ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۔ قتل سے متعلق مندرجہ ذیل سزائیں قرآن مجید میں مذکور ہیں:

(ا) مسلمان کے دانستہ خونِ ناحق کی سزا ابدی جہنم ہے۔ اللہ کا غضب اور لعنت مستزاد ہیں۔ (النساء:۹۳)

(ب) مسلمان کے قتل خطا کی سزا مقتول کے وارثوں کو خون بہا دینا اور ایک غلام آزاد کرنا ہے۔ (النساء:۹۲)

(ج) مقتول اگر معاہد قوم سے تعلق رکھتا ہو تو غلام آزاد کرنا اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا دینا ہے۔ اور اگر دشمن قوم سے تعلق رکھتا ہو (اور وہ خود مومن ہو) تو بھی ایک غلام آزاد کرنا ہے۔ (النساء:۹۲)

(د) نوزائیدہ بچیاں زندہ درگور کرنے کو بھی، جس کا عرب میں عام رواج تھا، قتل ہی قرار دیا گیا ہے۔ (التکویر:۸۔۹)

(ہ) قتلِ ناحق کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا ہو۔ (المائدۃ:۳۲)

قتل کی سب سے ہلکی سزا یہ ہے کہ مقتول کے وارث دیت پر راضی ہو جائیں، اور اگر وہ راضی ہو جائیں تو یہ ان کی مہربانی ہے۔ دیت کی مقدار سو اونٹ ہے جو دورِ جاہلیت میں مروج تھی۔ شریعت نے اسی کو بحال رکھا ہے یا سو اونٹ کی قیمت کے لگ بھگ نقد رقم ادا کرنا ہو گی۔

آپ ﷺ کی بعثت سے پیشتر عرب میں قبائلی نظام رائج تھا۔ یہ لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھ پڑتے اور قتل و غارت پر اُتر آتے تھے۔ اگر کسی قبیلہ کا کوئی شخص قتل ہو جاتا، تو جب تک یہ قبیلہ قاتل کے قبیلہ کے کسی شخص کو قتل نہ کر لیتا، چین سے نہیں بیٹھتا تھا۔ پھر یہ سلسلہ پشت در پشت آگے چلتا رہتا اور ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ اس کے متعلق آپ ﷺ نے اسی خطبہ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا:

(الا کل شیءٍ من امر الجاھلیة تحت قدمی موضوعٌ و دماء الجاھلیة موضوعة وان اول دم اضع من دماءِ نا دم ابن ربیعة بن حارثة) (مسلم۔ کتاب الحج۔ باب حجة النبی ﷺ)

''خبردار! دورِ جاہلیت کا ہر کام میرے ان دونوں قدموں کے نیچے رکھا گیا ہے۔ دورِ جاہلیت کے خون موقوف کر دیئے گئے ہیں، اور سب سے پہلا خون جو میں موقوف کرتا ہوں، وہ ہمارا خون ہے۔ ربیعہ بن حارثہ کا خون!''

گویا اس موقع پر آپ ﷺ نے اپنے قبیلہ کا خون موقوف کر کے اس بُرے دستور کا مکمل طور پر خاتمہ فرما دیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔مال کی حفاظت:

اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل سزائیں قرآن مجید میں نازل ہو چکی تھیں:

۱۔ چور کی حد یہ ہے کہ چور، خواہ مرد ہو یا عورت، اس کے ہاتھ کاٹے جائیں گے (المائدہ:۳۸)

۲۔ راہزنی اور ڈاکہ وغیرہ کے لیے قرآن مجید میں چار سزائیں مذکور ہیں:

(۱) سولی، (۲) قتل، (۳) آمنے سامنے کے ہاتھ پاؤں کاٹنا اور (۴) جلاوطنی (المائدہ:۳۳)

قاضی کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان میں سے کوئی ایک، یا کئی ایک سزائیں، جرم کی نوعیت کا لحاظ رکھتے ہوئے دے دے۔

آج کل اسلامی سزاؤں کو اور بالخصوص چوری کی سزا کو، وحشیانہ قسم کی سزا سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ تجربہ سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ لوگوں کے اموال کی حفاظت صرف اسی صورت میں ممکن ہے اور شرعی سزاؤں کے نفاذ سے جرائم کی تعداد میں حیرت ناک حد تک کمی واقع ہو جاتی ہے۔ آپ ﷺ نے ان سزاؤں کے نفاذ میں جس قدر استقلال کا ثبوت دیا، اس کا اندازہ درج ذیل واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

قریش کی ایک ذیلی شاخ بنو مخزوم کی ایک عورت فاطمہ مخزومی نے چوری کی۔ قریش لوگ عرب میں بڑے معزز سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر فاطمہ کا ہاتھ کٹ گیا تو سارا قبیلہ بدنام ہو جائے گا، لہٰذا وہ سفارش کی راہیں تلاش کرنے لگے۔ بالآخر نظر انتخاب سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ پر پڑی۔ سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ نے جب یہ سفارش کی تو آپ ﷺ کو ان پر بھی سخت غصہ آ گیا۔ آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور فرمایا:

(انما اهلك الذين قبلكم انهم كانوا اذا سرق فيهم الشريف تركوه و اذا سرق فيهم الضعيف اقاموا عليه الحد وايم الله لوان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها)	”تم سے پہلے کی امتیں اسی وجہ سے ہلاک کی گئیں کہ اگر ان میں سے کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اُسے چھوڑ دیتے، اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے۔ اور اللہ کی قسم! اگر فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد ﷺ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔“
(بخاری، کتاب الحدود باب اقامة الحدود)	

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۔ آبرو کی حفاظت:

آبروریزی یعنی زنا کی حد شادی شدہ کے لیے سو کوڑے مقرر ہے۔ (النور:۲) اور شادی شدہ کے لیے رجم ہے۔ ❶ اگر عورت سے جبراً یہ فعل کیا گیا ہو تو حد صرف مرد پر جاری ہوگی اور عورت بچ جائے گی۔ اور اگر یہ کام باہمی رضامندی سے ہو تو دونوں پر حد جاری ہوگی۔

۲۔ کسی عورت یا مرد پر تہمت لگانے کی سزا اسّی کوڑے مقرر ہے اور توبہ سے قبل اس کی گواہی نامقبول ہے۔ (النور:۴)

۳۔ شراب نوشی کی سزا جرم کی نوعیت کے مطابق ۴۰ کوڑے یا ۸۰ کوڑے ہے۔ ❷ کیونکہ شرابی نشہ کی حالت میں بعض دفعہ لوگوں کی بے عزتی کر دیتا ہے اور بعض دفعہ کسی پر تہمت بکنے لگتا ہے۔

یہ تو جان، مال اور آبرو کی حفاظت کے سلسلہ میں حدود و تعزیرات کا ذکر تھا۔ اب اسی سلسلہ کے درج ذیل ارشاداتِ نبوی ﷺ بھی ملاحظہ فرمالیجیے:

۱۔ جس نے ہم پر ہتھیار اٹھایا، وہ ہم میں سے نہیں۔ ❸ (یعنی ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں)

۲۔ جو شخص اپنے مال کو بچاتے ہوئے مارا جائے، وہ شہید ہے۔ ❹

۳۔ مسلمان پر لعنت کرنا اسے قتل کرنے کی مانند ہے۔ ❺

۴۔ کسی شخص کے لیے اتنی ہی برائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ ❻

۵۔ مسلمان کو گالی دینا گناہ ہے اور اسے قتل کرنا کفر ہے۔ ❼

۴۔ حق ملکیت:

سرمایہ دارانہ نظام میں زمین اور دوسری اشیاء کا غیر مشروط حق ملکیت تسلیم کیا گیا ہے۔ ایک سرمایہ دار

---

❶ بخاری۔ کتاب استتابة المرتدين

❷ مسلم۔ کتاب الحدود۔ باب حدّ الخمر

❸ مسلم، کتاب الایمان، عنوان باب

❹ مسلم۔ کتاب الایمان۔ باب من قُتِلَ دون ماله فهو شهيد

❺ مسلم۔ کتاب الایمان

❻ مسلم۔ کتاب البر والصلة۔ باب تحريم ظلم المسلم

❼ مسلم۔ کتاب الایمان۔ عنوان باب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے سرمایہ سے، جیسے بھی چاہے، اپنی دولت میں اضافہ کرسکتا ہے، خواہ اس کا یہ طریق کار معاشرہ کے اخلاق یا معاش کے لیے کتنا ہی نقصان دہ کیوں نہ ہو۔ اشتراکیت میں حق ملکیت کو یکسر ختم کیا گیا ہے اور سب کچھ قومی تحویل میں لے لیا جاتا ہے۔ جب کہ اسلام فرد کے حق ملکیت کو تسلیم تو کرتا ہے مگر چند شرائط کے تحت۔ اسلامی نقطۂ نظر سے ہر چیز کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اور انسان یا جماعت کے پاس جو کچھ ہے، وہ بطور امانت ہے۔ اس میں ہم اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تحت ہی تصرف کر سکتے ہیں۔

قدرتی اشیاء سے استفادہ کے معاملہ میں ہر شخص کو مساویانہ حق حاصل ہے۔ مثلاً جنگل کی لکڑیوں کو جو شخص بھی اکٹھا کر کے لائے گا، وہ اسی کی ہوں گی۔ خواہ وہ انہیں خود استعمال کرے یا بازار میں جا کر بیچ دے۔ یا کوئی شخص اگر محنت کر کے پانی کے چشمہ سے پانی لاتا ہے تو وہ اسی کا ہوگا۔ کوئی دوسرا اس سے چھین نہیں سکتا۔ اس طرح اگر جنگل میں کوئی پھلدار درخت اُگ آیا ہے، اور وہ زمین کسی کی ملکیت بھی نہیں، تو جو شخص سب سے پہلے وہاں جا کر قبضہ کرے گا اور اس کی حفاظت کا اہتمام کرے گا، تو وہ اسی کی ملکیت بن جائے گا۔ حتیٰ کہ اسلامی نقطۂ نظر سے تو اگر کوئی شخص بنجر اور غیر مملوکہ زمین کو آباد کر لیتا ہے، تو وہ اسی کی ہو جاتی ہے۔ [1]

۵۔ معاشرتی حقوق:

اسلام معاشرہ کے افراد میں اونچ نیچ کا قائل نہیں، بلکہ مساوات کا حامی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ...... ﴾ (الحجرات:۱۳)	''لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہی ہے، جو زیادہ متقی ہو۔''

انسان کے اس فطری حق کی رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبۂ حجۃ الوداع میں یوں وضاحت فرمائی:

(ایها الناس ان ربکم واحد وان اباکم واحد، کلکم بنو ادم و ادم من تراب، الا لا فضل لعربی علی	''لوگو! بلاشبہ تم سب کا رب ایک اور باپ بھی ایک ہے۔ تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو، اور آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔ سن رکھو! کسی عربی کو عجمی پر

[1] بخاری، کتاب المزارعۃ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عجمي ولا لعجمي علىٰ عربي ولا لاحمر علي اسود ولا لاسود علي احمر الا بالتقوى)(مسند احمد)	اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، نہ ہی کسی گورے کو کالے پر اور نہ ہی کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت حاصل ہے۔ فضیلت اگر ہو سکتی ہے تو صرف تقویٰ کی بناء پر ہو سکتی ہے"

رسول اللہ ﷺ کے اس ارشادِ مبارک سے قومیت پرستی، وطنیت پرستی اور لونی اختلافات و فسادات کی جڑ کٹ جاتی ہے، جو آج کل بین الاقوامی اور بین المملکتی فسادات نیز جنگ وجدال کا باعث بنے ہوئے ہیں۔

پھر اس سلسلہ میں آپ ﷺ کا اندازِ تربیت بھی ملاحظہ فرمائیے۔ سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ایک جلیل القدر صحابی اور سابقون الاولون میں سے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو ان سے خصوصی پیار بھی تھا۔ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ خود بیان فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ ایک شخص کو برا بھلا کہا اور اس کی ماں کو گالی دی، [1] تو آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا:

(يا ابا ذر اَعَيَّرتَهٗ بامّه انك امرؤ فيك جاهلية)(بخاری۔ کتاب الایمان۔ باب المعاصي في امر الجاهلية)	"اے ابو ذر! تو نے اسے (سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو) اس کی ماں سے عار دلائی ہے۔ تو ایسا شخص ہے جس میں ابھی تک جاہلیت کا اثر باقی ہے۔"

۶۔ معاشی حقوق:

سرمایہ دارانہ نظام میں معاشی حقوق کو بالکل آزاد چھوڑ دیا گیا ہے، خواہ اس بناء پر معاشرہ کو کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچے۔ اس کے اخلاق تباہ ہوں، بے حیائی اور فحاشی کو فروغ ملے! مثلاً لوگوں کو گندم کی ضرورت ہو، لیکن سرمایہ دار یہ سمجھے کہ اس وقت اسے شراب بنانے میں زیادہ فائدہ ہے تو وہ شراب ہی مہیا

---

[1] یہ شخص سیدنا بلال رضی اللہ عنہ تھے۔ اور سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ نے جو ماں کی گالی دی، وہ صرف یہ تھی کہ انہوں نے کہا تھا، "اے کالی ماں کے بیٹے!"..... رسول اللہ ﷺ نے اس پر جب ناراضگی کا اظہار فرمایا تو سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ نے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ سے معافی مانگی اور اپنا گال زمین پر رکھ کر کہنے لگے، "اس وقت تک اپنا گال نہ اٹھاؤں گا، جب تک بلال رضی اللہ عنہ اپنے پاؤں سے نہ روندیں۔" (وحید الزمان مترجم بخاری)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرے گا اور حکومت اس پر کوئی گرفت نہ کرے گی۔ اس کے برعکس اشتراکیت میں یہ حقوق یکسر چھین لیے گئے ہیں۔ چنانچہ ہر شخص کے لیے کاروبار حکومت خود تجویز کرتی ہے، اور اسے بس ایک مشین کی طرح وہ کام کرنا پڑتا ہے۔

اسلام میں اس حق کو تسلیم کیا گیا ہے، مگر چند در چند پابندیوں کے ساتھ۔ مثلاً جو چیزیں شریعت نے حرام قرار دی ہیں، ان کی خرید و فروخت بھی حرام ہے۔ چنانچہ شراب نوشی اگر حرام ہے تو شراب فروشی بھی حرام ہے۔ اگر مردار حرام ہے، تو اس کی کسی بھی چیز کو نہ فروخت کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی خود اس سے کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ چوری، ڈاکہ، غصب، رشوت، رہزنی وغیرہ، اور ان سے حاصل شدہ مال بھی حرام ہے۔

حرام اشیاء میں سرفہرست سود ہے۔ سود اور اس کی تمام شکلوں کو...... خواہ یہ مہاجنی قرضے ہوں یا کمرشل انٹرسٹ، سود مفرد ہو، مرکب یا ڈس کاؤنٹ (مِتی کاٹا) یا مارک اَپ اور مارک ڈاؤن...... شریعت نے نہ صرف حرام، بلکہ اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کے مترادف قرار دیا ہے۔ کیوں کہ طبقاتی تقسیم جس قدر سود سے بڑھتی ہے، اور کسی چیز سے نہیں بڑھتی، جو بالآخر فتنہ و فساد اور لوٹ مار پر منتج ہوتی ہے۔ سود چونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں ریڑھ کی ہڈی سمجھا جاتا ہے، اس لیے اس کی کوکھ سے اس کی دوسری انتہا اشتراکیت نے جنم لیا...... سود کی حرمت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خطبۂ حجۃ الوداع میں بالخصوص اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

(وربا الجاهلية موضوع و اول ربا اضع من ربانا ربا عباس بن عبد المطلب فانه موضوع كله) (صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبی ﷺ)

''دورِ جاہلیت کا سود موقوف کیا جاتا ہے اور پہلا سود جو میں تمام کا تمام موقوف کرتا ہوں، وہ اپنے قبیلہ میں سے عباس رضی اللہ عنہ بن عبد المطلب کا سود ہے۔''

سیدنا عباس رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے حقیقی چچا تھے، جو تجارت کے لیے رقم سود پر دیا کرتے تھے۔ گویا آپ ﷺ نے اس اصلاح کا آغاز اپنے گھر سے کر کے سود کا جزیرۃ العرب سے خاتمہ کر دیا۔

اسلام انسان کی کمائی کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے، ایک حلال، دوسرا حرام! حرام کمائی کی تمام تر تفصیلات کتاب و سنت میں مذکور ہیں۔ اس حرام کمائی سے بچتے ہوئے ہر انسان پیشہ کا انتخاب نیز کمائی کے ذرائع کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔ اور اس طرح جتنی بھی دولت وہ کما لے، یہ اس کی جائز آمدنی اور اس کی ملکیت ہوگی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاہم اس جائز کمائی پر بھی کچھ پابندیاں عائد ہیں۔ اسلام مال کو ضائع کرنے، دولت کے بے جا استعمال اور عیاشانہ زندگی گزارنے کی اجازت نہیں دیتا۔ بلکہ اس نے اس آمدنی میں زکوٰۃ و صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کی صورت میں دوسروں کے حقوق کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔ یوں معاشرہ کے محروم طبقات کو ان کا حق بھی مل جاتا ہے، دولت میں گردش بھی ہوتی ہے، اور معاشرہ فساد و بدامنی کا شکار بھی نہیں ہوتا۔ نیز طبقاتی تقسیم میں از خود نمایاں کمی واقع ہو جاتی ہے۔

۷۔ سیاسی حقوق:

آج کل سیاسی حقوق کا بڑا چرچا ہے۔ ہر بالغ انسان کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت، رائے دہی کا حق حاصل ہے، اور مملکت کا ہر شہری بلا تخصیص مرد و زن بڑے سے بڑے سرکاری منصب پر فائز ہو سکتا ہے۔ اسلام ایسے غیر مشروط سیاسی حقوق کا قائل نہیں ہے۔ اسلام نے عورت کو سیاسی ذمہ داریوں سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، کہ جب وہ اپنے گھر کی سربراہ بھی نہیں بن سکتی، تو ایک علاقہ یا ملک کی کیسے بن سکتی ہے؟ نیز اسلامی نقطۂ نظر سے ہر ایرے غیرے نتھو خیرے سے رائے طلب کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ رائے صرف اس شخص سے لی جائے گی، جو اس کا اہل ہو۔ حیرت کی بات ہے کہ ہم اپنے ذاتی اُمور میں تو رائے صرف اس شخص سے لیتے ہیں، جسے اس کا اہل سمجھتے ہیں...... ہر کسی سے نہ مشورہ کرتے ہیں نہ رائے لیتے ہیں، تو پھر کیا امورِ مملکت ہی ایسے گئے گزرے معاملات ہیں کہ ان کے بارے میں اس پابندی کو یکسر ختم کر دیا جائے؟

سیاسی اُمور میں اسلام باہمی مشورہ کی تاکید کرتا ہے، اور رائے دہی کا حق بھی دیتا ہے۔ مگر رائے دہی پر پابندیاں یہ ہیں کہ وہ مسلمان ہو، کم از کم نماز اور زکوٰۃ ادا کرتا ہو، سمجھ دار ہو اور کوئی ایسا جرم نہ کر چکا ہو، جس کی بناء پر اس کی شہادت نا قابلِ قبول ہو۔ ایسے لوگوں سے خلیفہ کے انتخاب میں رائے لی جا سکتی ہے۔ اور مناصب کے لیے چند شرائط بھی ہیں، جیسے علومِ شریعت سے واقفیت اور تقویٰ وغیرہ۔

جمہوریت میں عہدہ یا منصب کے حصول کو ہر فرد کا حق قرار دیا گیا ہے، جبکہ شرعی نقطۂ نظر سے یہ حق نہیں، بلکہ ایک گرانبار ذمہ داری ہے۔ اسی لیے عہدہ کی طلب کو مذموم قرار دیا گیا ہے۔

۸۔ عدل و انصاف کا حق:

ہر شہری کا یہ حق ہے کہ اسے عدل و انصاف مہیا ہو، مفت مہیا ہو اور بلا تاخیر مہیا ہو۔ اور یہ حق اس قدر اہم ہے کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰىكَ اللّٰهُ......﴾ (النساء:۱۰۵)

''اے پیغمبر ﷺ، ہم نے آپ پر سچی کتاب نازل کی، تا کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کریں۔''

اور آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں جتنے فیصلے فرمائے، ان میں یہ تینوں باتیں پائی جاتی تھیں۔ عدل وانصاف میں تاخیر بذاتِ خود بہت بڑا ظلم ہے۔ اب ہمارے ہاں عدالتوں کا جو حال ہے، وہ خود ملاحظہ فرما لیجیے۔ عدل وانصاف کا حصول انتہائی مہنگا ہے، اور فوجداری مقدمات پر بھی سال ہا سال لگ جاتے ہیں۔ دیوانی مقدمات کا تو اور بھی بُرا حال ہے۔ ایک غریب آدمی کے لیے عدل وانصاف کا حصول تقریباً ناممکن بن چکا ہے۔ ہماری عدالتوں کے اس طریق کار کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ جرائم کی تعداد میں دم بدم اضافہ ہو رہا ہے، اور معاشرہ میں امن وامان کی صورت پریشان کن بن چکی ہے۔

اسلامی قانون کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہاں قانون ساز خود اللہ تعالیٰ ہے، جس کی نظر میں شاہ وگدا، امیر وغریب، آقا وغلام سب برابر ہیں، لہٰذا شرعی قانون سب پر ایک ہی جیسا لاگو ہے۔ اسلام کی یہی وہ صفت ہے جو اسے دوسرے تمام نظام ہائے حیات سے ممتاز کر دیتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دوسرے تمام نظاموں میں قانونی حاکمیت یا تو کسی ایک انسان کی ہوتی ہے یا کسی ادارہ یا پارلیمنٹ کی۔ ایسے حاکم یا قانون ساز ادارے اپنے آپ کو بہر حال قانون کی گرفت میں آنے سے بچائے رکھتے ہیں۔

۹۔ آزادی رائے کا حق:

آزادئ رائے اگر معقول حدود میں ہو تو مثبت نتائج پیدا کرتی ہے، اور یہ بے لگام و بے مہار ہو تو یہ ہزاروں فتنے پیدا کر کے مملکت کی سرحدوں کو کمزور کرتی رہتی ہے جس کے نتیجہ میں وقتاً فوقتاً حکومتوں کو اس لامحدود آزادی کو مختلف پابندیوں اور اخلاقی ضابطوں سے محدود کرنا پڑتا ہے۔

اسلام نے آزادئ رائے کو جائز اور لازم قرار دیا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ وہ کتاب وسنت کے مطابق ہو۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دور میں ہر مسلمان کو آزادئ رائے اور حکومت پر نکتہ چینی کا پورا پورا حق حاصل تھا، جسے وہ اپنا دینی فریضہ تصور کرتا تھا، تا کہ عوام کو ان کے جائز حقوق مل سکیں اور ملک میں نیکی کی حوصلہ افزائی اور برائی کا استیصال ہو۔ یہاں یہ حق کسی خاص جماعت یعنی حزب اختلاف کو نہیں کہ وہ حکومت کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کرے اور اس کے اچھے کاموں کی بھی مذمت کرتی رہے۔ کیونکہ اسلامی شوریٰ میں باقاعدہ حزبِ اختلاف کا وجود ہی نہیں ہوتا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاریخِ اسلام میں کئی ایسے واقعات مذکور ہیں کہ عام مسلمانوں نے خلفاء پر گرفت کی اور انہوں نے اسے تسلیم ہی نہ کیا، بلکہ اس جذبۂ تنقید کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ ایسے واقعات کا اس مختصر مقالہ میں ذکر کرنا بہت مشکل ہے۔

۱۰۔ حق تعلیم:

اسلام میں تعلیم حاصل کرنا اس کا لازمی حصہ ہے۔ قرآن مجید میں جا بجا علم کے فضائل کا ذکر آیا ہے۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا:

(خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ) ''تم میں سے سب سے بہتر وہ شخص ہے، جو خود قرآن سیکھے پھر دوسروں کو سکھائے۔''

(بخاری۔ کتاب فضائل القرآن)

نیز آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرما کر تعلیم حاصل کرنا لازمی قرار دیا ہے:

(طلب العلم فريضة على كل مسلم) ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔''

(مشکوۃ۔ کتاب العلم۔ فصل ثانی)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے حصول تعلیم کو لازمی قرار دیا اور اس کے لیے بہت سے ادارے قائم کیے۔ حتیٰ کہ خانہ بدوش بدوؤں کے لیے قرآن مجید کی تعلیم کو لازمی قرار دیا۔ آپ ﷺ نے ابوسفیان نامی ایک شخص کو چند آدمیوں کے ساتھ مامور کیا کہ وہ قبائل میں پھر کر ہر شخص کا امتحان لے، اور جس کو قرآن مجید کا کوئی حصہ بھی یاد نہ ہو، اسے سزا دے۔ [1]

کتاب وسنت کے علاوہ دوسرے علوم کی تعلیم کی طرف قرآن میں واضح ہدایات موجود ہیں۔ البتہ ایک اسلامی مملکت میں ایسی تعلیم، جو اس کے بنیادی نظریات کے خلاف ہو، اُسے برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

۱۱۔ حق آزادئ مذہب:

ایک اسلامی مملکت میں ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جونسا عقیدہ اور مذہب پسند کرتا ہے، اختیار کرے، اور اپنی مذہبی عبادات بجا لائے۔ مگر اسے کوئی ایسا کام کرنے کی اجازت نہیں دیتا، جو کسی دوسرے مذہب یا فریق کی دل آزاری یا نقضِ عامہ کا باعث بنے۔

[1] الفاروق۔ شبلی نعمانی، ص: ۲۶۲ مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ، اُردو بازار، لاہور، بحوالہ: اصابہ فی احوال الصحابہ رضی اللہ عنہم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلام کسی کو جبراً مسلمان بنانے کا ہرگز قائل نہیں۔ لیکن ایک دفعہ اسلام لانے کے بعد مذہب کی تبدیلی کو وہ جرم قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اسلام ایک تحریک ہے۔ للہذا دین کی تبدیلی کو بغاوت سمجھ کر اس کی سزا قتل قرار دیتا ہے۔

دورِ فاروقی میں اہلِ کتاب آزادی سے اپنی مذہبی رسوم ادا کرتے، علانیہ ناقوس بجاتے اور صلیب نکالتے تھے۔ مسلمان اگر ان سے سختی کرتے تو وہ پاداش کے مستحق ہوتے تھے۔

۱۲۔ باہمی حقوق:

اب ہم افرادِ معاشرہ کے حقوق کا اس ترتیب سے ذکر کریں گے، جس پر معاشرہ کی بنیاد اٹھتی ہے۔ ان حقوق میں سب سے پہلا نمبر زوجین (میاں بیوی) کے حقوق کا ہے۔

(الف) زوجین کے حقوق:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَ لِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ......﴾ (البقرۃ:۲۲۸)

''اور بیویوں کے حقوق اپنے خاوندوں پر ایسے ہی ہیں، جیسے دستور کے مطابق خاوندوں کے ان پر ہیں۔ البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے۔''

عورتوں کا مردوں پر حق یہ ہے کہ مرد اپنی حیثیت کے مطابق بیویوں کے نان ونفقہ اور رہائش کے ذمہ دار ہیں۔ انہیں یہ ذمہ داری پوری کرنا بھی ضروری ہے اور حسنِ سلوک سے پیش آنا اس سے بھی زیادہ ضروری! ...... جب کہ مردوں کا عورتوں پر حق یہ ہے کہ وہ گھر کی مالکہ ہونے کی حیثیت سے اس امانت میں کسی طرح کی خیانت نہ کریں اور ان کی اطاعت کریں۔ مردوں کو جو زائد درجہ حاصل ہے، وہ عورتوں پر نگران ہونے کی بنا پر ہے۔ اب چونکہ منتظم خانہ ہونے کی حیثیت سے مردوں سے عورتوں پر زیادتی کا خطرہ موجود ہے، اس لیے آپ ﷺ نے اپنے خطبۂ حجۃ الوداع میں اس طرف خصوصی توجہ دلاتے ہوئے فرمایا:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(استوصوا بِالنساء خیرا فانهن عندکم عوانٌ لا یملکن لانفسهن شیئًا) (طبقات ابن سعد)

''عورتوں کے بارے میں مَیں تمہیں حسن سلوک کی تاکید کرتا ہوں، کیوں کہ وہ تمہارے زیرِ نگیں رکھی گئی ہیں، جو خود کچھ نہیں کر سکتیں۔''

ازدواجی زندگی کی اصل روح مودت، موانست اور مہربانی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَ جَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً﴾ (الروم:۲۱)

''اور اس اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے عورتیں پیدا کیں۔ تا کہ تم ان کی طرف (مائل ہو کر) سکون حاصل کرو۔ اور تم میں محبت اور مہربانی پیدا کر دی۔''

لہٰذا فریقین پر لازم ہے کہ وہ خوشگواری کی فضا کو بہر طور قائم رکھیں۔ لیکن اگر وہ اسے برقرار نہ رکھ سکیں اور ناچاقی کی صورت پیدا ہو جائے تو مرد کو طلاق کا حق دیا گیا ہے۔ جو اگرچہ ناگزیر حالات میں جائز ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے ہاں سخت ناپسندیدہ چیز ہے۔ [1]

(ب) والدین اور اولاد کے حقوق:

والدین پر اولاد کا حق یہ ہے کہ وہ اپنے بچے کا اچھا سا نام رکھیں اور اگر استطاعت ہو تو ساتویں دن عقیقہ کریں۔ اولاد کی تعلیم و تربیت کا داعیہ چونکہ ہر انسان میں فطری طور پر موجود ہے، لہٰذا یہاں قابلِ ذکر بات صرف یہ ہے کہ اولاد کی تربیت اور تعلیم اسلامی خطوط پر ہونی چاہیے۔ لڑکی اگر بالغ ہو جائے تو اس کے لیے کوئی موزوں اور دیندار رشتہ تلاش کر کے اس کی شادی کرنا والد پر فرض ہے۔ البتہ لڑکے کے سلسلہ میں وہ مختار ہے۔ اگر کر سکتا ہے تو کر دے، ورنہ اس پر ذمہ داری نہیں ہے۔

دوسری طرف اولاد پر والدین کی خدمت اور ان سے حسن سلوک اس قدر ضروری ہے کہ کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے ذکر کے ساتھ والدین سے احسان کا ذکر فرمایا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

[1] ابوداؤد۔ کتاب الطلاق، باب فی کراهية الطلاق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿وَ قَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَآ اَوْ کِلٰھُمَا فَلَا تَقُلْ لَّھُمَآ اُفٍّ وَّ لَا تَنْھَرْ ھُمَا وَ قُلْ لَّھُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا﴾

(بنی اسرائیل:۲۳)

''اور تمہارے رب نے فیصلہ فرما دیا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین سے بھلائی کرتے رہو۔ ان میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے اُف تک نہ کہنا، اور نہ انہیں جھڑکنا......اور ان سے بات ادب سے کرنا۔''

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَ وَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْہِ حَمَلَتْہُ اُمُّہٗ وَھْنًا عَلٰی وَھْنٍ وَّ فِصٰلُہٗ فِیْ عَامَیْنِ اَنِ اشْکُرْلِیْ وَ لِوَالِدَیْکَ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ﴾

(لقمان:۱۴)

''اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے بارے میں تاکیدی حکم دیا، اس کی ماں اسے تکلیفیں سہہ سہہ کر اٹھائے پھری۔ پھر دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے، کہ میرا بھی شکر ادا کرتا رہ، اور اپنے والدین کا بھی۔''

ایک دفعہ کسی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ''میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا ''تیری ماں'' سائل نے پوچھا: ''اس کے بعد کون؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیری ماں'' سائل نے تیسری بار کہا کہ ''اس کے بعد کون؟'' آپ ﷺ نے فرمایا ''تیری ماں''۔ اور جب چوتھی بار سائل نے یہی بات پوچھی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیرا باپ'' ❶

ایک دفعہ آپ ﷺ نے برسرِ منبر فرمایا: ''اس شخص پر لعنت جسے بوڑھے والدین یا ان میں سے کوئی ایک میسر آئے اور وہ اس کی خدمت کر کے اپنے گناہ بخشوا نہ لے۔'' ❷

ایک دفعہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا: ''سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے ساتھ شرک کرنا۔'' پھر پوچھا گیا ''اُس کے بعد کونسا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''عقوق الوالدین'' ❸ یعنی ''والدین کی نافرمانی کرنا یا انہیں ستانا۔''

---

❶ بخاری۔ کتاب الادب، باب من احق الناس بحسن الصحبۃ

❷ مسلم۔ کتاب البر والصلۃ۔ باب تقدیم بر الوالدین

❸ مسلم کتاب الایمان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک دفعہ ایک باپ بیٹے کی شکایت لے کر آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: میں بوڑھا ہوں، کمانے کے قابل نہیں رہا، اور میرا بیٹا مجھے کچھ نہیں دیتا۔ آپ ﷺ نے بیٹے کو بلا کر فرمایا:

(اَنْتَ وَمَالُکَ لِاَبِیْکَ) (ابن ماجہ۔ ابواب التجارات، باب للرجل من مال ولدہ) ''تم خود بھی اور تمہارا مال بھی سب کچھ تمہارے باپ کا ہے۔''

اور ایک دفعہ یوں فرمایا:

(اِنَّ اَطْیَبَ مَا اَکَلْتُمْ مِنْ کَسْبِکُمْ وَاِنَّ اَوْلَادَکُم مِنْ کَسْبِکُمْ) (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب البیوع، باب الکسب، فصل ثانی) ''پاکیزہ ترین رزق جو تم کھاتے ہو وہ تمہاری اپنی کمائی ہے، اور اولاد بھی تمہارے کمائی ہے۔''

ان ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر باپ ضرورت مند ہو اور بیٹا اس طرف توجہ نہ کرے تو باپ کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ بیٹے کا سب کچھ یا حسب ضرورت مال لے لے۔

(ج) خادموں کے حقوق:

ایک دفعہ آپ ﷺ سے کسی نے پوچھا: ''میرے پاس ایک ہی دینار ہے، وہ کس پر خرچ کروں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا ''اپنی ذات پر''۔ وہ کہنے لگا، ''اگر ایک اور بھی ہو تو اسے کس پر خرچ کروں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی اولاد پر''۔ وہ کہنے لگا: ''اور اگر ایک اور ہو تو؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی بیوی پر'' وہ کہنے لگا، ''اور اگر ایک اور ہو تو؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے خادم پر'' وہ کہنے لگا کہ ''اگر ایک اور ہو تو؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اب آگے جو تو خود مناسب سمجھے'' [1]

اس حدیث میں اولاد پر خرچ کرنے کا ذکر بیوی سے پہلے آیا ہے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ خاوند بہت تنگ دست ہو، جیسے یہ سائل تھا۔ اس صورت میں چھوٹی اولاد بہر حال ماں سے زیادہ محتاج ہوتی ہے۔ ورنہ بیوی کا نمبر اولاد سے پہلے ہے۔

اگرچہ قرآن کریم میں خدام سے حسن سلوک کا جا بجا ذکر آیا ہے، تاہم درج ذیل حدیث اس موضوع پر نہایت جامع ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] (ابوداؤد۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب الاستعفاف عن المسئلة)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(اخوانکم خولکم جعلهم الله تحت ایدیکم فمن کان اخوه تحت یده فلیطعمه مما یاکل ولیلبسه مما یلبس ولا تکلفوهم مما یغلبهم فان تکلفوهم فاعینوهم) (بخاری۔ کتاب الایمان۔باب المعاصی من امر الجاهلیة)

''تمہارے خادم، مزدور، غلام تمہارے بھائی ہیں۔ لہٰذا تم میں سے جس کے قبضے میں اس کا کوئی بھائی ہو تو اس کو ویسا ہی کھلائے اور پہنائے، جیسا وہ خود کھاتا اور پہنتا ہے۔ اور اسے ایسا کام کرنے کو نہ کہے، جس کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو۔ اور اگر کبھی ایسا کام کرنے کو کہے تو خود بھی اس کا ہاتھ بٹائے۔''

اس ارشاد نبوی ﷺ سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ خَوَلَ کا لفظ خادم، مزدور، غلام سب کے لیے مشترک ہے۔ لہٰذا یہ لوگ معاشرتی لحاظ سے تمہارے برابر ہی نہیں، بلکہ تمہارے بھائی ہیں۔ آپ نے اِخْوَانُکُمْ کا لفظ پہلے استعمال کر کے اس کی تائید مزید فرما دی۔

۲۔ ایسے خادموں کو کھانے اور پہننے کو وہی کچھ دینا چاہیے جو خود مالک کھاتا اور پہنتا ہے۔ اس سے مزدور کی اُجرت یا تنخواہ کی تعیین پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

۳۔ وَلَاتُکَلِّفُوْهُمْ مِمَّا یَغْلِبُهُمْ۔ اس سے معلوم ہوا کہ خادموں کے آرام اور آسائش کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ اور اگر کوئی کام ان کی ہمت سے زیادہ ہو تو مالک کو خود اس کام میں اس کا شریک بن جانا چاہیے، تاکہ آقا کی ذہنی برتری کا بھی علاج ہو جائے۔

ایک دفعہ ایک غلام روتا چلاتا آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: ''میں ایک غلام ہوں، میرے مالک نے مجھے ایک لونڈی کا بوسہ لینے کی پاداش میں خصی کر دیا ہے۔'' آپ ﷺ نے مالک کو بلایا، لیکن وہ حاضر نہ ہوا۔ اس پر آپ ﷺ نے یک طرفہ فیصلہ دے دیا، اور فرمایا: ''اِذْهَبْ اَنْتَ حُرٌّ'' (جا تو آزاد ہے) وہ کہنے لگا: ''اگر میرے مالک نے مجھے پکڑ کر دوبارہ غلام بنالیا تو پھر میری مدد کون کرے گا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ'' [1] (یعنی ہر مسلمان پر تمہاری مدد کرنا فرض ہے) گویا مسلم معاشرہ یا حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ تمہاری مدد کرے۔

بعد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں یہ دستور چل نکلا کہ اگر کوئی شخص اپنے غلام کو مارتا پیٹتا تو دوسرا صحابی

---

[1] ابن ماجہ۔ کتاب الدیات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسے برملا کہہ دیتا کہ اب اسے آزاد کرو۔ چنانچہ دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں اس طور پر بھی غلاموں کی ایک کثیر تعداد کو آزادی ملی۔

(د) رشتہ داروں کے حقوق:

رشتہ دار دو طرح کے ہیں: ایک قریبی یا خون کے رشتہ دار، دوسرے دُور کے رشتہ دار جن سے خونی تعلق نہیں ہوتا۔ ان دونوں سے حسن سلوک کی تاکید تو ایک جیسی ہے، البتہ قریبی رشتہ داروں کا حق یہ ہے کہ ان سے بہر طور تعلقات استوار اور خوشگوار رکھے جائیں۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر اس کی تاکید آئی ہے، جب کہ ہمارے ہاں اکثر سننے میں آتا ہے کہ ''اپنوں سے تو بیگانے ہی اچھے ہوتے ہیں۔'' ان لوگوں کا یہ قول شریعتِ اسلامیہ کے مزاج کے سراسر خلاف ہے۔ اس سلسلہ میں چند ارشاداتِ نبوی ملاحظہ ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

۱۔ کسی شخص کا یہ کمال نہیں کہ وہ حسن سلوک کا جواب حسن سلوک سے دے۔ بلکہ اس کا کمال یہ ہے کہ اس کے رشتہ دار اس سے بدسلوکی کریں تو بھی وہ ان سے حسن سلوک سے پیش آئے۔ ❶

۲۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے مجھے وصیت فرمائی کہ: ''رشتہ داروں کے حقوق پوری طرح ادا کرو۔ اگرچہ وہ تم سے بدسلوکی سے پیش آئیں۔'' ❷

۳۔ جو شخص عام غریبوں کو صدقہ کرے گا اسے ایک اجر ملے گا، لیکن جو اپنے قرابتداروں کی امداد کرے گا اسے دوہرا اجر ملے گا۔ ❸

۴۔ جو شخص صلہ رحمی کا حق ادا نہیں کرتا، وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ ❹

۵۔ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں فراخی ہو اور اس کی عمر دراز ہو، اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔ ❺

(ہ) ہمسایوں کے حقوق:

ہمسائے تین طرح کے ہوتے ہیں (۱) رشتہ دار ہمسائے، (۲) رفیق ہمسائے، (۳) اجنبی

---

❶ بخاری۔ کتاب الادب۔ باب لیس الواصل بالمکافی

❷ ایضاً ❸ ایضاً

❹ بخاری، کتاب الادب۔ باب اثم القاطع

❺ بخاری۔ کتاب الادب۔ باب اثم القاطع، مسلم۔ کتاب البر والصلۃ۔ باب صلۃ الرحم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہمسائے۔اسی ترتیب سے ان کے حقوق کا خیال رکھنا چاہیے۔ہمسایوں کے حق کے متعلق آپ ﷺ نے ایک بار یوں ارشاد فرمایا:

(مازال جبریل یوصینی بالجار حتیٰ ظننت انّہ، سیورّثہ) (بخاری۔کتاب الادب۔باب الوصیۃ بالجار)

''جبریلِ امین علیہ السلام مجھے ہمسایہ کے متعلق تاکید کرتے ہی گئے، تاآنکہ میں یہ خیال کرنے لگا کہ وہ ہمسایہ کو وراثت میں حق دار بنادیں گے۔''

ایک بار آپ ﷺ نے یوں فرمایا:

''وہ شخص مومن نہیں جو خود تو پیٹ بھر کر کھائے، اور اس کا ہمسایہ اس کے پہلو میں بھوکا ہو۔'' ❶

نیز فرمایا: ''وہ شخص مومن نہیں جس کا ہمسایہ اس کی شرارتوں سے امن میں نہ ہو۔'' ❷

اور ایک دفعہ یوں فرمایا: ''اگر تیرے ہمسائے تجھے اچھا آدمی سمجھتے ہیں تو تُو واقعی اچھا ہے۔اور اگر بُرا سمجھتے ہیں تو تُو واقعی بُرا آدمی ہے۔'' ❸

ایک مرتبہ آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ فلاں عورت خوب نمازیں اور نوافل پڑھتی، روزے رکھتی اور خیرات کرتی ہے۔مگر اس کے ہمسائے اس کی بدزبانی سے عاجز ہیں۔آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ جہنمی ہے۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ فلاں عورت میں یہ خوبیاں تو نہیں، وہ صرف فرائض ہی بجالاتی ہے، مگر پڑوسیوں کو تکلیف نہیں دیتی۔آپ ﷺ نے فرمایا ''وہ جنتی ہے۔'' ❹

(و) عام معاشرہ کے حقوق:

معاشرہ میں اُلفت ومحبت کے جذبہ کو فروغ دینے کے لیے قرآن مجید میں بھی بہت کچھ مذکور ہے۔ مگر ہم یہاں بغرض اختصار صرف رسول اللہ ﷺ کے چند ارشادات نقل کرتے ہیں۔آپ ﷺ نے فرمایا:

ا۔ ''تمام مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں۔ جب جسم کا ایک عضو تکلیف میں ہوتا ہے تو سارا جسم کرب واضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔'' ❺

---

❶ شعب الایمان للبیہقی

❷ بخاری۔کتاب الادب۔باب اثم من لایأمن جارہ

❸ ترمذی۔ابواب البر والصلۃ۔باب فی حق الجوار

❹ مشکوٰۃ۔کتاب الآداب۔باب البر والشفقۃ علی الخلق،فصلِ ثالث

❺ بخاری،کتاب الادب،باب رحمۃ الناس والبھائم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ ''مسلمان ایک عمارت کی طرح ہیں، جس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے۔'' ❶

۳۔ ''دین خیر خواہی کا نام ہے۔'' آپ ﷺ سے پوچھا گیا: ''کس سے خیر خواہی؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ سے، اس کے رسول ﷺ سے اور تمام مومنوں سے خیر خواہی۔'' ❷

۴۔ ''کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوتا، جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔ ❸

۵۔ ''جو شخص دوسروں پر رحم نہیں کرتا، اللہ بھی اس پر رحم نہیں کرتا۔ ❹

۶۔ ''مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان کو تکلیف نہ پہنچے۔'' ❺

۷۔ ''مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ تعلقات منقطع رکھے۔'' ❻

۸۔ ''ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو السلام علیکم کہے، خواہ اس سے پہچان ہو یا نہ ہو۔'' ❼

۹۔ ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے جو اس پر نہ ظلم کرتا ہے، نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے۔'' ❽

۱۰۔ ''جو شخص اپنے بھائی کی حاجت روائی میں لگا ہوتا ہے۔ اللہ اس کی حاجت روائی میں لگا ہوتا ہے۔'' ❾

۱۱۔ ''بدگمانی سے بچو، کیوں کہ بدگمانی بڑا جھوٹ ہے۔ کسی کی باتوں پر کان مت لگاؤ، اور نہ ہی کسی کی ٹوہ میں رہو۔ دنیا کے لیے ریس نہ کرو، اور نہ ایک دوسرے سے حسد کرو، نہ دشمنی رکھو اور بھائی بھائی بن کر اللہ کے بندے بن جاؤ۔'' ❿

۱۲۔ ''چغل خور جنت میں داخل نہ ہوگا۔'' ⓫

۱۳۔ ''جو شخص دنیا میں کسی بندے کا عیب چھپائے گا، قیامت کے دن اللہ اس کا عیب چھپائے گا۔'' ⓬

---

❶ بخاری، کتاب الادب، باب تعاون المسلمین ❷ مسلم، کتاب الایمان، باب الدین النصیحۃ....

❸ بخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ

❹ بخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الناس و البھائم

❺ بخاری، کتاب الایمان۔ باب المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ

❻ بخاری، کتاب الادب۔ باب ما ینھی عن التحاسد

❼ بخاری، کتاب الاستیذان، باب افشاء السلام

❽ بخاری، کتاب الاکراہ، باب یمین الرجل لصاحبہ ❾ ایضاً

❿ مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم الظن...... ⓫ ایضاً

⓬ مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم الغیبۃ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۴۔غیر مسلموں کے حقوق:

مملکت اسلامیہ میں غیر مسلموں کو بھی وہی قانونی حقوق حاصل ہیں، جیسے مسلمانوں کو ہوتے ہیں۔اگر کوئی مسلمان غیر مسلم کو قتل کر ڈالتا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فوراً اس کے بدلے مسلمان کو قتل کرا دیتے تھے۔مال اور جائیداد کے متعلق ان کے حقوق کی حفاظت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ جس قدر زمینیں ان کے قبضہ میں تھیں، فتح کے بعد بھی انہی کے قبضہ میں بحال رہنے دی گئیں۔ملکی انتظامات میں بھی ان سے مشورہ لیا جاتا تھا۔آپ رضی اللہ عنہ کے دور میں قاعدہ یہ تھا کہ جو مسلمان اپاہج یا ضعیف ہو جاتا تو بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر ہو جاتا تھا۔چنانچہ ایسی ہی مراعات ذمیوں کو بھی حاصل تھیں۔مذہبی عبادات و رسوم کی ادائیگی میں بھی انہیں پوری آزادی حاصل تھی۔ [1] وہ علانیہ ناقوس بجاتے اور صلیب نکالتے تھے۔ اور اگر کوئی مسلمان ان سے سخت کلامی سے پیش آتا تو وہ سزا کا مستوجب ہوتا تھا۔

ماحاصل یہ ہے کہ سوائے کلیدی اسامیوں پر فائز ہونے کے ان لوگوں کو وہ تمام قانونی مراعات حاصل تھیں، جو مسلمانوں کو حاصل تھیں۔یہی وجہ تھی کہ غیر مسلموں نے اپنی ہم مذہب سلطنتوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ساتھ دیا۔یہ غیر مسلم ہی تھے جو مسلمانوں کے لیے رسد بہم پہنچاتے، لشکر گاہ میں مینا بازار لگاتے، اپنے اہتمام سے سڑک اور پل تیار کراتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جاسوسی اور خبر رسانی کے فرائض بھی سرانجام دیتے تھے۔

نوٹ: زیر نظر مضمون قومی سیرت کانفرنس ۱۴۱۲ھ کے لیے لکھا گیا۔

---

[1] ماخوذ از الفاروق، شبلی نعمانی، زیر عنوان ''ذمیوں کے حقوق''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقالہ:۴

اسلامی معیشت اور سُود [1]

اسلام نے انسان کی معاشی فلاح کے لیے جو نظام پیش کیا ہے وہ اتنا مکمل اور جامع ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ بھی اس کی ہدایات سے خالی نہیں ہے۔ انسان زندگی کی بقاء اور دنیاوی آرام کے لیے کماتا ہے، اس سلسلہ میں معاشرہ کے جو فرائض اس پر عائد ہوتے ہیں اسلام اس میں مکمل رہنمائی کرتا ہے۔ ذیلی تقسیم کو اگر درخور اعتناء نہ سمجھا جائے تو اس وقت پوری دنیا میں تین قسم کے نظام ہائے معیشت رائج ہیں۔ ایک سرمایہ دارانہ نظام، دوسرا کمیونزم اور تیسرا اسلام کا فلاحی نظام۔ جہاں تک کمیونزم کا تعلق ہے۔ وہ اپنا دم توڑ چکا ہے اور خود اس نظام کا داعی روس اس کی ناکامی کو تسلیم کر چکا ہے اور اس میدان میں پٹ چکا ہے۔ لہٰذا یہ ہماری بحث سے خارج ہے۔ رہا سرمایہ دارانہ نظام، تو یہی نظام معیشت سب سے پُرانا ہے اور آج بھی دنیا کے بیشتر ممالک میں اور اسی طرح پاکستان میں بھی رائج ہے۔ اور تاہنوز تجربات کے دور سے گزر رہا ہے۔ لیکن اسے فلاحی نظام کہنے والے اور اس کے داعی اس سے کوئی فلاح حاصل نہیں کر سکے بلکہ ان کے مسائل میں اتنا اضافہ ہو چکا ہے کہ وہ ناقابل حل ہیں۔

سرمایہ داری نظام کے دو دائرے (پہیے) ہیں جن پر یہ گھومتا ہے۔ ایک سود، دوسرا ٹیکس۔ ان دو پہیوں کے، یا ان میں سے کسی ایک کے بغیر سرمایہ دارانہ نظام کے چلنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دو پہیوں پر چلتے ہوئے وہ جن لوگوں کو وسائل زندگی مہیا کرتا ہے، ان میں سے کچھ لوگ دوسروں کا استحصال تو نہیں کر رہے؟ اگر ایک طبقہ استحصال کر رہا ہو اور خوشحال بنتا جا رہا ہو اور دوسرے طبقہ کا استحصال ہو رہا ہو اور وہ کمزور سے کمزور تر ہو رہا ہو تو ایسا نظام فلاحی نہیں کہلا سکتا بلکہ بلاشبہ استحصالی نظام ہے۔

سود کی زد ہمیشہ کمزور طبقہ پر پڑتی ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی کو شک کی گنجائش نہیں۔ رہا ٹیکس تو اگر چہ سود کی زد ہمیشہ کمزور طبقہ پر پڑتی ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی کو شک کی گنجائش نہیں۔ رہا ٹیکس تو اگرچہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ امراء سے وصول کیا جاتا ہے لیکن اگر

[1] یہ مضمون سہ ماہی مجلّہ ''منہاج'' جنوری۔ اپریل ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ٹیکس کے پورے نظام کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ٹیکسوں کا بار بھی بالآخر اور زیادہ تر غریب طبقہ پر ہی پڑتا ہے۔ ٹیکس اس وقت ہمارے زیر بحث نہیں۔ البتہ اس کی حقیقت میں کسی دوسرے مضمون میں پوری شرح وبسط سے پیش کر چکا ہوں۔

سرمایہ دارانہ نظام میں سود، جو اس نظام کا پہلا پہیہ ہے، ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہی سود معاشرے کے اندر بدترین خرابیاں پیدا کرتا ہے۔ سود لینے والا، سُود دینے والے پر کبھی رحم نہیں کھاتا، وہ اس کی مالی پوزیشن کو کبھی مدنظر نہیں رکھتا وہ اس کی استطاعت کو کبھی نہیں دیکھتا، اگر اسے کچھ غرض ہوتی ہے تو صرف یہ کہ اس نے جو روپیہ سُود پر قرض دیا ہے اس پر اُسے زیادہ سے زیادہ نفع وصول ہو۔ کوئی دیوالیہ ہو یا تباہ ہو، کسی کی عزت نیلام ہو، کوئی کوڑی کوڑی کا محتاج ہو، اس کو کسی پر رحم نہیں آتا۔ اس کا دل پتھر کی مانند سخت ہوتا ہے۔ وہ اصل زر میں تو تاخیر برداشت کرسکتا ہے مگر سُود پر نہیں کرسکتا۔ وہ ایک مدت ختم ہونے کے بعد دوسری مدت پر اصل زر جمع سُود پر پھر سُود وصول کرتا ہے۔ یہاں تک کہ خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیتا ہے۔

یہ وہ استحصالی نظام ہے جس میں امیر تو امیر تر ہوتا جاتا ہے اور غریب، غریب تر۔ ایک طبقے کے پاس دولت کے انبار جمع ہو جاتے ہیں اور دوسرا محتاج تر ہوتا جاتا ہے۔ ایک طبقہ محنت کیے بغیر دولت سمیٹتا جاتا ہے، دوسرا سخت محنت کے باوجود اپنی محتاجی سے نکل نہیں سکتا۔ سرمایہ دار کو اس کے سرمایہ پر کبھی نقصان نہیں ہوگا۔ اس کا سرمایہ بڑھتا رہے گا اور اس کے نقصان کا کوئی احتمال نہیں ہے۔ سُودی قرضے لینے والے چاہے افراد ہوں یا حکومت دونوں استحصال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سود پر قرض دینے والے ملک امیر سے امیر تر ہوتے جاتے ہیں اور سود پر قرض لینے والے غریب سے غریب تر۔ آج کے دور میں سب سے بڑا سرمایہ دار اور سُود خور اور نظام سرمایہ داری کا علمبردار ملک امریکہ ہے۔ جس نے بے شمار ممالک کو سُود پر قرض دے رکھا ہے۔ جن میں سے ایک پاکستان بھی ہے۔

سُود کی حرمت میں تدریج:

جس دَور میں رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے، اس دور میں عرب اور اس کے گرد کے ممالک میں سُود ایسے ہی رائج تھا جیسے موجودہ زمانہ میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ شراب اور سُود عربوں کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے اور ان دونوں معاشرتی برائیوں کا بتدریج استیصال کیا گیا۔ پہلے ذہنی طور پر مسلمانوں کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھوڑنے پر آمادہ کیا گیا۔ اور بالآخر ان کی حرمت کے احکام نازل ہوئے۔ سود سے متعلق جو پہلی آیت نازل ہوئی، وہ درج ذیل ہے:

﴿وَ مَآ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ رِّبًا لِّیَرۡبُوَا۠ فِیۡۤ اَمۡوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرۡبُوۡا عِنۡدَ اللّٰہِ ۚ وَ مَاۤ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ زَکٰوۃٍ تُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُضۡعِفُوۡنَ﴾ (الروم:۳۹)

''اور جو رقم تم سُود پر دیتے ہو کہ وہ لوگوں کے مال و دولت سے بڑھیں تو یہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتیں۔ اور جو زکوٰۃ (وصدقات وغیرہ) اللہ کی خوشنودی کے لیے دیتے ہو۔ تو ایسے ہی لوگ ہیں جن کے کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔''

یہ سورۂ روم کی آیت ہے جو مکی دور میں نازل ہوئی تھی، جس وقت اسلام اور مسلمانوں پر مصائب و افلاس کے پہاڑ ٹوٹے پڑے تھے اور اسلامی ریاست کے قیام کا تصور بھی معدوم تھا۔ سُود کا رواج عام تھا اور زکوٰۃ ابھی تک فرض نہیں [1] ہوئی تھی۔

اس آیت میں سُود اور زکوٰۃ کا فرق اور ان کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے کہ سُود پر دی ہوئی رقم جو بظاہر تمہیں بڑھتی نظر آتی ہے وہ بالآخر معاشرہ کی تباہی پر منتج ہوگی جسے اللہ خوب جانتا ہے اور جو تم صدقات زکوٰۃ یا قرض حسنہ اللہ کی خوشنودی کی خاطر ایثار کے جذبہ سے دیتے ہو یہی چیز بالآخر بارآور ثابت ہوگی۔ گویا اس آیت سے زمین تیار کرنا، سُود سے نفرت دلانا اور صدقات وخیرات کی دلانا مقصود تھا۔ اس کے بعد سورۂ آل عمران کی مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔ یہ مدنی دَور کا آغاز ہے جبکہ اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آچکا تھا۔

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡکُلُوا الرِّبٰۤوا اَضۡعَافًا مُّضٰعَفَۃً ۪ وَّ اتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ﴾ (آل عمران:۱۳۰)

''اے ایمان والو! سُود مت کھاؤ جو بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

اس آیت میں مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا کہ سُود گناہ سے تعلق رکھتا ہے لہٰذا اس سے بچو اور اگر ایسا نہ کروگے تو شاید تمہاری نجات ہی نہ ہو۔

اس دَور میں مدینہ اور خیبر کے یہود بکثرت سُودی کاروبار کرتے تھے۔ اور مسلمانوں میں سے سُود پر

[1] زکوٰۃ مدنی دَور میں ۲ھ میں فرض ہوئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرض لینے والے تو بہت تھے لیکن سود پر دینے والے کم ہی تھے۔ گویا مسلمانوں میں سُودی لین دین کا سلسلہ جاری تھا۔ انہیں آئندہ محتاط رہنے کا حکم دیا گیا۔ تاہم سابقہ سُودی معاملات و معاہدات ابھی باقی تھے۔

مدینہ میں یہود بالخصوص ان کے قبیلہ بنوقینقاع کا ذریعہ معاش یہی سُود تھا اور یہودیوں میں سے یہی لوگ زیادہ مالدار تھے۔ یہود کی حرام خوری کا ذکر قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ سود ان پر بھی حرام تھا۔ تاہم ان میں بھی ماہرین معاشیات اور دانشوروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو معاشرہ سے سود کے اخراج کو ناقابل عمل قرار دیتا تھا۔ ان لوگوں کی دلیل یہ تھی۔ سرمایہ کے عامل پیداوار ہونے کی حیثیت سے سُود اور بیع میں کوئی فرق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ	''جو لوگ سُود کھاتے ہیں ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے
اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ	جیسے کوئی آسیب زدہ ہو اور مخبوط الحواس ہو گیا ہو۔ یہ
الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ	اس لیے جو وہ یہ کہتے ہیں کہ بیع بھی تو سُود ہی کی
قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَ اَحَلَّ	طرح ہے حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے
اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ	اور سود کو حرام۔ تو جس شخص تک اللہ تعالیٰ کی نصیحت
مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰی فَلَهٗ مَا	پہنچ گئی اور وہ سُود سے باز آ گیا تو جو پہلے ہو چکا وہ
سَلَفَ وَ اَمْرُهٗٓ اِلَی اللّٰهِ وَ مَنْ عَادَ	اس کا۔ اور اس کا معاملہ اللہ کے ذمہ ہے اور جو شخص
فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا	پھر بھی سُود لے تو یہی لوگ دوزخی ہیں جو اس میں
خٰلِدُوْنَ﴾ (البقرہ:۲۷۵)	ہمیشہ رہیں گے۔

جو لوگ سود کو عقلی دلائل سے معاشرہ کے لیے ضروری ثابت کرنا چاہتے ہیں اور سود اور بیع کو ایک مقام پر لے آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی مثال اس پاگل سے دی ہے جسے سُود کے لالچ نے عقل و فکر اور اخلاقِ فاضلہ سے عاری بنا دیا ہو۔ ایسے لوگ اگر کوئی دلیل سوچ سکتے ہیں تو محض اپنے فائدے کی مگر معاشرہ پر اس کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان سے وہ بالکل اندھے ہو جاتے ہیں۔ جو شخص پاگلوں کی سی باتیں کرتا۔ عرب اس کے متعلق کہتے کہ اسے کوئی شیطان یا جن (یا آسیب) چھو گیا ہے۔ قرآن کریم نے ایسے لوگوں کے لیے یہی محاورہ استعمال کیا ہے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس سے پہلے مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض ہو چکی تھی۔ صدقات، خیرات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مستحقین کے حقوق اور قرض حسنہ کے متعلق احکام بہت پہلے نازل ہونا شروع ہو چکے تھے۔ بالفاظ دیگر شخصی حاجات کے متبادل راستہ کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ اس آیت کے سیاق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تجارتی قرضوں کے سُود سے متعلق ہے جسے آج کی زبان میں کمرشل انٹرسٹ کہا جاتا ہے۔

بعدازاں آخری مرحلہ کا وقت بھی آ گیا اور سُود کو کلیتاً حرام قرار دیا گیا اور اس لعنت کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا پورا طریق کار سمجھا دیا گیا: ارشاد باری ہے:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ○ وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرہ:۲۷۸تا۲۸۰)

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈر جاؤ اور سُود کے بقایا جات چھوڑ دو اگر تم فی الواقع مومن ہو۔ اور اگر ایسا نہ کرو گے تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اور اگر تم باز آ جاؤ تو تم اپنے راس المال کے حقدار ہو۔ نہ تم ظلم کرو اور نہ ہی تم پر ظلم ہو۔ اور اگر مقروض تنگ دست ہے تو اسے اس کی گنجائش تک مہلت دو۔ اور اگر معاف ہی کر دو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اگر تم سمجھو۔“

ان آیات میں سُود کے مکمل خاتمہ کے بعد پیدا ہونے والے مسائل کا حل بتایا گیا ہے جو درج ذیل نکات پر مشتمل ہے:

۱۔ سُود کے بقایا جات کو فوری طور پر چھوڑنا ہوگا۔ یہ مقروض سے ہمدردی ضروری ہے لیکن قرض خواہ کے ساتھ ظلم نہیں ہے۔ اس کے پاس یہ رقم ضرورت سے زائد تھی۔ اگر اس فاضل رقم کو اس کے کسی ضرورت مند بھائی نے کچھ عرصہ کے لیے استعمال کر لیا تو چنداں مضائقہ نہیں لہٰذا اسے اصل رقم سے زائد (سُود) لینے کی ہوس ترک کر دینا چاہیے۔

۲۔ قرض خواہ کو اصل رقم واپس ملنا چاہیے۔ عدل و انصاف کا یہی تقاضا ہے۔ مقروض کا یہ کوئی حق نہیں کہ اصل رقم ہی دبا بیٹھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۔ اگر مقروض اصل رقم بھی ادا کرنے کے قابل نہیں تو اسے تنگ اور مجبور نہ کیا جائے۔ بلکہ اسے اس کی گنجائش تک مہلت دی جائے۔

۴۔ اور اگر تنگ دست مقروض کو یہ قرض معاف کر دیا جائے تو یہ بات تمہارے لیے اجر وثواب کے لحاظ سے بھی بہتر ہے اور اس لحاظ سے بھی کہ آپس میں جذبۂ اخوت اور ہمدردی بڑھے گا۔ سُود خور اور مقروض کے درمیان نفرت کی جو دیوار حائل ہوتی ہے وہ گر جائے گی اور اس کی بھلائی میں تمہاری اپنی بھلائی بھی مضمر ہے۔

یہ آیات رسول اللہ ﷺ کی وفات سے صرف چار ماہ قبل نازل ہوئیں۔ گویا سُود کی قطعی حرمت آپ کی زندگی کے آخری دور میں نازل ہوئی اسی بات سے عرب میں سُود کی ہمہ گیریت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

انہی دنوں آپ حج کے لیے تشریف لے گئے جو حجۃ الوداع کے نام سے موسوم ہے اور اس دوران آپ نے جو نہایت اہم امور پر مشتمل اور بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا اسے خطبہ الوداع کہا جاتا ہے۔ یہ خطبہ تمام دنیا کے لیے ایک بنیادی منشور کی حیثیت رکھتا ہے۔ جسے آپ نے تقریباً ڈیڑھ لاکھ کے مسلمانوں کے عظیم اجتماع میں ارشاد فرمایا اور جس کی تشہیر کے لیے تمام مسلمانوں کو تاکید کی گئی۔ کیونکہ یہ خطبہ ایک حیثیت سے آپ کا وصیت نامہ تھا۔ اس کی ایک شق یہ بھی تھی۔

(وَرِبَا الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعٌ كُلُّهُ، وَاَوَّلُ رِبًا اَضَعُ رِبَا عَبَّاسِ ابْنِ عبدالْمُطَّلِبِ فَاِنَّهُ مَوْضُوْعٌ كُلُّهُ) (مسلم کتاب الحج۔ باب حجۃ النبی ﷺ)	''اور دورِ جاہلیت کے تمام سُود موقوف کیے جاتے ہیں۔ اور سب سے پہلے میں (اپنے چچا) عباس بن عبدالمطلب کے جملہ سودی بقایاجات موقوف کرتا ہوں۔''

آپ نے یہ اعلان ایک سربراہِ مملکت کی حیثیت سے فرمایا۔ لہٰذا یہ ایک آرڈیننس کی حیثیت رکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کا آغاز آپ ﷺ نے اپنے گھر سے کیا۔ آپ کے چچا عباس بن عبدالمطلب وسیع پیمانہ پر شخصی اور تجارتی قرضے دیا کرتے تھے۔ اس آرڈیننس کے تحت ان کے علاوہ باقی لوگوں کی سُودی رقمیں بھی ازخود منسوخ قرار پاگئیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سُود کے متعلق ارشاداتِ نبوی ﷺ

قرآن کریم کی ان آیات کے نزول کے دوران رسول اللہ ﷺ بھی مسلمانوں کی ذہنی تربیت فرما رہے تھے۔ سُود سے شدید نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

(عن جابرٍ قال: لعن رسول الله ﷺ اکل الرّبوا و موکله و کاتبه و شاهدیه و قال هم فیه سواء) (مسلم۔ کتاب المساقات والمزارعت۔ باب الربا)

''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے سُود لینے والے پر، تحریر کرنے پر اور دونوں گواہوں پر لعنت کی ہے اور فرمایا کہ سب گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔''

گویا شراب کی طرح سُود بھی تمام متعلقہ افراد کو اپنی حرمت کی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور ان سب کو برابر کا مجرم قرار دیتا ہے۔ اس حدیث کی رو سے سُودی کاروبار کرنے والے اداروں کے عملہ کی کمائی حرام قرار پاتی ہے۔ جن میں سے کچھ افراد کی حیثیت تو کاتب یا لکھنے والے کی ہوتی ہے اور باقی افراد کی حیثیت گواہوں کی ہوتی ہے۔ یہ ادارے خواہ بنک ہوں، قومی بچت کے مراکز ہوں، بیمہ کمپنیاں ہوں، سرکاری ہوں، نیم سرکاری ہوں یا نجی ہوں اور خواہ لوگ انفرادی طور پر سودی لین دین کرتے ہوں ان سب کا یہی حکم ہے۔

اب اس جرم کا اندازہ بھی رسول اللہ ﷺ کی زبانی سنیے۔ حضرت عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(دِرْهَمُ رِبًا يَأْكُلُ الرَّجلُ وَهُوَ يَعْلَمُ اَشَدَّ مِنْ سِتَّةٍ وَثَلٰثِيْنَ زِنْيَةً) (مسند احمد۔ دارمی بحوالہ مشکوٰۃ۔ کتاب البیوع۔ باب الربا۔ فصل ثالث)

''جو شخص سود کا ایک درہم کھاتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ یہ درہم سُود کا ہے تو اس کا گناہ چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ سخت ہے۔''

اور ایک دفعہ یوں فرمایا: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ جُزْءًا، اَيْسَرُهَا اَنْ يَّنْكِحَ الرَّجُلُ اُمَّهٗ) (ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب البیوع۔ باب الربا۔ فصل ثالث)

''سُود کے ستر حصے ہیں۔ ان میں سب سے کمتر حصہ ایسا ہے۔ جیسے کوئی شخص اپنی ماں سے زنا کرے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حرمت سُود میں شدت کی وجوہ

یہاں ایک سوال از خود ذہن میں اُبھرتا ہے۔ جو یہ ہے کہ شرعی نقطہ نظر سے کئی گناہ ایسے ہیں جو سُود سے بُرے ہیں۔ مثلاً شرک، قتلِ ناحق، زنا، چوری، ڈاکہ وغیرہ۔ شرک ایسا گناہ ہے جو اکبر الکبائر ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں متعدد مقامات پر یہ صراحت آئی ہے کہ مشرک کی کبھی نجات نہ ہوگی باقی جرائم ایسے ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے حدود و قصاص کے احکام نازل فرمائے ہیں لیکن اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی تہدید اللہ تعالیٰ نے صرف سُود کے متعلق سنائی ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے بھی سُود کے متعلق ایسے سخت الفاظ استعمال فرمائے ہیں جو اور کسی گناہ کے متعلق استعمال نہیں فرمائے تو آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ سود اسلامی تعلیمات کا نقیض اور اس سے براہِ راست متصادم ہے اور اس کا حملہ بالخصوص اسلام کے معاشرتی اور معاشی نظام پر ہوتا ہے۔

اسلام کے معاشرتی اور معاشی نظام سے متصادم:

اسلام بھی ایک دوسرے کا بھائی بن کر رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ ہمیں آپس میں مروت، ہمدردی، ایک دوسرے پر رحم اور ایک دوسرے پر ایثار کا سبق سکھلاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے زندگی بھر اخوت و ہمدردی کا سبق دیا۔ اور ایک دوسرے کے جانی دشمن معاشرے کی وحی الٰہی کے تحت اس طرح تربیت کی کہ وہ فی الواقع ایک دوسرے کے بھائی بھائی اور مونس و غم خوار بن گئے۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم احسان شمار کرتے ہوئے اس کا یوں تذکرہ فرمایا کہ:

﴿وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا﴾ (۳:۱۰۳)

”اور اللہ کی اس مہربانی کو یاد کرو۔ جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے کہ اللہ نے تمہیں اس سے بچالیا۔“

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ (۸:۶۳)

''اور (اللہ تعالیٰ نے ہی) ان (صحابہ کرام) کے درمیان الفت پیدا کر دی۔ اگر آپ (اس طریق کار کے علاوہ) دنیا بھر کی دولت بھی خرچ کرتے تو ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے یہ اللہ ہی ہے جس نے ان میں الفت پیدا کی۔ بلاشبہ وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔''

اور یہ چیز رسول اللہ کی زندگی بھر کی محنت وتربیت کا ماحصل تھی۔ جبکہ سُود انسان میں ان صفت سے بالکل متضاد صفات یعنی بخل، حرص، شقاوت قلبی اور لالچ پیدا کر دیتا ہے جو اسلامی روح کی عین ضد ہے۔

دوسرے یہ کہ اسلام کے معاشی نظام کا تمام تر ماحصل یہ ہے کہ دولت گردش میں رہے اور اس گردش کا بہاؤ امیر سے غریب کی طرف ہو۔ اسلام کے نظام زکوٰۃ وصدقات کو اسی لیے فرض قرار دیا گیا ہے۔ اسلام کا قانونِ میراث اور حقوق باہمی بھی اسی بات کی تائید کرتے ہیں جبکہ سودی معاشرہ میں دولت کا بہاؤ غریب سے امیر کی طرف ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی سُود اسلام کے پورے معاشی نظام کی عین ضد ہے۔

غور فرمایئے کہ اس سُود کی زد کہاں تک پہنچ رہی ہے۔ اگر ایک اسلامی معاشرہ سے اس کے معاشرتی اور معاشی نظام کو تبدیل کر دیا جائے تو پھر ہمیں یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ آیا ایسے معاشرہ کو اسلامی کہنا بھی درست ہے یا نہیں؟

سود کے مفاسد:

اب ہم معاشی نقطہ نظر سے سود کے ان نقصانات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جو ماہرین معاشیات نے گنوائے ہیں:

قرضہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ قرضہ جو مفلس اور نادار لوگ اپنی بھوک، علالت اور حوادث کے وقت اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے لیتے ہیں۔ ایسے قرضہ کو معاشیات کی اصطلاح میں ''قرض صرف'' کہا جاتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جو تاجر یا صنعت کار لوگ اپنا کاروبار چلانے کے لیے بنکوں وغیرہ سے لیتے ہیں۔ اسے قرض پیداآور کہتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مہاجنی قرضہ:

قرض صرف یا شخصی قرضہ انسان کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اور ایسے لوگ چونکہ نادار ہوتے ہیں۔ لہٰذا بنک انہیں قرض دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لیے سرمایہ دارانہ نظام میں حکومتیں عموماً ساہوکاروں کو لائسنس عطا کرتی ہیں اور ان کی شرح سُود بھی مقرر کر دی جاتی ہے اور یہ شرح سود بنک کی شرح سُود سے عموماً دو تین گنا زیادہ ہوتی ہے۔ مگر ساہوکار اس مقررہ شرح پر بھی اکتفا نہیں کرتا بلکہ مقروض کی شدت احتیاج سے فائدہ اٹھا کر من مانی شرح وصول کرتا ہے۔ پھر یہ معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ بہت سے غیر لائسنس یافتہ مہاجن بھی چوری چھپے یہ دھندا کرتے اور گراں تر شرح سود وصول کرتے ہیں۔ پس ماندہ ممالک کا تو کیا ذکر بڑے بڑے متمدن ممالک میں بھی یہ کاروبار وسیع پیمانہ پر ہو رہا ہے۔ ہم یہاں سر یکنزی چارس سابق معتمد امور داخلہ انگلینڈ کی اس رپورٹ کا اقتباس پیش کرتے ہیں جو انہوں نے سُود کی خرابیوں کے متعلق ۱۹۲۵ء میں لندن کی منتخبہ کمیٹی کے سامنے پڑھی اور ان شرائط پر روشنی ڈالی جن پر عموماً مزدور طبقہ کو قرض ملتا ہے:

''اصولاً دو ضمانتیں دینا ہوتی ہیں۔ جب ایک تحریری ضمانت ۵ پونڈ کے لیے لکھی جاتی تو $\frac{1}{2}$ ۴ پونڈ اس شرط پر دیے جاتے کہ اگر کوئی قسط رہ گئی تو جملہ قرضہ $\frac{1}{2}$ پنس فی شلنگ فی ہفتہ کی شرح سے واجب الادا ہو جائے گا۔ اس طرح میرے خیال میں ۲۵۰ فیصد سے زائد سود ادا کیا جاتا۔ علاوہ ازیں ساہوکاروں کو جو سود ادا کیا جاتا ہے وہ اکثر ۴۰۰% سے بھی بڑھ جاتا ہے۔

عام طور پر ایک پنس فی شلنگ فی ہفتہ یعنی ۴۳۳% سالانہ کی شرح سے سود وصول کیا جاتا۔ یہودیوں کی ایک سو ساہوکارہ کرنے والی عورتیں اپنے گاہکوں سے اسی شرح سے وصول کرتی ہیں اور ایسے واقعات بھی منظر عام پر آئے ہیں کہ دو پنس یہاں تک کہ تین پنس فی شلنگ فی ہفتہ سُود کی شکل میں وصول کیے گئے ہیں۔

وہ ساہوکار جنہوں نے اپنے آپ کو غریب طبقہ سے مخصوص کر لیا تھا ایک، دو اور تین پنس فی شلنگ فی ہفتہ یعنی بالترتیب ۴۹۳، ۸۶۶ اور ۱۳۰۰% سالانہ کی شرح سے سود وصول کرتے ہیں۔

منتخبہ کمیٹی کی رپورٹ میں متعدد ایسے قرض داروں کی رپورٹیں پیش کی گئیں ہیں جو ہمیشہ کے لیے ساہو کاروں کے پنجہ میں پھنس چکے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض مثالوں کو سچ تصور کرنا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مہاجنی قرضہ کے مہلک اثرات سے تو عموماً ہر شخص واقف ہے اور اس کی تباہیاں اتنی اظہر من الشّمس ہیں کہ خود حامیانِ سُود بھی مقدمہ کی اس شق کی حمایت سے دستبردار ہو گئے ہیں اور اپنی ساری قوت تجارتی سُود کی حمایت پر صرف کر رہے ہیں۔

قرض پیدآور کے مہلک اثرات:

شخصی قرضوں میں تو ایک متعلقہ فرد ہی سُود کے ناخوشگوار اثرات سے متاثر ہوتا ہے جبکہ تجارتی قرضے کی صورت میں پورا معاشرہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ سُود لینے والا (بنک) اور سود دینے والا (تاجر اور صنعت کار وغیرہ) دونوں اپنا اپنا مفاد تو محفوظ کر لیتے ہیں۔ لیکن اس کے تباہ کن اثرات معاشرہ پر چھوڑ جاتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

ا۔ گرانی:

یہ بات تو واضح ہے کہ ایک تاجر یا صنعت کار جو ۱۴% شرح سُود پر سرمایہ حاصل کرے گا، قیمت فروخت طے کرنے سے بیشتر اسے یہ سوچنا ہو گا کہ اسے سُود کی رقم بھی ادا کرنا ہے خود بھی نفع کمانا ہے، پھر اتفاقی حوادث کی بنا پر نقصان کا احتمال بھی موجود ہے تو لامحالہ وہ گراں فروشی کی طرف مائل ہو گا۔ یا ایسے ہتھکنڈے استعمال کرے گا جن کی بنا پر وہ زیادہ سے زیادہ نفع پیدا کر سے۔ وہ جو کچھ بھی کرے گا اس کا نتیجہ غریب عوام کو بھگتنا ہو گا۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک صنعت کار بنک سے ۱۴% شرح پر قرضہ لے کر ایک ٹیکسٹائل مل لگاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ۱۴% کے زائد اخراجات بھی تیار شدہ مال کی لاگت میں شمار ہوں گے۔ پھر یہ صنعت کار کسی تاجر کے ہاتھ تھوک مال چکاتا ہے۔ تاجر نے خود بھی بنک سے اسی شرح سُود پر قرضہ لیا ہوا ہے۔ وہ بھی یہ ۱۴% زائد رقم قیمت خرید میں شامل کر کے منافع کی گنجائش رکھ کر مال آگے چلا دے گا۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ جس زمیندار نے کپاس منڈی میں فروخت کی تھی، اس نے یا منڈی کے دکاندار نے بھی بنک سے قرضہ لیا ہو تو یہ سب اخراجات اس تیار شدہ کپڑے پر پڑتے جائیں گے اور سُود کا یہ سارا بار بالواسطہ خریدار پر پڑ جائے گا جس نے اپنی شلوار یا قمیض کے لیے کپڑا خریدا ہے۔ دیکھیے اس پورے سلسلہ میں نہ تو بنک نقصان میں رہا، زمیندار، نہ صنعت کار اور نہ تاجران میں کسی پر بھی سود کا کوئی بوجھ نہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہا۔ان سب نے اپنے اپنے فائدہ کی راہ سوچ لی ہے۔مال جتنا مہنگا تیار یا دستیاب ہوگا وہ اپنا منافع اس پر لگا کر اسے آگے چلا دے گا اور بالآخر یہ سارا بار صارفین پر پڑے گا۔گویا اس تمام تر سود کی رقم بالواسطہ عوام کی جیب سے نکلی اور بنک میں چلی گئی بقول علامہ اقبال ؂

سُود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات

آج کل جو کمر توڑ گرانی کا چکر چل رہا ہے۔اس کی ایک بڑی وجہ یہی سُود ہے۔

۲۔تجارتی چکر:

کسی بھی ملک کی معاشی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کاروبار میں اکثر اُتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔کبھی تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ کاروبار خوب ترقی پر ہے۔اشیاء کی قیمتیں چڑھ رہی ہیں اور روزگار بھی عام ہے ایسے دور کو گرم بازی یا خوشحالی کا دور کہا جاتا ہے۔پھر کچھ عرصے کے بعد یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اشیاء کی قیمتیں گر رہی ہیں۔ بازار مندا پڑ جاتا ہے اور بے روزگاری عام ہو جاتی ہے۔ایسے دور کو کساد بازاری یا سرد بازاری یا تجارتی بحران کہا جاتا ہے۔کاروبار میں یہ شکل اکثر رونما ہوتی رہتی ہے جسے معاشیات کی اصطلاح میں تجارتی چکر کہا جاتا ہے۔اس تجارتی چکر کے کئی اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہی 'سوڈ' ہے۔

جب گرم بازاری کا آغاز ہو تو سرمایہ کی طلب بڑھنے لگتی ہے۔جس کے نتیجہ میں شرح سُود بڑھ جاتی ہے۔مگر سُود خوار یا بنک جلد ہی اصل رقم اور سُود کی واپسی کا مطالبہ شروع کر دیتا ہے جبکہ مقروض ادائیگی کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔اور اگر ادا کرے تو اس کا کاروبار گرنا شروع ہو جاتا ہے۔ بنک مزید سرمایہ کی فراہمی میں کمی کر دیتا ہے تو کساد بازاری شروع ہو جاتی ہے جسے طویل بنانے میں زیادتی شرح سُود اور طویل المیعاد سودی معاہدات کو بڑا دخل ہوتا ہے۔

بعض دفعہ 'زیادہ شرح سُود' کا مسئلہ بذاتِ خود کساد بازاری کا موجب بن جاتا ہے۔سرمایہ محض شرح سُود کے بڑھنے کی انتظار میں رُکا رہتا ہے۔حالانکہ اس کے استعمال کے وسائل موجود ہوتے ہیں اور روزگار کے طالب بھی کثرت سے مارے مارے پھرتے ہیں اور یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ سرمایہ دار جتنی شرح سُود لینا چاہتا ہے اتنی اسے مل نہیں رہی ہوتی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۔ کاروباری مزاحمت:

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے کہ جب کسی کاروبار یا صنعت میں لگایا ہوا سرمایہ یا اس کا کچھ حصہ نکال لیا جائے تو بسا اوقات کاروبار کو سخت نقصان پہنچ جاتا ہے۔ لیکن سرمایہ دار کو اپنا ہی مفاد عزیز ہوتا ہے۔ اس تضاد کی وجہ سے ملکی معیشت صحیح طور پر ترقی نہیں کر سکتی۔ اسلام نے اس الجھن کا حل نہایت احسن طریق پر کر دیا ہے وہ سُود اور شرح سُود سب باتوں کو حرام اور لغو قرار دیتا ہے اور اس کے بجائے مضاربت کی راہ دکھلا کر سرمایہ اور محنت کو ایک صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ اور ان دونوں کے مفادات کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیتا ہے۔ جس کا ملکی معیشت پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔

موجودہ بنک جو کارخانہ داروں اور تاجروں کو قرض دیتے ہیں تو ابتدائی عرصے میں ہی جبکہ روپے کی سخت ضرورت ہوتی ہے اور منافع یا تو ہوتا ہی نہیں اور اگر ہو تو بہت کم ہوتا ہے، سُود کی ادائیگی پر صرف اصرار ہی نہیں کرتے۔ بلکہ عملی طور پر وصول بھی کرتے ہیں۔ یہ ادائیگی قرض دینے والوں پر سخت گراں گزرتی ہے اور کاروبار بھی بُری طرح متاثر ہوتا ہے۔

۴۔ قومی مفاد کی عدم توجہ اور اخلاقی بگاڑ:

بہت سے کاروبار ایسے ہوتے ہیں جو معاشرہ کے لیے بہت مفید اور کارآمد ہوتے ہیں۔ لیکن ان سے مقابلتاً کم شرح سُود ملنے کی توقع ہوتی ہے۔ مثلاً آب رسانی کا منصوبہ، جس سے ملک میں کافی غلّہ پیدا ہونے کی توقع ہوتی ہے اور معاشرہ کی خوشحالی میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ دوسری طرف سرمایہ دار کو ایک شراب بنانے والے یا بیچنے والے سے زیادہ شرح سود ملنے کی توقع ہوتی ہے تو سرمایہ دار یا بنک عموماً دوسری قسم میں سرمایہ لگانے کو ترجیح دے گا۔ اسے نہ اس سے غرض ہے کہ ملک خوشحال ہو اور نہ اس سے کہ شراب کے کاروبار میں سرمایہ لگانے سے معاشرہ میں کتنا بگاڑ پیدا ہوگا۔ اسے اگر غرض ہوتی ہے تو صرف اس سے کہ سود کہاں سے زیادہ مل سکتا ہے؟

۵۔ طبقاتی تقسیم اور باہمی منافرت:

بنک لوگوں کی دولت پر بڑے شریفانہ انداز میں ڈاکہ ڈالتے ہیں اور یہ کام بنک اور تاجر یا صنعت کار کی ملی بھگت سے ہوتا ہے۔ کیونکہ فریقین اپنا اپنا فائدہ سوچ لیتے ہیں۔ گویا یہ بنکاری نظام جو بظاہر بڑا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معصوم سا نظر آتا ہے، لوگوں کے استحصال کا بڑا مہلک ذریعہ ثابت ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں امیر طبقہ تو امیر تر اور غریب پہلے سے بھی غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح طبقاتی تقسیم بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اور جب یہ تقسیم بڑھتی ہے تو محض دولت کی ناہموار تقسیم میں ہی اضافہ نہیں ہوتا بلکہ امیر و غریب کے درمیان نفرت کا جذبہ بھی بڑھتا ہے۔ غریب جب یہ دیکھتا ہے کہ اپنی مقدور بھر کوشش کے باوجود وہ اپنے اہل و عیال کی بنیادی ضرورتوں سے بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، دوسری طرف امیر لوگ شاندار کوٹھیوں اور بنگلوں میں رہتے ہیں اور ان کے سامنے بیش قیمت کاروں میں گھومتے نظر آتے ہیں تو ان کے دل میں امیروں کے خلاف عناد پیدا ہو جاتا ہے۔ آجر اور اجیر کے درمیان اخوت اور ہمدردی کی فضا ختم ہو جانے کے باعث ملک کی معیشت پر گہرا اور دُور رس اثر پڑتا ہے۔ اس صورت حال کی بیشتر ذمہ داری بالواسطہ سودی بنکاری نظام پر پڑتی ہے۔

سرمایہ دار افراد کی تعداد معاشرہ میں ہمیشہ قلیل ہوتی ہے۔ جب یہ لوگ اپنا روپیہ سُود کی راہ پر ڈال دیتے ہیں تو وہ غریبوں کے گھروں میں پہنچ پہنچ کر ان کی دولت سرمایہ دار کی جیب میں پہنچا دیتے ہیں۔ کچھ مدت بعد یہ تماشہ دیکھنے میں آتا ہے کہ عوام بدترین معاشی لاغری میں مبتلا ہیں اور چند گھرانوں میں دولت کے انبار لگ گئے ہیں۔ سرمایہ دار کے پاس اگر دولت کی قوت ہوتی ہے تو ملک کی اکثریت جسمانی قوت رکھتی ہے۔ تنگ آ کر سُود خوروں کی مالی قوت پر جسمانی قوت کا حملہ ہو جاتا ہے۔ امن و امان غارت ہو جاتا ہے۔ غرباء بُھو کے غضبناک بھیڑیئے کی طرح سرمایہ داروں کو پھاڑ دیتے ہیں۔ سلطنتیں تک تباہ ہو جاتی ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سُود اتنی ہی نقصان دہ چیز ہے تو مغربی ممالک میں سُودی معیشتیں کیسے کامیابی سے چل رہی ہیں؟ وہاں یہ طبقاتی اور منافرت جنگ کیوں پیدا نہیں ہوتی تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نقصانات تو بہر حال سود کا لازمی نتیجہ ہیں اور سود چونکہ صرف سرمایہ داری نظام میں پنپ سکتا ہے لہٰذا ردعمل کے طور پر اشتراکی نظام وجود میں آیا جس میں سود کو یکسر ختم کیا گیا اور سرمایہ دار اور جاگیردار پر ضبطی جائداد کے علاوہ ایسے مظالم توڑے گئے۔ جن کے دہرانے سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن اشتراکی نظام بھی چونکہ دوسری انتہا تھی اور انتظامی طور پر وجود میں آیا اور راہِ اعتدال سے ہٹا ہوا تھا۔ لہٰذا ابتدا میں اس کی ناکامی کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے جنہیں جبر و تشدد سے دبانے کی کوششیں کی گئیں مگر تابکے یہ بے خدا، غیر فطری اور محض ڈنڈے کا نظام چل سکتا تھا۔ پون صدی بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ اس نظام کو پوری طرح ناکامی سے دوچار ہونا پڑا اور اب یہ نظام اپنی موت آپ مر چکا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں حکومتیں صرف سرمایہ دار کے حقوق کا تحفظ کرتی ہیں اور اسی غرض سے بنکوں کی سرپرستی بھی کرتی ہیں۔ حکومت، بنک اور سرمایہ دار سب کا مفاد اسی میں ہوتا ہے کہ سود کا سلسلہ قائم و دائم رہے غریب لوگوں کے انتقامانہ جذبات تو ان کی اشک شوئی کے لیے اور اشتراکیت کے مظالم سے عبرت حاصل کرتے ہوئے ان حکومتوں نے چند اقدامات کیے ہیں۔ جو اسلامی نظام معیشت سے ہی مستعار لیے گئے ہیں تاکہ اس نظام کے مفاسد کو کسی حد تک کم کیا جا سکے۔ وہ اقدامات درج ذیل ہیں:

۱۔ خیرات فنڈ (Benovelent Fund) جو سرکاری ملازمین کی تنخواہوں سے تقریباً ایک فیصد کے حساب سے وضع کیا جاتا اور اسے غریبوں پر خرچ کیا جاتا ہے۔

۲۔ طبی سہولت (Social Secuirty Measure) جس کی رُو سے کارخانہ داروں پر لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مزدور ملازموں کو طبی سہولت مفت فراہم کریں۔ ہمارے پاکستان میں بھی ایسی فری ڈسپنسریاں موجود ہیں۔ جو فیکٹری ایریا کے چند مالکان مل کر کسی درمیانی جگہ قائم کر لیتے ہیں۔

۳۔ بیروزگاری الاؤنس (Unemployment Allownce) یعنی وہ الاؤنس جو روزگار مہیا ہونے تک گزر اوقات کے لیے حکومت کی طرف سے دیا جاتا ہے۔

ان اقدامات کے باوجود غریب طبقہ سود کی چکی میں پستا رہتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

بنک انٹرسٹ اور کمرشل انٹرسٹ

سُود کی حرمت، اس حرمت کی شدت اور اس کے نقصانات کے علی الرغم مسلمانوں میں ہی ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو بنک کے سُود کو صرف جائز ہی نہیں سمجھتا بلکہ اس کے لیے کئی طرح کے دلائل بھی پیش کر رہا ہے اور اس میں اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہا ہے۔ یہ مسئلہ چونکہ نہایت اہم ہے، اس لیے ان حضرات کے دلائل کا ذرا تفصیل سے جائزہ لینا چاہتے ہیں:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ربا اور سُود میں فرق:

کہا یہ جاتا ہے کہ ''ربا'' ایسے سود کا نام ہے جو کوئی مقروض اپنی بھوک یا احتیاج دور کرنے کی غرض سے کسی مہاجن یا ساہوکار سے قرض لیتا ہے۔ اور سود خوار اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر بھاری شرح سود پر معاملہ کر کے اس پر ظلم کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایسے ہی شخصی احتیاج کے قرض پر سود کو ''ربا'' کہا جاتا ہے، جسے قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے۔ رہا تجارتی سُود تو عہد نبوی میں ایسے تجارتی قرضوں کا رواج ہی نہ تھا۔ عرب میں طوائف الملوکی، لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں عام ہوتی تھیں۔ وسائل سفر انتہائی محدود تھے لہٰذا تجارت بھی برائے نام ہوتی تھی۔ اور جب تجارت ہی برائے نام ہو تو تجارتی قرضوں اور تجارتی سُود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا نہ ہی اس کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ اندریں حالات دورِ حاضر کے بنک کا سُود اس ربا کی تعریف میں کیونکر آ سکتا ہے، جسے قرآن نے حرام قرار دیا ہے۔

بنک کے سُود کے جواز کے دلائل؟

مہاجنی سُود اور بنک کے سُود میں امتیازی فرق کی وضاحت کے لیے عموماً درج ذیل نکات پیش کیے جاتے ہیں یا بالفاظ دیگر اس کے جواز کے لیے درج ذیل دلائل پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ مہاجنی قرضہ میں مقروض خود مہاجن کے پاس جا کر قرضہ کی درخواست کرتا ہے جبکہ بنک انٹرسٹ کی صورت میں قرض دینے والا خود بنک کے پاس جا کر اپنی رقم پیش کرتا ہے کہ اسے کاروبار میں لگائے اور منافع میں سے اسے بھی کچھ دے دے۔ بنک اس قرض دھندہ کو ایک پہلے سے طے شدہ شرح سود ادا کرتا ہے۔

۲۔ جو تاجر یا صنعت کار بنک سے قرضہ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ بسا اوقات بنک کو خود شرح سود کی پیش کش کرتا ہے۔ مثلاً قرض خواہ کی ساکھ اچھی ہے اور رقم بھی زیادہ لینا چاہتا ہے تو وہ بنک کی مقررہ شرح سے کم شرح کی پیش کش کرے گا کہ اگر بنک کو منظور ہو تو میں قرض لوں گا مثلاً ۱۴% کے بجائے صرف ۱۰% سُود دوں گا۔ اور چونکہ اس کی ساکھ اچھی ہوتی ہے تو بنک اس کی پیش کش کو قبول کر کے اسے کم شرح سُود پر بھی قرض دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح بنک کے لین دین میں کسی فریق کی مجبوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سب کام باہمی رضامندی سے طے پاتے ہیں جو کہ لین دین کی ایک لازمی اور شرعی شرط ہے۔

۳۔ مہاجنی قرضہ میں شرح سُود اتنی بلند ہوتی ہے کہ ایک ضرورت مند مفلس اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جبکہ تجارتی سُود کی صورت میں تجارت میں نقصان کے احتمال کو مدنظر رکھ کر مناسب شرح سُود مقرر کی جاتی ہے جونقصان کی صورت میں بھی قابل برداشت ہوتی ہے۔لہٰذا بنک انٹرسٹ میں مقروض پر کچھ ظلم نہیں ہوتا۔

۴۔ مہاجنی قرضے کی صورت میں مہاجن کو بعض دفعہ سُود تو بجائے خود رہا۔اصل بھی وصول نہیں ہوتا۔ جبکہ بنک انٹرسٹ کی صورت میں بنک اپنے مفادات کا پورا تحفظ کرلیتا ہے۔بنک زیورات،جنس،خام مال یا دیگر اشیاء بطور زرِ رہن رکھ کر اس کا ساٹھ فیصد تک قرضہ دیتا ہے۔اس طرح بنک بھی نقصان سے محفوظ رہتا اور ظلم سے بچ جاتا ہے۔رہے نادار لوگ تو بنک انہیں قرضہ دینے سے یکسر انکار کردیتے ہیں۔

۵۔ مہاجنی قرضہ میں نقصان کا پہلو نفع کی نسبت فی الواقع زیادہ ہوتا ہے۔کیونکہ اس میں ایک نادار شخص پر ظلم ہوتا ہے جبکہ بنک انٹرسٹ کی صورت میں فریقین میں سے ہر ایک کے لیے فائدہ تو یقینی ہوتا ہے اور نقصان کا احتمال بہت کم رہ جاتا ہے۔لہٰذا قرآن کریم کے اس اصول ﴿وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ کے مطابق بھی بنک انٹرسٹ کو اس ''ربا'' سے مستثنیٰ قرار دیا جانا چاہیے جسے حرام قرار دیا گیا ہے۔

اور اس استثناء کی ضرورت یہ بیان کی جاتی ہے کہ موجودہ دور میں تمام تر ملکی اور غیر ملکی تجارت کا انحصار بنک کے سُود پر ہے۔لہٰذا عصرِ حاضر کا تقاضا یہ ہے کہ مندرجہ بالا وجوہات کے پیش نظر ربا کی تعریف میں اجتہاد کر کے مناسب ترمیم کی جانی چاہیے تاکہ اسلام ہر زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے والا دین ثابت ہوسکے۔

حامیانِ سُود کے دلائل کا جائزہ

یہ ہیں وہ دلائل جن کے پیش نظر ''ربا'' کی تعریف میں مناسب ترمیم اور اجتہاد کی سفارش کی جاتی ہے۔اگر غور سے دیکھا جائے تو مذکورہ بالا دلائل میں مندرجہ ذیل تنقیح طلب امور سامنے آتے ہیں:

۱۔ کیا عہد نبوی میں عرب میں تجارت فی الواقع نہایت محدود پیمانہ پر ہوتی تھی؟

۲۔ اس دور میں تجارتی قرضوں یا تجارتی سود کا وجود ثابت ہوتا ہے یا نہیں؟

۳۔ کیا شرح سُود کی کمی یا مناسب شرح سُود،حرمت سُود کو سندِ جواز عطا کرسکتی ہے؟

۴۔ کیا فریقین کی رضامندی سُود کو جائز بناسکتی ہے؟

۵۔ کیا فی الواقع حُرمت سُود کی علت ''ظلم'' ہی ہے؟ اور اگر فریقین میں سے کسی پر ظلم کا احتمال نہ ہو تو کیا سُود کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۶۔ عصرِ حاضر کے تقاضوں کے تحت سُود کی تعریف میں اجتہاد کیا جا سکتا ہے جبکہ اس کا نفع نقصان سے زیادہ ہے؟

اب ہم ان تنقیحات کو علی الترتیب زیرِ بحث لائیں گے۔

ا۔عہدِ نبوی میں تجارت:

عرب ایک بے آب و گیاہ ملک ہے جس کا بہت تھوڑا رقبہ کاشت کے قابل ہے اس پر بھی کم ہی توجہ دی جاتی تھی۔ کیونکہ شرفائے عرب تجارت کو کوئی معزز پیشہ تصور نہیں کرتے تھے۔اسی طرح ہاتھ سے کام کرنے یا دست کاری کے کام کو بھی باعثِ عار سمجھتے تھے۔عرب میں عام لوگوں کا پیشہ تو بھیڑ بکریاں، گائے اور اُونٹ پالنا تھا لیکن شرفائے عرب کا محبوب مشغلہ تجارت ہی تھا۔البتہ یمن میں اُون کاتنے اور چادریں اور کمبل بُننے کا کام بھی ہوتا تھا۔عربوں کو چونکہ فنونِ سپہ گری سے گہری دلچسپی تھی۔لہٰذا کہیں کہیں آلاتِ جنگ بھی تیار کیے جاتے تھے۔

نتیجتاً اہل عرب کو اشیائے خورد و نوش اور دیگر ضروریات کا سامان باہر سے برآمد کرنا پڑتا تھا۔ بلاشبہ ان دنوں لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کا دَور دورہ تھا اور کسی اکے دُکے مسافر کا جان و مال محفوظ نہ تھا۔مگر یہ تجارت عموماً قافلوں کی شکل میں ہوا کرتی تھی۔قریش مکہ کا تو پاسبان حرم ہونے کی وجہ سے بھی احترام کیا جاتا۔دوسرے قافلے یا تو قریش مکہ کے اثر سے فائدہ اٹھاتے یا اپنی حفاظت کا سامان خود ساتھ لے کر چلتے تھے۔غیر ملکی قافلوں کو بحفاظت گزارنے کے عوض ان سے ٹیکس بھی لیا جاتا تھا۔ارشادِ باری ہے:

﴿لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ o اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ o فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ o الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ﴾	’’قریش کو مانوس رکھنے کی وجہ سے کہ وہ سردی میں اور گرمی میں سفر سے مانوس تھے انہیں چاہیے کہ وہ اس گھر کے مالک کی بندگی کریں جس نے انہیں بھوک میں کھانا کھلایا اور خوف سے امن بخشا۔‘‘

(۱۰۶:۱تا۴)

ہوتا یہ تھا کہ مکہ میں ہر طبقہ کے لوگ اپنا فروختنی سامان اس قافلہ کے حوالہ کرتے، جسے وہ اچھے داموں بیچ کر ادھر سے سامان خرید لاتے تھے اس طرح دوہری تجارت سے انہیں دُگنا منافع حاصل ہوتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو بسا اوقات ۵۰% تک پہنچ جاتا تھا۔ اہل مکہ کی خوشحالی کا دارو مدار اس قافلے کی کامیابی پر منحصر ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے خود بھی اپنی بعثت سے پہلے مدینہ، بصرہ اور شام کے متعدد تجارتی سفر کیے تھے۔

یہ قافلے کتنے بڑے ہوتے تھے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابوسفیان کا وہ قافلۂ تجارت، جو جنگ بدر کا پیش خیمہ ثابت ہوا، دو ہزار بار بردار اونٹوں پر مشتمل تھا۔ کئی مؤرخوں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ درآمد برآمد کی کل تجارت ۵۰ لاکھ دینار سالانہ تک ہوتی تھی۔ دینار، سونے کا ایک سکہ ہے جو ۴ ۱/۲ ماشہ کے برابر ہے۔ ❶ گویا محتاط اندازہ کے مطابق اگر اس وقت کے دینار کی قیمت آج کل کی پاکستانی کرنسی کے مطابق ۱۲۰۰ روپے تصور کر لی جائے تو گویا یہ تجارت ۶ ارب روپے سالانہ تک جا پہنچتی تھی۔

پھر یہ تجارتی قافلے قریش مکہ تک ہی محدود نہ تھے۔ یمنی تاجر مکہ اور مدینہ کے راستے شام تک جاتے تھے۔ مدینہ کے یہودی، جو ایک سرمایہ دار قوم تھی، شام سے گندم اور شراب درآمد کرتے تھے۔ علاوہ ازیں غیر ملکی تاجروں کی آمد و رفت بھی رہتی تھی۔ ملک میں کئی جگہ بازار اور منڈیاں لگتیں۔

جہاں لوگ خرید و فروخت کے لیے جمع ہوتے تھے۔ سوداگروں کے قافلے ایران اور عراق سے تجارتی سامان لے کر آتے اور یہاں کی اشیاء اپنے ممالک میں لے جاتے۔ اس طرح یمن سے بحر ہند کے راستے ہندوستان سے عراق کے راستے مشرقی ممالک سے اور شام و مصر کے راستے سے افریقہ سے تجارت ہوتی تھی۔ گویا عرب مشرق و مغرب میں بین الاقوامی منڈی بن گیا تھا۔ جس میں شہر مکہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ حج کے دنوں میں تین مشہور تجارتی میلے لگتے تھے عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز جو ہمارے دعویٰ ❷ کا زندہ ثبوت ہے۔

پھر احادیث میں تجارت کی جن اقسام کا ذکر ملتا ہے اور جن میں سے بیشتر آج بھی رائج ہیں۔ ان سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ ان ایام میں عرب میں تجارت کا کاروبار عروج پر تھا اور تجارت کے سلسلہ میں جو ہدایات و احکام مسلمانوں کو دیے گئے ہیں وہ آج بھی مشعل راہ کا کام دیتے ہیں۔ اور تاریخ سے بھی یہ ثابت ہے کہ متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تجارت ہی کی وجہ سے اس دور میں لکھ پتی بن گئے تھے۔

---

❶ زکوٰۃ کے لیے سونے کا نصاب ۲۰ دینار ہے جسے علماء نے پوری تحقیق کے بعد ۷ ۱/۲ تولے سونا قرار دیا ہے۔ اس لحاظ سے بھی ایک دینار کی قیمت ۴ ۱/۲ ماشہ سونے کے برابر ہے۔

❷ بخاری۔ کتاب التفسیر۔ باب قولہ لیس علیکم جناح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اندریں حالات یہ مفروضہ۔ کہ عہد نبوی میں تجارت نہایت پر خطر تھی، لہٰذا برائے نام رہ گئی تھی۔ ایسا بے معنی مفروضہ ہے جس کی نہ تاریخ تائید کرتی ہے اور نہ ہی قرآن کریم۔

۲۔تجارتی قرضے اور تجارتی سُود:

اس بحث کو ہم تین حصوں میں تقسیم کریں گے:

الف عہد نبوی میں اندرونِ عرب تجارتی قرضوں اور تجارتی سُود کا وجود۔

ب عہد نبوی میں ہمسایہ ممالک میں تجارتی قرضے اور سُود

ج آیا 'ربا' کا لفظ قرآن کریم یا لغوی اعتبار سے تجارتی سُود کا بھی احاطہ کرتا ہے یا نہیں؟

(الف) عرب میں تجارتی سُود:

عہد نبوی میں تجارتی قرضوں پر سُود لینے کا رواج موجود تھا۔ جس کا ذکر تفاسیر میں ملتا ہے۔ صاحب تفسیر خازن ﴿وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا﴾ (البقرہ:۲۸۷) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''حضرت عباس اور خالد بن ولید نے زمانہ جاہلیت میں شراکت کی تھی اور سودی کاروبار کرتے تھے۔ وہ قبیلہ بنو عمیر، جو قبیلہ ثقیف (طائف) سے تعلق رکھتا تھا، کے لوگوں کو کاروبار کے لیے سُودی قرض دیتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ان کی بہت بڑی رقم واجب الوصول تھی جو انہوں نے چھوڑ دی۔ اور اس بات کا اعلان خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبہ الوداع [1] میں فرمایا جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔''

جلیل القدر مفسر علامہ ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) اس آیت کی تفسیر میں یوں رقمطراز ہیں:

(كان ربا يتبايعون به في الجاهلية) ''یہ وہ سُود تھا جس سے دورِ جاہلیت میں لوگ لین دین کرتے تھے۔''

ب۔ہمسایہ ممالک میں تجارتی قرضے اور سُود:

رسول اللہ ﷺ کے بالکل قریب زمانہ میں قیصر روم جسٹینین نے، جس کی وفات آپ ﷺ کی پیدائش سے صرف پانچ سال قبل ہوئی تھی۔ تمام بازنطینی سلطنت میں از روئے قانون زمینداروں اور کاشت کاروں کے قرضوں پر ۴ فیصد، تجارتی اور صنعتی قرضوں پر ۸ فیصد اور بحری تجارت کے

---

[1] مسلم۔کتاب الحج۔باب حجۃ النبی ﷺ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرضوں پر ۱۲ فیصد شرح سُود مقرر کی تھی۔ یہ قانون جسٹینین کے بعد بھی ایک مدت تک بازنطینی سلطنت میں رائج رہا۔ ❶

روم کی سلطنت عرب کی ہمسایہ مملکت تھی جس کا ذکر قرآن کریم میں بھی آیا ہے۔ یہاں تجارتی سُود اپنی تمام تر شکلوں میں رائج تھا۔ اسی طرح دیگر ممالک میں بھی تجارتی سُود کے شواہد مل جاتے ہیں اور یہ بات ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ آس پاس کے ملکوں سے اہل عرب کے گہرے تجارتی روابط اور میل جول تھا۔ اندریں حالات یہ تصور کرنا ناممکن ہے کہ اہل عرب تجارتی سود سے ناواقف ہوں۔ اگر ہم بفرض محال تجارتی سود کے حامیوں کے خیال کے مطابق یہ فرض کر بھی لیں کہ اہل عرب اس دور میں تجارتی سود سے ناآشنا تھے تو بھی اس سے سُود کی اباحت کے متعلق کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی...... ایک طرف تو ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام کے احکام ابدی اور تمام دنیا کے لیے ہیں۔ دوسری طرف ہم صرف عرب کے ایک مخصوص دَور پر نظر کر کے سُود کے احکام کو صرف اس قدر اور اس علاقے تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ کو اتنا علم بھی نہ تھا کہ اگر بالفرض عرب میں نہیں تو ہمسایہ ممالک میں کس کس قسم کا سُود رائج ہے اور آئندہ کیا کچھ ہونے والا ہے؟ کیا یہی علم وحکمت خداوندی ہے؟ سُود کے متعلق یہ علی الاطلاق خدائی احکام اور رسول اللہ ﷺ کا سود کی تمام مشتبہ شکلوں سے پرہیز کو لازم قرار دینا کیا اس بات کی واضح دلیل نہیں کہ سُود کی کوئی بھی قسم کسی بھی دور میں جائز قرار نہیں دی جاسکتی۔

ج۔ تجارتی سُود اور قرآنِ کریم: www.KitaboSunnat.com

اسلام نے تجارتی اور شخصی قرضوں میں کوئی فرق روا نہیں رکھا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو ضرور اس کی وضاحت کر دی جاتی۔ قرآن کی نگاہ میں اصل سے جو کچھ بھی زائد لیا جائے اور جس طرح بھی لیا جائے، خواہ وہ مقررہ شرح سے ہو یا بالمقطع ہو، وہ ''ربا'' ہی ہے۔ ربا کے لغوی معنی بھی وہ مخصوص اضافہ ہے جو اصل سے زائد لیا جاتا ہے۔ اب شخصی اور تجارتی قرضوں کے سُود میں فرق کرنا گویا:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ (البقرۃ:۸۵) ''کیا تم کتاب کے کچھ حصے پر ایمان لاتے ہو اور کچھ کا انکار کر دیتے ہو۔''

---

❶ سُود از مولانا مودودی، ص ۲۸۷ بحوالہ (۱) ول ڈورانٹ (ج ۴، ص ۱۲۰، ۴۳۶ A Story of Civilization) زوال وسقوط دولت روم از گبن، ج ۴، ص ۲۱۶

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مترادف ہوگا۔ ربا کو مہاجنی قرضہ سے مختص کرنا اور شخصی اور تجارتی سود کا الگ الگ مفہوم مقرر کرنا موجودہ دَور کی اختراع ہے جس کا مسلمانوں کی طویل تاریخ میں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

تجارتی سُود کے متعلق الگ احکام یا الگ لغت کی ضرورت اس لیے پیش نہ آئی کہ اسلام تجارتی قرضوں اور سُود کی الگ الگ نوعیت کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ سُود کے احکام ہر قسم کے قرضوں پر منطبق ہوتے ہیں۔ ان احکامات میں جہاں شخصی حاجات کے سود کی حرمت کا پتہ چلتا ہے وہاں تجارتی سود کی حرمت پر بھی واضح دلائل موجود ہیں مثلاً:

پہلی دلیل: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (البقرہ:۲۷۵) ''اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سُود کو حرام قرار دیا ہے۔''

یہاں خرید و فروخت یا تجارت کے مقابلے میں لفظ ربا کا استعمال تجارتی سُود کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ کیونکہ جہاں حاجات کے قرضوں کا ذکر مقصود تھا وہاں قرآن کریم نے ربا کے مقابلے صدقہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ﴾ (۲۷۶:۲) ''اللہ تعالیٰ سُود کو ختم کرتا اور صدقات کی پرورش کرتا ہے۔''

دوسری دلیل: ارشاد باری ہے:

﴿وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ﴾ (۲۷۹:۲) ''اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے لیے تمہارے راس المال ہیں۔''

اس آیت میں تجارتی قرضوں کے سُود کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے۔ کیونکہ لفظ راس المال (سرمایہ) کا اطلاق کاروبار پر لگائی ہوئی رقم کے لیے ہوتا ہے۔

تیسری دلیل: قرض کے لیے عربی لغت میں دو الفاظ ملتے ہیں۔ قرض اور دَین۔ قرض کا مطلب عام فہم ہے اور عام طور پر شخصی قرضوں کے لیے آتا ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

(اذا اقرض الرَّجُلُ فَلَا يَاْخُذُ هَدِيَّةً) (بخاری فی تاریخہ) ''جب کوئی شخص کسی دوسرے کو قرض دے تو پھر اس سے ہدیہ قبول نہ کرے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جبکہ دَین کا لفظ ہر قسم کے لین دین پر محیط ہے اس کا صحیح ترجمہ ذمہ داری یا انگریزی میں Liability (ادائیگی کی ذمہ داری) ہوگا۔ جس میں کاروباری قرضے بھی شامل ہوتے ہیں۔ ارشادِ باری ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْهُ﴾ (البقرہ:۲۸۲)

''اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک مقررہ وقت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔''

اور ربا کی تعریف الزیادة في الدَین سے کی جاتی ہے نہ کہ الزیادہ في الغرض سے لہٰذا از روئے قرآن ولغت بھی تجارتی سُود کو 'ربا' سے خارج کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

۳۔ شرح سُود کی کمی:

تجارتی سُود کی حمایت میں یہ دلیل کہ اس کی شرح نقصان کے احتمال کو مدِ نظر رکھ کر مناسب اور قابل برداشت مقرر کی جاتی ہے کئی لحاظ سے محل نظر ہے۔

اولاً: یہ کہ آج تک مناسب اور معقول شرح کا تعین نہیں ہو سکا۔ کبھی تو یہ شرح ۲ فیصد بھی نامناسب اور غیر معقول قرار دی جاتی ہے۔ جیسا کہ دوسری جنگ عظیم کے لگ بھگ زمانے میں ریزرو بنک آف انڈیا ڈسکونٹ ریٹ مقرر ہوا اور یہی شرح دورانِ جنگ قائم رہی۔ پھر پونے تین فیصد پر حکومت ہند کو قرضے ملتے رہے[1] اور کبھی یہ شرح ۲۹ فیصد[2] بھی معقول اور مناسب سمجھ لی جاتی ہے۔ شرح سُود کی مناسب تعیین نہ ہو سکنے کی غالباً وجہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد ہی متزلزل اور کمزور ہے۔ مناسب اور معقول شرح سُود کی تعیین تو صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے جب یہ معلوم ہو سکے کہ قرض لینے والا اس سے کتنا ہی یقینی فائدہ حاصل کرے گا اور اس میں سے قرض دینے والے کا معقول حصہ کیا ہونا چاہیے۔ مگر ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ قرض لینے والے کو اس مقررہ مدت میں کتنا فائدہ ہوگا یا کچھ فائدہ ہوگا بھی یا نہیں؟ تو پھر معقول شرح سود کی تعیین کیسے ممکن ہے، بلکہ اس سے بھی ذرا آگے بڑھیں اور شرح سُود کے بجائے نفس سُود اور اس کے جواز پر غور کریں کہ سُود آخر کس چیز کا معاوضہ ہے؟ تو اس اہم مسئلہ پر ماہرین معاشیات کے جتنے اختلافات پائے جاتے ہیں، شاید ہی علم معاشیات کے کسی دوسرے مسئلہ پر پائے جاتے ہوں۔[3]

---

[1] سود (چھٹا ایڈیشن)، ص ۱۸۳ از مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ

[2] اشتہار انوسٹمنٹ بنک نوائے وقت، ۱۸ راگست ۱۹۷۷ء

[3] بنیادی معاشیات، ج ۱، طبع سوم، ص ۳۸۰ از محمد حسین چودھری صدر شعبہ معاشیات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ثانیاً: یہ کہ ایک ہی ملک اور ایک ہی وقت میں بنکوں کی شرح سُود میں انتہائی تفاوت پایا جاتا ہے۔ سٹیٹ بنک عام بنکوں کو ۱۰ فیصد شرح سُود پر قرض دیتا ہے تو بنک کاروباری لوگوں کو ۱۶ فیصد پر دے رہے ہیں جو سُود در سُود کے چکر میں اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ پھر حکومت خود جو عوام سے کاروبار کے لیے قرضے لیتی ہے اس کی شرح دس سال کے قرض کے لیے ۲۹ فیصد ہے اور رقم دس سال میں چار گنا ہو جاتی۔ اب آپ خود اندازہ فرمالیجیے کہ اگر یہ سب کچھ مناسب شرح ہے تو نامناسب کیا ہو سکتی ہے؟ اور اگر ایسے قرض لے کر تجارت کی جائے جہاں نقصان کے احتمال بھی موجود ہیں تو گرانی اشیاء کا کیا عالم ہوگا؟

ثالثاً: یہ بات قابل غور ہے کہ اگر بالفرض شرح سُود مناسب حد تک کم اور معقول ہو تو کیا حرمت سُود پر اثر انداز ہو بھی سکتی ہے یا نہیں؟ اور حقیقتاً یہی اصل مبحث ہے۔ تو ہمارے خیال میں شرح سُود ایک فیصد ہو یا ۵۰ فیصد، شریعت کی نگاہ میں ایک ہی جیسا جرم ہے شراب کا ایک قطرہ بھی ویسے ہی حرام ہے جیسے شراب کا ایک چھلکتا ہوا جام کیونکہ شریعت کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ حرام چیز مثلاً شراب کی قلیل مقدار بھی ویسے ہی حرام ہے جیسے اس کی کثیر مقدار۔ ❶ لہٰذا شرح سُود کی کمی یا معقولیت کی بنا پر سُود کی اباحت کے لیے راہ ہموار کرنا بالکل فضول سی بات ہے۔

۴۔ فریقین کی رضامندی:

فریقین کی رضامندی کی شرط صرف حلال چیزوں میں ہوا کرتی ہے جیسے تجارت یا نکاح وغیرہ۔ حرام چیزوں یا معاہدات میں رضامندی کی شرط ہی سرے سے غلط اور باطل ہے۔ فریقین کی رضامندی زنا یا جوئے کو جائز نہیں بنا سکتی۔ حالانکہ یہ دونوں کام بھی بسا اوقات باہمی رضامندی سے ہی طے پاتے ہیں پھر آخر سود جیسی حرام چیز کو لوگوں کی مرضی یا فریقین کی رضامندی پر کیسے چھوڑا جا سکتا ہے؟ اسی طرح خواہ سُود لینے والا شرح سُود کی تعیین کرے یا سُود دینے والا، ان باتوں سے بھی نفس سُود کی حرمت پر کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

پھر یہ بات بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ سُود دینے والا کبھی سُود دینے پر رضامند نہیں ہوا کرتا۔ اس کی رضامندی نہیں ہوتی بلکہ یہ اس کی مجبوری ہوتی ہے۔ اگر اسے کم شرح سُود پر قرضہ مل سکے یا کہیں سے قرضِ حسنہ ملنے کی توقع ہو تو وہ کبھی یہ سُودی قرض لینے پر تیار نہ ہوگا۔ سودی معاہدات میں رضامندی کا جتنا پہلو ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ درج ذیل تاریخی واقعہ سے بخوبی ہو سکے گا۔

❶ ترمذی۔ ابواب الاشربہ۔ باب ماسکر کثیرہٗ فقلیلہ حرامٌ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسری جنگ عظیم کی بات ہے کہ انگلستان نے امریکہ سے ایک بھاری قرض کا معاملہ کیا جو Briton Wood Agreement کے نام سے مشہور ہے۔ یہ معاہدہ مشہور ماہر معاشیات برطانیہ لارڈ کینز (J.M. Kaynes) کی معرفت طے پایا۔ انگلستان یہ چاہتا تھا کہ اس کا خوشحال دوست امریکہ میں اس لڑائی میں اس کا رفیق تھا اسے بلا سُود قرض دے دے لیکن امریکہ سُود چھوڑنے پر راضی نہ ہوا انگلستان اپنی مشکلات کی وجہ سے مجبور ہو گیا کہ سُود دینا قبول کرے اس کا جو اثر انگریز قوم پر مرتب ہوا وہ بھی ملاحظہ فرمالیجیے:

لارڈ کینز جب اپنا مشن پورا کر کے پلٹے تو انہوں نے برطانوی دارالامراء میں تقریر کرتے ہوئے کہا: ''میں تمام عمر اس رنج کو نہ بھولوں گا جو مجھے اس بات سے ہوا کہ امریکہ نے ہم کو بلا سُود قرض دینا گوارا نہ کیا۔

مسٹر چرچل جیسے امریکہ پسند شخص نے کہا کہ: ''یہ بنیے پن کا برتاؤ جو ہمارے ساتھ ہوا ہے، مجھے اس کی گہرائی میں بڑے خطرات نظر آتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارے باہمی تعلقات پر بہت ہی بُرا اثر پڑا ہے۔

اس وقت کے وزیر خزانہ مسٹر ڈالٹن نے کہا کہ: ''یہ بھاری بوجھ جسے لادے ہوئے ہم جنگ سے نکل رہے ہیں ہماری ان قربانیوں اور جفاکشیوں کا بڑا ہی عجیب صلہ ہے جو ہم نے مشترک مقاصد کے لیے برداشت کیں۔'' ❶

یہ تو خیر ایک ضمنی سی بحث تھی کہ سُود میں رضامندی کا نہیں بلکہ اضطرار کا معاملہ ہوتا ہے۔ تاہم اس پہلو کو نظر انداز کر کے اگر فریقین کی رضامندی کو بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی سُود کی حرمت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔

۵۔ ربا اور ظلم:

تجارتی سُود کی حمایت میں یہ دلیل بڑے شد و مد سے پیش کی جاتی ہے کہ چونکہ یہ سُودی معاہدہ باہمی رضامندی سے طے پاتا ہے اور فریقین میں سے کسی پر بھی ظلم نہیں ہوتا۔ لہٰذا قرآن کریم کے الفاظ ﴿لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ﴾ کے مطابق یہ سُود اور اس ربا کی تعریف میں کیسے آسکتا ہے جس کی

❶ سُود (چھٹا ایڈیشن)، ص ۱۰۵، ۱۰۶ از مولانا مودودی رحمہ اللہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بنیادی ہی ظلم پر ہوتی ہے۔ گویا حرمت سُود کی علت ''ظلم'' سمجھا جاتا ہے حالانکہ سُود کی حرمت کی علت ''ظلم'' نہیں۔ آیت کے سیاق وسباق سے واضح ہے کہ یہ الفاظ سُودی معاملات اور ہدایات کو ختم کرنے کی احسن صورت پیش کررہے ہیں۔ یعنی نہ تو مقروض قرض خواہ کی اصل رقم بھی دبا کر اس پر ظلم کرے اور نہ مقروض پر سُود کا بھی بوجھ لاد کر اس پر ظلم کرے۔

سُود کی حرمت کی علت ظلم نہیں بلکہ بیٹھے بٹھائے اپنے مال میں اضافہ کی ہوس ہے سُود کے متعلق سب سے پہلی آیت جو مکی دور میں نازل ہوئی۔ اس میں اس کی پوری وضاحت موجود ہے۔

ارشاد باری ہے:

﴿وَ مَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (۲۹:۳)	''اور جو تم تم سُود پر دیتے ہو تاکہ وہ لوگوں کے اموال سے بڑھتی رہے تو یہ مال اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا۔''

بفرض محال ہم یہ تسلیم کرلیں کہ حرمت سُود کی علت ظلم ہی ہے اور یہ بھی کہ چونکہ سودی معاہدہ باہمی رضامندی سے طے پاتا ہے اور یہ بھی فریقین میں سے کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔ لیکن اصل مظلوم تو وہ معاشرہ ہے جس پر ان دو حرام خوروں کے اس سُودی کاروبار کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جن کی تفصیل ہم پہلے پیش کرچکے ہیں۔ اس ظلم کی ذمہ داری کیا ان دونوں پر نہیں پڑتی؟

۶۔ ربا میں نفع ونقصان کا تقابل:

ایسے شرعی احکام میں، جو نص قطعی سے ثابت ہوں، نفع ونقصان کا تقابل کرنا ایک مسلمان کا شیوہ نہیں۔ کیونکہ انسانی عقل کسی چیز کے نفع ونقصان کا مکمل احاطہ نہیں کرسکتی۔ شراب اور جوئے کے متعلق قرآن کریم میں جو نفع ونقصان کا تقابل کیا گیا ہے۔ وہ خود اللہ تعالیٰ نے کیا ہے جو خود فریق نہیں بلکہ اس کی نظر سب نوع انسانی پر ایک جیسی ہے۔ اللہ نے اسے شرابیوں اور جواریوں کے فیصلے پر نہیں چھوڑا اگر ایسی بات ہوتو وہ یقیناً شراب اور جوئے کے فوائد ہی زیادہ بتلائیں گے۔ پھر سُود کے حامیوں کو اس تقابل کا حق کیونکر دیا جاسکتا ہے؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ''شراب کی حرمت کی علت نشہ ہے لیکن اس کے باوجود فقہاء نے ہر نشہ آور چیز کو حرام قرار نہیں دیا۔ بلکہ صرف ان نشہ آور چیزوں کو حرام قرار دیا ہے جن کا ضرر واقعی نفع سے زیادہ ہو۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اس بیان سے مطلوب یہ چیز ہوتی ہے کہ سُود کی کوئی نرم سی شکل (جیسے بنک کا سُود) جس میں نفع کا پہلو نقصان سے زیادہ ہو اس کو حرام قرار نہ دینا چاہیے۔

اب دیکھیے کہ یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ ''فقہاء نے ہر نشہ آور چیز کو حرام قرار نہیں دیا، کیونکہ واضح طور پر رسول اللہ ﷺ کا فرمان کل مسکر حرام (ہر نشہ آور چیز حرام ہے) اور جہاں نص موجود ہو وہاں فقہاء کا کوئی کام باقی نہیں رہ جاتا۔ فقہاء کا کام فقط یہ سوچنا باقی رہ جاتا ہے کہ آیا زیر بحث چیز نشہ آور ہے یا نہیں۔ اگر اس کا نشہ آور ہونا یا بالفاظ دیگر انسانی حواس کو مختل کر دینا ثابت ہو جائے۔ تو پھر وہ حرام ہی ہو گی اسے کوئی فقیہ یا کوئی دوسرا شخص حلال نہیں بنا سکتا۔ نہ ہی اسے نفع و نقصان کا تقابل کر کے جائز بنانے کا حق دیا جا سکتا ہے۔

ربا کی تعریف میں اجتہاد:

حامیانِ سُود کے جن دلائل کا جائزہ اُوپر پیش کیا گیا ہے، اُن کی بنا پر ہی ربا کی تعریف میں اجتہاد کی سفارش کی جاتی ہے، تو اس سے ہم معذرت ہی چاہیں گے۔ اجتہاد کی ضرورت تو اس وقت پیش آتی ہے جب اوامر کے نفاذ میں کوئی مجبوری یا دشواری درپیش ہو یا اس کے نفاذ سے کسی بگاڑ کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قحط کے دوران چوری کی حد ساقط کر دی تھی۔ یا حج کا سفر پرخطر ہونے کے باعث کسی سال حج کو ساقط کر دیا جائے اور یہ محض وقتی تبدیلیاں ہوتی ہیں، دائمی نہیں ہوتیں۔ لیکن سُود کے معاملہ میں کوئی ایسی مجبوری درپیش نہیں ہے۔ نہ قرض لینے والے کو اور نہ دینے والے کو کسی کو بھی کوئی مجبوری نہیں۔ تجارتی قرضوں کے لیے شریعت نے مضاربت کی راہ کھولی ہے اور شخصی قرضوں کے لیے، قرض حسنہ، صدقات، نظامِ زکوٰۃ اور بیت المال کی۔ ملکی اور غیر ملکی تجارت کے سلسلہ میں کوئی اور ایسی مجبوری درپیش نہیں جس کا شریعت میں حل موجود نہ ہو۔ اس کے باوجود اگر ایک قطعی حرام چیز کے لیے جواز کی راہیں تلاش کی جائیں تو یہ اجتہاد نہیں بلکہ دین میں تحریف ہو گی۔ جس سے اسلامی معیشت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فتویٰ:

ہمارے یہ دوست جب اجتہاد کا ذکر کرتے ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گیارہ سالہ دورِ حکومت کے کئی واقعات بطورِ شہادت پیش کر دیتے ہیں۔ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فی الواقع ایک عظیم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مفکر، بہت بڑے سیاست دان، صاحب بصیرت اور اسلام کے انتہائی دلدادہ تھے۔ حالات کے تقاضوں کے مطابق اجتہادیا قانون میں لچک پیدا کر لیتے تھے۔ ہمیں حیرت تو اس بات پر ہے کہ ان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے شیدائیوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ فتویٰ کیوں قابل قبول نہیں جو آپ نے سُود کے متعلق فرمایا تھا۔ وہ فتویٰ یہ ہے:

(اِنَّ اٰیَةَ الرِّبٰا مِن اٰخرِ مَا اُنزِل من القراٰنِ واَنَّ النبی ﷺ قُبِض ان یُبِیّنَهٗ لَنا فَذَرُوا الرِبا والرِیبَةَ)(ابن ماجہ۔ دارمی۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ کتاب البیوع۔ باب الربا فصل ثالث)

''آیت ربا ان آیات سے ہے جو قرآن کے نزول کے آخری زمانہ میں نازل ہوئیں اور نبی ﷺ کا وصال ہو گیا بیشتر اس کے کہ وہ تمام احکام ہم پر واضح فرماتے لہٰذا تم لوگ سُود کو بھی چھوڑ دو اور ہر اس چیز کو بھی جس میں سُود کا شائبہ تک ہو۔''

غور فرمایئے اگر تجارتی سُود میں کچھ بھی اجتہاد کی گنجائش ہوتی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ضرور ایسا کرتے۔ تجارتی سُود کی نظیریں، عرب اور ہمسایہ ممالک سب جگہ اپنی ارتقائی شکل میں موجود تھیں۔ تجارتی سُود کے نفع ونقصان کے تمام تر پہلو بھی سامنے آچکے تھے۔ جس سُود کو رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سب سے پہلے کالعدم قرار دیا تھا وہ آپ ﷺ کے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سُود [1] تھا اور یہ تجارتی سُود ہی تھا۔ جیسا کہ پہلے اس کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ قرآن کے اس حکم اور رسول اللہ ﷺ کے اس کے مطابق عمل کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ یا کسی بھی دوسرے کے لیے یہ گنجائش کہاں باقی رہ جاتی ہے کہ تجارتی سُود کو ربا کے حکم سے خارج کر کے تجارتی سُود کے لیے جواز کی راہیں تلاش کی جائیں۔

حامیانِ سُود کے اشکالات اور ان کا جائزہ

سُود اور تجارتی منافع:

حامیانِ سُود کی طرف سے یہ اشکال کوئی نیا نہیں۔ بلکہ وہی اعتراض یا اشکال ہے جو مدینہ کے یہود نے پیش کیا تھا۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ جب اسلام بھی سرمایہ کو عامل پیداوار تسلیم کرتا ہے۔ تو پھر اگر ایک شخص کسی دوسرے کو تجارت یا کاروبار کے لیے سرمایہ مہیا کر کے منافع کا حصہ لیتا ہے اور دوسرا شخص منافع

[1] مسلم۔ کتاب الحج۔ باب حجة النبی ﷺ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے حصہ کے بجائے پہلے سے طے شدہ حصہ لیتا ہے۔ تو یہ دونوں ایک ہی جیسے ہیں۔ منافع کا حصہ چھوڑا تو کسی نے بھی نہیں۔ لہٰذا ان میں کوئی فرق نہیں۔

قرآن کریم نے ایسی مثال دینے والے شخص کو مخبوط الحواس قرار دیا ہے۔ (البقرہ: ۲۷۵) کیونکہ سود اور بیع میں فرق اتنا واضح ہے جسے ایک عام عقل کا آدمی بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اس کے باوجود انہیں ایک جیسا قرار دینا دیوانگی نہیں تو کیا ہے؟ اب ہم تجارت اور سُود کا فرق ذرا وضاحت سے پیش کرتے ہیں:

تجارت اور سُود کا فرق:

سُود اور تجارت میں فرق درج ذیل امور میں پایا جاتا ہے۔

۱۔ سود ایک طے شدہ شرح کے مطابق یقینی منافع ہوتا ہے۔ جبکہ تجارت میں منافع کے ساتھ نقصان کا احتمال بھی موجود ہوتا ہے۔ خواہ کوئی شخص یہ تجارت اپنے سرمایہ سے کرے یا کسی دوسرے کے سرمایہ سے، جسے عرف عام میں مضاربت کہا جاتا ہے۔ [1]

۲۔ مضاربت کی شکل میں فریقین کو تجارت سے یکساں ہمدردی ہوتی ہے۔ قرض دینے والا کسی آڑے وقت پیسہ کا مطالبہ کر کے کاروبار کو نقصان پہنچانے کا سبب نہیں بنتا۔ کیونکہ اس سے اس کا اپنا مفاد بھی وابستہ ہوتا ہے۔ جبکہ سُود خوار کو کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ سُود خوار کے اس فعل سے صرف محنت کرنے والا یا مقروض ہی متاثر نہیں ہوتا بلکہ نتیجتاً ملکی معیشت پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

۳۔ اور تیسرا فرق یہ ہے کہ تجارت کی صورت میں فریقین میں اخوت اور ہمدردی کے جذبات پروان چڑھتے ہیں اور سُود کی صورت میں منافرت وعداوت کے۔ سُود خوار میں خودغرضی، مفاد پرستی، زر پرستی اور سنگ دلی۔ جیسے اخلاق رزیلہ پیدا ہوتے ہیں۔ سُود کی حرمت کی علّت بھی یہی ہے کہ سُود خوار بیٹھے

---

[1] مضاربت تجارت کی وہ قسم ہے جس میں ایک کا سرمایہ ہو اور دوسرا محنت کرے اور منافع طے شدہ شرائط کے مطابق تقسیم ہو۔ اور اگر نقصان ہو جائے تو یہ نقصان سرمایہ پر پڑے گا اور محنت کش کی محنت ضائع ہوگی۔ ہمارے ہاں عموماً یہ شرط طے کر لیتے ہیں کہ نفع و نقصان دونوں میں سرمایہ دار اور محنت کرنے والا شریک ہوتے ہیں۔ یہ شرط سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اسلام محنت کے مقابلہ سرمایہ کی بالادستی کو تسلیم نہیں کرتا۔ ہاں اگر صاحب مال محنت کرنے والے پر یہ شرط عائد کردے کہ وہ فلاں کام یا فلاں کاروبار نہ کرے۔ پھر بھی محنت کرنے والا وہ کام کرے تو نقصان کا ذمہ دار ہوگا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بٹھائے ایک مقررہ منافع کی ضمانت چاہتا ہے اور حالات خواہ کچھ ہو وہ اس کی وصولی پر مصر ہوتا ہے۔ سُودی نظام معیشت نے صرف ایک ہی شائی لاک پیدا نہیں کیا بلکہ ہر دَور میں ہزاروں شائی لاک [1] پیدا ہوتے رہے اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔

دوسرا اشکال۔ سُود اور کرایہ جات

تجارتی سُود کی حمایت میں یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے کہ اگر سُود یقینی منافع کی بنا پر ناجائز سمجھا گیا ہے تو اور بھی کئی باتیں ایسی ہیں جن میں منافع بھی یقینی ہوتا ہے اور انہیں جائز بھی سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً دکانوں اور مکانوں کے کرائے۔ زمین کا لگان اور بعض دیگر اشیائے استعمال مثلاً کراکری۔ خیموں اور کرایہ کی موٹر سائیکل وغیرہ۔ تو پھر آخر سُود کو ہی یقینی منافع کی بنا پر کیوں ناجائز قرار دیا جاتا ہے؟

یہ اشکال بھی ہمارے نزدیک عذرِ گناہ بدتر از گناہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ کرایہ اور منافع دونوں الفاظ بالکل الگ الگ مفہوم کے حامل ہیں۔ تاہم ان کا فرق ذرا وضاحت سے بیان کیا جاتا ہے۔

ا۔ ملکیت میں تبدیلی:

کرایہ کی صورت میں اصل اشیاء کی ملکیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی کوئی کرایہ دار مکان یا دکان کا مالک نہیں بن سکتا۔ نہ ہی اس چیز میں مالک کی مرضی کے بغیر کسی قسم کا تصرف کر سکتا ہے۔ جبکہ سرمایہ دار کی رقم جب اس سے جدا ہوئی تو وہ دوسرے کی ملکیت ہوگئی اور وہ جب تک اس میں تصرف نہ کرے، اس سے فائدہ اٹھا ہی نہیں سکتا ہے۔ وہ اسے جس طرح چاہے۔ استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے۔

۲۔ ماہیت میں تبدیلی:

کرائے کی اشیاء مثلاً مکان، خیموں یا سائیکلوں وغیرہ، کی بنیادی حیثیت و ماہیت برقرار رہتی ہے۔ جبکہ سرمایہ کی بنیادی شکل کو ختم کر کے اسے کسی دوسری شکل میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ بلکہ جب تک اسے تبدیل نہ کیا جائے تجارت کا تصور ہی ناممکن ہے۔

---

[1] ایک سنگ دل یہودی سُود خوار جس نے ایک مقروض کو قرض دیتے وقت یہ شرط عائد کی تھی کہ اگر وہ مقررہ وقت تک اصل بمعہ سود ادا نہ کرے گا تو وہ اس کی ران سے گوشت کاٹ لے گا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ مقروض کسی مجبوری کی وجہ سے اس سُود خوار کی رقم بروقت ادا نہ کر سکا۔ تو اس سنگ دل مثالی کردار نے فی الواقع اس کی ران سے بے دریغ گوشت کا ٹکڑا کاٹ لیا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۔عوضانہ:

کرایہ اور سُود میں سب سے بڑا اور بنیادی فرق یہ ہے کہ اشیاء کا مالک کرایہ کی رقم ان اشیاء کی گھسائی، ٹوٹ پھوٹ اور مرمت کے عوض وصول کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی نگہداشت اور بہبود مالک کے ذمہ ہوتی ہے۔ جبکہ رقم کی صورت میں اس گھسائی، ٹوٹ پھوٹ اور مرمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سُود کی رقم محض مدت کے بالعوض وصول کی جاتی ہے۔

زمین کے لگان یا ٹھیکہ کا مسئلہ بھی کرایہ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ اس کی بھی نہ ملکیت تبدیل ہوتی ہے اور نہ ماہیت۔ البتہ اس میں گھسائی، ٹوٹ پھوٹ اور مرمت نہیں ہوتی مگر سیم تھور کی وجہ سے زمین کلر بنجر بن سکتی ہے۔ تاہم بعض علماء اسے سُود کی مثل قرار دے کر اس سے اجتناب ہی بہتر سمجھتے ہیں اور علماء کی اکثریت اس صُورت میں اسے جائز سمجھتی ہے کہ اگر فصل کسی اتفاقی حادثہ کی وجہ سے کم پیدا ہو یا تباہ ہو جائے تو مالک زمین اس طے شدہ ٹھیکہ میں مناسب کمی کر دے یا معاف کر دے تو اس صورت میں یہ مضاربت ہی کی شکل بن جاتی ہے۔

اب تک ہم نے جن دلائل یا اشکالات کا جائزہ پیش کیا ہے ان کی حیثیت یا تو شرعی ہے یا عقلی اور تاریخی۔ اب ہم حامیان سُود کے اس اشکال کا جائزہ لیں گے جس کا تعلق سراسر معاشیات سے ہے۔ لہٰذا اس اشکال کا جائزہ ہم تفصیل سے پیش کریں گے۔

تیسرا اشکال سُود اور قومی معیشت

(بچت اور سرمایہ کاری کا اسلامی نظریہ)

حامیانِ سُود کی طرف سے بڑے شد و مد سے یہ اعتراض اٹھایا جاتا ہے کہ سُود ہی کی کشش کی وجہ سے لوگ بچت کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اگر بنکوں سے سُود کو ختم کر دیا جائے تو لوگ بچت کرنا چھوڑ دیں گے اور اس طرح قومی معیشت متاثر ہوگی۔

اس اشکال پر تین پہلوؤں سے غور کیا جا سکتا ہے:

الف کیا فی الواقع بچتوں کا محرک سُود ہی ہے؟

ب۔ کیا انفرادی بچتیں قومی بچت کو متاثر کرتی ہیں؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ج سُود کو ختم کرنے سے اسلامی نظامِ حیات میں بچتوں پر کیا اثر پڑے گا؟

(الف) بچت اور سُود:

ہمارے خیال میں یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ لوگ محض سود کی کشش کی وجہ سے بچت کے عادی ہوتے ہیں۔ بچت کے اور بھی بہت سے محرکات ہیں جو سود سے قوی تر ہیں۔ جدید ماہرین معاشیات اس امر پر متفق ہیں کہ بچت کے کئی ایک عوامل میں سے ایک سُود بھی ہے۔ مشہور برطانوی معیشت دان لارڈ کینز (J.M. Keynes) نے اپنی کتاب ''روزگار، سُود اور زر کا عام نظریہ''[1] میں بچت کے داخلی محرکات کا ذکر کرتے ہوئے جن باتوں کا ذکر کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ اتفاقی حوادث کے لیے پیش بندی

۲۔ مستقبل میں متوقع اخراجات۔ بچوں کی تعلیم اور شادیوں کے اخراجات

۳۔ بڑھاپے میں قوتِ کار کم ہونے کی وجہ سے آمدن کا محدود ہونا

۴۔ احتیاج سے آزادی چاہنا

۵۔ معیارزندگی میں اضافہ کے خیال سے بچت کرنا

۶۔ کاروبار کے لیے کچھ سرمایہ بچا کر رکھنا یا ورثاء کے لیے ترکہ چھوڑنے کی خواہش

۷۔ طبعی کنجوسی کے سبب پس انداز کرنا۔

۸۔ سُود، بچت میں مزید اضافہ حاصل کرنے کے لیے

گویا لارڈ موصوف نے سُود کو بچت کے عوامل میں آخری آٹھویں نمبر پر شمار کیا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ بچت میں مزید اضافہ کا محرک کوئی بھی آمدنی ہوسکتی ہے، ضروری نہیں کہ وہ سُود ہی ہو۔

لارڈ موصوف کے بعد اس سلسلہ میں مزید تحقیق کے نتیجہ میں کئی اور محرکات بھی سامنے آئے ہیں مثلاً سیاسی نظم واستحکام، صارفین کو قرض کی فراہمی، سابق معیارزندگی اور آمدنی میں اضافہ کی رفتار وغیرہ وغیرہ۔

ب۔ انفرادی بچت اور قومی بچت:

جب ہر شخص بچت پر آمادہ ہو جائے تو ظاہر ہے کہ عوام کی قوت خرید کم ہو جائے گی اور جب

[1] The General Theory of Employment, Interest-Money, P.10, Mac Millanar, London.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اشیائے صرف کی خرید رک جائے گی تو ملکی معیشت ایک دوسرے انداز سے متاثر ہونا شروع ہو جائے گی۔ جو لوگ اشیائے صرف پیدا کرتے ہیں ان کی آمدن، اور اسی طرح بچت اس حد تک محدود ہو جائے گی جس حد تک انفرادی بچتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ بچت کے متعلق لارڈ کینز موصوف کا یہی نظریہ ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''قومی بچت افرادی بچت سے متاثر نہیں ہوتی۔ جب معاشرہ کے چند لوگ بہت زیادہ بچت کرنے لگتے ہیں تو دوسروں کی قوتِ پس اندازی کم ہو جاتی ہے۔ قومی بچت تب ہی بڑھ سکتی ہے۔ جب قومی آمدنی میں اضافہ ہو۔ لہٰذا تمام تر توجہ پیداوار اور وسائل پیداوار بڑھانے پر مرکوز کرنی چاہیے۔''

ج۔ اسلام اور نظریہ بچت:

اسلام نے اس مسئلہ میں اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے کفایت شعاری ایک اچھی صفت ہے لیکن اگر بخل کی حد تک پہنچ جائے تو مذموم اور ایک اخلاقی جرم بن جاتی ہے۔ اسلام ہمیں یہ سکھلاتا ہے کہ خرچ کرنے میں نہ اسراف کیا جائے اور نہ بخل بلکہ کفایت کو ملحوظ رکھا جائے۔ اس طرح جو کچھ پس انداز ہوتا ہے، اگر ہو سکے تو یہ سب کچھ فقیر محتاج لوگوں کی ضرورت پر خرچ کر دیا جائے بموجب ارشاد باری تعالیٰ:

﴿وَيَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ (۲:۲۱۹) ''لوگ آپ ﷺ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں۔ آپ کہہ دیجیے کہ جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو۔''

لیکن ایسا کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس پر صرف اہل عزیمت متقی لوگ ہی عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ انسان میں بچت سے بہت سے داخلی محرکات ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ لہٰذا اخلاق فطرت نے انسان کی اس کمزوری کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے اور اس بچی ہوئی رقم کا ایک قلیل حصہ یعنی ۲½ فیصد اللہ کی راہ میں فقراء و مساکین کی ضروریات پر خرچ کرنے کی پابندی عائد کی ہے۔ باقی ۹۷½ فیصد یا ۳۹ حصے انسان بچا کر خود اپنے پاس بھی رکھ سکتا ہے، اسے مزید نفع آور کاموں یعنی تجارت وغیرہ میں بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لگا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح انفرادی بچتوں میں تو معمولی سا فرق پڑ سکتا ہے، لیکن قومی بچت متاثر نہیں ہوگی جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے۔

سُود کے خاتمہ کی صورت میں ہمارے اندازے کے مطابق بنک میں جمع ہونے والی رقوم میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام میں آج بھی ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو بنک کے سود کو حرام سمجھتا اور اس کے لین دین سے گریز کرتا ہے۔ کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو اپنی رقوم محض اس لیے چالو کھاتہ میں رکھتے ہیں کہ سُود لینے سے نفرت ہے۔ غیر سودی نظام میں ایسی تمام رقوم چالو کھاتہ (Current Account) سے نکل کر کاروبار مضاربت یا شراکت کے لیے بچت کھاتوں میں چلی جائیں گی۔ اور چالو کھاتہ میں کمی واقع ہو جائے گی۔ پھر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو سرے سے بنک میں رقوم برائے حفاظت، رکھوانے کے بھی روادار نہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ آخر بنک بھی ہماری رقوم سے سُودی کاروبار کیوں کرے؟ فائدہ تو بنک اُٹھائے اور اس گناہ کے کاروبار میں حصہ ہمارا بھی ہو۔ بموجب ارشادِ باری تعالیٰ:

﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (۵:۲) ''اور کسی گناہ یا زیادتی کے کام میں تعاون مت کرو۔''

وہ اس چیز سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی رقوم کی حفاظت کا انتظام گھر پر یا دوسرے ذرائع سے کر لیتے ہیں۔ غیر سُودی نظام میں یہ تمام رقوم گھروں سے نکل کر بنکوں میں چلی جائیں گی اور چالو کھاتہ کی رسد برقرار رہے گی۔

علاوہ ازیں مالدار طبقہ اپنی رقوم کا ایک حصہ گھر پر رکھتا ہے۔ تاکہ حکومت کے عائد کردہ ٹیکسوں، جنہیں اکثر لوگ ناجائز تصور کرتے ہیں، سے بچ سکے۔ اسلامی نظامِ معیشت میں ٹیکسوں کے بجائے نظام زکوٰۃ رائج ہوتا ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کو ایسی رقوم گھر پر رکھنے کا چنداں فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ زکوٰۃ ایک اہم فریضہ، مالی عبادت اور اللہ کا مسلمانوں پر حق ہے جس سے ایک مسلمان کے لیے کوئی مفر نہیں ہے لہٰذا گھروں میں محفوظ ایسی تمام رقوم بھی بنکوں میں چلی جائیں گی۔ اندریں صورت گمان غالب یہی ہے کہ بنکوں میں سرمایہ کی فراہمی کم ہونے کے بجائے بڑھ جائے گی۔

سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی:

سُود کا سب سے بڑا فائدہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے ملک کی صنعت وتجارت کو ''حیات بخش

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خون'' (سرمایہ) مہیا ہوتا ہے۔ سُود کے لالچ کی بنا پر ہی بنک سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ جس سے ملکی پیداوار اور قومی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ روزگار عام ہوتا ہے اور خوشحالی بڑھتی ہے۔ اگر سُود کو ختم کر دیا جائے تو ملک کی اقتصادی ترقی کی رفتار رک جائے گی۔

اسلام نے نفع آور اغراض کے لیے سُود کے بجائے تجارت کی راہ دکھلائی ہے۔ تجارت میں اگرچہ خسارہ کا امکان بھی ہوتا ہے اس کے باوجود تجارت میں نفع کے امکانات سود سے بہت زیادہ ہیں۔ اور اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ تاجر حضرات سُود پر سرمایہ لینے کے بعد تجارت ہی کرتے ہیں۔ لہٰذا غیر سُودی معیشت میں صنعت و تجارت کو یہ حیات بخش خون ملتا ہی رہے گا۔ تبدیلی صرف طریق کار میں واقع ہوگی۔

بلاشبہ اگر بنک تجارتی بنیادوں پر سرمایہ دار کی ''خدمت'' کریں گے تو سُودی نظام سے کہیں بہتر نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ سرمایہ و محنت کے اشتراک عمل سے کاروباری مزاحمت کم ہوگی۔ لہٰذا گرانی بھی کم ہوگی۔ کساد بازاری کا رجحان بھی ختم ہوگا۔ قومی آمدنی بھی بڑھے گی، فی کس آمدنی میں بھی اضافہ ہوگا۔ تھوڑے بہت لوگوں کو، حسبِ ضرورت سرمایہ دار، روزگار بھی میسر آئے گا۔ مگر غریبوں کے مسائل پھر بھی پوری طرح حل نہ ہو سکیں گے۔ گردش زر کا دائرہ محدود ہی رہے گا، لہٰذا مملکت پوری طرح فلاحی مملکت نہ بن سکے گی۔ وجہ یہ ہے کہ ہم نے سرمایہ کاری کے لیے وہی راہ اختیار کی ہے جو سرمایہ کاری نظام کے لیے مختص اور سرمایہ دار ہی کی خدمت پر مامور ہے۔

سرمایہ کاری اور اسلام:

سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ کاری کا میدان، تاجر، زمیندار اور صنعت کار ہے۔ عوام کی بچتیں انہیں حضرات کے سامنے لا کر ڈھیر کی جاتی ہیں تاکہ وہ اور بھی پھلیں پھولیں۔ اس کے برعکس اسلام میں سرمایہ کاری کا میدان غریب طبقہ ہے۔ امراء سے ان کی بچتوں کا ایک حصہ وصول کر کے ان کی خدمت کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں امراء کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی ہر وقت غریب طبقہ کا خیال رکھیں۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ غریب طبقہ کی خدمت سے سرمایہ کاری کیونکر ہوتی ہے اور وہ قومی معیشت پر کیسا خوشگوار اثر ڈالتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قومی معیشت میں صدقات وخیرات کی اہمیت:

فرض کیجیے کہ کسی مخصوص طبقہ میں بچت کا میلان $\frac{1}{3}$ ہے۔ بالفاظ دیگر اگر ایک آدمی کی ماہوار آمدنی تین ہزار روپے ہے تو اس میں سے دو ہزار روپے اشیائے ضرورت پر صرف کر دیتا ہے اور ایک ہزار روپے ماہوار بچاتا ہے اور علم معاشیات کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ ایک شخص کا خرچ دوسرے کی آمدنی ہوتی ہے۔ یعنی جس شخص نے تین ہزار روپے ایک ماہ میں کمائے ہیں تو یہ دوسرے لوگوں کا خرچ تھا اور یہ شخص جو دو ہزار روپے خرچ کرے گا تو وہ دوسروں کی آمدنی ہوگی۔ مثلاً زید بازار میں جا کر بیس روپے کا گوشت خریدتا ہے، چالیس کا کپڑا اور دس روپے کی ڈاکٹر سے دوائی لاتا ہے تو زید کا یہ ستر روپے کا خرچ فی الحقیقت قصاب، بزاز اور ڈاکٹر کی آمدنی ہوگی۔

اب دیکھیے ایک شخص نے مثلاً ایک ہزار روپے تنخواہ پائی تو یہ آدمی اس مخصوص میلانِ بچت کے تحت ۶۶۶ روپے تو خرچ کر دے گا اور ۳۳۳ روپے بچائے گا۔ اس کا ۶۶۶ روپے کا خرچ دوسروں کی آمدنی ہے۔ اب یہ دوسرے لوگ بھی ۶۶۶ روپے دبا کر نہیں بیٹھ جائیں گے بلکہ اس میں سے اسی میلان بچت کے تحت ۴۴۴ روپے خرچ کر دیں گے جو دوسروں کی آمدنی ہوگی۔ اس طرح قومی آمدنی میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے گا۔ یہاں تک کہ یہ ایک ہزار روپیہ کا خرچ کئی مراحل [1] کے بعد قومی آمدنی میں تین ہزار روپے کا اضافہ کا سبب بنے گا۔ اور یہ خرچ یا قومی آمدنی میں اضافہ بالآخر ان لوگوں کی جیب میں چلا جائے گا جو اشیائے صرف پیدا کرتے ہیں۔

اب اگر یہی معاشرہ اپنی بچت $\frac{1}{3}$ میں سے آدھا زکوۃ وصدقات کی صورت میں غرباء میں تقسیم کر دے یعنی میلان صَرف $\frac{5}{6}$ ہو جائے اور میلان بچت $\frac{1}{6}$ رہ جائے تو اتنے ہی مراحل گزرنے کے بعد قومی آمدنی میں ۶۰۰۰ روپے کا اضافہ ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر میلان صَرف بڑھ کر $\frac{9}{10}$ ہو جائے اور میلان بچت اور بھی کم یعنی $\frac{1}{10}$ رہ جائے تو اتنے ہی مراحل گزرنے کے بعد قومی آمدنی میں ۱۰،۰۰۰ روپے کا اضافہ ہوگا۔ اور یہ اضافہ پورے کا پورا اشیائے صَرف پیدا کرنے والے یعنی امیر طبقہ کی طرف واپس لوٹ جائے گا۔ ان مراحل کو نقشہ کے ذریعہ یوں واضح کیا جا سکتا ہے: [2]

---

[1] قومی آمدنی میں اضافہ کی یہ رفتار علم معاشیات میں اصولِ مضارب Principle of Multiplier سے واضح کی جاتی ہے۔

[2] اصول معاشیات (گیارھواں ایڈیشن) ص ۲۱۲ از پروفیسر منظور علی شیخ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

	میلان بچت ۱/۳ کے بعد قومی آمدنی میں اضافہ	میلان بچت ۱/۶ کے بعد	میلان بچت ۱/۱۰ کے بعد
پہلا مرحلہ	۱۰۰۰	۱۰۰۰	۱۰۰۰
دوسرا مرحلہ	۶۶۶	۸۳۳	۹۰۰
تیسرا مرحلہ	۴۴۴	۶۹۴	۸۱۰
چوتھا مرحلہ	۲۹۶	۵۷۸	۷۲۹
پانچواں مرحلہ	۱۹۷	۴۸۱	۶۵۷
	ــــــ	ــــــ	ــــــ
	ــــــ	ــــــ	ــــــ
	ــــــ	ــــــ	ــــــ
آخری مرحلہ	۳۰۰۰	۶۰۰۰	۱۰,۰۰۰

یہ رقم جو خرچ کے بعد قومی پیداوار میں مزید اضافہ کا سبب بنی ہے یعنی دوسری صورت میں پہلی سے مزید -/۳۰۰۰ روپے کا اضافہ اور تیسری صورت میں مزید -/۷۰۰۰ روپے کا اضافہ ہے، یہ سب کچھ اشیائے صرف پیدا کرنے والے طبقہ یعنی سرمایہ دار کے پاس پہنچ جائے گا۔ اور یہ اس کا حقیقی اور ذاتی سرمایہ ہوگا۔ جس کے لیے اسے کسی بنک سے قرضہ لینے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی۔ سرمایہ کی رہی سہی ضرورت بنک اپنے ذاتی سرمایہ سے پوری کر دیں گے۔ اور بنکوں کو بھی کارخانہ داروں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے عوام سے بچتیں اکٹھی کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ جس کے لیے وہ طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔

نقشہ بالا میں دوسرے مرحلہ پر دوسری صورت میں -/۱۶۷ روپے پہلی صورت سے زائد۔

(۸۳۳-۶۶۶=۱۶۷)

اسی طرح تیسری صورت میں -/۲۳۴ روپے پہلی صورت سے زائد دکھلائے گئے ہیں۔

گویا اتنی رقم کی مزید سرمایہ کاری غریب طبقہ میں ہوئی ہے۔ اگر اتنی ہی رقم بنک کی معرفت سرمایہ کاری میں صرف ہوتی تو کبھی اتنا اضافہ پیدا نہ کر سکتی تھی۔

رہا یہ سوال کہ یہ مراحل کتنی مدت میں طے ہوتے ہیں؟ تو اس کا انحصار دو باتوں پر ہے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۔ گردشِ دولت کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ اگر دولت صرف متوسط اور امیر طبقہ میں ہی گردش کرتی رہے تو یہ دائرہ بہت محدود ہوگا۔ کیونکہ غریب طبقہ کی تعداد زیادہ ہے۔ اور اگر یہ گردش غریب طبقہ تک بھی پہنچ جائے تو گردشِ زر کا دائرہ دُگنے سے بھی زیادہ وسیع ہو جائے گا۔

۲۔ جس طبقہ میں دولت خرچ ہو رہی ہے یا کی جا رہی ہے اس کی ضرورت کتنی شدید ہے۔ یہ ضرورت جتنی شدید ہوگی اتنی ہی دولت تیزی سے گردش کرے گی۔ اگر کسی غریب آدمی کو ایک سو روپیہ مل جائے تو عین ممکن ہے کہ وہ اسے ایک آدھ دن میں ہی خرچ کر دے۔ کیونکہ اس نے اپنی ضروریات پیسہ کی کمی کی وجہ سے عرصہ سے روک رکھی تھیں۔ اور اگر یہی سو روپے کی رقم ایک امیر آدمی کو مل جائے تو عین ممکن ہے کہ یہ رقم کئی ماہ تک اس کے گھر پر یا بنک میں پڑی رہے کیونکہ اس کی ضروریاتِ زندگی پہلے سے ہی پوری ہو رہی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظامِ معیشت میں صدقات و خیرات کے ذریعہ دولت کی گردش کئی گنا بڑھ جاتی ہے اور یہی حقیقی سرمایہ کاری ہے۔

گردشِ دولت کی رفتار:

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر امیر طبقہ اپنا ہی ذاتی خرچ بڑھا کر بچت کم کر دے تو کیا نظریاتی طور وہی نتائج برآمد ہوں گے جو اوپر بیان ہوئے ہیں؟ اگر اس بات کا جواب اثبات میں ہے تو پھر بچت کو غریبوں میں تقسیم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نظریاتی طور پر تو وہی نتائج برآمد ہونا چاہئیں، لیکن ان مراحل کی رفتار اتنی دھیمی ہوگی جسے معاشرہ محسوس تک بھی نہ کر سکے گا۔ میدانِ صَرف کی تنگی اور عدمِ ضرورت کی وجہ سے متوقع نتائج برآمد نہ ہو سکیں گے۔ یہی وجہ ہے قرآن کریم نے جہاں اسراف کو اخلاقی جرم قرار دیا ہے اور جابجا ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ کہہ کر فضول خرچی یا اپنی ذات پر ضرورت سے زائد خرچ کرنے سے بچنے کی ہدایت فرمائی ہے، وہاں میدانِ صَرف کو تنگ رکھنے سے بھی منع فرما دیا۔ ارشادِ باری ہے:

﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ﴾ (الحشر:۷) ''ایسا نہ ہو کہ دولت تمہارے امراء میں ہی گردش کرتی رہے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گردشِ دولت کی رفتار کی مثال:

سرمایہ دارانہ نظام معیشت اور اسلامی نظامِ معیشت میں گردشِ زر کی رفتار کو واضح کرنے کے لیے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ معاشرے کی مثال اس گہرے پانی کی سی ہے جو کسی کھلے منہ والے برتن میں پڑا ہو۔ ہوا کی لہریں پانی کی اُوپر کی سطح کو متحرک رکھتی ہیں جس کا تھوڑا بہت اثر درمیانی حصہ تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ لیکن نچلا حصہ بالعموم ساکن رہتا ہے یا بہت کم اثر قبول کرتا ہے۔ یہی صورتِ حال سُورج کی گرمی کی بھی ہے کہ وہ پانی کی سطح کو گرم کر دیتا ہے جس کا کچھ نہ کچھ اثر درمیانی حصہ تک بھی پہنچ جاتا ہے لیکن گہرائی والا پانی عموماً ٹھنڈا ہی رہتا ہے یا بہت کم اثر پذیر ہوتا ہے۔ یہ صورت حال سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں واقع ہوتی ہے۔ جہاں غریب کا یعنی نچلے طبقہ کا کوئی بھی پُرسانِ حال نہیں ہوتا۔ روپے کی گردش صرف اسی حد تک ہوتی ہے کہ وہ بمشکل بسر اوقات کر سکتے ہیں یا اپنا وجود قائم رکھ سکتے ہیں۔

اور اسلامی نظامِ معیشت کی مثال یہ ہے جیسے اس پانی کو نیچے سے آگ کے ذریعہ جوش دے دیا جائے تو پانی نیچے سے اُٹھ کر تمام پانی کو گرم اور متحرک کر دے گا۔ اُوپر کے پانی کو نیچے آنا پڑے گا اور نیچے کا پانی ضرور اوپر اٹھے گا۔ کیونکہ امراء کی دولت میں اسلام نے جو غریب کا حق مقرر کیا ہوا ہے وہ صرف خیرات نہیں کہ امیر لوگ محض ازراہِ مہربانی کسی پر نظرِ کرم کر کے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جائیں۔ پھر یہ بھی چاہیں کہ غریب ان کے ممنونِ احسان ہوں بلکہ یہ امراء کے اموال میں غریبوں کا حق ہوتا ہے۔ تو جس طرح جوش کھایا ہوا پانی سارے پانی کو متحرک بنا دیتا ہے۔ اسی طرح غریب طبقہ میں سرمایہ کاری کی تخم ریزی گردشِ دولت کی رفتار کو کئی گنا تیز تر کر دیتی ہے۔ اور یہ تو علم معاشیات کا مسلّمہ اصول ہے کہ گردشِ دولت کی رفتار جتنی تیز ہوگی، معاشرہ کی معیشت اسی رفتار سے مضبوط ہوتی جائے گی۔ لہٰذا اسلامی نظام معیشت میں صنعت کار یا تاجر کو ایسے حیات بخش خون کی ضرورت ہی نہیں رہے گی جس کی بنیاد سودی بچتوں پر ہو۔

سُود کی اقسام اور مختلف شکلیں

سُود کی حرمت اور حامیانِ سُود کے دلائل و اشکالات کا جائزہ لینے کے بعد اب ہم سُود کی مختلف قسموں کا ذکر کریں گے۔

سُود کی بالکل سادہ اور معروف شکل یہ ہے کہ مثلاً الف، ب سے ایک سو روپے ایک سال کے لیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرض لیتا ہے اور پندرہ فیصد شرح سود طے ہوتی ہے۔ تو الف ایک سال گزرنے پر ایک سو روپے اصل رقم جمع پندرہ روپے سود کل ایک سو پندرہ روپے ب کو واپس کر دے۔ یہ صورت سود مفرد کہلاتی ہے۔

اب اگر الف سال گزرنے پر اصل زر اور سود ادا نہیں کر سکا۔ تو ب اصل زر اور سود کی مجموعی رقم یعنی ایک سو پندرہ روپے کو اصل زر شمار کر کے اسے مزید مہلت دے دے گا۔ اسے عام زبان میں سُود مرکب یا سُود در سُود کہتے ہیں۔ سُود مفرد کی مدت ایک سال بھی ہو سکتی ہے، چھ ماہ بھی، تین ماہ بھی حتیٰ کہ اگر ضرورت مند سخت مجبور ہے تو ایک ماہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس طرح سُود مرکب کی رقم سُود مفرد سے بہت زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَأْكُلُوا۟ ٱلرِّبَوٰٓا۟ أَضْعَـٰفًا مُّضَـٰعَفَةً﴾ (۳:۱۳۰)

”اے ایمان والو! بڑھوتری در بڑھوتری والا سُود مت کھاؤ۔“

سُود کی تیسری قسم مُتی کاٹا یا ڈس کاونٹ (Discount) ہے۔ اس میں معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ مثلاً الف نے ب سے کوئی چیز ایک ہزار روپے میں تین ماہ کے وعدہ پر خریدی اور اس کو تحریر لکھ کر دے دی۔ اب الف کوئی قابل اعتماد شخص یا فرم یا گورنمنٹ بذاتِ خود ہے جس کی تحریر ہنڈی، تمسک یا پوسٹ ڈیٹ چیک کی صورت میں ہے جسے لینے سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ مگر الف کو فوری طور پر رقم کی ضرورت ہے۔ وہ یہ دستاویز لے کر کسی بنک یا کسی شخص مثلاً ج کے پاس جاتا ہے تو ج کہتا ہے کہ میں یہ رقم دستاویز ادا کر دیتا ہوں۔ مگر پانچ فیصد کاٹ لوں گا۔ معاملہ طے ہونے پر وہ الف کو ۹۵۰ روپے فوراً ادا کر دیتا ہے اور -/۵۰ روپے کاٹ لیتا ہے۔ یہ بھی خاص سُود ہے اور تجارتی حلقوں میں اس قسم کا سُود بھی مروج ہے۔

رِبَا النَّسِيْئَة:

سُود کی یہ تینوں صورتیں بالعموم معروف اور مروج ہیں۔ ان تمام صورتوں میں زائد رقم چونکہ مدت یا مہلت کے عوض لی دی جاتی ہے۔ لہٰذا ایسے سود کو شرعی اصطلاح میں ربا النسیئہ کہا جاتا ہے (یعنی مدت یا ادھار کی وجہ سے سُود)

ربا الفضل:

مندرجہ بالا اقسام سُود کے علاوہ سُود کی ایک اور قسم بھی ہے جس سے صرف اسلام ہی نے متعارف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرایا ہے اور وہ ہے رِبَا الفضل۔ ایسا سُود جس میں مدت بھی نہ ہو اور جنس میں کمی بیشی بھی ہو۔ مثلاً الف کے پاس ناقص قسم کی گندم ہے اور ب کے پاس اچھی قسم کی۔ الف، ب سے کہتا ہے کہ تم مجھ سے چار کلو گندم لے لو اور اس کے عوض اپنی گندم ۳ کلو دے دو۔ اور وہ دونوں آپس میں لین دین کر لیتے ہیں۔ ایسا لین دین نہ بظاہر سُود معلوم ہوتا ہے اور نہ ہی دنیا اسے سُود شمار کرتی ہے۔ لیکن اسلامی نقطہ نظر سے ب نے الف سے جو زائد ایک سیر گندم لی ہے۔ تو یہ بھی اسی جنس میں بغیر مدت کے زیادتی ہے۔ للہٰذا یہ بھی سُود ہے اور الف اور ب دونوں سُودی لین دین کے مجرم ہیں۔ اب ارشادات نبوی ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس برنی کھجور (اعلیٰ قسم کی کھجور) لے کر حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ کھجوریں کہاں سے آئیں؟ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''ہمارے پاس ناقص قسم کی کھجور تھی تو میں نے اپنی دو صاع (ٹوپہ) کھجور کے بدلے ایک صاع کا سودا کر لیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(اَوّہْ! عَیْنُ الرِّبَا عَیْنُ الرِّبَا، لَا تَفْعَل ولکن اذا اردت ان تشتری فبع التمر ببیع اخر ثم اشتربه) [1]

''اوہ! خالص سُود، خالص سُود۔ ایسا مت کرو۔ ہاں جب ایسا ارادہ ہو تو اپنی کھجور الگ بیچو اور پھر دوسرا سودا کر کے اپنے لیے خرید لو۔''

اب دوبارہ ارشاد بھی ملاحظہ فرمایئے، حضرت سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں کہ:

(سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم سئل عن شری التمر باالرطب فقال اینتقص الرطب اذا یبس؟ فقال نعم، فنهاه عن ذالک) (نسائی۔ کتاب البیوع۔ باب اشتراء التمر بالرطب)

''میں نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تازہ کھجور کے عوض خشک کھجور خریدنے کے متعلق پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تازہ کھجور خشک ہو کر وزن میں کم ہو جاتی ہے؟ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا ہاں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے سودے سے منع فرما دیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس براہِ راست تبادلہ سے کیوں منع فرمایا جبکہ نتیجہ پھر بھی (یعنی ناقص جنس فروخت کر کے اس رقم سے اچھی جنس خریدنے پر بھی) اسی کے لگ بھگ ہی رہتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام ایک تو لگ بھگ والی بات کو ختم کرنا چاہتا ہے کہ فریقین میں سے کسی

---

[1] بخاری کتاب الوکالۃ۔ باب اذا باع الوکیل شیئا نیز کتاب البیوع۔ باب بیع الخلط من التمر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو تھوڑا بہت بھی نقصان نہ ہو اور دوسرے یہ کہ ایسے براہِ راست لین دین میں ''زیادہ ستانی'' کی ہوس کو فروغ ملتا ہے۔ مثال کے طور پر حدیث نمبرا میں اگر حضرت بلال رضی اللہ عنہ دو صاع ناقص کھجور منڈی میں بیچتے پھر اس رقم سے برنی کھجور خریدتے تو گمان غالب یہی ہے کہ آپ کو ایک صاع سے زیادہ کھجور مل سکتی تھی۔

ربا النسیئہ اور ربا الفضل کی مرکب شکلیں:

گویا ایک ہی جنس میں، خواہ یہ جنس روپیہ ہو یا گندم ہو یا کوئی اور چیز ہو، اگر زیادتی مدت کے عوض یا ادھار کی شکل میں ہو تو وہ ربا النسیئہ ہے اور اگر بلا مدت یعنی دست بدست لین دین میں ہو وہ ربا الفضل ہے۔ اب اگر ایک ہی جنس کے لین دین میں ادھار اور کمی بیشی دونوں باتوں کو شامل کر لیا جائے تو لین دین کی بیسیوں شکلیں پیدا ہو سکتی ہیں اور ان سب میں کسی نہ کسی طرح سُود کا عنصر شامل ہوگا۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نہایت جامع قسم کا ارشاد فرمایا۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(الذھبُ بالذھب و الفضةُ بالفضةِ والبُرُّ با البرِّ والشعیر بالشعیر والتمر بـالتَّمَـرِ والملح باالملح مثلاً بمثلٍ یـدا بیدٍ فمن زَادَ اَوِستزادَ فقد ربٰی، الاٰخِـذُ والـمُـعْـطِیُ فیه سَوَاءٌ)(مسلم کتاب المساقات والمزارعت۔ باب الربا)

''سونا سونے کے عوض، چاندی چاندی کے، گندم گندم کے، جَو جو کے، کھجور کھجور کے، نمک نمک کے عوض وزن، ماپ میں برابر برابر اور نقد بہ نقد ہوں تو بیع جائز ہے۔ تو جس شخص نے زیادہ لیا یا زیادہ کا مطالبہ کیا اس نے سُود کھایا۔ اور لینے والا اور دینے والا دونوں گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔''

اس حدیث میں چھ اجناس شمار کی گئی ہیں۔ سونا چاندی، گندم، جَو، کھجور اور نمک۔ اگر ان کا برابر برابر اور دست بدست لین دین ہو تو ٹھیک ورنہ بیع درست نہ ہوگی۔ حدیث میں مثل بمثل کے الفاظ ربا الفضل کی نہی کے لیے اور یـداً بیـدٍ کے الفاظ ربا النسیئہ کی نہی کے لیے آئے ہیں اور ان میں جو چھ اجناس شمار کی گئی ہیں ان میں سے سونا اور چاندی تو زر مبادلہ ہیں اور باقی چار اہم خوردنی اجناس ہیں۔ بخاری کی ایک دوسری روایت میں منقہ کا بھی ذکر ہے۔ کیونکہ وہاں انگور بھی بکثرت پیدا ہوتا تھا۔

اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل امور کو بغور سمجھ لینا چاہیے:

۱۔ اگر جنس تبدیل ہو جائے تو لین دین درست ہوگا۔ مثلاً ۳ کلو گندم کا تبادلہ ۴ کلو جَو سے، یا ایک کلو کھجور کا تبادلہ ۳ کلو نمک کے عوض۔ اس میں برابر برابر کی قید تو ختم ہو جائے گی مگر نقد بہ نقد کی بحال رہے گی۔ یہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں ہوسکتا کہ ۳ کلو گندم تو آج لے لے اور ۴ کلو جو ۳ ماہ بعد دے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

(فاذا اختلف هذه الاصناف فبيعوه كيف شئتم اذا كان يداً بِيَدٍ) (ابوداود۔ کتاب البیوع۔ باب فی الصرف)

''''پھر اگر جنس مختلف ہو جائے تو جیسے چاہو لین دین کرلو۔ بشرطیکہ یہ تبادلہ دست بدست (یعنی نقد بہ نقد) ہو۔

۲۔ اگر ۳ کلو گندم کی، جَو سے مثلاً تین ماہ کے ادھار پر بیع کرنا چاہے تو یہ اس صورت میں جائز ہوگی کہ بیع کے دن گندم کا نرخ دریافت کر کے قیمت لگائی جائے اور تین ماہ بعد اس رقم کے جتنے جَو مارکیٹ ریٹ کے حساب سے آسکتے ہوں، اتنے ہی لیے جائیں۔ ●

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

اس حدیث سے بھی ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک ہی جنس مثلاً ایک کلو گندم کا ایک ہی کلو گندم سے تبادلہ کرتا کون ہے؟ اور اس کا فائدہ کیا ہے کہ کوئی ایسا تبادلہ کرے؟ تبادلہ یوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک فریق مثلاً الف کی گندم بہتر ہے اور دوسرے فریق مثلاً ب کی گندم ناقص ہے تو اس صورت میں ب تو ضرور تبادلہ پر آمادہ ہو جائے گا مگر الف کو یہ بات کب گوارا ہوگی۔ الا یہ کہ وہ احسان سمجھ کر ایسا گوارا کر لے۔ اس ارشاد مبارک سے آپ ﷺ کی مراد بھی یہی ہے کہ اگر ایک بھائی دوسرے کے لیے اتنا احسان کرسکتا ہے تو کرے ورنہ ایسا سودا نہ کیا جائے۔ گویا یہ حدیث کمی بیشی کے لین دین کی انتہائی ممانعت پر دلالت کرتی ہے۔ جس کے الفاظ اس ممانعت کی تاکید مزید کررہے ہیں۔

شبہ نمبر ۲ اور اس کا ازالہ:

اور ایک ضرورت مند دوسرے سے یہ کہتا ہے کہ آج مجھے ایک من گندم دے دو۔ دو ماہ بعد جب گندم پک جائے گی تو میں ادا کر دوں گا۔ یہ صورت صرف جائز ہی نہیں بلکہ بہت بڑا کارِ ثواب ہے۔ حالانکہ اس میں جنس ایک ہے اور وزن بھی برابر ہے۔ مگر نقد بہ نقد والی شرط پوری نہیں ہو رہی۔ اس لحاظ سے تو یہ بیع ناجائز ہونا چاہیے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بیع نہیں بلکہ قرض حسنہ بن گیا۔ جس کے احکام بالکل جدا ہیں۔ یہ دراصل

● مشکوٰۃ: کتاب البیوع، باب المنهى عنها عن البيوع۔ فصل ثانی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بیع کے احکام میں ضرورت مندوں کے لیے یہ ایک رخصت ہے۔ جیسے کہ (بیع نہیں) عرایا میں بھی غریبوں کے لیے رخصت رکھی گئی ہے۔

سُود کے چور دروازے:

۱۔ مقروض سے ہدیہ وصول کرنا سُود کا چور دروازہ ہے:

حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ بن ابو موسیٰ کہتے ہیں کہ میں مدینہ آیا تو عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے ملا۔ وہ مجھے کہنے لگے:

(انک بارض فیھا الربوا فاش فاذا کان لک علی رجلٍ حقٌّ فاھدی الیک حمل تبنٍ اوحمل شعیرا وحمل قتٍ فلا تاخذہ فانہ ربوا.) (بخاری۔ کتاب المناقب۔ باب مناقب عبداللہ بن سلام)

''آپ ایسی سرزمین میں رہتے ہیں جہاں سُود کا علانیہ رواج ہے۔ سو اگر تیرا کسی شخص پر حق (قرضہ) ہو اور وہ تجھے بھُس کا گٹھا، یا جَو یا گھاس کا گٹھا ہدیہ دے تو مت قبول کر۔ کیونکہ وہ سُود ہے۔''

اسی طرح کی ایک حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(اذا اَقْرَضَ الرجلَ فَلا تَاْ خُذْ ھَدِیَّۃً) (رواہ البخاری فی تاریخہ)

''جب کوئی شخص کسی دوسرے کو قرضہ دے تو پھر اس سے ہدیہ قبول نہ کرے۔''

ہاں اگر مقروض اور قرض خواہ کے درمیان اس قرضہ سے پہلے بھی ایک دوسرے کو ہدیہ دینے دلانے کے مراسم ہوں تو پھر مقروض سے ہدیہ لے لینے میں کوئی حرج نہیں۔ [1]

۲۔ سفارش کرنے والے کو بھی ہدیہ قبول کرنا ممنوع ہے اور یہ سُود ہے:

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(مَن یشفع لِاَحَدٍ شفاعۃً فاھدی لہ ھدیَّۃً علیھا فتقبَّلَھَا فقد اَتٰی بابًا عظیمًا من ابواب الربٰوا) (ابوداؤد۔ کتاب البیوع۔ باب فی الھدیۃ لقضاء الحاجۃ)

''جو شخص کسی دوسرے کی سفارش کرے۔ پھر وہ اس سفارش کے عوض اس سفارش کرنے والے کو کوئی تحفہ بھیجے اور وہ اسے قبول کر لے تو وہ سُود کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔''

---

[1] ابوداؤد۔ کتاب البیوع۔ باب فی الھدیۃ لقضاء الحاجۃ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۔نقد اور اُدھار کی الگ الگ قیمت ممنوع ہے۔یعنی اُدھار کی قیمت میں زیادتی سُود ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

(نَهٰى رسول الله ﷺ عن بَيْعَتَيْنِ فِي بيعةٍ)(ترمذی۔ابواب البیوع۔باب فی النھی عن بیعتین فی بیعةٍ)

''رسول اللہ ﷺ نے ایک سودے میں دو سودوں سے منع فرمایا ہے۔''

اور ابوداؤد میں روایت یوں ہے:

(من باع بيعتين في بيعة فلهٗ اَوْكَسُهُمَا اَوِالرِّبا)(ابوداؤد۔کتاب البیوع باب فیمن باع بیعتین فی بیعةٍ)

''جس نے ایک چیز دو مختلف صورتوں میں بیچی تو خریدار کم قیمت والی کا مستحق ہے یا پھر وہ سُود ہے۔''

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ایک ہی چیز کی نقد قیمت کم اور اُدھار قیمت زیادہ رکھنا ممنوع ہے اور جو رقم نقد قیمت سے زائد ہوگی۔وہ سُود ہے۔بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ ایک بیع دو بیع کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے۔جبکہ ایک ہی شخص سے یہ کہا جائے کہ مثلاً اگر نقد لو تو چار سو روپے اور چھ ماہ کے اُدھار پر لو تو ساڑھے چار سو روپے۔لیکن اگر کوئی شخص نقد کی قیمت ہی الگ مقرر کرتا ہے اور نقد والوں کو چار سو روپے میں دیتا ہے اور اُدھار کی قیمت میں ساڑھے چار سو روپے رکھتا ہے اور اُدھار والوں کو اس نرخ پر دیتا ہے۔کیونکہ یہ ایک ہی شخص سے دو بیع نہیں ہیں۔

اقساط پر فروخت ہونے والی اشیاء:

لیکن ہم اس جواب پر مطمئن نہیں۔کیونکہ ہمارے ہاں اقساط پر اشیاء فروخت کرنے کا عام رواج ہے۔اور یہ ایک آدمی سے ایک ہی بیع ہوتی ہے۔لیکن اگر کوئی شخص اپنی باقی ماندہ اقساط کی مجموعی رقم یک مشت ادا کر دے تو اقساط کی نسبت سے باقی قیمت میں کمی کر دی جاتی ہے۔اب سوال یہ ہے کہ اگر اس اُدھار میں سُود شامل نہ تھا۔تو اقساط کی نسبت سے مقررہ نرخ پر رقم مجرا کیسے مل جاتی ہے؟

ہاں اگر کسی نے ایک چیز تین ماہ کے اُدھار پر خریدی اور تین ماہ گزرنے سے پیشتر ہی خریدار کو رقم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میسر آ گئی اور اس نے وہ رقم بائع کے حوالہ کر دی۔ اور بائع خوش ہو کر اپنی مرضی سے کچھ رقم چھوڑ دے یا واپس کر دے، جو اس نے طے نہ کی تھی، تو یہ صورت جائز ہے اور اس میں کچھ قباحت نہیں۔

۴۔ بیع عینہ:

یہ ایسی بیع ہے جس میں حیلہ سازی کے ذریعہ سُود کو بیع کی شکل دے کر اسے جائز بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے۔ مثلاً الف کو کچھ نقد رقم کی ضرورت پیش آ گئی لیکن اس کے پاس نقد رقم موجود نہیں اور وہ سُود میں ملوث بھی نہیں ہونا چاہتا تو وہ ب سے کوئی چیز مثلاً ایک گھوڑا پانچ ہزار روپے میں ایک سال کے وعدہ پر خریدتا ہے۔ پھر ایک دو دن بعد الف وہی گھوڑا ب کے پاس ہی چار ہزار روپے نقد میں فروخت کر کے اس سے نقد چار ہزار روپے وصول پا لیتا ہے۔ اور سال بعد الف کو پانچ ہزار روپے ادا کر دیتا ہے۔ اس حیلہ بازی سے الف کو فوراً رقم میسر آ گئی اور ب کو ایک سال بعد ایک ہزار روپے منافع مل گیا جو دراصل چار ہزار روپے کا ایک سال کا سُود تھا۔ گھوڑے کی بیع کو درمیان میں لا کر سُود کو حلال بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ بیع عینہ کہلاتی ہے [1] اور یہ خالص سُود ہے۔ اور الف اور ب دونوں ایک جیسے گنہگار ہیں۔

اس سے ملتی جلتی وہ شکل ہے جس کے ذریعہ پاکستان کے بنکوں میں شراکتی کھاتوں کو سُود سے پاک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور جس کا بیان آگے آ رہا ہے۔

موجودہ دور میں چند معروف سُودی لین دین:

آج کل سُود پوری قوم کے رگ و ریشہ میں کچھ اس طرح سرایت کر گیا ہے جس سے ہر شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہو رہا ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ:

(لیاتین علی الناس زمان لا یبقی احدٌ اِلَّا اٰکِل الربوا فان لم یاکله اصابه من بخاره وَرُوِی من غباره) (نسائی۔ کتاب البیوع۔ باب اجتناب الشبہات فی الکسب)

”لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ ہر کوئی سُود کھانے والا ہو گا۔ اور اگر سُود نہ کھائے تو بھی اس کا بخار (اور دوسری روایت میں اس کا غبار) اسے ضرور پہنچ کر رہے گا۔“

---

[1] [illegible] کتاب البیوع۔ باب فی العینة

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آج ایک مسلمان اگر پوری نیک نیتی سے بچنا بھی چاہے تو اسے کئی مقامات پر الجھن پیش آتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص اس وقت تک نئی گاڑی خریدنے کے بعد چلا نہیں سکتا۔ جب تک اس کا بیمہ نہ کرائے۔ اور بیمہ کا کاروبار کیسا ہوتا ہے؟ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

اسی طرح اپنی بچت یا زائد رقم کو کہیں محفوظ رکھنے کا معاملہ ہے۔ جس کی ضرورت تقریباً ہر شخص کو پیش آتی ہے اور لامحالہ اسے بنک کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ وہ خود سُود نہ بھی لے تو بھی بنک تو اس کے پیسہ سے سودی کاروبار کرتا ہے۔

تاجر پیشہ حضرات بنک سے تعلق رکھے بغیر نہ مال برآمد کر سکتے ہیں نہ درآمد۔ ان کے لیے آسان راہ یہی ہے کہ وہ بنک سے ایل۔ سی (Letter of Credit) یا اعتماد نامہ حاصل کریں۔ اس میں بنک کا بھی فائدہ کہ اسے بغیر رقم دیے ایک مدت تک سود ملتا ہے اور تاجر کا بھی فائدہ کہ پوری رقم کا کچھ حصہ ہی ادا کرنے سے اس کا مال درآمد ہو جاتا ہے۔ اور بقایا رقم وہ مال آنے کے بعد ادا کرتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص سُود سے بچنا چاہے بھی تو اسے خاصی مشکلات پیش آتی ہیں۔ گویا آج کے دَور میں حرام کی راہیں وافر اور آسان بنا دی گئی ہیں اور حلال کی کمیاب اور دشوار تر۔ اب کون اتنا متقی ہو گا جو دنیوی لحاظ سے نقصان میں بھی رہے اور دشواریاں بھی جھیلے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال منڈیوں کے تاجروں کی ہے۔ ان میں شاید ہی کوئی سُودی لین دین سے بچا ہوا ہو گا۔ اندریں صورت حال رسول اللہ ﷺ کی یہ پیشین گوئی ایک ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آ رہی ہے۔ کہ اگر کوئی شخص سُودی لین دین نہ بھی کرے تو بھی اس کا غبار اسے پہنچ کر رہے گا۔

اس تمہید کے بعد اب ہم چند ایسے ہی سُودی معاملات کا ذکر کریں گے۔

ا۔ بیمہ پالیسی:

بیمے کی ابتدا خالص انسانی ہمدردی کے جذبہ سے شروع ہوئی تھی۔ تقریباً ۱۴۰۰ میں اٹلی کے تاجروں میں سے ایک تاجر کا جہاز سمندر میں غرق ہو گیا اور وہ انتہائی تنگ دست ہو گیا۔ دوسرے تاجروں نے اس کے ساتھ تعاون کیا اور اس کے لیے کچھ رقم اکٹھی کر کے اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چونکہ ایسے حوادث کا آئندہ بھی امکان تھا، لہٰذا ان تاجروں نے آپس میں ایک تجویز منظور کی کہ آئندہ تمام تاجر ہر ماہ ایک معین رقم ادا کر دیا کریں تا کہ اس قسم کے حوادث کے نقصان کا کسی حد تک تدارک کیا جا سکے۔

لیکن آہستہ آہستہ امداد باہمی کا یہ ادارہ کاروباری شکل اختیار کرنے لگا اور ایسے ادارے کا نام انشورنس کمپنی (Insurence Company) تجویز ہوا۔ انشورنس ''یقین دہانی'' کو کہتے ہیں بیمہ اسی انگریزی لفظ کا ترجمہ ہے۔ گویا بیمہ کمپنی ایک ایسا ادارہ ہے جو آفات و حوادث کے وقت نقصان کی تلافی کی یقین دہانی کراتا ہے۔

ابتداءً املاک (مثلاً بس، ٹرک، جہاز، عمارات وغیرہ) کا بیمہ شروع ہوا۔ بعد ازاں انسانی زندگی کا بھی بیمہ شروع ہو گیا۔ آج کل اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہو چکا ہے۔ انسان کے ایک ایک عضو کا بیمہ جانوروں کا بیمہ اور بعض ذمہ داریوں (مثلاً بچوں کی تعلیم اور شادی وغیرہ) کا بھی بیمہ کیا جاتا ہے۔

بیمے کے کاروبار کو بیشتر ممالک میں بنکوں کی طرح حکومت کی سرپرستی حاصل ہے اور بعض اوقات تو مجبوراً زندگی اور املاک کا بیمہ کرانا پڑتا ہے۔ ۱۹۷۳ء سے پہلے پاکستان میں کمپنیاں نجی طور پر بیمے کا کاروبار کرتی تھیں لیکن ۱۹۷۳ء میں حکومت نے ان کو اپنی تحویل میں لے لیا اور ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی بے شمار کمپنیوں کو مدغم کر کے سٹیٹ لائف کے نام سے اس کاروبار کو مزید فروغ بخشا۔ آج کل ہر سرکاری و نیم سرکاری ملازم، نیز ہر صنعتی اور تجارتی ادارے کے ملازم کا بیمہ لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس کی موت یا حادثے کی صورت میں مقررہ رقم اس کے ورثاء کو مل جاتی ہے جو حکومت یا متعلقہ ادارہ ادا کرتا ہے۔

بیمے کی شرائط:

بیمہ کی جانے والی اشیاء میں سے چونکہ زندگی کا بیمہ ہی سب سے اہم ہے۔ لہٰذا ہم اسی کو زیر بحث لانا چاہتے ہیں۔

ایک شخص اگر اپنی زندگی کا بیمہ کرانا چاہے تو اس کا طریق کار یہ ہے کہ بیمہ کمپنی کا ڈاکٹر اس کی صحت کا معائنہ کر کے اندازہ کرتا ہے کہ یہ شخص اتنی مدت مثلاً مزید بیس سال تک طبعی طور پر زندہ رہنے کے قابل ہے۔ اب بیمہ کمپنی اور بیمہ دار کے درمیان ایک معاہدہ طے پاتا ہے۔ بیمہ دار جتنی رقم بیمہ کرانا چاہتا ہے۔ اسے سالانہ اقسام میں تقسیم کر کے بالاقساط بیمہ کمپنی کو ادا کرتا رہتا ہے۔ شرائط بالعموم یہ ہوتی ہیں:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اگر بیمہ دار اپنی مدت مجوزہ تک زندہ رہے اور اقساط بیمہ کمپنی کو ادا کرتا رہتا ہے تو اس مدت کے اختتام پر اس کو اس کی تمام جمع شدہ رقم مع مقررہ شرح کے سود جسے بیمہ کمپنی کی اصطلاح میں ایک معصوم سا نام ''بونس'' (فالتو رقم) دیا گیا ہے۔ ادا کر دی جاتی ہے۔

۲۔ اگر دورانِ مدت بیمہ، بیمہ دار طبعی طور پر یا کسی حادثہ کے نتیجہ میں مر جاتا ہے تو اب تک اس کی جمع شدہ رقم مع سود اس کے ورثاء کو، جنہیں وہ خود ہی نامزد کر چکا ہوتا ہے، مل جاتی ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ادائیگی اقساط کی مدت جتنی کم ہوگی، یا بالفاظ دیگر بیمہ دار جتنی جلدی مرتا ہے۔ شرحِ سود اسی نسبت سے زیادہ ہوتی ہے۔

۳۔ اگر بیمہ دار کسی خاص مجبوری سے یا بالارادہ اقساط دینا چھوڑ دے تو پہلی ادا کردہ اقساط بحق کمپنی ضبط متصور ہوتی ہیں۔ الا یہ کہ پالیسی پھر سے شروع کر دی جائے اور غیر ادا شدہ اقساط یکمشت ادا کر دی جائیں۔

آج کل اس شق میں یہ ترمیم کی گئی ہے کہ پالیسی ختم کرنے والے کو کل ادا شدہ رقم کا ۶۰ فیصد رقم واپس مل جاتی ہے۔

املاک یا بیمے کی دوسری اقسام میں بھی اس سے ملتی جلتی شرائط طے پاتی ہیں۔

بیمہ پالیسی کا اسلامی نقطہ نظر سے تجزیہ:

تھوڑا سا غور کرنے پر ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ بیمہ پالیسی چند در چند شرعی جرائم و منہیات سے ترکیب پاتی ہے۔ جو درج ذیل ہیں:

۱۔ شرط نمبر ۱ میں اصل ادا شدہ رقم سے زائد (مقررہ شرح سے) جو رقم ملتی ہے وہ سُود ہے جس کی حرمت میں کسی قسم کا شک نہیں۔

۲۔ شرط نمبر ۲ کے مطابق جو آدمی ایک آدھ قسط ادا کرنے کے بعد مر جاتا ہے تو اسے اس کی ادا کردہ رقم سے کئی گنا زائد رقم مل جاتی ہے، جو جوئے (میسر) سے مشابہت رکھتی ہے۔ تھوڑی سی محنت پر اتفاقی طور پر بہت زیادہ رقم مل جانے کو ہی میسر کہا جاتا ہے۔ جسے قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے۔

۳۔ شرط نمبر ۳ شرعی احکام وراثت کو بھی متاثر کرتی ہے۔ کیونکہ اگر ایک شخص اپنی بیوی یا بیٹے کو اپنا وارث نامزد کرتا ہے تو کمپنی اسی خاص آدمی کو رقم حوالہ کرنے کی پابند ہوتی ہے۔ جبکہ عام حالات میں اگر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کوئی شخص ایسی غلط وصیت کر بھی جائے تو وہ قانوناً غیر موثر ہوتی ہے۔غلط قسم کی وصیت بجائے خود ایک گناہ ہے۔قرآن کے واضح احکام کی موجودگی میں ایسی غلط وصیت پر نہ کوئی عمل پیرا ہوتا ہے نہ دوسرے وارث اسے ہونے دیتے ہیں اور نہ ہی قانوناً وہ ہوسکتا ہے۔لیکن بیمہ کمپنی کی شرائط کی رُو سے۔ جسے عموماً حکومت کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔نامزد وارث دوسرے وارثوں کا حق غصب کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

۴۔ ایسے واقعات بھی منظر عام پر آتے ہیں کہ نامزد وارث بیمہ دار کو، محض حصول زر کی خاطر، کسی حیلے بہانے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔اسے یہ تو پہلے ہی یقین ہوتا ہے کہ دوسرے وارث اس رقم سے حصہ نہیں بانٹ سکتے۔''یہ یقین دہانی'' اسے قتل جیسے جرم کے ارتکاب پر دلیر بنا دیتی ہے۔ایسی ہی صورت بیمہ کی دوسری شکلوں میں پیش آسکتی ہے۔مثلاً املاک کے بیمہ دار کئی دفعہ انہی املاک کو اپنے ہاتھوں تلف کرتے دیکھے گئے ہیں کہ وہ کمپنی سے زیادہ فائدہ حاصل کرسکیں۔

۵۔ شرط نمبر ۳ کے مطابق اگر کوئی شخص پالیسی جاری نہیں رکھ سکتا یا رکھنا نہیں چاہتا تو اس کی جمع شدہ رقم کا ۴۰ فیصد ضبط کرلینا شرعی احکام کے خلاف ہے۔

۶۔ شرط نمبر ۳ کے مطابق نہ تو بیمہ دار کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنی قسطیں ادا کرے گا اور نہ بیمہ کمپنی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا وصول کرسکے گی اور اسے کیا کچھ ادائیگی کرنا پڑے گی۔لہٰذا یہ ''اندھا سودا'' یا بیع غرر ہے جو قطعاً ناجائز ہے۔

بیمے کے مزعومہ فوائد اور ان کا شرعی متبادل حل:

بیمہ کے درج ذیل فوائد بیان کیے جاتے ہیں اور سماجی تحفظ کے نام سے انہیں مقبول بنانے کی کوشش کی جاتی ہے:

۱۔ رقم آسان اقساط کی صورت میں جمع ہوتی رہتی ہے اور معینہ مدت کے بعد منافع (سُود) سمیت واپس مل جاتی ہے گویا سرمایہ بھی محفوظ رہتا ہے اور اس میں اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔

۲۔ حوادث کی صورت میں نقصان کی تلافی ہوسکتی ہے۔

۳۔ متوفی کا بڑا بیٹا اگر خود سر ہو تو وہ جائز وارثوں یعنی اور چھوٹے بھائیوں کا حق غصب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔جبکہ بیمہ کمپنی متوفی کی آرزو کے مطابق اس کے نامزد کردہ وارث یا وارثوں کو یہ رقم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ادا کرتی ہے۔علاوہ ازیں بڑا بھائی چھوٹے بھائیوں کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ذمہ داری کے بیمہ کی صُورت میں بیمہ کمپنی ایسی اولاد کی اعلیٰ تعلیم اور شادیوں کے اخراجات کی کفیل ہوتی ہے۔

۴۔ عام حالات میں ایک غریب آدمی کے لیے کچھ رقم پس انداز کرنا یا ترکہ چھوڑنا کچھ مشکل سا کام ہے۔پالیسی کی صُورت میں تھوڑی تھوڑی جمع شدہ رقم یتیموں اور بیواؤں کا سہارا بنتی اور آڑے وقت میں ان کے کام آتی ہے۔

تھوڑا سا غور کیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ مندرجہ بالا تمام تر صورتِ حال سرمایہ دارانہ نظام ایک مخصوص ذہن عطا کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنا ہی فائدہ سوچتا ہے اور دوسرے کی احتیاج اور مشکلات سے بے نیاز رہتا ہے اور یہ بات اسلامی معیشت کی رُو سے سراسر غلط ہے۔جس کا پہلا سبق ہی یہ ہے کہ:

(لا یومن احدکم حتی یحب لاخیه ما یحب لنفسه) (بخاری۔کتاب الایمان۔ باب ای الاسلام افضل)

''کوئی شخص اس وقت تک ایماندار نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

لہٰذا اسلامی نظامِ معیشت میں ان مندرجہ بالا صورتوں میں سے کچھ تو پیدا ہی نہیں ہوتیں، کیونکہ بیت المال میں وہ یقین دہانی موجود ہے جو ایک بیمہ کمپنی کرواسکتی ہے۔اور اگر کچھ ہوتی ہیں ان کا واضح حل موجود ہے۔

اب ہم علی الترتیب مندرجہ بالا ''قواعد'' کا جائزہ لیں گے۔

۱۔ جہاں تک سرمایہ کے جمع ہونے، اس کے تحفظ اور اس میں اضافے کا تعلق ہے تو یہ کام کاروبار یا تجارت کی صُورت میں بیمہ یا بنک سے بہتر بھی ہوسکتا ہے۔سود پر رقم لینے والے بنک اور بیمہ کمپنیاں بھی بالآخر کاروبار ہی کرتے ہیں۔جو ہمارے دعویٰ کا واضح ثبوت ہے۔لہٰذا اصل مسئلہ ان اداروں کو سود سے پاک کرنے کا ہے نہ کہ عوام کو سودی کاروبار میں پھنسانے کا۔

آج کے دور میں بھی کئی مشترکہ سرمائے کی کمپنیاں بلاسُود کاروبار کر رہی ہیں اور اب تو کئی ایسے بنک بھی قائم ہو چکے ہیں جو تجارت کی بنیادوں پر چل رہے ہیں۔ایسے اداروں میں رقوم جمع کرانے سے جہاں تمام مطلوبہ فوائد حاصل ہوتے ہیں وہاں سُود کی کسک سے بھی انسان کو نجات مل جاتی ہے۔

۲۔ **حوادث کے موقع پر نقصان کی تلافی:** اسلام نظامِ معیشت میں ایسی صورتوں میں حسبِ ضرورت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بیت المال کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور بیت المال کی ذمہ داری ہے کہ وہ مناسب امداد فراہم کرے۔ موجودہ دَور میں اس کا حل وہی ہے جہاں سے بیمے کی ابتدا ہوئی تھی۔ مثلاً بسوں اور ٹرکوں کے مالک ایسی انجمن بنائیں جس میں وہ ماہانہ چندہ اور عطیات ادا کریں پھر اس رقم کو تجارت پر لگائیں اور منافع تقسیم کرنے کے بجائے حوادث کی تلافی کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ بلکہ حسبِ ضرورت اصل سرمائے سے بھی رقم استعمال کی جاسکتی ہے۔ کسی بس یا ٹرک کا ایکسیڈنٹ ہو جائے یا جانی نقصان کی وجہ سے کچھ معاوضہ ادا کرنا پڑے تو اس فنڈ سے ادا کر دیا جائے۔

یہ طریقہ اس لحاظ سے بھی بہتر ہے کہ حوادث پر کنٹرول کی فکر خود انجمن کو ہوگی۔ وہ خود ایسی تجاویز مرتب کرے گی جس سے حادثات کم سے کم رونما ہوں۔ نیز ان میں رقابت کے بجائے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں گے۔ علاوہ ازیں بیمہ کی صورت میں بعض مالکان خود اپنی املاک تلف کرنے کا ارتکاب کرتے ہیں تاکہ وہ بیمہ کمپنی سے معقول رقم وصول کر سکیں۔ ایسے قومی معیشت کو تباہ کرنے والے جرائم سے بھی انسان کو نجات مل جائے گی۔

الغرض ہر قسم کے کاروبار کرنے والے اور پیشہ ور حضرات ایسی انجمنیں بنا کر اپنے مسائل بیمہ پالیسی سے بہتر صورت میں حل کر سکتے ہیں۔

۳۔ **متروکہ مال کی تقسیم میں گڑبڑ:** بیمہ کمپنی کی شرائط میں شریعت کے قانونِ وراثت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ اور یہ ایک بہت بڑا جرم ہے۔ پھر چونکہ بیمہ کمپنی حکومت کی تحویل میں ہے۔ لہٰذا ایسی رقم جو کسی نامزد وارث نے بیمہ کمپنی سے حاصل کی ہو، اسے اس سے واپس لے کر شرعی قانون کے مطابق تقسیم کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ بلکہ یہ ایک ناممکن سی بات ہے۔

رہا بڑے بیٹے کے خودسر ہونے کا سوال تو ایسی صورت میں ''وصیت'' کا انتظام موجود ہے۔ اگر ایسا خطرہ ہو تو متوفی اپنی برادری سے یا برادری سے باہر سے بھی کسی قابل اعتماد اور دیانت دار آدمی کو وصی مقرر کر سکتا ہے۔ اگر مرنے والا خود وصی مقرر نہیں کر سکا تو حاکمِ وقت یا اس کے کسی بھی نائب کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ وصی مقرر کر دے۔

وصی کے باضابطہ فرائض ہیں اور وہ ان کے لیے جواب دہ ہے۔ وصی کے فرائض یہ ہیں کہ وہ ترکہ حسبِ دستورِ شریعت تقسیم کرے اور اگر بچے عیاش یا ابھی نادان ہوں تو متروکہ جائداد کو یا تو بیت المال

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں جمع کرادے یا اپنے پاس بطور امانت رکھے اور حسب ضرورت اس سے خرچ کرتا رہے اور جب حالات سازگار ہوں تو ان کا بقایا ان میں شرعی دستور کے موافق تقسیم کر دے۔ گویا وصیت کے نظام میں ''ذمہ داریوں'' کا مکمل حل بھی موجود ہے اور کسی شرعی جرم کا ارتکاب بھی نہیں کرنا پڑتا۔

وصایا کے اس نظام پر عہد نبوی اور دورِ صحابہ میں برابر عمل ہوتا رہا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے کئی بار یہ ذمہ داری قبول فرمائی۔ حضرت زبیر بن عوام اس ''بار وصایت'' کے اٹھانے میں بہت مشہور تھے۔ چنانچہ سات جلیل القدر صحابہ نے آپ کو وصی مقرر کیا تھا۔ ●

۴۔ **پس ماندگان کی امداد:** ایسے یتیم اور بیوہ جن کی گزر اوقات کے لیے کچھ ترکہ نہ ہو، ان کی پرورش کی ذمہ داری میت کے اولیاء اور ورثاء پر ہے اگر ان میں کوئی بھی نہ ہو یا وہ اس ذمہ داری سے غافل رہیں یا کمزور ہوں اور نبھانے کی طاقت نہ رکھتے ہوں۔ تو یہ ذمہ داری عام مسلمانوں پر بھی ہے۔ یتیم اور بیوہ کی پرورش بہت بڑے اجر و ثواب کا کام ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی دونوں ساتھ والی انگلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

(انا و کافل الیتیم کھاتین فی الجنة) (بخاری۔ کتاب الادب۔ باب فضل من یعُول یتیماً)

''میں اور یتیم کا پرورش کرنے والا جنت میں اس طرح ساتھ ساتھ ہوں گے۔''

اور اگر یہ بات بھی میسر نہ آئے تو ان کی کفالت کی ذمہ داری بیت المال پر ہے۔

علاوہ ازیں موجودہ دور میں اس کا حل برادری کی تنظیم ہے۔ جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ہر برادری، برادری کی سطح پر اپنا بیت المال قائم کرے جس سے پس ماندگان کی وقتی امداد کے علاوہ کئی دوسرے فوائد بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ جو بیمہ کمپنی کے ذریعے میسر نہیں آ سکتے۔

بیمہ کمپنی اور بیت المال کا تقابلی مطالعہ:

اب ہم ان بیمہ کمپنیوں یا سماجی تحفظ دینے والے ادارہ کا چند پہلوؤں میں بیت المال سے موازنہ پیش کرتے ہیں:

۱۔ بیمہ کمپنی صرف اس شخص کی امداد کرتی ہے جو بیمہ دار ہو، عام لوگوں سے اس کا کچھ تعلق نہیں ہوتا،

● بیمہ زندگی از مفتی محمد شفیع صاحب ص۵۱، ۵۲ بحوالہ ہدایہ، ص۶۷۹

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جبکہ بیت المال ہر مصیبت زدہ اور پریشان حال کی امداد کو پہنچتا ہے۔ خواہ اس نے بیت المال میں عمر بھر ایک پیسہ بھی جمع نہ کرایا ہو یا وہ جمع کرانے کے قابل ہی نہ ہو۔

۲۔ بیمہ کمپنی کے بیمہ دار یا امیر طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں یا متوسط طبقہ کے جو کچھ بچت کر سکتے ہوں اور وقت آنے پر یہی لوگ بیمہ کمپنی سے فائدہ بھی اُٹھاتے ہیں۔ جبکہ بیت المال سے فیض یاب ہونے والا بالعموم غریب طبقہ ہوتا ہے جو بچت تو کیا کرے گا، اکثر مقروض ہی رہتا ہے۔

۳۔ بیمہ کمپنی ایک خالص سودی کاروباری ادارہ ہے اور صرف منافع کے حصول کی خاطر یہ دھندہ کرتا ہے۔ تعاون اور سماجی تحفظ محض ایک ڈھونگ ہے۔ وہ جمع شدہ رقوم کے سود سے کچھ حصہ بیمہ داروں کی نذر کرتا ہے۔ باقی سب کچھ اس کا اپنا ہی ہوتا ہے۔ اس کاروبار میں اس کا اپنا منافع کتنا ہوتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ ۱۹۷۸ء میں امریکہ کی بیمہ کمپنیوں کو اپنے بیمہ داروں سے ۹۸ ارب ڈالر کی رقم وصول ہوئی اور اس رقم میں سے انہوں نے صرف ۴ ارب ڈالر اپنے بیمہ داروں کو ادا کیے۔ اس طرح ان لوگوں نے ۹۴ ارب ڈالر کی رقم اپنے پاس جمع کر لی۔ ●

گویا بیمہ کمپنی کا کاروبار بنکوں کے کاروبار سے بھی زیادہ نفع بخش ہے۔ اور معیشت پر اس کے بعینہٖ وہی اثرات مرتب ہوتے ہیں جو سود سے ہوتے ہیں۔ یعنی عوام کی دولت سے فائدہ صرف امیر طبقہ ہی اٹھاتا ہے۔ بالفاظ دیگر گردش دولت کا رُخ غریب سے امیر کی طرف ہوتا ہے اور یہ اسلامی روح کی عین ضد ہے۔

جبکہ بیت المال کوئی کاروباری ادارہ نہیں۔ وہ صرف حاجت مندوں کی حاجت روائی کے لیے قائم کیا جاتا ہے جس میں اغنیاء سے رقوم وصول کر کے غریبوں تک پہنچائی جاتی ہیں۔

۴۔ بیمہ کے نظام کو تعاون و تکافل کا نام دینا دراصل حقائق سے چشم پوشی ہے۔ بیمہ کمپنی ہر بیمہ دار سے علیحدہ علیحدہ دوطرفہ معاہدہ کرتی ہے۔ اور کوئی بھی بیمہ دار دوسرے بیمہ دار سے کسی اخلاقی یا قانونی رشتے میں منسلک نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ ایک دوسرے کے نقصان کی تلافی کے پابند ہوتے ہیں۔ نقصان کی تلافی یا بیمہ کی رقم ادا کرنے کی پابند صرف بیمہ کمپنی ہوتی ہے۔ بیمہ کمپنی کے اس تعاون و تکافل کے دعویٰ کے باطل ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ خود بیمہ کمپنی کے مالکوں تک کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ خود بھی اس کمپنی کے بیمہ دار بنیں۔ گویا جن خوبیوں کا وہ دن رات پروپیگنڈہ کرتے ہیں ان پر وہ خود ایمان لاتے ہیں اور نہ ہی اس پر عمل پیرا ہونا پسند فرماتے ہیں۔

● روزنامہ جنگ، ۱۰ رمئی ۱۹۷۹ء۔ بحوالہ اسلام اور جدید اقتصادی نظریات، ص ۲۷۶ از پروفیسر منور حسن چیمہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کے برعکس بیت المال کا یہ حال ہے کہ اسے قائم کرنے والے سب سے پہلے خود اس پر ایمان لاتے اور اس کے حصہ دار بنتے ہیں، اگر وہ اس قابل ہوں۔ اور تعاون و تکافل کی یہ صورت کہ اس معاشرہ میں اگر ایک شخص کو کوئی تکلیف پہنچے تو دوسرا فوراً اس کی مدد کو اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور بیت المال کی طرف رجوع تو آخری چارۂ کار کی صورت میں ہوتا ہے۔

۲۔ پراویڈنٹ فنڈ

اسی طرح کا ایک مسئلہ سرکاری، نیم سرکاری اور بعض دوسرے تجارتی اداروں کے ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ کا ہے۔ جس میں کچھ رقم تو ملازموں کی اپنی تنخواہ سے ماہوار وضع ہوتی اور جمع ہوتی رہتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ سود در سود کے حساب سے اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اب اس سود کی رقم کا کیا کیا جائے۔ یہ مسئلہ ان لوگوں کے لیے خاصی الجھن کا سبب ● بنا ہوا ہے۔ جو سود کو حرام سمجھ کر اسے قبول کرنا گوارا نہیں کرتے۔ بعض لوگوں نے چند ایک مصلحتوں کے پیش نظر اس کو لے لینا جائز قرار دیا ہے۔ بشرطیکہ اسے اپنے استعمال میں نہ لایا جائے بلکہ:

الف۔ اسے غریبوں اور یتیموں میں تقسیم کر دیا جائے۔

ب۔ اگر بنک سے قرضہ لینے کی ضرورت پڑے تو اس سود کی جگہ یہ رقم ادا کر دی جائے۔

ج۔ گورنمنٹ جو ناجائز قسم کے ٹیکس عائد کرتی ہے۔ ایسی مدات میں یہ سود کی رقم صرف کر دی جائے۔ مگر جب ہم اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ ساری مصلحتیں دھری کی دھری

● عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کا مسئلہ اضطراری ہے۔ یہ حکومت یا اداروں کا ایک طرفہ فیصلہ یا شرط ہوتی ہے اور ملازم اس سلسلہ میں مجبور ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ بات لاعلمی کی بنا پر کہی جاتی ہے۔ اگر کوئی سود نہ لینا چاہے تو اسے کوئی مجبور نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں پراویڈنٹ فنڈ کے معاہدہ فارم کی پشت پر جو شرائط لکھی ہوتی ہیں ان کی شق ۱۶ میں یہ بات وضاحت سے درج ہے کہ جو شخص سود نہ لینا چاہے، نہ لے اُسے کوئی مجبوری نہیں۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ انسان فطرتاً حریص واقع ہوا ہے لہٰذا جو مال اس راہ سے آتا ہے اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر جو لوگ کچھ دیندار قسم کے ہیں وہ سودی پیسہ حرام ہی سمجھتے ہیں لیکن اُسے چھوڑنا بھی نہیں چاہتے۔ اب الجھن یہ بن جاتی ہے کہ اسے لے کر کریں کیا؟

لیکن اب یہ مسئلہ علماء کے زیر بحث نہ آنا چاہیے۔ کیونکہ ضیاء الحق مرحوم نے اس کے متبادل حل کو قانونی شکل دے دی ہے اور وہ یہ ہے کہ جو شخص سود نہ لینا چاہے نہ لے، اور اس کے عوض اسے یہ رعایت دی گئی ہے کہ وہ کسی وقت بھی اپنی جمع شدہ رقم کا ۸۰ فیصد بطور قرض حسنہ لے سکتا ہے جسے وہ بعد میں بالاقساط اپنی تنخواہ سے کٹوا دیا کرے گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہ جاتی ہیں۔ لہٰذا اس گندگی سے بہر صورت پرہیز لازم ہے۔ پہلی صورت بظاہر مستحسن نظر آتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ملاحظہ فرمائیے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ﴾ (البقرہ:۲۶۷)

''اے ایمان والو! اپنی پاکیزہ کمائی سے خرچ کرو اور ہم نے تمہارے لیے جو کچھ زمین سے نکالا ہے اس میں سے ناپاک چیز خرچ کرنے کا قصد مت کرو۔''

اور یہ تو ظاہر ہے کہ سود جیسی حرام اور ناپاک چیز پاک نہیں ہو سکتی۔

دوسری اور تیسری صورت اس سے بھی بُری ہے کہ انسان سود لے بھی اور دے بھی۔ صرف اپنی ذات پر خرچ نہ کرے۔ تو ایک مسلمان کے لیے یہ جسارت بہت ہی خطرناک ہے جو بالآخر اسے مکمل سُود کی لپیٹ میں لے آئے گی۔ حضرت نعمان بن بشیر کی مشہور حدیث جو بخاری اور مسلم دونوں میں موجود ہے اس کے الفاظ ہیں **ومن وقع في الشبهات وقع في الحرام** (جو شبہ والی چیزوں میں جا پڑا وہ بالآخر حرام میں بھی جا پڑے گا) اس بات کا ان لوگوں کے پاس کیا جواب ہے؟

لہٰذا ایک مسلمان کے لیے محفوظ ترین راستہ یہی ہے کہ مصلحت کوشیوں کو اللہ کے سپرد کرے اور اپنے آپ کو بہر حال اس نجاست سے محفوظ رکھے۔

۳۔ بنکوں کے چالو کھاتے اور شراکتی کھاتے:

ضیاء الحق مرحوم نے پاکستان کے بنکوں سے سود کے خاتمہ کا اعلان کیا تو اس سے پہلے بنکوں میں تین طرح کے حسابات یا کھاتے ہوئے تھے:

۱۔ کرنٹ اکاونٹ (Current Account) یا چالو کھاتے۔ ان کھاتوں میں عموماً وہ لوگ حساب کھلواتے ہیں جو کسی قیمت پر سود لینا گوارا نہیں کرتے اور محض حفاظت کی خاطر اپنی رقوم بنکوں میں رکھتے ہیں۔

۲۔ سیونگ اکاؤنٹ (Saving Account) یا بچت کھاتے ایسے کھاتے عموماً تھوڑی تھوڑی رقوم جمع کرانے والوں کے لیے مختص ہیں۔ ان کی جمع شدہ رقم پر انہیں سود تو ملتا ہے لیکن شرح سود نسبتاً کم ہوتی ہے۔ ایسے کھاتوں سے ایک مقررہ حد کے اندر اندر ہفتہ میں دو بار حسب ضرورت رقم نکلوائی بھی جا سکتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۔ فکسڈ ڈیپازٹ (Fixed Deposit) یا امانت کھاتے۔ایسے کھاتوں میں بڑی رقوم ایک معینہ مدت مثلاً تین سال یا چار، پانچ بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت کے لیے جمع کرائی جاتی ہیں۔ایسی رقوم پر شرح سود سیونگ بنک سے کافی زیادہ مل جاتی ہے۔رقم جس قدر بڑی اور عرصہ لمبا ہوگا اسی حساب سے شرح سود بھی زیادہ ہوگی۔اس کھاتہ سے عام حالات میں مقررہ مدت سے پیشتر رقم نکلوانا مشکل ہوتا ہے۔

ضیاء الحق مرحوم کے دور ۱۹۸۰ء میں بنکوں میں شراکتی کھاتے کو (Profit & Loss Shares)(یعنی نفع ونقصان میں حصہ داری) کھولے گئے۔جسے مختصر کر کے P.L.S کہا جاتا ہے۔ گویا اب ہر شخص مختار تھا کہ اپنا حساب P.L.S میں کھلوائے یا بچت کھاتوں میں۔گویا بنکوں میں بیک وقت دونوں طرح کے حسابات چل رہے تھے۔تاہم یہ اعلان کیا گیا کہ عنقریب سابقہ معاہدات ختم ہونے کے ساتھ سیونگ اور فکسڈ کھاتے ختم کیے جائیں گے۔چنانچہ یکم جولائی ۱۹۸۵ء کو یہ کھاتے ایک اعلان کے ذریعہ ختم کر دیے گئے۔اور اب بنکوں میں یا تو چالو کھاتے ہیں یا شراکتی کھاتے۔

چالو کھاتے:

جو لوگ سود کے سلسلہ میں انتہائی محتاط ہیں وہ پہلے بھی اپنا حساب چالو کھاتہ میں رکھتے تھے اور اب بھی اس کھاتہ میں رکھتے ہیں۔وہ اب اپنا حساب شراکتی کھاتوں میں کیوں منتقل نہیں کرتے اس کا جواب آگے 'شراکتی کھاتے' کے بیان میں آ رہا ہے۔البتہ ان لوگوں کے لیے بھی ایک بات الجھن کا باعث بنی رہتی ہے۔جو یہ ہے کہ یہ درست کہ وہ خود سود نہیں لیتے۔مگر بنک تو ان کی رقوم سے سودی کاروبار کرتے اور نفع کماتے ہیں۔اگر وہ بنک کے پاس چھوڑتے ہیں تو بنک اس رقم سے مزید سودی کاروبار ہی کرے گا۔اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے ارشاد:

﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (آل عمران:۸۵) ''گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون مت کرو۔''

کی خلاف ورزی ہے۔

گویا یہ مسئلہ بھی پراویڈنٹ فنڈ کے سود سے ملتا جلتا مسئلہ ہے۔بنک چالو کھاتوں پر سود نہیں دیتے مگر خود تو لیتے ہیں۔لہٰذا حفاظت کی خاطر اپنی رقوم کو بنک کے چالو کھاتہ میں رکھنا ایک اضطراری جواز

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔اور جولوگ سود کے معاملہ میں اور بھی سخت ہیں۔وہ چالو کھاتہ میں بھی اپنی رقوم نہیں رکھتے بلکہ ان کی حفاظت کا انتظام گھر پر ہی یا دوسرے ذرائع سے کر لیتے ہیں۔

اور بعض لوگ سود کی حرمت کے قائل ہونے کے باوجود اپنی رقوم محض اس خیال سے بچت کھاتوں میں رکھتے ہیں کہ آخر ہمارے پیسہ سے کمایا ہوا سود بنک کے پاس کیوں رہنے دیں۔وہ اسے بنک سے وصول کر کے انہیں مصارف میں خرچ کرتے ہیں جن کا پراویڈنٹ فنڈ میں ذکر کیا گیا ہے لیکن ہمارے نقطہ نظر سے ان کا یہ اقدام درست نہیں۔جس کی وجوہ پہلے ذکر ہو چکی ہیں۔

شراکتی کھاتے:

شراکتی کھاتوں میں چند در چند ایسے اقدامات کیے گئے ہیں۔جن سے بظاہر یہی تاثر ملتا ہے کہ شاید فی الواقع یہ نظام سود سے پاک ہو گیا ہے مثلاً حصہ منافع فریقین کے سمجھوتہ سے طے پاتی ہے۔ کاغذات میں اس چیز یا اشیاء کا بھی اندراج ہوتا ہے جو سرمایہ سے خریدی گئیں، شرح منافع کا بھی چھ ماہ بعد اعلان ہوتا ہے۔

لیکن کئی باتیں ایسی بھی ہیں۔جو سودی نظام کے ضروری اجزاء ہیں۔ان کا صرف نام تبدیل کر کے انہیں بحال رکھا گیا ہے۔مثلاً پہلے شرح سود فی صد روپیہ سالانہ ہوتی تھی۔اب شرح سود کا نام مارک اپ (Markup) ہو گیا ہے اور یہ فی ہزار روپیہ یومیہ کے حساب سے ہوتا ہے۔مثلاً پہلے بنک ۱۵ یا ۱۶ فیصد سالانہ شرح سے سرمایہ مہیا کرتے تھے اب ۴۳ پیسے یومیہ، مارک اپ کے حساب سے جو ۱۵.۲۷ فیصد بنتا ہے۔

اسی طرح Discount یا منی کاٹا کا نام شراکتی کھاتوں میں (Mark Down) مارک ڈاؤن ہو گیا ہے اور اس کا بھی مفہوم بالکل اسی طرح کا ہے جو ڈسکاؤنٹ کا ہے۔

بنک پہلے بھی کسی طرح کے نقصان کی ذمہ قبول نہیں کرتا تھا اور اب بھی سارا نقصان مضارب کے کھاتہ میں ڈال دیتا ہے اور یہی وہ فرق ہے جو تجارت کو سود سے ممتاز کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جن علماء نے اس نئے نظام کا بنظر غائر جائزہ لیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اب بھی سود ہی اپنی نئی شکل میں جلوہ گری کر رہا ہے۔اور سود کے درمیان بیع کو لا کر سود کو حلال کرنے کی کوشش کی گئی ہے جیسا کہ بیع عینہ کی صورت میں ہوتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۔انعامی بانڈ(Prize Bond)

آج کل عوام میں انعامی بانڈز کا بھی خوب چرچا ہے اور ان پر ملنے والے انعامات کا بھی۔ یہ دراصل سود اور قمار کی مرکب شکل ہے۔ یہ کاروبار حکومتی سطح پر کیا جاتا ہے۔حکومت کو جب سرمایہ کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ اس ذریعہ سے سود کا نام لیے بغیر عوام سے روپیہ حاصل کرتی ہے طریق کار یہ ہے کہ آج کل حکومت اسلامی جمہوریہ پاکستان نے ۵۰ روپے، ۱۰۰ روپے، ۵۰۰ روپے اور ۱۰۰۰ روپے کے بانڈ (سرکاری تمسکات) چھاپ رکھے ہیں جو کسی بھی وقت پر بنک سے کیش بھی کروائے جاسکتے ہیں۔ان پر نمبر بھی اسی طریق پر طبع کیے جاتے ہیں جیسا کہ کرنسی نوٹوں کے ہوتے ہیں۔ان میں سے ہر قسم کے بانڈ کی فروخت اور پھر قرعہ اندازی کی باری دو ماہ بعد آتی ہے۔ مثلاً جنوری ۱۹۹۱ء میں -/۱۰۰ روپے والے بانڈوں کی باری ہوگی۔اور مارچ میں -/۵۰ روپے والے بانڈوں کی قرعہ اندازی ہوگی اور قرعہ اندازی میں آنے والے نمبروں کا اعلان کر دیا جائے گا۔اس طرح باری باری ہر قسم کے بانڈ کی قرعہ اندازی ہوتی رہتی ہے۔ جو نمبر قرعہ اندازی میں نکلیں وہ جس شخص کے پاس موجود ہوں گے وہ انہیں سٹیٹ بنک آف پاکستان یا قومی بچت کے کسی مرکز میں دکھلا کر اعلان شدہ انعام حاصل کر سکتا ہے۔

یہ کاروبار چونکہ حکومت خود چلا رہی ہے۔ لہٰذا سے خاصا فروغ حاصل ہوا ہے۔ ہر دو ماہ بعد جو انعامات تقسیم ہوتے ہیں۔ وہ دراصل دو ماہ کا اس جمع شدہ رقم کا سُود ہوتا ہے جو سب حصہ داروں میں تقسیم کرنے کے بجائے قرعہ اندازی کے ذریعہ چند افراد کو دے دیا جاتا ہے۔اس کاروبار میں اس ناپاک اور حرام چیز یعنی سود کا نام ''انعام'' رکھ دیا گیا ہے۔تا کہ عام لوگ سود کے نام سے بِدک نہ جائیں۔اور قرعہ اندازی کے ذریعہ چند افراد کو یہ رقوم عطا کرنے کے لحاظ سے یہ کاروبار میسر یا قمار کی تعریف میں آتا ہے۔

۵۔متفرق ادارے:

سودی کاروبار انہی مشاغل پر منحصر نہیں۔ اگر بنک سودی کاروبار کرتے ہیں تو ڈاکخانہ والے بھی کرتے ہیں،قومی بچت کے مراکز بھی اور ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشنیں بھی۔علاوہ ازیں بہت سے سرکاری، نیم سرکاری اور نجی ادارے ایسے ہیں جو سود پر روپیہ لے کر اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔ اگر تاجر اور صنعت کار اس لعنت میں مبتلا ہیں تو اقساط پر اشیاء فروخت کرنے والوں نے بھی بہت سی اشیاء کو اپنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

احاطہ میں لے لیا ہے۔ اور گورنمنٹ کا تو شاید ہی کوئی ادارہ ایسا ہو گا جس میں سود کسی نہ کسی شکل میں جلوہ گر نہ ہو۔ خواہ اس سود کا نام جرمانہ یا کچھ اور رکھ لیا جائے پچھلے دنوں جب وفاقی شرعی عدالت نے سود کے خلاف فیصلہ سنایا تو پاکستان کے دستور کی ۲۲ دفعات کی نشان دہی کی گئی۔ اسی سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ معاشرہ میں سود کا جال کہاں کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ ہر طرف ہی فضا سود کے اثرات سے مسموم ہو چکی ہے۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ کی وہ پیشین گوئی پوری ہو رہی ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اگر کوئی سود سے بچا بھی رہے گا تو سود کا غبار ضرور اس تک پہنچے گا۔

بایں ہمہ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر آج بھی کوئی شخص سود سے بچنے کا عزم کرے تو وہ بچ سکتا ہے۔ البتہ اگر نا قابل علاج چیز ہے تو وہ انسان کی ھل من مزید کی ہوس ہے۔ اگر ایک تاجر ایک لاکھ کے سرمایہ سے بنک کی ملی بھگت سے چار لاکھ کا کاروبار کرنا چاہتا ہے تو وہ اسے اضطرار کا نام کیوں دیتا ہے۔ اور اگر کوئی چیز درآمد کرتا ہے تو وہ پوری رقم پیشگی جمع کرا کر سود سے بچ بھی سکتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں وہ یہی ہے کہ اضطرار کہیں بھی نہیں۔ البتہ حلال کمائی کم ہوتی ہے جس پر انسان اکتفا نہیں کرتا۔ ہاں اگر فی الواقع کہیں اضطرار ہو تو وہ گناہ نہیں اسے اللہ تعالیٰ ضرور معاف فرما دے گا۔ محض زیادہ کمائی کی خاطر سود میں خود ملوث ہونا پھر اسے اضطرار کا نام دینا ڈھٹائی نہیں تو اور کیا ہے؟

سود سے نجات:

اگر سودی دھندا کرانے والے ادارے ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں تو ایسے ادارے بھی موجود ہیں جو مضاربت اور شراکت کی بنیادوں سے سرمایہ اکٹھا کرتے ہیں۔ مثلاً جائنٹ سٹاک کمپنیاں اور کوآپریٹو سوسائٹیاں تجارتی بنیادوں پر ہی کاروبار کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں آج بھی کئی ایسے دیانتدار تاجر موجود ہیں جو مضاربت کی شرائط پر رقوم قبول کرتے اور مقررہ وقت پر طے شدہ شرائط کے مطابق منافع بھی ادا کرتے ہیں اور بوقت ضرورت ایک ماہ کے نوٹس پر رقم بھی واپس کر دیتے ہیں۔

بنکوں سے سود کے اخراج کے سلسلہ میں پاکستان اس وقت تجرباتی دور سے گزر رہا ہے جبکہ بعض اسلامی ممالک اس میدان میں بہت آگے نکل چکے ہیں۔ مختلف اسلامی ممالک میں ایسے گیارہ بنک قائم ہو چکے ہیں۔ جو خالص تجارتی بنیادوں پر اور شرعی احکام کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ آج سے ساڑھے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دس سال قبل جولائی ۱۹۸۱ء کے ماہنامہ ترجمان القرآن میں خلیل حامدی صاحب کا ایک مضمون بعنوان اسلامی بنکوں کی عالمی تحریک شائع ہوا تھا۔اس مضمون میں ان بنکوں سے متعلق کافی تفصیلات آ گئی ہیں۔انہی بنکوں میں سے ایک بنک مصرف فیصل الاسلامی البحرین (Faisal Islamic Bank of Bahrine) بھی ہے جس کی تین شاخیں پاکستان میں بھی کھل چکی ہیں۔لاہور شاخ کا پتہ ۴۳ شاہراہ قائداعظم ،لاہور ہے۔یہ بنک عام بنکوں کے وہ وظائف بھی پورے کرتے ہیں۔جن میں سود کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔جیسے ترسیل زرخواہ بنک ڈرافٹ کی شکل میں ہو یا ٹیلی گراف ٹرانسفر یا میل ٹرانسفر یا مسافر چیک یا امانتوں کے لیے لاکرز وغیرہ ایسے کام ہیں جن پر بنک معمولی سی کمیشن یا فیس لیتے ہیں۔ اوران کے علاوہ شرعی بنیادوں پر کاروبار بھی کرتے ہیں۔اور درآمد و برآمد کا کام بھی۔لطف کی بات یہ ہے کہ ان بنکوں کو سودی بنکوں کی نسبت بہت زیادہ پذیرائی ہوئی ہے۔اندریں صورت لوگوں پر اس لحاظ سے بھی اللہ کی حجت پوری ہو چکی ہے۔اب بھی اگر کوئی شخص سود کی لعنت میں مبتلا ہونا یا رہنا چاہتا ہے تو وہ اس کی اپنی گردن پر ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقالہ:۵

احکامِ وراثت ❶

علم وراثت کو شرعی اصطلاح میں علم الفرائض کہا جاتا ہے۔ یہ علم کچھ مشکل بھی ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بعض دفعہ اس میں دقیق قسم کی شکلیں اور ان کا حساب سامنے آ جاتا ہے، جو ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ روزمرہ کے معمولات میں سے نہیں، لہٰذا کم ہی یاد رہتا ہے...... میں کوشش کروں گا کہ اسے آسان الفاظ اور آسان انداز میں پیش کروں۔ **وما توفیقی الا باللہ**

موضوع کی اہمیت اور فضیلت:

یہ علم جس قدر مشکل ہے، اسی قدر اسے سیکھنے اور یاد رکھنے کی ترغیب احادیثِ رسول اللہ ﷺ میں مذکور ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

(تعلموا الفرائض والقران و علّموا الناس فانی مقبوض) (ترمذی، ابواب الفرائض، باب فی تعلیم الفرائض)

”(علم) فرائض اور قرآن خود سیکھو اور دوسروں کو سکھلاؤ، اس لیے کہ میں وفات پا جانے والا ہوں۔“

نیز فرمایا:

(العلم ثلثة وما سوی ذلک فهو فضل، اية محكمة اوسنة قائمة اوفريضة عادلة) (ابوداؤد، کتاب الفرائض، باب فی تعلیم الفرائض)

”علم تین ہیں، اور ان کے سوا جو کچھ ہے، وہ زائد ہے۔ اول، آیاتِ محکمات کا علم، دوسرے سنتِ قائمہ اور تیسرے انصاف کے ساتھ وراثت کی تقسیم۔“

دارقطنی اور ابن ماجہ میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا، ”علم فرائض سیکھو، وہ نصف علم ہے۔ مگر بھلایا جاتا ہے، اور میری امت سے پہلے وہی چھینا جائے گا۔“

---

❶ یہ مضمون ماہ نامہ ”حرمین“ ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۲ء میں طبع ہوا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ لوگوں کو علم فرائض سیکھنے کی بڑی تاکید کرتے اور فرماتے:

"علم دین سیکھو، یہ تمہارے دین کا حصہ ہے۔"

آپ رضی اللہ عنہ نے ۱۸ھ میں شام کا جو سفر کیا تھا، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ طاعون عمواس میں جو لوگ وفات پا گئے تھے، ان کے ترکہ کو حسبِ قواعد شرعی تقسیم کیا جا سکے۔ (دائرۃ المعارف الاسلامیہ اردو، ج ۴، ص ۲۲، بحوالہ الکامل، ج ۲، ص ۵۶۱)

تقسیم وراثت کی ابتدائی ہدایات

ا۔ تجہیز و تکفین:

تجہیز و تکفین کے اخراجات کا بندوبست میت کے ترکہ سے کیا جائے گا۔ (ابوداود، کتاب الوصایا)

۲۔ میت کے ذمہ قرض کی ادائیگی:

اس کے بعد میت کے ذمہ اگر کچھ قرض ہے، تو وہ ادا کیا جائے گا۔ کیوں کہ جب تک میت کے سر پر قرضہ ہو، اس کی بخشش نہیں ہوتی۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے میت کا جنازہ بھی نہ پڑھاتے تھے، جب تک کہ حاضرین میں سے کوئی اس کی ادائیگی کی ذمہ داری نہ لے لیتا۔ (بخاری، کتاب النفقات)

۳۔ وصیت:

قرضہ کی ادائیگی کے بعد اگر میت کوئی وصیت کر گیا ہو تو اسے پورا کیا جائے گا...... وصیت سے متعلقہ احکام درج ذیل ہیں:

(الف) اگر کوئی شخص وصیت کرنا چاہتا ہو تو اسے دو راتیں بھی اس حال میں نہ گزارنا چاہئیں کہ اس کے پاس وصیت لکھی ہوئی موجود نہ ہو۔ (مسلم کتاب الوصیۃ)

(ب) وصیت کی حد یہ ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ تہائی مال میں ہو سکتی ہے، اور یہ بھی بہت ہے۔

وصیت کی حد سے متعلق دو طرح کی روایات آتی ہیں، اور یہ دونوں سیدنا سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ سے متعلق ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ مکہ میں آ کر بیمار ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لیے تشریف لائے۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، میں چاہتا ہوں کہ اپنے سارے مال کی وصیت کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاؤں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا، ''نہیں!'' پھر وہ کہنے لگے، ''دو تہائی مال کی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں! کہا، ''ایک تہائی مال کی؟'' آپ ﷺ نے فرمایا، ''ہاں تہائی، اور تہائی بھی بہت ہے'' (مسلم، کتاب الوصیۃ، بخاری کتاب الوصایا، باب الوصیۃ بالثلث)

اور دوسری روایت یوں ہے کہ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے پوچھا تو خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دسواں حصہ وصیت کرو۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ زیادہ کی وصیت کی بات کرتے رہے، بالآخر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک تہائی کی وصیت کرو، اور یہ بھی بہت ہے۔'' (ترمذی، بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب الوصایا، فصل ثانی)

اسی لیے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ''کاش لوگ ثلث سے کم کر کے چوتھائی کی وصیت کریں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''تہائی بہت ہے!'' اور وکیع کی حدیث میں ''کَثِیْرٌ اَوْ کَبِیْرٌ'' کے الفاظ ہیں۔

وصیت مال کے علاوہ دوسری باتوں میں بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص اپنے لین دین کا حساب لکھ کر اپنے پاس رکھ لے، تاکہ بعد میں کسی قسم کا جھگڑا نہ پیدا ہو۔ اور آپ ﷺ نے جو وصیت فرمائی تھی، وہ یہ تھی:

(الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم) ''نماز کا خیال رکھنا، اور ان کا جو تمہارے زیرِ دست ہیں''

یاد رہے، رسول اللہ ﷺ نے کتاب و سنت پر جمے رہنے کی بھی وصیت فرمائی!

(ج) میت کے ذمہ اگر کوئی اللہ کا حق رہ گیا ہو۔ مثلاً حج، کفارہ، منت اور نذر وغیرہ۔ اور وہ اپنی بیماری یا کسی دوسری وجہ سے وہ کام نہ کر سکا یا وصیت نہ کر سکا ہو، تو اسے بھی پورا کرنا ضروری ہے، کیوں کہ یہ بھی بندے پر اللہ کا قرض ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور کہنے لگی، ''میری ماں نے حج کی منت مانی تھی، لیکن وہ حج کرنے سے پہلے فوت ہو گئی، کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، اس کی طرف سے حج کر...... بھلا بتلا، اگر تیری ماں پر کسی کا قرض ہوتا تو تُو اسے ادا کرتی یا نہیں؟'' (اس نے کہا، ضرور) آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو پھر اللہ تعالیٰ اس کا بہت زیادہ حق دار ہے کہ اس کا قرض ادا کیا جائے۔'' (بخاری، باب الحج والنذور عن المیت)

ایک دفعہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''اللہ کے رسول ﷺ، میری ماں اچانک فوت ہو گئی اور وصیت نہ کر سکی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ بات کرتی تو ضرور صدقہ کرتی۔ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو اسے ثواب ملے گا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں'' (مسلم، کتاب الوصیۃ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(د) وصیت شرعی وارث کے حق میں نہیں کی جاسکتی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبۂ حجۃ الوداع میں فرمایا:

''اللہ بزرگ و برتر نے ہر صاحب حق کا حق مقرر کر دیا ہے، لہٰذا اب وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں''(ترمذی، ابواب الوصایا، باب **لا وصية لوارث**)

کیوں کہ اس طرح باقی سب وارثوں کے حصے متاثر ہوتے ہیں اور ان میں گڑ بڑ ہو جاتی ہے، جو تنازعہ کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ ہاں اگر حالات کا تقاضا ایسا ہی ہو، تو دوسرے وارثوں کی رضا مندی سے متوفی ایسا کر سکتا ہے۔ بلکہ اس کی وفات کے بعد وارث خود بھی باہمی رضا مندی سے ایسا کر سکتے ہیں، کیونکہ ہر شخص اپنا حق چھوڑنے یا کم کرنے کا حق رکھتا ہے۔

(ہ) وصیت کسی بھی غیر وارث رشتہ دار، دوست، یتیم پوتے، یا کسی بھی یتیم، مسکین، دینی ادارے وغیرہ سب کے حق میں کی جاسکتی ہے۔

(و) اگر مال تھوڑا ہو تو وصیت نہ کرنا زیادہ بہتر ہے۔

(ز) ایسی وصیت کرنا، جس سے کسی دوسرے کو تکلیف یا نقصان پہنچتا ہو، حرام ہے۔

(ح) اگر ترکہ سے قرضے بھی پورے نہ ہوں، یا بمشکل پورے ہو سکیں، تو پھر نہ وارثوں کو کچھ ملے گا اور نہ اسے، جس کے حق میں وصیت کی گئی ہو۔

(ط) اگر میت جنون یا بے ہوشی میں وصیت کرے، اور اسی حالت میں وہ مر جائے تو ایسی وصیت معتبر نہ ہوگی۔

صدقہ:

ان باتوں کو پورا کرنے کے بعد تقسیم ترکہ کے وقت اگر کوئی غیر وارث رشتہ دار یا یتیم یا نادار محتاج آجائے تو اسے کچھ نہ کچھ دے دینا چاہیے۔ (سورۃ النساء: ۸)

موانع میراث:

موانع میراث، یعنی ایسے اسباب، جن کی بناء پر کوئی حق دار وارث غیر مستحق ہو جاتا ہے:

۱۔ قاتل مقتول کا وارث نہیں بن سکتا (ترمذی، ابواب الفرائض، **باب فی ابطال میراث القاتل**)۔ اس حکم میں غالباً حکمت یہ ہے کہ کوئی وارث ورثہ کے لالچ میں آکر مورِث کو قتل نہ کر ڈالے، تا کہ جلد از جلد وہ اس کا وارث بن سکے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ کافر یا مرتد کسی مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا۔اسی طرح کوئی مسلمان کسی کافر کا وارث نہیں بن سکتا...... گویا دین کا اختلاف بذاتِ خود مانع میراث ہے۔(بخاری، کتاب الفرائض، باب لا یرث المسلم الکافر)

تقسیم وراثت کے اصول

۱۔ صرف وہ وارث ترکہ کے حقدار ہوں گے جو میت کی وفات کے وقت زندہ ہوں، فوت شدہ وارث ترکہ سے محروم ہوتے ہیں۔

۲۔ تقسیم وراثت کا سب سے اہم اصول ''الاقرب فالاقرب'' ہے۔اور یہ اصول قرآن مجید ہی سے ماخوذ ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں دُور کا رشتہ دار محروم ہوتا ہے۔مثلاً بیٹا موجود ہو تو پوتا محروم ہے، باپ موجود ہو تو دادا محروم ہوتا ہے۔

۳۔ میت کی بیویاں اگر ایک سے زیادہ ہوں تو وہ اپنے مقررہ حصے (بصورت اولاد $\frac{1}{8}$ اور بغیر اولاد $\frac{1}{4}$) میں برابر کی شریک ہوں گی۔

۴۔ اگر متوفی کی بیوی حاملہ ہو تو پیدا ہونے والا بچہ وراثت کا حقدار ہوتا ہے، ایسی صورت میں یا تو تقسیم کو وضع حمل تک روک دیا جائے، یا کوئی ایسی صورت پیدا کرلی جائے کہ نومولود (خواہ بیٹا ہو یا بیٹی) کو اس کا حق پورا پورا مل سکے...... یا جو بھی صورت ہو۔

۵۔ اسی طرح اگر کوئی وارث مفقود الخبر ہو تو اس کا بھی انتظار کیا جائے گا...... بصورتِ دیگر ایسا بندوبست کرلیا جائے کہ جب وہ آئے تو اسے اس کا حق مل سکے۔(ایضاً)

وارثوں کی اقسام

۱۔ذوی الفروض:

یہ وہ رشتہ دار ہیں جن کا حصہ، وراثت کتاب وسنت اور اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم سے طے شدہ ہے۔ان کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ایسے رشتہ دار جن کا تعلق نکاح کے سبب ہو......اور یہ دو ہیں: خاوند اور بیوی۔

۲۔ ایسے رشتہ دار جن کا تعلق نسب کے سبب ہو، اور یہ دس ہیں۔

ان میں سے تین مرد ہیں: باپ، دادا، اور ماں جائے (ماوری یا اخیافی) بھائی۔باقی سات عورتیں ہیں:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۱) ماں (۲) دادی (۳) بیٹی (۴) پوتی (۵) حقیقی (عینی یا سگی) بہن (۶) پدری (علاتی یا سوتیلی) بہن (۷) مادری (اخیافی یا ماں جائی) بہن۔

عصبات:

عصبہ کی جمع ہے، یعنی میت کے باپ کی جانب سے رشتہ دار۔ عصبہ دراصل میت کا سب سے قریبی رشتہ دار ہوتا ہے (بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث الولد......)

ذوالفروض کو ان کے مقررہ حصے ملنے کے بعد جو کچھ بچے، وہ عصبہ کا ہوتا ہے۔ اور عام طور پر یہ میت کا بیٹا ہی ہوتا ہے، جو اپنی بہنوں کو بھی (جو اس کی عدم موجودگی میں ذوی الفروض ہوتی ہیں) عصبہ بنا دیتا ہے۔ پھر انہیں (یعنی میت کی بیٹیوں کو) مقررہ حصہ نہیں ملتا، بلکہ بقایا ترکہ بیٹے بیٹیوں میں: ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ﴾ کے اصول کے مطابق (۲۔۱) کی نسبت سے ان میں تقسیم ہوتا ہے۔

میراث کی کوئی شکل ایسی نہیں، جس میں ذوی الفروض کو ادائیگی کے بعد بیٹے کو کچھ نہ ملتا ہو۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ سارا ترکہ ہی اسے مل جائے۔ مثلاً میت کے والدین اور بیوی پہلے ہی فوت ہو چکے ہوں، اور اولاد صرف ایک بیٹا ہو، تو یہ پورے ترکہ کا وارث ہوگا۔

۳۔ ذوی الارحام:

''ذوی الارحام'' کا لغوی معنی تو رحم سے تعلق رکھنے والے رشتہ دار ہیں (یعنی قریبی رشتہ دار..... مگر علم الفرائض کی اصطلاح میں صرف ان رشتہ داروں کو کہا جاتا ہے، جن سے رشتہ بذریعہ رحم تو ہو، مگر ان کا شمار ذوی الفروض اور عصبات میں نہ ہو۔ مثلاً ماموں، خالہ، نانا، بھانجا، بھانجی، نواسہ، نواسی، پھوپھی اور پھر ان کی اولادیں وغیرہ۔

ذوی الفروض اور عصبہ کے بعد تیسرے نمبر پر ان میں تقسیم ترکہ کی باری آتی ہے، لیکن عملاً شاذ و نادر ہی ان کے حصہ میں کچھ آتا ہے۔ تاہم یہ ناممکن بھی نہیں!

اس اجمالی تعارف کے بعد اب ہم ان وارثوں کا تفصیلی ذکر کریں گے۔

ذوی الفروض اور ان کے حصے:

ذی الفروض کے حصے چونکہ سب سے زیادہ قرآن مجید میں ہی سورۂ نساء کی آیت ۱۱۔۱۲۔۱۷۶ میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں، لہٰذا پہلے ہم انہی آیات کو بنیاد بنا کر ان کے حصوں کا ذکر کریں گے:

آیت نمبر ۱۱:

(ابنائی جانب) ۱۔ اگر اولاد میں بیٹے اور بیٹیاں ملے جلے ہوں، تو مرد کو دوگنا اور عورت کو ایک حصہ ملے گا (یہ عصبات کی صورت بن جائے گی، ذوی الفروض کی نہ رہے گی)

۲۔ اگر صرف ایک بیٹی ہی ہو تو اس کا حصہ $\frac{1}{2}$ ہے۔

۳۔ اگر صرف دو سے زیادہ بیٹیاں ہی ہوں تو ان کا حصہ $\frac{2}{3}$ ہے۔ اور سنت سے یہ ثابت ہے کہ اگر دو ہی بیٹیاں ہوں تو بھی حصہ $\frac{2}{3}$ ہی ہے۔ (بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث الولد من ابیه وامه)

(آبائی جانب) ۴۔ اگر میت کے والدین زندہ ہوں، تو ان میں سے ہر ایک کو $\frac{1}{6}$ حصہ ملے گا (اس صورت میں مرد اور عورت کا حصہ برابر ہے)

۵۔ اور اگر میت کی اولاد نہ ہو تو ماں کو $\frac{1}{3}$ حصہ ملے گا۔

۶۔ اور اگر میت کے بہن بھائی بھی ہوں تو پھر ماں کو $\frac{1}{6}$ ہی ملے گا۔

اور سنت سے یہ ثابت ہے کہ:

۷۔ اگر ایک بیٹی ہو تو اسے $\frac{1}{2}$، اور ایک پوتی ہو تو اسے $\frac{1}{6}$ حصہ ملے گا۔ (مؤطا، کتاب الفرائض، باب میراث الصلب)

۸۔ ماں فوت ہو چکی ہو تو اس کا حصہ ($\frac{1}{6}$) نانی کو ملے گا۔

۹۔ اگر باپ فوت ہو چکا ہو تو اس کا حصہ ($\frac{1}{6}$) دادا کو ملے گا۔ (ترمذی، ابواب الفرائض، باب فی میراث الجدّ)

۱۰۔ دادی کا $\frac{1}{6}$ حصہ بھی اجماع سے ثابت ہے (مؤطا، کتاب الفرائض، باب میراث الجدة) تفصیل ''دادی کا حصہ'' میں دیکھیے۔

۱۱۔ اگر نانی اور دادی دونوں موجود ہوں تو $\frac{1}{6}$ ان میں برابر تقسیم ہوگا۔ (ایضاً)

آیت نمبر ۱۲:

(صلبی جانب) ۱۲۔ میت اگر عورت بے اولاد ہو تو اس کے شوہر کو اس کے ترکہ کا $\frac{1}{2}$ حصہ ملے گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۳۔ اور اگر میت اولاد والی تھی، تو شوہر کو $\frac{1}{4}$ حصہ ملے گا۔

۱۴۔ میت اگر بے اولاد ہے تو اس کی بیوی کو $\frac{1}{4}$ حصہ ملے گا۔

۱۵۔ اور اگر صاحبِ اولاد ہے تو بیوی کا حصہ $\frac{1}{8}$ ہے۔

(اخوی جانب) ۱۶۔ اگر میت (عورت یا مرد) ''کلالہ'' ہے، یعنی نہ اس کی اولاد ہے، نہ والد...... اور اس کے صرف (اخیافی: ماں جائے یا مادری) بھائی بہن ہوں، تو اگر ایک بہن ہے تو اسے $\frac{1}{6}$، اور ایک بھائی بھی ہے تو اسے بھی $\frac{1}{6}$ ...... اور دو سے زیادہ بھائی بہنیں ہوں تو ان کو کل $\frac{1}{3}$ ہی ملے گا۔ اور یہ ان میں ۱۔۲ کی نسبت سے نہیں، بلکہ برابر برابر تقسیم ہوگا۔

آیت نمبر ۱۷۶:

(اخوی جانب) میت اگر کلالہ ہے اور اس کے (حقیقی: عینی یا سگے) بہن بھائی موجود ہوں، تو کلالہ کی میراث ان میں ایسے ہی تقسیم ہوگی جیسے اولاد میں ہوتی ہے۔ یعنی:

۱۷۔ اگر صرف ایک بہن ہے تو $\frac{1}{2}$ حصہ، دو یا دو سے زیادہ بہنیں ہوں تو $\frac{2}{3}$، اور اگر بہن بھائی ملے جلے ہوں تو ترکہ ۱۔۲ کی نسبت سے تقسیم ہوگا۔

۱۸۔ کلالہ اگر عورت ہے، تو اس کا بھائی (بشرطیکہ اکیلا ہو) اس کے پورے ترکہ کا وارث ہے۔

۱۹۔ اور اگر بہن بھائی ملے جلے ہوں تو پھر ۱۔۲ کی نسبت سے ترکہ تقسیم ہو جائے گا۔

نتائج:

مندرجہ بالا احکام سے درج ذیل امور سامنے آتے ہیں:

۱۔ کتاب وسنت میں مذکور وارثوں (ذوی الفروض) کا دائرہ پانچ پشتوں کو محیط ہے، جیسا کہ ذیل کے نقشہ سے ظاہر ہے:

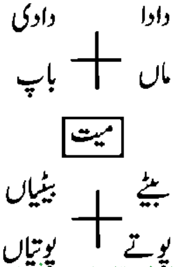

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اب ابنائی جانب کو مزید کئی پشتوں تک نیچے لے جانا، یا آبائی جانب کو مزید کئی پشتوں تک اوپر لے جانا، یا اخوی اور عمومی جانب کی انتہاؤں سے عصبہ اور دوسرے ورثاء کو تلاش کرنا فقہاء کا اپنا استنباط ہے، تاہم اس کے اصول موجود ہیں۔

۲۔ ذوی الفروض میں پانچ وارث ایسے ہیں، جن کا حصہ بہر حال قائم رہتا ہے، اور کسی بھی رشتہ دار کی موجودگی انہیں ان کے مقررہ حصہ سے محروم نہیں کرتی:

(۱) شوہر یا بیوی (۲) باپ (۳) ماں (۴) بیٹے (۵) بیٹیاں

باقی ذو الفروض کے حصے مشروط ہیں، مثلاً:

(الف) بیٹے بیٹیوں کی موجودگی میں پوتے پوتیوں کا کوئی حصہ نہیں۔

(ب) اولاد کی موجودگی میں بہن بھائی محروم ہوتے ہیں۔

(ج) ماں باپ کی موجودگی میں دادا، دادی، نانا، نانی سب محروم ہوتے ہیں۔

۳۔ بہن بھائی تین قسم کے ہوتے ہیں..... ترکہ کی تقسیم کے وقت ان کی ترتیب یہ ہے:

(۱) حقیقی (عینی یا سگے) بہن بھائی (۲) علاتی (پدری یا سوتیلے) بہن بھائی اور (۳) اخیافی (مادری یا ماں جائے) بہن بھائی۔

اخیافی بہن بھائی صرف کلالہ کے ترکہ $\frac{1}{3}$ کے وارث ہوتے ہیں (بلکہ اگر عینی بھائی موجود ہوں تو وہ بھی اسی $\frac{1}{3}$ میں برابر کے شریک ہو جاتے ہیں)

نوٹ:

جدّ دو قسم کا ہے: جدّ صحیح، جدِّ فاسد۔ جدِّ صحیح وہ ہے جس میں عورت کا واسطہ نہ ہو، جیسے دادا، پردادا وغیرہ۔ اور جدِّ فاسد وہ ہے جس میں عورت کا واسطہ ہو، مثلاً نانا، پرنانا وغیرہ۔

جدِّ صحیح ذوی الفروض سے ہے، اور جدِّ فاسد ذوی الارحام سے۔

اور جدہ صحیحہ وہ ہے جس میں جدِّ فاسد کا واسطہ نہ ہو، جیسے دادی، پردادی اور نانی، پرنانی وغیرہ۔

اور جدّہ فاسدہ کی مثال، جیسے نانا کی ماں یا نانا کے باپ کی ماں۔

جدِّ صحیح کی طرح جدّہ صحیحہ بھی ذو الفروض سے ہے، اور جدّہ فاسدہ ذوی الارحام سے!

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقررہ حصوں کی وراثت:

اب ہم ذوی الفروض کے حصوں کی ایک اور طریق سے وضاحت کرتے ہیں، تاکہ انہیں ذہن نشین کرنے میں آسانی ہو جائے...... کتاب وسنت میں سات قسم کے حصوں کا ذکر آیا ہے، جو درج ذیل ہیں:

$\frac{1}{8}$ ، $\frac{1}{6}$ ، $\frac{1}{4}$ ، $\frac{1}{3}$ ، $\frac{1}{2}$ ، $\frac{2}{3}$ اور پورا ترکہ

اب ہم دیکھیں گے کہ کس حصہ کا کون کون رشتہ دار وارث ہو جاتا ہے:

حصہ	وارث کون کون؟
$\frac{1}{8}$	(۱) بیوی، جب کہ میت صاحب اولاد ہو (۲) ایک سے زیادہ بیویاں ہونے کی صورت میں یہ $\frac{1}{8}$ ان پر برابر تقسیم ہوگا۔ اور اس میں یہ تخصیص نہ ہوگی کہ فلاں بیوی کی اولاد نہیں۔ (اولاد میں بیٹے بیٹیوں کے علاوہ پوتے پوتیاں وغیرہ بھی شامل ہیں)
$\frac{1}{6}$	(۳) میت صاحب اولاد ہے تو ماں، باپ میں سے ہر ایک کو $\frac{1}{6}$ حصہ ملے گا۔ (مرد اور عورت کا حصہ برابر برابر) (۴) میت بے اولاد ہو مگر بہن بھائی موجود ہوں، تو بھی ماں کو $\frac{1}{6}$ ملے گا۔ (۵) کلالہ کے اخیافی (مادری، ماں جائے) بہن یا بھائی میں سے ہر ایک کو $\frac{1}{6}$ ملے گا۔ (اور اگر بہن بھائی زیادہ ہوں، تو $\frac{1}{3}$ ان میں برابر برابر تقسیم ہوگا۔ (۶) میت کی صرف ایک بیٹی اور ایک پوتی ہو تو پوتی کو $\frac{1}{6}$ ملے گا (اور بیٹی کو $\frac{1}{2}$)
$\frac{1}{4}$	(۷) خاوند کو، جب کہ مرنے والی بیوی سے اولاد ہو (اولاد میں بیٹے بیٹیوں کے علاوہ پوتے پوتیاں وغیرہ بھی شامل ہیں) (۸) بیوی کو جب کہ مرنے والے خاوند کی اولاد نہ ہو۔
$\frac{1}{3}$	(۹) میت بے اولاد ہو اور بہن بھائی بھی نہ ہوں تو ماں کو $\frac{1}{3}$ ملے گا۔ (۱۰) کلالہ کے ماں جائے بہن بھائیوں کو $\frac{1}{3}$ ملے گا اور یہ ان میں برابر تقسیم ہوگا، ۱۔۲ کی نسبت سے نہیں، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱/۲	(۱۱) میت عورت بے اولاد ہو تو خاوند کو ۱/۲ ملے گا۔ (۱۲) کلالہ کی حقیقی بہن کو ۱/۲ ملے گا۔ (۱۳) میت کی ایک ہی بیٹی ہو تو اسے ۱/۲ ملے گا۔ (اور اگر میت کی صرف پوتی ہی ہو تو ۱/۲ اُسے مل جائے گا۔ (۱۴) میت کی ایک بیٹی اور ایک بہن ہو تو ہر ایک کو آدھا آدھا ملے گا۔ (بخاری۔ کتاب الفرائض۔ باب میراث البنات)
۲/۳	(۱۵) میت کی دو یا دو سے زیادہ بیٹیاں ہوں تو ان کو ۲/۳ ملے گا (اگر بیٹیوں کے بجائے صرف پوتیاں ہوں تو یہ حصہ انہیں مل جائے گا) (۱۶) کلالہ کی حقیقی بہنیں دو یا دو سے زیادہ ہوں تو ۲/۳ ملے گا۔
پورا ترکہ	(۱۷) اگر میت کا صرف ایک ہی بیٹا ہو...... بیوی اور ماں باپ کوئی نہ ہو تو بیٹے کو پورا ترکہ ملے گا۔ (۱۸) کلالہ میت اگر عورت ہو اور اس کا ایک ہی بھائی ہو تو وہ پورے ترکہ کا وارث ہے۔ (۱۹) میت کا اگر صرف والد ہو، نہ بیوی بچے ہوں اور نہ ماں ہو، تو والد کو پورا ترکہ ملے گا۔

ذوی الفروض کے حصوں کی تفصیل

میت کی چار جوانب ہوتی ہیں۔ سب سے مقدم ابنائی جانب ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے احکامِ میراث کی ابتداء ﴿یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ﴾ سے فرمائی ہے۔ یہ ''جزءِ میت'' ہے۔ دوسری آبائی جانب (اصل میت) ہے، یعنی ماں، باپ، دادا وغیرہ۔ تیسری سببی جانب ہے، یعنی زوجین۔ اور چوتھی اخوی جانب (جزءِ اصل میت) ہے...... عموی جانب (جزءِ جدِّ میت) کا بھی اسی میں شمار ہو گا۔

سببی جانب، یعنی زوجین، چونکہ ایک دوسرے کے عصبہ نہیں بن سکتے۔ لٰہذا عصبہ کی تعیین میں فقہاء اسے نظر انداز کر دیتے ہیں اور چار جوانب یوں شمار کرتے ہیں:

(۱) ابنائی جانب (۲) آبائی جانب (۳) اخوی جانب (۴) عموی جانب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اولاد کی میراث:

اولاد کی میراث کے بارے میں درج ذیل مسائل قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ میت کی اولاد صرف ایک بیٹی ہو تو اس کا حصہ $\frac{1}{2}$ ہے۔ دو یا دو سے زیادہ ہوں تو حصہ $\frac{2}{3}$ ہے۔ اور اگر اولادِ نرینہ بھی ہو تو پھر بیٹیاں ذوی الفروض نہ رہیں گی، باقی ذوالفروض کے حصے ادا کرنے کے بعد باقی جو ترکہ بچے گا اس میں سب بیٹے بیٹیاں دوہرے اور اکہرے حصے کی نسبت سے شریک ہوں گے، اور پوتیاں پوتے محروم رہیں گے۔

۲۔ اگر میت کی صرف ایک بیٹی اور پوتی ہو تو پوتی کو $\frac{1}{6}$ ملے گا اور بیٹی کو $\frac{1}{2}$ ...... یہ کل $\frac{2}{3}$ عورتوں کے حصہ کی آخری حد ہے۔ اور اگر میت کی صرف لڑکیاں ہی دو یا دو سے زیادہ ہوں تو ان کو $\frac{2}{3}$ مل جائے گا اور پوتی محروم ہو گی۔

۳۔ اگر ایک بیٹی اور پوتیاں ایک سے زیادہ ہوں تو $\frac{1}{6}$ حصہ ہی ان پوتیوں میں برابر برابر تقسیم ہو گا۔

۴۔ اور اگر پوتا موجود ہے تو وہ عصبہ ہے۔ ذوی الفروض کا حصہ نکالنے کے بعد باقی ترکہ اسے ملے گا۔ اب پوتی یا پوتیاں ذوی الفروض سے نہ رہیں گی، بلکہ اس کے ساتھ عصبہ بن جائیں گی اور ان میں ۱۔۲ کی نسبت سے بقایا ترکہ تقسیم ہو گا۔

۵۔ میت کی اولاد (بیٹے بیٹیوں) میں سے کوئی زندہ نہ رہا ہو، البتہ پوتے پوتیاں موجود ہوں تو ان میں میراث اسی طرح تقسیم ہو گی جس طرح صلبی اولاد میں۔ یعنی اگر صرف ایک پوتی ہے تو $\frac{1}{2}$۔ دو یا دو سے زیادہ ہیں تو $\frac{2}{3}$۔ اور اگر پوتا یا پوتیاں موجود ہیں تو باقی ترکہ ان میں ۱۔۲ کی نسبت سے تقسیم ہو گا۔

اسی ترتیب سے یہ سلسلہ اگلی پشت یعنی پڑپوتے پڑپوتیوں تک بھی چلے گا۔ اسے درج ذیل مثال سے سمجھئے۔

زید (میت) ایک بیوی، دو بیٹیاں، دو پوتیاں، ایک پڑوتی، ایک پڑوتا، اور دو پڑپوتیاں چھوڑ گیا ہے۔ اس کی میراث یوں تقسیم ہو گی۔

۱۔ اس مثال میں تیسری پشت پر پڑوتا مل گیا ہے، اور وہ عصبہ ہے، لہٰذا چوتھی پشت کی پڑوتیاں محروم ہیں۔

۲۔ زوجہ کا حصہ $\frac{1}{8}$ ہے۔ پہلی پشت میں دو بیٹیوں کا حصہ $\frac{2}{3}$ ہے اور دوسری پشت میں محروم ہیں، کیوں کہ طبقہ اناث کا زیادہ سے زیادہ حصہ دو تہائی ہے اور یہ بیٹیوں کو مل چکا ہے۔ مگر اب چونکہ تیسری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پشت میں پڑوتا آ گیا ہے جو کہ عصبہ ہے، تو اس ذریعہ سے پوتیوں کو بھی حصہ مل جائے گا (یعنی درجہ سافل کے عصبہ نے اوپر کی اناث کو بھی عصبہ بنا دیا) اور وہ حصہ یوں ہوگا:

بیوی کا $\frac{1}{8}$ + بیٹیوں کا $\frac{2}{3}$ ۔ یہ کل $\frac{19}{24}$ ہوا۔ باقی رہے ۲۴ میں سے ۵ حصے، ان حصوں کو پڑوتے، پڑوتی اور پوتیوں میں ۱۔۲ کی نسبت سے تقسیم کریں گے۔ یعنی پڑوتے کے دو حصے، پڑوتی اور پوتیوں کا ایک ایک حصہ (مؤطا، کتاب الفرائض، باب میراث الولد)

مندرجہ بالا مثال میں اگر زید کی بیٹی ایک ہوتی تو اس کا حل یہ ہوتا:

بیوی کا حصہ $\frac{1}{8}$، بیٹی کا حصہ $\frac{1}{2}$، بیٹی کے ساتھ دو پوتیوں کا حصہ $\frac{1}{6}$

یہ کل $\frac{۳ + ۱۲ + ۴}{۲۴}$ = $\frac{19}{24}$ ہوئے۔ گویا ۲۴ میں سے ۵ بچ رہے۔

یہ پانچ حصے ایک پڑوتا اور ایک پڑوتی ہیں ۱۔۲ کی نسبت سے تقسیم کرنے کے لیے، پانچ کے اب پندرہ حصے بنائے جائیں گے، دس حصے پڑوتا کو دیں گے اور پانچ پڑوتی کو۔

والد کا حصہ:

والد ذوی الفروض میں سے ہے، جس کا $\frac{1}{6}$ حصہ مقرر ہے۔ لیکن اگر میت شادی شدہ نہ ہو۔ یا شادی شدہ ہو، مگر اس کی اولاد (بیٹا، پوتا وغیرہ) نہ ہو تو یہ اپنا مقرر حصہ پانے کے علاوہ بقایا ترکہ بھی پائے گا۔

مثلاً میت کی صرف والدہ، والد ہی ہیں تو والدہ کو $\frac{1}{3}$ یا والد کو $\frac{1}{6}$ ...... اور پھر باقی کا $\frac{1}{2}$ بھی والد کو بطور عصبہ مل جائے گا اور اس کا حصہ $\frac{2}{3}$ ہو جائے گا۔ اور اگر ذوی الفروض کے حصے پورے کرنے کے بعد والد کے لیے $\frac{1}{6}$ بھی نہ بچے، تو اسے بہر حال $\frac{1}{6}$ دیا جائے گا۔ مثلاً میت کی بیوی بھی ہے، ماں بھی اور دو بیٹیاں بھی تو ان کے حصے:

$$\frac{1}{8} + \frac{1}{6} + \frac{2}{3} = \frac{۳ + ۴ + ۱۶}{۲۴} = \frac{۲۳}{۲۴}$$

یعنی صرف $\frac{1}{24}$ حصہ بچا۔ اب والد کا حصہ پورا کرنے کے لیے، یا سب حصوں میں درست نسبت قائم کرنے کے لیے عول کا قاعدہ استعمال کریں گے، جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

اس مسئلہ کو مسئلہ منبریہ بھی کہتے ہیں۔ کیوں کہ ایسا ہی سوال سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے برسرِ منبر ہوا تھا، تو آپ رضی اللہ عنہ نے عول کے قاعدہ کے مطابق ہی جواب دیا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اولادِ نرینہ اور والد کی موجودگی میں بہن بھائی محروم ہوتے ہیں...... گویا والد تین طرح حصہ پاتا ہے۔

۱۔ بصورتِ فرض $\frac{1}{6}$ (۲) بصورتِ عصبہ اور فرض، جیسا کہ مثال میں مذکور ہے۔ اور (۳) بصورت عصبہ۔ اگر میت کا صرف والد ہی موجود ہو تو اسے پورا ترکہ ملے گا۔

ماں کا حصہ:

۱۔ اولاد (بیٹے، بیٹیاں یا پوتے، پوتیاں) کی موجودگی میں ماں کا حصہ $\frac{1}{6}$ ہے۔

۲۔ اگر اولاد تو نہیں، مگر دو یا دو سے زیادہ بھائی۔ اسی طرح دو یا دو سے زیادہ بہنیں ہوں (خواہ یہ سگے ہوں، سوتیلے یا ماں جائے) تو بھی ماں کا چھٹا یعنی $\frac{1}{6}$ حصہ ہے۔

۳۔ اگر اولاد نہ ہو، مگر بھائی یا بہن صرف ایک ایک ہو تو ماں کا حصہ $\frac{1}{3}$ ہے۔

۴۔ اگر نہ اولاد ہو، نہ بھائی بہن تو اس کا حصہ $\frac{1}{3}$ ہے، مگر اس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً میت کی زوجہ اور ماں باپ ہوں، تو زوجہ کا حصہ $\frac{1}{4}$ نکال کر باقی کا $\frac{1}{3}$ ($\frac{3}{4} \times \frac{1}{3}$) یعنی اسے کل کا $\frac{1}{4}$ ملے گا، باقی $\frac{1}{2}$ باپ کو مل جائے گا (عصبہ)...... اور اگر والد کی بجائے دادا ہو تو ماں کو کل کا $\frac{1}{3}$ ملے گا۔

یہ مسئلہ عمریہ کہلاتا ہے، کیوں کہ یہ فیصلہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ اور مسئلہ غرائیہ بھی، کیوں کہ یہ روشن ستارے کی طرح مشہور ہے۔

۵۔ اگر میت عورت ہے اور وہ خاوند اور ماں باپ چھوڑ جاتی ہے، تو پہلے خاوند کو $\frac{1}{2}$ ملے گا۔ باقی $\frac{1}{2}$ کا $\frac{1}{3}$ (یعنی کل کا $\frac{1}{6}$) ماں کو ملے گا اور باقی $\frac{1}{3}$ باپ کو۔

ماں جائے بہن بھائیوں کا حصہ:

یہ صرف کلالہ کے وارث ہوتے ہیں۔ وہ یوں کہ اگر ایک بھائی ہے تو اسے $\frac{1}{6}$ ملے گا۔ اگر ایک بہن بھی ہے تو اسے بھی $\frac{1}{6}$، اور اگر بہن بھائی زیادہ ہوں تو یہ سب $\frac{1}{3}$ میں ہی برابر کے شریک ہوں گے، جیسا کہ پہلے گزر چکا۔

سگے بہن بھائیوں کا حصہ:

۱۔ سگے بہن بھائی اس وقت وارث ہوں گے، جب میت کی نہ اولاد نرینہ ہو اور نہ باپ۔ یہ بیٹیوں یا پوتوں کے ساتھ وارث ہوتے ہیں۔ مثلاً میت کی صرف ایک بیٹی ہے تو اسے $\frac{1}{2}$ ملے گا۔ پھر اگر سگی بہن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی ہے تو اسے $\frac{1}{2}$ ملے گا۔ اور اگر بیٹی کے ساتھ پوتی بھی ہو، تو بیٹی کا $\frac{1}{2}$، باقی $\frac{1}{3}$ بہن کو ملے گا۔ (بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث ابنة ابن مع ابنته)

۲۔ میت کی اولادِ ذرینہ نہ ہو، نہ باپ ہو، مگر دادا زندہ ہو تو دادا کی موجودگی میں بہن بھائیوں کی وراثت اور حصہ میں اختلاف ہے، جس کا ذکر ''دادا کے حصہ'' میں ہوگا۔

۳۔ اور اگر دادا بھی زندہ نہ ہو تو سگے بہن بھائیوں کی حیثیت ملی جلی اولاد کی سی ہوتی ہے۔ یعنی ذوی الفروض کا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی ترکہ ان میں ۱۔۲ کی نسبت سے تقسیم ہوگا۔ اور اگر ذوی الفروض سے کچھ نہ بچے تو کچھ نہ پائیں گے۔

۴۔ میت بے اولاد ہے، باپ یا دادا بھی نہیں، مگر سگی بہن ہے، تو اس کا حصہ $\frac{1}{2}$ ہے۔ دو ہوں، یا زیادہ ہوں تو ان کا حصہ $\frac{2}{3}$ ہے۔ اور کوئی بھائی بھی ہے تو پھر وہ عصبہ ہیں۔ باقی کا ترکہ ان میں ۱۔۲ کی نسبت سے تقسیم ہوگا۔ گویا اس صورت میں بہن بھائی اولاد کے قائم مقام ہوں گے۔

۵۔ درج ذیل صورت میں سگے بہن بھائیوں کے لیے کچھ نہیں بچتا:

مثلاً میت عورت ہے، اور اس کے وارث خاوند، ماں، سگے بہن بھائی اور ماں جائے بہن بھائی ہیں۔ اب خاوند کو $\frac{1}{2}$، ماں کو $\frac{1}{6}$ اور مادری بہن بھائیوں کو $\frac{1}{3}$ ملا، تو سگے بہن بھائیوں کے لیے کچھ نہ بچا۔ اس صورت میں سگے بہن بھائی بھی ماں جائے بہن بھائیوں کے $\frac{1}{3}$ حصہ میں شریک ہو جائیں گے۔ اور مرد، عورت سب کا حصہ برابر ہوگا۔ البتہ سوتیلوں کو کچھ نہ ملے گا۔

سوتیلے بہن بھائیوں کا حصہ:

۱۔ اگر سگے بہن بھائی نہ ہوں تو سوتیلے بہن بھائی ان کے قائم مقام ہوتے ہیں۔ مثلاً میت کا صرف ایک ہی سوتیلا بھائی ہے تو وہ کل ترکہ کا وارث ہے۔ اور اگر ایک بہن ہے تو $\frac{1}{2}$، زیادہ ہوں تو $\frac{2}{3}$۔ اور اگر ملے جلے ہوں تو ان میں بقایا ترکہ ۱۔۲ کی نسبت سے تقسیم ہوگا۔

۲۔ اگر حقیقی اور سوتیلی بہنیں مل جلی ہوں، تو ان کی حیثیت بیٹی اور پوتی کی ہوتی ہے۔ جس طرح بیٹی کا $\frac{1}{2}$ اور پوتی کا $\frac{1}{6}$ ہوتا ہے، اسی طرح سگی بہن کا $\frac{1}{2}$ اور سوتیلی بہن کا $\frac{1}{6}$ ہوگا۔ اور اگر سوتیلی بہنیں ایک سے زیادہ ہوں تو یہی $\frac{1}{6}$ ان میں برابر برابر تقسیم ہوگا۔ اور اگر سوتیلی بہنوں کے ساتھ کوئی سوتیلا بھائی ہو تو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھر وہ عصبہ ہیں۔ذوی الفروض کی ادائیگی کے بعد اگر کچھ حصہ بچ جائے تو ۱۔۲ کی نسبت سے تقسیم ہوگا۔

۳۔ پھر جس طرح دو یا زیادہ بیٹیاں ہوں تو پوتی کو کچھ نہیں ملتا، اسی طرح اگر دو سگی بہنیں ہوں تو سوتیلی بہنوں کو کچھ نہ ملے گا۔

مثال نمبر ۱:

میت کی بیوی، ایک بیٹی، ایک سوتیلا بھائی، دو سوتیلی بہنیں اور تین مادری بہنیں موجود ہیں، ان میں ترکہ یوں تقسیم ہوگا:

مادری بہنیں صرف کلالہ عورت سے حصہ پاتی ہیں، لہٰذا وہ محروم ہیں۔ بیوی اور بیٹی کا حصہ نکالنے کے بعد باقی سوتیلے بہن بھائیوں میں ۱۔۲ کی نسبت سے تقسیم ہوگا۔ چنانچہ:

بیوی $\frac{1}{8}$، بیٹی $\frac{1}{2}$، یہ کل $\frac{5}{8}$ ہوئے۔ باقی ۸ حصوں میں سے ۳ بچ رہے، ان کے پھر ۱۲ حصے بنائیں گے، جن میں سے ۶ بھائی کے اور ہر بہن کے ۳، ۳ ہوں گے۔ (مادری بہن بھائی کلالہ میت (عورت) سے کل $\frac{1}{3}$ حصہ پاتے ہیں۔ اس صورت میں سوتیلے محروم، اور اگر عینی ہوں تو مادری بہن بھائیوں سے مل کر برابر برابر حصہ پائیں گے)

مثال نمبر ۲:

میت نے دو حقیقی بہنیں، ایک علاتی بہن اور ایک بھتیجا چھوڑا ہے۔ ان میں ترکہ یوں تقسیم ہوگا:

دو حقیقی بہنوں کا $\frac{2}{3}$ ہے، یہ اناث کے معین حصہ کی آخری حد ہے۔ لہٰذا علاتی بہن محروم اور باقی $\frac{1}{3}$ بھتیجا بطور عصبہ لے جائے گا۔

دادا کا حصہ:

۱۔ باپ نہ ہونے کی صورت میں دادا $\frac{1}{6}$ حصہ پائے گا۔

۲۔ اگر اولاد نرینہ نہ ہو اور باپ بھی نہ ہو، البتہ حقیقی بہن بھائی موجود ہوں، تو کیا دادا عصبہ بن سکتا ہے؟ یہ مسئلہ اختلافی ہے اور اس کے حصہ میں بھی اختلاف ہے۔ علم الفرائض میں یہ مسئلہ ''مقاسمة الجد'' کی اصطلاح سے مشہور ہے۔ اگر بہن بھائی نہ ہوں پھر تو اس کے عصبہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ چنانچہ ترمذی اور ابوداؤد میں مذکور ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا ''میرا پوتا مر گیا ہے،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس میں میرا حصہ کیا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''چھٹا''۔ وہ چلا گیا تو آپ ﷺ نے اسے بلا کر فرمایا، ''تیرے لیے ایک چھٹا حصہ اور ہے۔'' پھر دوبارہ اسے بلا کر وضاحت فرمائی کہ یہ دوسرا چھٹا تمہارے لیے خوراک (ابوداؤد) اور ترمذی میں ''لک عصبة'' (یعنی بطور عصبہ) ہے۔ (ترمذی، ابواب الفرائض۔ باب فی میراث الجد)

اس حدیث کی تشریح لمعات میں یوں مذکور ہے کہ میت کے وارث تھے ہی دو بیٹیاں اور ایک دادا، دیگر کوئی نہ تھا۔ $\frac{2}{3}$ بیٹیوں کو اور $\frac{1}{6}$ دادا کو۔ باقی کا $\frac{1}{6}$ آپ ﷺ نے اسے بطور عصبہ دے دیا، اور اس کی وضاحت بھی فرما دی۔

''مقاسمة الجد'' کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ ذوی الفروض کے بعد اسے باقی مال کا $\frac{1}{3}$ دے دیا جائے، اور باقی $\frac{2}{3}$ بہن بھائیوں میں ۱۔۲ کی نسبت سے تقسیم ہو۔

۲۔ اسے بھی ایک بھائی تصور کر کے باقی مال دادا اور بہن بھائیوں میں ۱۔۲ کی نسبت سے تقسیم ہو۔

۳۔ اسے کل مال کا $\frac{1}{6}$ دے دیا جائے (فرض)۔ ان میں سے جو صورت دادا کے حق میں بہتر ہو، وہی اختیار کی جائے گی۔

اور مؤطا میں سلیمان بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے دادا کو بھائی بہنوں کے ساتھ ایک ثلث دلایا (مؤطا باب میراث الجد)

مندرجہ بالا تینوں صورتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دادا کی موجودگی میں بہن بھائی بطور عصبہ حصے پاتے ہیں۔ خواہ یہ عصبہ مکمل ہو یا مشترکہ ہو۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مذہب ہے۔ جب کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دادا کی موجودگی میں بہن بھائی محروم ہوتے ہیں۔

گویا راجح مذہب یہی ہے کہ دادا کی موجودگی میں بہن بھائی وارث ہوتے ہیں...... اب سوال یہ ہے کہ آیا بھائیوں کے حصہ میں ہر طرح کے بہن بھائی (سگے، سوتیلے اور ماں جائے) شریک ہوں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ماں جائے تو بہر حال محروم ہوتے ہیں۔ رہے سوتیلے، تو ان کے ترکہ پانے کی صرف یہ صورت ہوگی کہ سگے بھائی نہ ہوں اور صرف بہن یا بہنیں ہی ہوں۔ اس صورت میں باقی ترکہ کو اکائی مان کر سگی بہنوں کو $\frac{1}{2}$ یا $\frac{2}{3}$ دے دیا جائے، باقی کا سوتیلے بہن بھائیوں میں ۱۔۲ کی نسبت سے تقسیم ہو۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جدّہ صحیحہ کا حصہ:

جدہ صحیحہ صرف نانی اور پڑنانی (ماں کی ماں کی ماں) یا پھر دادی اور پڑدادی (باپ کی ماں کی ماں) ہے..... باقی سب قسم کی نانیاں، دادیاں محروم ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اور پھر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ماں کی موجودگی میں نانی کو $\frac{1}{6}$ حصہ دلایا۔ اور دادی کا حصہ ماں یا باپ کسی بھی ایک کے نہ ہونے کی صورت میں ہوسکتا ہے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دادی کو $\frac{1}{6}$ حصہ دلایا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اگر نانی اور دادی دونوں موجود ہوں تو وہ اسی $\frac{1}{6}$ میں برابر کی شریک ہوں گی (مؤطا، کتاب الفرائض، باب میراث الجدة) یعنی ماں کی جگہ نانی، اور اگر نانی نہ ہو تو دادی، اور اگر دونوں ہوں تو دونوں شریک ہوں گی۔

اگر ماں باپ دونوں نہیں اور دادا بھی نہیں، تو دادی کو باپ کی جگہ $\frac{1}{6}$ ملے گا، اور نانی ہے تو محروم ہو گی۔ گویا نانی صرف ماں کی طرف سے حصہ لے سکتی ہے، اور دادی ماں باپ دونوں کی جگہ۔

عول اور ردّ

www.KitaboSunnat.com

عول:

بعض دفعہ ذوی الفروض کے حصوں کا نسبتی مجموعہ ایک سے بڑھ جاتا ہے۔ مثلاً میت کے وارث بیوی، ماں، باپ اور تین بیٹیاں ہیں، ان کے ترکہ کی نسبت یہ ہوگی:

بیوی $\frac{1}{8}$ + ماں $\frac{1}{6}$ + باپ $\frac{1}{6}$ + بیٹیاں $\frac{2}{3}$ = $\frac{16+4+4+3}{24} = \frac{27}{24}$ (یا $\frac{9}{8}$)

یہاں نسبتی مجموعہ ایک سے بڑھ گیا ہے، تو اب جائیداد کے ۲۴ کے بجائے ۲۷ حصے بنا دیئے جائیں گے۔ پھر بیوی کو ۳ ماں کو ۴، باپ کو ۴، بیٹیوں کو ۱۶ حصے مل جائیں گے، اور ہر حصہ میں آٹھواں حصہ کمی واقع ہوجائے گی۔

یہ مثال قبل ازیں ''والد کے حصہ'' میں گزر چکی ہے۔ نیز یہ کہ اس سوال کا جواب سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے برسرِ منبر دیا تھا، اس وجہ سے اس کا نام ہی ''مسئلہ منبریہ'' پڑ گیا۔

دوسری مثال، جو ''مسئلہ اکدریہ'' کہلاتی ہے، یہ ہے کہ مثلاً میت عورت ہے، جو خاوند، ماں، سگی بہن اور دادا چھوڑ جاتی ہے.....اب:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خاوند کو $\frac{1}{۲}$، ماں کو $\frac{1}{۳}$، دادا کو $\frac{1}{۶}$ اور سگی بہن کو $\frac{1}{۲}$ ملے گا۔ یعنی

$$\frac{1}{۲}+\frac{1}{۶}+\frac{1}{۳}+\frac{1}{۲} = \frac{۳+۱+۲+۳}{۶} = \frac{۹}{۶}$$

یہاں بھی ترکہ کو نو حصوں میں تقسیم کر کے خاوند کو ۳، ماں کو ۲، دادا کو ۱، اور بہن کو ۳ حصے دیئے جائیں، اور ہر حصے میں تیسرا حصہ کمی واقع ہو جائے گی۔

''عول'' صرف ایسے مسائل میں پیش آتا ہے جبکہ ذواضعاف اقل ۶ یا ۱۲ یا ۲۴ ہو۔ اور جن مسائل میں ۲۔۳۔۴۔۸ ذواضعاف اقل آئے، ان میں نہیں ہوتا۔

اگر ذواضعاف اقل ۶ ہو تو وہ ۷ یا ۸ یا ۹ یا ۱۰ حصوں میں بدلتا ہے۔ اگر ۱۲ ہو تو ۱۳۔۱۵۔۱۷ حصوں میں...... اور اگر ذواضعاف اقل ۲۴ ہو تو وہ صرف ۲۷ میں بدلتا ہے۔

ردّ:

اور بعض دفعہ یوں ہوتا ہے کہ ذوی الفروض میں حصے تقسیم کرنے پر کچھ ترکہ بچ جاتا ہے، مگر کوئی عصبہ بھی زندہ نہیں ہوتا۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ ذوی الفروض یا عصبہ کی موجودگی میں ذوی الارحام حصہ نہیں پاتے۔ لہٰذا بقایا ترکہ بھی ذوی الفروض کو ان کے حصوں کی نسبت سے بانٹ دیا جاتا ہے۔ علم فرائض کی اصطلاح میں یہ قاعدہ ''الرد'' کہلاتا ہے۔ مثلاً میت کی بیوی، ماں اور ایک لڑکی زندہ ہیں، تو ان کے حصے یوں ہوں گے:

بیوی $\frac{1}{۸}$ + ماں $\frac{1}{۶}$ + بیٹی $\frac{1}{۲}$ = $\frac{۳+۴+۱۲}{۲۴}$ = $\frac{۱۹}{۲۴}$ باقی = $\frac{۵}{۲۴}$

اب قاعدہ یہ ہے کہ ردّ کی صورت میں خاوند یا بیوی کو مزید کچھ نہیں ملتا۔ لہٰذا یہ بقایا ۵ حصے ماں بیٹی میں ان کے مقررہ حصوں کی نسبت، یعنی ۱۔۳ کی نسبت سے تقسیم ہو جائیں گے۔ چنانچہ ان پانچ حصوں کے ۲۰ حصے بنا کر ۵ ماں کو اور ۱۵ بیٹی کو دے دیئے جائیں گے۔

ردّ کے مسئلہ میں بھی کئی طرح کے اختلاف ہیں۔ مثلاً:

۱۔ بعض تو سرے سے ردّ کے قائل ہی نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عصبہ نہ ہونے کی صورت میں بقایا بیت المال میں جانا چاہیے۔

۲۔ بعض کہتے ہیں کہ زوجین کو ذوی الفروض سے خارج کر دینا چاہیے، کیوں کہ وہ رحم کا رشتہ نہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۔ بعض باپ دادا کو بھی خارج کر دیتے ہیں، کیوں کہ وہ عصبہ بن سکتے ہیں۔اور

۴۔ بعض کہتے ہیں کہ کسی کو بھی خارج نہ کرنا چاہیے، حتیٰ کہ زوجین کو بھی خارج نہ کرنا چاہیے۔

جب کہ راجح مذہب وہ ہے جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ، جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین رحمۃ اللہ علیہم، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔اسی پر شافعیہ نے اعتماد کیا ہے، اور بعض مالکیوں نے بھی، کہ جب بیت المال موجود نہ ہو تو بقایا ترکہ درج ذیل آٹھ ذوی الفروض میں سے جو موجود ہوں، ان پر لوٹا دیا جائے۔اس میں زوجین اور ماں باپ دونوں کو خارج کر دیا گیا ہے۔

(۱) بیٹی (۲) پوتی (۳) سگی بہن (۴) سوتیلی بہن (۵) ماں (۶) نانی، دادی (۷) مادری بھائی (۸) مادری بہن۔ (فقہ السنۃ، ج ۳، ص ۴۴۴)

عصبات:

ذوی الفروض کی بحث میں عصبہ کی تعریف اور تقسیم بہت حد تک ذکر ہو چکی۔ مختصراً عصبہ نسبی کی چار جانبیں ہیں جو درج ذیل ہیں:

(الف) بیٹا، پوتا نیچے تک (جزءِ میت)، (ب) باپ۔دادا (اصل میت)، (ج) بھائی اور ان کی نرینہ اولاد، (جزءِ اصل میت)، (د) چچے اور ان کی نرینہ اولاد (جزءِ حصہ میت)

مزید وضاحت یہ ہے کہ عصبہ کی تعیین کے سلسلہ میں دو باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے، ایک میت سے بلحاظِ رشتہ قُرب اور بُعد اور دوسرے یہ کہ سگے رشتہ دار سوتیلے پر اور سوتیلے ماں جائے رشتہ دار پر مقدم ہوتے ہیں۔ مثلاً سگا بھائی سوتیلے بھائی پر تو مقدم ہوگا، لیکن سگے بھائی کا بیٹا سوتیلے بھائی پر مقدم نہ ہوگا۔اسی طرح سوتیلا چچا سگے چچا کے بیٹوں پر مقدم ہوگا۔اور سوتیلے بھائی کا بیٹا سگے بھائی کے پوتے پر مقدم ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس

عصبہ کی اقسام:

ایک دوسرے پہلو سے عصبہ کی تین اقسام ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

۱۔ عصبہ بنفسہ: مندرجہ بالا چاروں جوانب میں جو رشتے مذکور ہوئے، یہ عصبہ بنفسہ ہیں۔ یعنی عصبہ ہونے میں کسی دوسرے کے محتاج نہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ عصبہ بالغیر یا بغیرہ: میت کی بیٹی یا بیٹیاں ذوی الفروض سے ہیں۔ لیکن جب ان کا کوئی بھائی بھی ہوگا (جو میت کا بیٹا اور عصبہ بنفسہٖ ہے) وہ اپنی بہنوں کو بھی عصبہ بنا دے گا اور وہ ذوی الفروض سے نہ رہیں گی۔ پہلی صورت میں ان کا $\frac{1}{2}$ یا $\frac{2}{3}$ حصہ مقرر تھا۔ اب وہ نہ رہا۔ اب وہ اپنے بھائی کے ساتھ بقایا ترکہ میں سے دوہرے اور اکہرے حصہ کی نسبت سے حصہ پائیں گی۔ گویا بیٹے کے ساتھ بیٹیاں عصبہ بالغیر یا بغیرہ بن گئیں۔ عصبہ بالغیر بیٹیاں، پوتیاں، حقیقی بہنیں اور سوتیلی بہنیں ہیں۔

۳۔ عصبہ مع الغیر: بعض دفعہ کسی ذی الفرض رشتہ دار کی موجودگی دوسرے ذی الفرض رشتہ دار کو عصبہ بنا دیتی ہے۔ مثلاً میت کی ایک بیٹی اور ایک بہن ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا حصہ $\frac{1}{2}$ ہے۔ [1] اب اگر ایک پوتی بھی ہو جو بیٹی کے ساتھ $\frac{1}{6}$ حصہ پاتی ہے، تو یہ پوتی بہن کو عصبہ بنا دے گی۔ بیٹی بھی ذی الفرض اور پوتی بھی ذی الفرض۔ ان دونوں نے مل کر ایک تیسری ذی الفرض بہن کو عصبہ بنا دیا۔ اب بہن کو، بیٹی اور پوتی کا حصہ $\frac{1}{2}$ اور $\frac{1}{6}$ نکالنے کے بعد جو بچے گا، وہ ملے گا۔ یعنی $\frac{1}{3}$۔ [2]

گویا عصبہ بالغیر میں کوئی عصبہ ذوی الفروض کو عصبہ بناتا ہے، جب کہ عصبہ مع الغیر میں ذی الفرض ہی دوسرے ذی الفرض کو عصبہ بنا دیتا ہے۔ اور یہ حقیقی یا پدری بہنیں ہی ہوتی ہیں۔

ابنائی جانب میں عصبہ عموماً حصہ کو کم کر دیتا ہے۔ مثلاً بیٹی کا حصہ $\frac{1}{2}$ ہے۔ جب بیٹا ساتھ مل جائے گا تو بیٹی کا حصہ $\frac{1}{3}$ ہو جائے گا۔ مگر آبائی جانب میں یہ حصہ بڑھ جاتا ہے۔ مثلاً میت کے ماں باپ اور بھائی بہنیں ہیں۔ باپ کی موجودگی میں بھائی بہنیں محروم اور حصہ صرف ماں اور باپ کو $\frac{1}{6}$ اور $\frac{1}{6}$ کل $\frac{1}{3}$ ملے گا۔ باقی $\frac{2}{3}$ بھی باپ کو عصبہ کی حیثیت سے مل جائے گا۔

خاوند بیوی کا عصبہ نہیں بن سکتا۔ وہ $\frac{1}{2}$ کا ہی حق دار ہے۔ اور ہمارے ہاں جو یہ دستور چل نکلا ہے کہ بے اولاد عورت مر جائے تو اس کے رشتہ دار اس کا سب کچھ لے جاتے ہیں، یہ شریعت کے خلاف ہے۔

ذوی الارحام:

ذوی الفروض اور عصبات میں ترکہ کی تقسیم کے بعد ہی ذوی الارحام کی باری آتی ہے اور یہ باری شاذ و نادر ہی آسکتی ہے، جس کی وجوہ درج ذیل ہیں:

---

1. بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث البنات
2. بخاری، کتاب الفرائض

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۔ ایسی مثال ملنا ہی شاذ ہے کہ میت کی نہ تو اولاد ہو اور نہ ہی آبائی، اخوی اور عمومی جانب میں کوئی عصبہ ملتا ہو۔ اور جب تک ذوی الفروض اور عصبات مل سکتے ہوں، ذوی الارحام کو کچھ نہیں ملتا۔

۲۔ اور اگر عصبات نہ ملتے ہوں اور ذوی الفروض موجود ہوں، تو اگر ذوی الفروض سے کچھ ترکہ بچ بھی جائے تو قاعدہ ''رد'' کے تحت وہ پھر انہی میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

۳۔ علماء کا سرے سے اس بات میں ہی اختلاف ہے کہ آیا ذوی الارحام وارث ہوتے بھی ہیں یا نہیں؟ کتاب و سنت میں، ذوی الارحام کا تقسیم ترکہ کے سلسلہ میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔ رسول اللہ ﷺ سے پھوپھی اور خالہ کی میراث کے متعلق پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان کے لیے کچھ نہیں'' (اسلامی وراثت از حافظ عبداللہ روپڑی رحمہ اللہ، حصہ دوم، ص ۲)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے، ''تعجب ہے کہ بھتیجا تو پھوپھی کا وارث ہے، مگر وہ بھتیجے کی وارث نہیں۔'' (مؤطا، کتاب الفرائض، باب فی میراث العمة)

نیز ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا، ''جس کا کوئی وارث نہیں، اس کا میں وارث ہوں۔'' (ابوداؤد، کتاب الفرائض، باب میراث ذوی الارحام)

گویا وہ ترکہ بیت المال میں جائے گا۔ چنانچہ بعض صحابہ مثلاً زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ، نیز امام شافعی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ اسی بات کے قائل ہیں۔

دوسری طرف ترمذی میں ایک مرسل حدیث یہ بھی ہے کہ: ''الخال من لا وارث له''۔ یعنی جس کا کوئی وارث نہ ہو، ماموں اس کا وارث ہوتا ہے۔ پھر اس کے قائلین یہ بھی کہتے ہیں کہ گو کتاب و سنت میں تقسیم میراث کے بارے ذوی الارحام کا ذکر نہیں، تاہم اولوا الارحام کے الفاظ تو موجود ہیں، اور یہ سب مطالب کے لیے عام ہیں۔ چنانچہ کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین رحمہم اللہ اور حنفیہ اس بات کے حق میں ہیں کہ ذوی الفروض اور عصبہ کی عدم موجودگی میں ترکہ ذوی الارحام میں تقسیم ہونا چاہیے۔

قائلین نے ایسے رشتہ داروں کی طول طویل تفصیلات پیش کی ہیں اور ان میں تقدم و تاخر کے اصول اور ترتیب وہی ہے، جو عصبات کی ہے، مثلاً:

۱۔ جزءِ میت، جیسے بیٹی کی اولاد، نواسے نواسیاں وغیرہ نیچے تک۔ اسی طرح پوتے پوتیاں اور ان کی اولاد نیچے تک۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ اصل میت، جیسے جدِّ فاسد، یعنی نانا پڑنانا اور دادی کا باپ وغیرہ، اور جدّہ ٔفاسدہ، جیسے نانا کی ماں، دادی کے باپ کی ماں وغیرہ۔

۳۔ جزء والدین میت، جیسے بہن کی اولاد، بھانجے بھانجیاں نیچے تک اور بھتیجے بھتیجیاں نیچے تک۔

۴۔ جزء جدین میت (جو میت کے نانے، دادے کی طرف منسوب ہوں) جیسے پھوپھی اور اس کی اولاد نیچے تک، خالہ اور اس کی اولاد نیچے تک، ماموں اور اس کی اولاد نیچے تک، چچا زاد بہن اور اس کی اولاد نیچے تک۔

گویا تفصیلاً یہ مندرجہ ذیل گیارہ اقسام بن جاتی ہیں:

(۱) نواسے نواسیاں (۲) بھانجے بھانجیاں (۳) بھتیجے بھتیجیاں (۴) مادری بہنوں کی اولاد (۵) پھوپھیاں اور ان کی اولاد (۶) چچا، جو میت کے باپ کا مادری بھائی ہو (۷) ماموں (۸) خالہ (۹) چچا زاد بہنیں (۱۰) جدِ فاسد اور جدّہ ٔفاسدہ۔

اور یہ ایسی تفصیلات ہیں، جن کی شاید ہی کبھی ضرورت پیش آئی ہو یا آئندہ کبھی پیش آئے۔

پھر ان رشتہ داروں میں تقسیمِ ترکہ کے طریقہ میں بے شمار اختلافات ہیں۔ اور چونکہ کتاب وسنت میں ان کے متعلق کوئی نص نہیں ملتی، لہٰذا اس میدان میں فقہاء نے خوب جولانیاں دکھائی اور موشگافیاں کی ہیں۔ چنانچہ ایک ہی مسئلہ کے کئی کئی حل پیش کیے ہیں۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ کوئی ایسا مسئلہ نہ ہوگا، جس میں اختلاف نہ پایا جاتا ہو تو زیادہ موزوں ہے۔ اس طول طویل بحث کا نہ یہاں حصر ممکن ہے اور نہ ہی ہم اس کا کچھ فائدہ سمجھتے ہیں۔

ہمارے خیال میں بہتر صورت یہ ہے کہ مرنے والا جن ذوی الارحام یا محروم رشتہ داروں میں سے کسی کی مدد کرنا چاہے تو اس کے حق میں وصیت کر جائے۔ بصورتِ دیگر ورثاء کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایسے ذوی الارحام یا محروم رشتہ داروں میں سے جسے مستحق سمجھیں، اسے کچھ نہ کچھ حصہ دے دیں، بموجب ارشادِ باری تعالیٰ:

﴿وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ﴾ (النساء:۸)

”اور جب تقسیم میراث کے وقت (غیر وارث رشتہ دار اور یتیم اور مسکین آ جائیں، تو اس میں سے ان کو کچھ دے دیا کرو۔“

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلامی قانون وراثت کی امتیازی خصوصیات

ا۔ میراث میں عورت کا حصہ:

قبل از اسلام، اس وقت کے مہذب ممالک، مثلاً ہندوستان، چین اور مغربی ممالک میں عورت کو وراثت سے محروم رکھا جاتا تھا۔ اور عرب میں تو اس کا اور بھی برا حال تھا کہ عورت کا وارث ہونا تو درکنار، وہ ترکہ کا مال بنی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ باپ کی منکوحہ بیٹے کے حصے میں آتی تو وہ اس سے نکاح کر لیتا۔ اس ظلم کا خاتمہ اللہ رب العزت کے اس ارشادِ مبارک سے ہوا:

﴿وَلَا تَنكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُم مِّنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَمَقْتًا وَسَاءَ سَبِيلًا﴾ (النساء:۲۲)

''اور جن عورتوں سے تمہارے باپوں نے نکاح کیا ہو، ان سے نکاح نہ کرنا، مگر (دورِ جاہلیت میں) جو ہو چکا سو ہو چکا۔ یہ بے حیائی اور اللہ کی ناخوشی کی بات اور بہت ہی بُرا دستور تھا۔''

عورتوں سے ترکہ چھین لینا بھی ایسا ہی ایک ظالمانہ دستور تھا۔ جنگِ اُحد میں سیدنا سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے اور دو لڑکیاں اور بیوی چھوڑ گئے۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ شہید کا بھائی زندہ تھا، اس نے عرب کے دستور کے موافق پورے ترکہ پر قبضہ جما لیا۔ یتیم لڑکیاں اور بے کس بیوی دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور صورتِ حال عرض کرتے ہوئے کہا کہ: ''ابھی تو ان کی شادی بھی کرنی ہے اور ترکہ سارا ان لڑکیوں کا چچا لے گیا ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: ''اللہ کے حکم کا انتظار کرو۔'' اسی پس منظر میں آیاتِ میراث نازل ہوئیں۔ جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کے بھائی کو بلا کر فرمایا: ترکہ کا دو تہائی تو ان بیٹیوں کو دو اور $\frac{1}{8}$ ان کی ماں کو، باقی جو کچھ بچے، وہ تمہارا ہے''۔ یہ پہلی میراث تھی جو اسلام میں تقسیم ہوئی اور عورتوں کو میراث میں حصہ دار بنایا گیا۔

۲۔ عورتوں کے حصہ معینہ کی حکمت:

اس قانون کی دوسری خوبی یہ ہے کہ عورتوں کو حسبِ ضرورت حصہ دیا گیا ہے۔ مثلاً اوپر کی مثال میں لڑکیاں یتیم تھیں اور شادی کے قابل، تو انہیں کل ترکہ کا $\frac{2}{3}$ دے دیا گیا۔ اور اگر ان کے ساتھ ان کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کفالت کرنے والا کوئی بھائی بھی ہوتا، یا زیادہ بھائی ہوتے، تو بارِ کفالت ان بھائیوں پر تھا، لہٰذا انہیں عورت سے دوگنا حصہ دیا جاتا، جب کہ لڑکیوں کو ان سے آدھا حصہ دینے پر اکتفا کیا گیا۔ اسی طرح بوڑھے ماں باپ دونوں کا حصہ برابر (یعنی ہر ایک کا $\frac{1}{6}$) رکھا گیا، اسی لیے کہ زندگی کے اس دور میں دونوں پیسے کے لیے برابر اور ایک جیسے محتاج ہوتے ہیں۔

۳۔ غیر مستحقین کے حقوق کا خاتمہ:

عرب میں یہ دستور بھی تھا کہ کوئی شخص مثلاً زید اپنے کسی دوست مثلاً بکر سے ولایت وحمایت کا عہد و پیمان کر لیتا۔ اس عہد میں یہ بات بھی شامل ہوتی کہ زید کے ترکہ کا بکر، اور بکر کے ترکہ کا زید وارث بنے گا۔ اس طرح اصل ورثا محروم رہ جاتے۔

علاوہ ازیں ایک دستور یہ بھی تھا کہ جس کے اولاد نہ ہوتی، وہ کسی کو اپنا متبنیٰ (منہ بولا بیٹا) بنا لیتا۔ اب یہ متبنیٰ ہی وارث ہوتا اور اصل مستحقین محروم رہ جاتے۔

قرآن کریم نے ان لوگوں کے ایسے حق کو، جس سے حق داروں کا حق سلب ہو رہا تھا، ختم کر دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ﴾ (النساء:۳۳)

''اور ہم نے ہر اس ترکہ کے حق دار مقرر کر دیئے ہیں، جو والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں۔ رہے وہ لوگ، جن سے تمہارے عہد و پیمان ہوں، تو انہیں ان کا حصہ (ان کی زندگی ہی میں جو چاہو) دے دو''

ہجرت نبوی ﷺ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے انصار و مہاجرین میں سلسلہ مؤاخات (بھائی بھائی بنانا) قائم فرمایا، جس میں یہ بھائی ایک دوسرے کے وارث قرار پائے۔ اور یہ خالصتاً دینی مقصد تھا، جس کے ذریعہ مہاجرین کی آباد کاری اور مسلمانوں کا معاشی مسئلہ حل کیا گیا تھا۔ مگر جب مسلمانوں کی معاشی حالت کچھ سنبھل گئی تو اس حکم کو بھی درج ذیل آیت سے منسوخ کر دیا گیا:

﴿وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوا إِلَىٰ أَوْلِيَائِكُمْ مَعْرُوفًا﴾ (الاحزاب:۶)

''کتاب اللہ کی رُو سے عام مسلمانوں اور مہاجرین کی نسبت رشتہ دار ہی ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں، الا یہ کہ تم اپنے دوستوں سے کوئی بھلائی (کرنا چاہو تو) کر سکتے ہو''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۔حق وصیت:

ان احکامِ میراث میں میت کو بالکل بے بس نہیں چھوڑا گیا، بلکہ اسے اپنے مال میں سے $\frac{1}{3}$ تک وصیت کا حق دیا گیا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں ہدیہ، تحائف اور ہبہ کے ذریعہ نیز بوقت وفات وصیت کے ذریعہ اپنے دوستوں کو، رشتہ داروں کو، متبنیٰ کو...... غرض جسے بھی چاہے...... اپنے مال میں سے حصہ دے کران کے عہد و پیمان اور اپنی تمنا کو پورا کرسکتا ہے۔

۵۔صغر و کبر کے تفاوت کا خاتمہ:

قبل از اسلام کئی ممالک میں یہ رواج تھا کہ ترکہ کا اصل وارث خلفِ اکبر (بڑا بیٹا) ہی قرار دیا جاتا۔ پھر جسے وہ چاہتا، کچھ دے دیتا، یہ اس کی اپنی صوابدید پر منحصر تھا۔ اور عرب میں یہ دستور تھا کہ ترکہ صرف ان بیٹوں کو ملتا جو جنگ کرنے کے اہل ہوتے، چھوٹے بیٹے ورثہ سے محروم کردیئے جاتے۔ اسلام نے اس طرح کے ہر قسم کے تفاوت کو ختم کرکے چھوٹے بڑے سب کا حصہ برابر قرار دیا۔ حتیٰ کہ پیٹ کے جنین کو بھی وراثت میں حصہ دار بنایا گیا ہے۔

اولاد میں سے کسی کا اپنے والد کا فرمانبردار ہونا، نہ ہونا اس کے حصۂ وراثت کو متاثر نہیں کرسکتا۔ ہمارے ہاں جو یہ رواج چل نکلا ہے کہ ادھر والد اپنے کسی بیٹے سے ناراض ہوا، اُدھر اُس نے اخبارات میں "عاق نامہ" شائع کرا کے اسے محروم الارث قرار دے دیا۔ ایسے عاق ناموں کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں۔ والد کا نافرمان ہونا گناہِ کبیرہ ہے، جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن یہ گناہ بیٹے کے حق وراثت کو ساقط نہیں کرسکتا۔ حق وراثت صرف قتل سے ساقط ہوتا ہے۔

۶۔ہر ایک کے حصہ کی تعیین:

اللہ تعالیٰ نے ہر وارث کے حصے خود ہی مقرر فرما دیئے ہیں۔ چنانچہ ہر ایک کو یہ پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکہ میں اس کا حصہ کیا ہے؟ اس طرح باہم لڑائی جھگڑے اور تنازعات کا خاتمہ کردیا گیا ہے۔

۷۔عدل وانصاف پر مبنی قانون:

ہر انسان (بلکہ اگر ہر جاندار کہیں تو زیادہ مناسب ہے) کی توجہ اپنی اولاد کی طرف ہوتی ہے۔ اور اپنی اصل، یعنی والدین کی طرف سے وہ لاپرواہ ہوتا جاتا ہے۔ اسی فطرتِ انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلام نے دوسرے ورثاء کے مقابلہ میں اولاد کو مقدم کیا ہے۔ چنانچہ آیاتِ میراث کی ابتدا ہی ﴿يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ﴾ سے ہوتی ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ دوسرے نمبر پر والدین کا حصہ مقرر کردیا گیا ہے، کہ جن ہستیوں نے محنت ومشقت سے اسے پروان چڑھایا ہے، انہیں وہ یکسر فراموش ہی نہ کر دے۔ شوہر، بیوی، بیٹا، بیٹی، ماں، باپ، یہ سب لازمی ورثاء ہیں، جو کسی صورت میں بھی (اگر موجود ہوں تو) محروم نہیں ہوتے۔

۸۔ خاندانی نظام کا استحکام:

معاشرہ کے استحکام کا انحصار خاندان کے استحکام پر منحصر ہے، کیونکہ خاندان ہی معاشرہ کی ابتدائی اور اوّلین منزل ہے۔ اسلام کا نظامِ وراثت اس سلسلہ میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

معاشی اہمیت

مذکورہ بالا امتیازی خصوصیات کے علاوہ اسلامی قانونِ وراثت کے چند در چند معاشی فوائد بھی ہیں۔ مثلاً:

۱۔ ارتکازِ دولت اور جاگیرداری کا خاتمہ:

دولت کا چند ہاتھوں یا چند خاندانوں میں سمٹ جانا معاشرہ میں طبقاتی تقسیم کا موجب بنتا ہے، جو اپنے ساتھ بے شمار خرابیاں لاتا ہے۔ ارتکازِ دولت سرمایہ دارانہ نظام کا خاصہ ہے۔ انہی خرابیوں کی وجہ سے اس نظام کی کوکھ سے اس کی دوسری انتہا اشتراکیت نے جنم لیا، جو بنی نوع انسان کے لیے سرمایہ دارانہ نظام سے بھی زیادہ مہلک ثابت ہوئی ہے۔ اسلامی نظامِ وراثت کی خوبی یہ ہے کہ وہ دولت کے خزانوں کو ایک ہی پشت میں کم وبیش آٹھ دس حصوں میں بانٹ دیتا ہے اور یہ سلسلہ ہر پشت میں، بلکہ ہر وقت آگے بڑھتا رہتا ہے، جس سے سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں ازخود ختم ہونے لگتی ہیں۔

یہی صورت حال جاگیرداری کی بھی ہے۔ موجودہ زمانے کی جاگیریں اگر اسلام کے قانونِ وراثت کے مطابق ورثاء میں تقسیم ہوتی رہتیں تو آج ملکی دولت پر چند خاندانوں کا قبضہ نہ ہوتا۔ اور حکومتوں کو آئے دن زرعی اصلاحات کی جو ضرورت پیش آتی ہے، اس کی نوبت ہی نہ آتی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ پیداوار میں اضافہ:

جاگیرداری کا سب سے بڑا نقصان ملکی سطح پر ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کے پاس ہزاروں ایکڑ رقبہ موجود ہے۔ اور ایسے اشخاص ہمارے ملک میں اگر سینکڑوں نہیں تو بیسیوں ضرور موجود ہیں ...... اب یہ تو ظاہر ہے کہ اس قدر وسیع رقبے کا ایک مالک اس رقبہ پر وہ توجہ نہیں دے سکتا جو دس، بیس یا اس سے بھی زیادہ مالک دے سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زمین سے اتنی پیداوار حاصل نہیں ہوسکتی جتنی کہ ہونا چاہیے تھی۔ اگر یہ زمینیں متعدد افراد کی ملکیت میں ہوتیں تو یقیناً ان سے دوگنی پیداوار حاصل کی جاسکتی تھی۔

۳۔ خاندانی کفالت:

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ میں آ کر سخت بیمار پڑ گئے اور انہیں اپنے جانبر ہونے کی امید نہ رہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کی عیادت کو آئے اور تسلی دی۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی، میں چاہتا ہوں کہ اپنی ساری جائیداد کی وصیت کر جاؤں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت نہ دی۔ پھر سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے دو تہائی وصیت کی بات کی، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ صورت بھی تسلیم نہیں فرمائی۔ پھر انہوں نے آدھے ترکہ کی بات کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات بھی قبول نہ فرمائی۔ اس کے بعد سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے ایک تہائی کی اجازت چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تہائی کی اجازت تو دے دی، مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ یہ ایک تہائی بھی بہت ہے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کو جو کچھ ارشاد فرمایا، وہ زریں حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر آپ اپنی اولاد کو مالدار چھوڑ جائیں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ انہیں آپ محتاج چھوڑ جائیں اور وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔'' (بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث البنات)

پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ وارث صرف اولاد ہی نہیں ہوتی، بلکہ ایسے وارثوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اگر ہر شخص کا ترکہ یوں انصاف کے ساتھ تقسیم ہوتا رہے تو معاشی ناہمواریوں میں حیرت انگیز حد تک خود بخود کمی ہوتی چلی جاتی ہے۔ یوں ہر خاندان کی اپنی اپنی سطح پر کفالت بھی ہو جاتی ہے اور معاشی سطح میں یکسانی بھی پیدا ہونے لگتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۔ گردشِ دولت اور غربت کا علاج:

ترکہ پانے والے وارثوں میں غریب بھی موجود ہوتے ہیں۔ وصیت میں صدقہ و خیرات سب غریب طبقہ کا حصہ ہوتا ہے۔ پھر قرآن کریم کی ہدایت بھی موجود ہے کہ میراث سے پہلے محتاج و نادار حاضرین کو کچھ دے دیا کرو۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکہ میں غرباء کا ایک معتد بہ حصہ ہوتا ہے۔ معاشیات کا ایک قاعدہ تو یہ ہے کہ دولت کی گردش سے خوشحالی میں اضافہ ہوتا ہے اور دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ اگر دولت غریب طبقہ میں آئے تو گردش کی رفتار تیز تر ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ طبقہ اپنی ضروریات پہلے سے ہی روکے ہوئے ہوتا ہے کہ کہیں سے پیسہ ملے تو اسے خرچ کر کے اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ہر ہر مقام پر غریب طبقہ کا خیال رکھا ہے۔ بلکہ ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی فرمادی کہ:

﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ﴾ (الحشر:۷) ”ایسا نہ ہو کہ دولت تمہارے اغنیاء میں ہی گردش کرتی رہے“

اس لحاظ سے اسلامی قانون وراثت جہاں غریبوں کا سہارا بنتا ہے، وہاں ملک کی خوشحالی کا بھی موثر سبب بن جاتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقالہ:٦

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی شرعی تبدیلیاں ٭

انکار حدیث کا فتنہ بڑا پہلو دار ہے اور اسی لحاظ سے منکرین حدیث کی بھی کئی اقسام بن گئی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو حدیث کو حجت سمجھتے ہیں اور نہ ہی اس کی ضرورت۔ ان کے نزدیک تمام تر ذخیرہ احادیث دفتر بے معنی ہے۔ وہ اپنا کام صرف قرآن سے چلانا چاہتے ہیں اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کے باوجود اپنی ہٹ سے باز نہیں آتے۔ یہ اہل قرآن کہلاتے ہیں جن کے لیڈر مولوی عبداللہ چکڑالوی تھے۔ یہ فرقہ مسلسل ناکامیوں کے بعد اب قریباً قریباً اپنا وجود ختم کر چکا ہے۔

دوسرا گروہ اس ذخیرہ احادیث کو صرف تاریخ کی حد تک مفید سمجھتا ہے۔ جس میں وہ اپنی پسند کے مطابق احادیث سے اپنی تحریروں اور دفتروں کو سجاتے ہیں اور ایک کثیر حصہ کو اپنے خود ساختہ معیار کے مطابق رد کر دیتے ہیں۔ اس گروہ کی نمائندگی اس دور میں ادارہ طلوع اسلام کر رہا ہے۔ ان کے نزدیک اگر کوئی حدیث درست بھی ہو تو بھی وہ دور نبوی کے لیے حجت تھی۔ بعد کے ادوار کے لیے اور اسی طرح آج بھی وہ ہمارے لیے حجت نہیں ہے۔

تیسرا گروہ وہ ہے جو کسی حدیث کے درست ثابت ہو جانے کے بعد یا بالفاظ دیگر سنت رسول کو حجت شرعیہ تو ضرور سمجھتا ہے مگر ان کے خیال کے مطابق اسوہ حسنہ کا ایک قلیل حصہ ہی ایسا ہے جو تشریعی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہی حصہ غیر متبدل ہے جیسے عبادات کو بجالانے کے طریقے، رہا معاملات پر مشتمل ایک کثیر حصہ سنت رسول، تو اس حصہ میں زمانہ کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے تحت تبدیلیوں کے جواز کے قائل ہیں۔ آج کل اس گروہ کی نمائندگی ادارہ ثقافت اسلامیہ کر رہا ہے۔ یہ حضرات سنت تو درکنار، حالات کے تقاضوں کے مقابلہ میں قرآنی احکام کو بھی متبدل سمجھتے ہیں۔ حدیث کو مقبول و مردود قرار دینے کے لیے بھی ان کے معیار الگ ہیں گویا جس نتیجہ پر طلوع اسلام پہنچا تھا۔ یہ حضرات بھی بالآخر وہیں جا پہنچے ہیں۔ اگرچہ ان کا راستہ جداگانہ ہے۔

٭ یہ مضمون سہ ماہی مجلہ ''منہاج'' جنوری تا اپریل ۱۹۸۷ء میں طبع ہوا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذکورہ بالا تین گروہوں کے علاوہ ایک چوتھا گروہ ایسا بھی ہے جو سنت رسول کو فی الواقع شرعی حجت اور شرعی قوانین کا مستقل اور الگ ماخذ تسلیم کرتا ہے۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ گروہ محدثین کے کیے ہوئے کام پر پوری طرح مطمئن نہیں۔ یہ حضرات درایت کو روایت سے زیادہ قابل اعتناء سمجھتے ہیں۔ خبر واحد کی حجت کے سلسلہ میں خاصی لچک رکھتے ہیں اور ہر خبر واحد کو قابل اتباع نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک خبر واحد عقیدہ کی بنیاد نہیں بن سکتی خواہ وہ صحیح ہو۔ ایسے لوگوں کو منکر حدیث یا سنت کہنا تو بہت زیادتی ہوگی تاہم بعض پہلوؤں میں ان کی سرحدیں منکرین حدیث سے جا ملتی ہیں۔

آج ہم گروہ نمبر۲ اور نمبر۳ کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔ ان دونوں گروہوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ کوئی بھی صحیح حدیث یا سنت رسول بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کے تحت غیر متبدل نہیں رہ سکتی اور اس میں حسب ضرور تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر سنت رسول فی الواقع غیر متبدل ہوتی تو خلفائے راشدین ان میں تبدیلیاں کیوں کرتے رہے۔ ان خلفائے راشدین کے ایسے اقدامات میں سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا نام سرفہرست پیش کیا جاتا ہے۔ بلکہ اگر یوں کیا جائے کہ اس سلسلہ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا نام ہی پیش کیا جاتا ہے تو بھی بے جا نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر یہ کہا جائے کہ ادارہ طلوع اسلام کی نظر انتخاب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پر بطور ''شہکار رسالت'' محض اس لیے پڑی کہ ادارہ مذکور کے خیال کے مطابق تمام تر ''شرعی ترمیمات'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمائی تھیں تو یہ بات بھی بے جا نہ ہوگی۔

اس سلسلہ میں پہلے تو ''اولیاتِ عمر'' کا ہوا دکھایا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ کم وبیش نصف صد ایسے امور ہیں جو دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود نہیں تھے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی ابتدا کی تھی۔ لیکن یہ حضرات ایسے نصف صد امور درج کرنے سے عموماً گریز کیا کرتے ہیں۔ اس کے بجائے چند ایک ایسے امور لکھ دیتے ہیں جن کا تعلق فی الواقع امور شرعیہ سے معلوم ہوتا ہے ان اولیات عمر رضی اللہ عنہ، میں چونکہ بیشتر امور محض تدبیری قسم کے ہیں لہٰذا ان کا ذکر مناسب نہیں سمجھتے۔ اس سے ایک عام قاری کا ذہن خواہ مخواہ اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ اگر نصف صد کے قریب سنت رسول ایسی ہیں جن میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے تبدیلی کر دی تو پھر سنت رسول غیر متبدل کیونکر ہو سکتی ہے؟ اس مغالطہ کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان ''اولیات عمر'' کو پہلے مکمل طور پر درج کر دیا جائے۔ تبصرہ کی باری بعد میں آئے گی۔ یہ تفصیل عام تاریخ کی کتابوں میں یکجا طور پر کم ہی ملتی ہے۔ ہم یہ تفصیل ایم اے تاریخ کی کتاب تاریخ اسلام کے صفحہ ۱۸۳،۱۸۴ سے پیش کر رہے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اولیاتِ عمر رضی اللہ عنہ:

۱۔ بیت المال یا خزانہ قائم کیا
۲۔ سنہ ہجری قائم کیا
۳۔ عدالتیں بنائیں اور قاضی مقرر کیے
۴۔ امیر المومنین کا لقب اختیار کیا
۵۔ فوجی دفتر قائم کیا
۶۔ مالی دفتر ترتیب دیا
۷۔ رضا کاروں کی تنخواہیں مقرر کیں
۸۔ پیمائش کا طریقہ جاری کیا
۹۔ مردم شماری کرائی
۱۰۔ نہریں کھدوائیں
۱۱۔ شہر آباد کرائے
۱۲۔ مقبوضہ ممالک کو صوبوں میں تقسیم کیا
۱۳۔ عربی تاجروں کو ملک میں آنے اور تجارت کرنے کی اجازت دی۔
۱۴۔ دُرّے کا استعمال کیا۔
۱۵۔ جیل خانہ قائم کیا۔
۱۶۔ پولیس کا محکمہ قائم کیا۔
۱۷۔ پرچہ نویس مقرر کیے۔
۱۸۔ رات کو گشت کر کے رعایا کا حال معلوم کرنے کا طریقہ نکالا۔
۱۹۔ راستے اور مسافروں کے لیے کنوئیں اور سرائیں بنوائیں۔
۲۰۔ نادار عیسائیوں اور یہودیوں کے روزینے مقرر کیے۔
۲۱۔ فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔
۲۲۔ قیاس کا اصول وضع کیا۔
۲۳۔ مدرسے کھولے۔
۲۴۔ معلموں کی تنخواہیں مقرر کیں۔
۲۵۔ گھوڑوں کی نسل میں اصیل وغیرہ کی تمیز قائم کی۔
۲۶۔ راستے میں پڑے بچوں کی پرورش کے لیے روزینے مقرر کیے۔
۲۷۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے قرآن مدون کرایا
۲۸۔ فرائض میں عول کا مسئلہ ایجاد کیا۔
۲۹۔ وقف کا طریقہ ایجاد کیا۔
۳۰۔ مسجدوں میں وعظ کا طریقہ ایجاد کیا۔
۳۱۔ اماموں اور موذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں۔
۳۲۔ مسجدوں میں روشنی کا اہتمام کیا۔
۳۳۔ ہجو گو کے لیے سزا مقرر کی۔
۳۴۔ غزلوں میں عورتوں کے نام لینے
۳۵۔ عشر مقرر کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی ممانعت کی۔

۳۶۔ دریا کی پیداوار پر محصول لگایا۔

۳۷۔ تجارت کے گھوڑوں پر زکوٰۃ مقرر کی۔

۳۸۔ فجر کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کا جملہ بڑھایا۔

۳۹۔ تراویح کی نماز باجماعت پڑھنے کا اہتمام کیا۔

۴۰۔ جنازے کی نماز میں چار تکبیروں پر اجماع کرایا۔

۴۱۔ ایک ہی دفعہ دی ہوئی تین طلاقوں کو بائن ٹھہرایا۔

۴۲۔ شراب کی حد اسّی (۸۰) کوڑے مقرر کی۔

۴۳۔ بنی تغلب کے عیسائیوں پر جزیے کے بجائے زکوٰۃ مقرر کی۔

مندرجہ بالا فہرست میں نصف صد کے بجائے (۴۳) امور کا اندراج ہے۔ جن پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں سے پہلے (۳۲) امور ایسے ہیں جن کا تعلق صرف تدبیر سے ہے۔ شریعت سے نہیں۔ لہٰذا ان پر بدعت یا تبدیلی سنت کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا۔

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ دور نبوی یا خلفائے راشدین میں نہ ریل تھی نہ تار برقی نہ ٹیلی فون نہ ریڈیو نہ وائرلیس وغیرہ وغیرہ۔ اب اگر یہ محکمے اپنے اپنے محکمہ کے انتظام کے لیے ایسے امور طے کریں یا ایسے قوانین بنالیں جن سے کوئی شرعی حکم مجروح نہ ہوتا ہو تو یہ وقت کا تقاضا اور ایک مستحسن کام ہوگا۔ جس پر تبدیلی سنت یا بدعت کا اطلاق نہیں ہوگا۔ یہی صورت پہلے (۳۲) امور کی ہے۔ البتہ ۳۳ سے ۴۳ تک گیارہ امور ایسے ہیں جن کا بظاہر شرعی امور سے تعلق معلوم ہو رہا ہے۔

اس کے بعد اب ہم جناب جعفر شاہ صاحب پھلواروی رکن ادارہ ثقافت اسلامیہ کی تصنیف ''اسلام، دین آسان'' کے صفحہ ۱۴ تا ۱۶ سے ان ۱۶ ''شرعی تبدیلیوں'' کا ذکر کرتے ہیں جن میں انہوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے علاوہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بھی شامل فرمایا ہے۔

۲۔ جعفر شاہ صاحب کی پیش کردہ ''شرعی تبدیلیاں''

دور فاروقی: شاہ صاحب نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی مندرجہ ذیل ''شرعی ترمیمات'' کا ذکر فرمایا ہے۔

۱۔ دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں غزلوں میں عورتوں کا نام لینے یا ذکر کرنے پر کوئی پابندی نہ تھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے شعراء کو آگاہ کر دیا کہ جو شخص کسی عورت کا نام لے کر تشبیب کرے گا میں اسے کوڑوں کی سزا دوں گا۔

۲۔ جب قریش مکہ نے اسلام، اہل اسلام نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بھی ہجویہ اشعار کہنے شروع

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو جوابی ہجو کی اجازت دی۔ لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں یہ حکم جاری کیا کہ ان اشعار کو اب زبان پر نہ لایا جائے کیونکہ اس سے گزشتہ رنجشیں تازہ ہو جاتی ہیں۔

۳۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور تک شرابی کی تعزیر چالیس درے تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بڑھا کر اسّی درے کر دیا اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے مختلف اوقات میں دونوں طرح کی سزا دی۔ یعنی کبھی چالیس کوڑے اور کبھی اسّی۔

۴۔ دور صدیقی رضی اللہ عنہ تک ام ولد (جس لونڈی کے بطن سے کوئی اولاد ہو جائے) کی خرید و فروخت جائز تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں ام ولد کی خرید و فروخت کو روک دیا کیونکہ قوانین غلامی کا اصل مقصد غلامی کی رسم کو ختم کر دینا ہی تھا۔

۵۔ غزوہ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قیدی کا فدیہ ایک دینار مقرر فرمایا لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مختلف ممالک میں مختلف شرحیں مقرر فرمائیں۔

۶۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مفتوحہ زمینیں (مثلاً خیبر) مجاہدین میں تقسیم کی گئیں مگر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایسی زمینیں مجاہدین میں تقسیم کرنے کے بجائے قومی تحویل میں لے لیں۔

۷۔ دور صدیقی تک بیک مجلس تین طلاق کو طلاق رجعی قرار دیا جاتا رہا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں اسے طلاق مغلظہ قرار دیا۔

۸۔ حلالہ کرنے والے اور کرانے والے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ملعون قرار دیا تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں اعلان فرمایا کہ ''حلالہ کرنے والے اور کرانے والے کو سنگسار کر دوں گا۔''

۹۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے رمضان میں کبھی بیس رکعت اور وہ بھی با جماعت نماز نہیں پڑھی۔ دورِ صدیقی میں بھی اس کا ثبوت نہیں ملتا لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں اس کا باقاعدہ اہتمام فرمایا اور وہ اب تک رائج ہے۔

۱۰۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قابل کاشت اجناس کی شرح خراج کی تفصیل نہیں بتائی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں بالتفصیل ہر جنس کے متعلق خراج کی شرح (کہ فلاں جنس میں فی جریب اتنا) متعین فرمائی۔

۱۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کبھی نہ فرمایا کہ ''کوئی عرب غلام نہیں بن سکتا'' لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے غلامی کو ختم کرنے کے لیے یہ قدم اُٹھایا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۲۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مصارف زکوٰۃ سے ''مؤلفۃ القلوب'' کی مد کو ختم کر دیا اور کہا کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔

۱۳۔ دورِ صدیقی تک غیر شادی شدہ کی سزائے زنا سو کوڑے کے ساتھ ایک سال کی ملک بدری بھی تھی۔ لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں ملک بدری کو روک دیا۔

۱۴۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی اولیات کو بھی جن کی تعداد کم و بیش نصف صد ہے۔ اسی میں داخل سمجھنا چاہیے۔ مثلاً تجارتی گھوڑوں اور دریائی پیداوار پر زکوٰۃ قائم کرنا وغیرہ اسی طرح اور بھی بیسیوں مسائل ہیں۔

دورِ عثمانی:

۱۵۔ عہد فاروقی تک جمعہ کے دن قبل از خطبہ جمعہ ایک ہی اذان ہوا کرتی تھی۔ لیکن جب تمدن وسیع ہو گیا اور کاروبار تجارت میں خاصا پھیلاؤ پیدا ہو گیا تو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں ایک اور اذان کا اضافہ فرمایا۔ جو اب تک رائج ہے۔

دورِ علوی:

۱۶۔ دورِ عثمانی تک اجازت قرآنی کے مطابق کتابیہ عورت سے نکاح کا رواج تھا۔ لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں مسلمانوں کو بعض فتنوں کے اندیشے کی وجہ سے روک دیا۔

مثالیں کہاں تک پیش کی جائیں۔ مختصر یہ ہے کہ عبادات سے لے کر معاملات تک میں بیسیوں شرعی ترمیمات محض اس لیے ہوتی رہیں کہ بدلتے ہوئے حالات کا یہی تقاضا تھا۔'' (ص ۱۶)

''یہ عجیب بات ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو تو فیصلہ نبوی اور فیصلہ صدیقی بدلنے کا اختیار ہو لیکن خود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ بدلنے کا کسی کو حق نہ ہو۔'' (ایضاً ص ۱۶)

مندرجہ بالا اقتباس میں شاہ صاحب نے ایک دفعہ تو نصف صد کے قریب ''اولیات عمر'' کا ذکر فرمایا اور دو دفعہ ''بیسیوں شرعی ترمیمات'' کا مگر جب لکھنے بیٹھے تو بہ مشکل ۱۶ نمبر پورے کر سکے۔

پرویز صاحب کے پیش کردہ اختلافی فیصلے

اب ہم اسی قبیل کی وہ ''شرعی ترمیمات'' درج کرتے ہیں جو پرویز صاحب نے ''اختلافی فیصلے'' کے عنوان کے تحت اپنی تصنیف شہکار رسالت کے صفحہ ۲۷۷ تا ۲۸۰ پر درج فرمائے ہیں اور بالآخر یہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نتیجہ پیش کیا ہے کہ سنت رسول ایک متبدل چیز ہے۔

۱۔ تطلیق ثلاثة جس کا ذکر پہلے دو بار آ چکا ہے۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اگر کوئی غیر مسلم اسلام قبول کرتا تو اس کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد اسی کے پاس رہتی تھی۔ لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ تبدیلی کر دی کہ اس کی غیر منقولہ جائیداد اس بستی کے غیر مسلموں میں تقسیم کر دی جاتی اور اس کے کفاف (بدلہ) کے لیے حکومت کی طرف سے وظیفہ مقرر کر دیا جاتا۔

۳۔ شرابی کی تعزیر میں اضافہ جس کا ذکر دو بار پہلے آ چکا ہے۔

۴۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے قحط کے زمانہ میں چوری کی سزا موقوف کر دی۔ اور قرآن کریم کے عام حکم کو مشروط بہ حالات کر دیا۔ نیز آپ نے جنگ کے دوران سزا دینے سے بھی منع کر دیا۔

۵۔ مصارف زکوۃ میں تالیف قلوب کی مد کو ختم کر دیا۔

۶۔ دور نبوی میں آپ کے ارشاد کے مطابق حج کے ایک رکن طواف کے پہلے تین چکر عام رفتار سے تیز لگائے جاتے تھے۔ ایسی چال کو رمل کہتے ہیں۔ اس ارشاد کی وجہ یہ تھی کہ کافروں نے مشہور کر رکھا تھا کہ مسلمان مدینہ جا کر کمزور ہو گئے ہیں۔ آپ ﷺ نے اس الزام کی تردید کے طور پر مسلمانوں کو ایسا حکم دیا تھا لیکن سیدنا عمر نے اپنے زمانہ میں کہا۔ اب وہ مصلحت باقی نہیں رہی۔ نہ مخالفین باقی رہے نہ ان کی طنز۔ لہٰذا اب ہمیں معمول کے موافق طواف کرنا چاہیے۔

۷۔ کتابیہ عورت سے نکاح پر پابندی لگا دی۔ نیز آپ نے مسلمانوں کی بستیوں سے یہود و نصاریٰ کے ذبیحہ خانے یہ کہہ کر بند کرا دیے کہ اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔

۸۔ ام ولد کی خرید و فروخت کو ممنوع قرار دیا۔

۹۔ عراق کی مفتوحہ زمینوں کو قومی تحویل میں لے لیا۔

۱۰۔ رسول اللہ ﷺ نے اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بعض افراد امت کے وظائف مقرر کرتے وقت ان کی ضروریات کا لحاظ رکھا تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام کی خدمات کے لحاظ سے مدارج مقرر کر کے انہیں وظائف کا معیار قرار دیا۔

۱۱۔ عشور (محصول چنگی) کی ابتدا کی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۲۔ دریائی پیداوار اور گھوڑوں پر ٹیکس عائد کیا۔

۱۳۔ نماز تراویح جماعت سے قائم کی۔

۱۴۔ فجر کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ کیا۔

۱۵۔ خزانہ قائم کیا۔

۱۶۔ سنہ ہجری رائج کیا۔

۱۷۔ دفاتر قائم کیے اور رجسٹر مرتب کرائے۔

۱۸۔ مردم شماری کرائی۔

۱۹۔ مسجد میں روشنی کا انتظام کرایا۔

۲۰۔ شہر آباد کرائے، نہریں کھدوائیں۔

مندرجہ بالا بیان کردہ بیس امور میں سے آخری چھ امور تو بالکل انتظامی قسم کے ہیں۔ باقی ۱۴ قابل غور ہیں۔ گویا گیارہ امور تاریخ اسلام سے ۱۶ جعفر شاہ صاحب کے اور ۱۴ پرویز صاحب کے کل ۴۱ ہوئے۔ ان میں سے اگر تکرار کو حذف کیا جائے تو ۲۵ رہ جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں پرویز صاحب نے کتاب شہکار رسالت کے صفحہ ۹۴۔ ۹۵ پر ''فقہ عمری'' کے ذیلی عنوانات کے تحت چھ ایسے امور کا تذکرہ کیا ہے۔ جن میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سابقہ شریعت میں تبدیلیاں کیں۔ ان میں سے چار کی ہیئت تکرار کی ہے۔ البتہ دو باتیں نئی ہیں، جو یہ ہیں:

۱۔ قرآن نے زنا بالجبر کے وقوعہ میں عورت کے لیے سزا کی کوئی تصریح نہیں کی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عورت کو کوئی سزا نہیں دی۔

۲۔ قرآن نے ترکہ کی تقسیم کے سلسلہ میں وارثوں پر کوئی شرط نہیں لگائی۔ لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ کیا کہ قاتل مقتول کا وارث نہیں ہو سکتا۔

گویا یہ کل ۲۷ ''شرعی تبدیلیاں'' ہیں۔ ان کی وضاحت درج ذیل نقشہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شرعی ترمیمات کی کل تعداد کا نقشہ:

نمبر شمار	تفصیل	تاریخ اسلام سے صفحہ نمبر	دین آسان سے صفحہ نمبر	شاہکار رسالت سے صفحہ نمبر
	نماز			
۱	جنازے کی نماز میں چار تکبیر پر اجماع کرنا	۴۰	X	X
۲	صبح کی اذان میں ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' کا اضافہ	۳۸	X	۱۴
۳	جمعہ کے خطبہ سے قبل ایک اذان کا اضافہ (سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ)	X	۱۵	X
۴	نماز تراویح۔ جماعت کا التزام کیا۔	۳۹	۹	۱۳
۵	مصارف زکوٰۃ میں تالیف قلوب کی مد ختم کی۔	X	۱۲	۵
۶	تجارت کے گھوڑوں پر زکوٰۃ مقرر کی۔	۳۷	۱۴/۱	۱۲/۱
	زکوٰۃ			
۷	عشور مقرر کیا۔	۳۵	--	۱۱
۸	دریا کی پیداوار پر محصول لگایا۔	۳۶	۱۴/۲	۱۲/۲
۹	بنی تغلب کے عیسائیوں کے کہنے پر جزیے کی بجائے زکوٰۃ مقرر کی۔	۴۳	X	X
	حدود و تعزیرات			
۱۰	قحط کے زمانہ میں چوری کی حد موقوف کی اور جنگ کے دوران ملتوی کی۔	--	---	۴
۱۱	شراب کی تعزیر ۴۰ کوڑے کے بجائے ۸۰ کوڑے مقرر کی۔	۴۲	۳	۳

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۲۔ حلالہ کرنے والے اور کرانے والے کو سنگسار کرنے کا اعلان کیا۔	--	۸	—
۱۳۔ غیر شادی شدہ کی سزا سے جلا وطنی کی سزا کو موقوف کیا۔	--	۱۳	--
۱۴۔ ہجو گو کے لیے سزا مقرر کی۔	۳۳	۲	--
۱۵۔ زنا بالجبر کے مقدمہ میں عورت کو شرعی حد سے مستثنیٰ قرار دیا۔	--	--	۱۵

مناکحات

۱۶۔ ایک مجلس کی تین طلاقیں کو طلاق مغلظہ قرار دیا	۴۱	۷	۱
۱۷۔ کتابیہ عورت سے نکاح پر پابندی لگا دی۔	--	۱۶	۷
(سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بموجب شاہ صاحب)			
(سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بموجب پرویز صاحب)			

اموال

۱۸۔ عراق کی زمینوں کو قومی تحویل میں لیا۔	--	۶	۹
۱۹۔ ام ولد کی خرید و فروخت کو ممنوع قرار دیا۔	--	۴	۳
۲۰۔ یہ اعلان کیا کہ کوئی عرب غلام نہیں بن سکتا۔	--	۱۱	--
۲۱۔ کسی مسلمان کی غیر منقولہ جائیداد کو غیر مسلموں میں تقسیم کر کے حکومت کی طرف سے وظیفہ مقرر کیا۔	--	--	۲
۲۲۔ وظائف کا معیار اسلامی خدمات کے لحاظ سے مقرر کیا۔	--	--	۱۰

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۳۔غزوہ تبوک میں قیدی کا فدیہ ایک دینار تھا۔سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مختلف ممالک کے لیے مختلف شرحیں مقرر کیں۔	--	۵	--
۲۴۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خراج کی صورت میں مختلف اجناس کی شرح مقرر نہیں کی۔یہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مقرر کی۔	--	۱۰	--
۲۵۔قاتل کو مقتول کے ورثہ سے محروم کیا	--	--	۱۶

متفرقات

۲۶۔حج کے طواف سے رمل کو ختم کیا	--	--	۶
۲۷۔غزلوں میں عورتوں کا نام لینے یا ذکر کرنے کی ممانعت کی اور سزا کا اعلان کیا۔	۳۴	۱	-
میزان	۱۱	۱۲	۱۶

نقشہ بالا دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درج ذیل 14 امور ایسے ہیں جنہیں کسی ایک ہی نے بیان کیا۔نمبر ۱،۳،۹،۱۰،۱۲،۱۳،۱۵،۲۰،۲۱،۲۲،۲۳،۲۴،۲۵،۲۶=۱۴

اور درج ذیل 8 امور پر کسی بھی دو کا اتفاق ہے۔

نمبر ۲،۵،۷،۱۴،۱۶،۱۷،۱۸،۲۵=۸

اور مندرجہ ذیل 5 امور تینوں نے بیان کیے ہیں۔

(۴) نماز تراویح کی جماعت (۶) تجارت کے گھوڑوں پر زکوٰۃ (۸) دریائی پیداوار پر زکوٰۃ (۱۱) شراب کی تعزیر میں اضافہ (۱۵) تین طلاق بیک مجلس کو تین شمار کرنا۔

مندرجہ بالا شرعی ترمیمات کا جائزہ

اب ہم ان تمام مندرجہ امور کا نئی ترتیب سے جائزہ پیش کرتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ا۔تدبیری امور

تدبیری امور سے ہماری مراد یہ ہے کہ کسی امر کے متعلق شرعی حکم موجود ہے۔لیکن دورِ نبوی میں اس کے اطلاق کا موقعہ نہ آیا۔ بلکہ بعد میں آیا تو اس پر شرعی حکم کا اطلاق کر دیا گیا۔مثلاً:

ا۔گھوڑوں پر زکوٰۃ:

عرب میں اونٹ، بھیڑ بکری، گائے وغیرہ تو تجارتی اغراض کے تحت پالے جاتے اور بکثرت پائے جاتے تھے۔لہٰذا ان پر رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ عائد کر دی۔گھوڑے عرب میں بہت کم یاب تھے جو تجارتی بنیادوں پر نہیں بلکہ صرف رئیسانہ ٹھاٹھ کی نمائش کے طور پر ہی پالے جاتے تھے۔جنگ بدر کے تین سو تیرہ مجاہدین کی سواریوں کا تناسب حفیظ جالندھری مصنف شاہنامہ اسلام کے درج ذیل شعر سے خوب واضح ہوتا ہے۔

یہ ستر اونٹ دو گھوڑے یہاں سیراب ہو جاتے
مجاہد بھی وضو کرتے، نہاتے، غسل فرماتے

قرآن کریم نے جہاد فی سبیل اللہ کی غرض سے گھوڑے پالنے کی ترغیب دلائی۔اور ایسے گھوڑے جو جہاد کی غرض سے پالے جائیں یا صرف کسی شخص کے ذاتی استعمال میں آنے والے جانور یا اشیاء بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوتی ہیں۔ ● لیکن جب دور فاروقی میں اسلامی مملکت کی حدود ان ممالک تک پہنچ گئیں جہاں گھوڑے تجارتی بنیادوں پر پالے جاتے اور کثیر مقدار میں پائے جاتے تھے تو آپ نے ایسے گھوڑوں پر بھی زکوٰۃ عائد کر دی۔اسی اصول کے مطابق جن ممالک میں بھینسیں تجارتی اغراض کے تحت پالی جاتی ہیں ان پر بھی زکوٰۃ عائد ہوگی۔اور یہ کام عین سنت نبوی کے مطابق ہوگا۔حالانکہ دورِ نبوی میں ایسی زکوٰۃ کا سراغ بھی نہیں ملتا۔کیونکہ عرب میں بھینسوں کا وجود ہی نہ تھا یا اگر تھا بھی تو بہت قلیل مقدار میں تھا۔

۲۔دریائی پیداوار پر زکوٰۃ:

بالکل یہی صورت حال دریائی پیداوار پر زکوٰۃ عائد کرنے کی ہے۔زمینی پیداوار پر زکوٰۃ آیات قرآنی (۶:۴۲) اور سنت نبوی دونوں سے ثابت ہے۔اب عرب میں نہ دریا ہیں نہ دریا کی پیداوار۔لہٰذا رسول اللہ ﷺ کس

● مزید تفصیل کے لیے دیکھیے تنقیح الرواۃ فی تخریج احادیث مشکوٰۃ، ج ۲، ص ۵، مطبوعہ مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ، لاہور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چیز پر زکوۃ عائد کرتے۔ حکم یہ ہے کہ پیداوار پر زکوۃ عائد ہوگی۔ تو جہاں کہیں دریا، سمندر ہوں گے وہاں دریائی یا سمندری پیداوار ہوگی اس پر زکوۃ عائد کرنا عین اتباع کتاب وسنت ہوگا نہ کہ شرعی ترمیم۔

۳۔ عشور:

اسی طرح ایک مسئلہ عشور کا ہے۔ جسے آج کی زبان میں کسٹم ڈیوٹی کہتے ہیں۔ اس کا معنی محصول چنگی غلط ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ کسٹم ڈیوٹی بطور ایک عام ٹیکس کے نہیں بلکہ صرف ان غیر مسلم تاجروں پر لگائی تھی جو عرب میں یا اسلامی مملکت میں مال درآمد کرتے تھے۔ اور صرف اس لیے لگائی تھی کہ غیر مسلم ممالک نے پہلے مسلمان تاجروں سے اس قسم کا ٹیکس وصول کرنا شروع کر دیا تھا جس کے جواب میں علیٰ سواء کے اصول کے مطابق غیر مسلم تاجروں پر بھی یہ ٹیکس لگا دیا تھا یہ مسئلہ تدبیر مملکت سے متعلق رکھتا ہے نہ کہ شریعت سے۔ پھر اس سے کوئی شرعی حکم بھی مجروح نہیں ہوتا تو اسے ''شرعی ترمیم'' کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟ رہا اس کی شرح کا مسئلہ تو ہر حکومت اس معاملہ میں آزاد ہے۔ کیونکہ یہ مسئلہ شرعی تو ہے نہیں جس کی شرح معین ہوتی ہے۔

۴۔ نومسلم کی جائیداد غیر منقولہ:

اسی طرح اگر کوئی مسلمان حکومت کسی نومسلم کی غیر منقولہ جائیداد کو کسی مصلحت کی بناء پر غیر مسلموں کو دے کر اس کا کفاف وظیفہ کی شکل میں اس نومسلم کو دے دے تو ہم نہیں سمجھتے کہ اس سے کون سا شرعی حکم مجروح ہوتا ہے جو اسے شرعی ترمیم کا نام دیا جائے۔ یہ ایک تدبیری مسئلہ ہے اور تدبیر ہمیشہ پیش آمدہ معاملات کو مدنظر رکھ کر کی جاتی ہے اور ایسی تدابیر میں مختلف ادوار میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے اور ایسا اختلاف کسی شرعی امر پر ذرہ بھر بھی اثر انداز نہیں ہوتا۔

۵۔ خراج کی شرح:

خراج کی صورت میں مختلف اجناس کی شرح متعین کرنا بھی تدبیر ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ اب قبلہ شاہ صاحب کو یہ اعتراض ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ شرح مقرر نہیں کی تھی۔ شاہ صاحب کو یہ تو بتانا چاہیے تھا کہ دور نبوی میں خراجی زمینیں کہاں اور کون کون سی تھیں اور ان میں کیا کچھ فصلیں پیدا ہوتی تھیں جو آپ نے شرح متعین نہ فرمائی۔ ظاہر ہے کہ یہ موقعہ تو تب ہی آ سکتا تھا جب ایسی خراجی زمینیں اسلامی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حکومت کے زیرِ اقتدار آتیں جن میں مختلف قسم کی اجناس بھی پیدا ہوتیں اور یہ دور دورِ فاروقی ہی ہے۔ دورِ نبوی یا صدیقی نہیں تھا۔ علاوہ ازیں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی مقرر کردہ شرحیں بھی کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتیں۔ کیونکہ یہ مسئلہ تدبیر سے تعلق رکھتا ہے۔

۶۔ زکوٰۃ کے برابر جزیہ:

بنی تغلب کے مطالبہ پر جزیہ کی شرح کو زکوٰۃ کے برابر کر دینا بھی تدبیری امر ہے۔ زکوٰۃ کا نصاب اور شرح ضرور غیر متبدل ہے۔ لیکن جزیہ کا نصاب اور شرح غیر متبدل نہیں ہے۔ صدرِ مملکت کو یہ اختیار ہے کہ وہ ایک ہی شہر کے بعض لوگوں سے عام شرح سے زیادہ جزیہ وصول کرے اور بعض کمزور و نادار بچوں یا عورتوں سے جزیہ کلیتًا ساقط کر دے۔ وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ اگر اسے اعتماد حاصل ہو جائے تو ذمیوں سے فوجی خدمت کے بدلہ ان سے جزیہ ساقط کر دے اور یہ بھی کہ اس کی شرح کو حالات کے مطابق زکوٰۃ کی شرح سے زیادہ یا برابر یا کم کر دے۔

۷۔ خطبہ جمعہ اور دوسری اذان:

اذان کا مسئلہ اس لحاظ سے تدبیری ہے کہ اذان کے متعلق دورِ نبوی میں باقاعدہ مجلس مشاورت قائم ہوئی تھی اور شرعی اس لحاظ سے ہے کہ بالآخر اذان کے کلمات بذریعہ الہام ہی طے ہوئے تھے۔ اب جمعہ کی اذان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس اذان کے بعد مسجد میں جا کر خطبہ جمعہ سننا فرض اور دوسرا کوئی بھی کام کاج کرنا حرام ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جیسا کہ شاہ صاحب نے وضاحت کر بھی دی ہے۔ جب دورِ عثمانی میں مدینہ کی آبادی دور دور تک پھیل گئی اور یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ دور رہنے والے لوگ اگر اذان سن کر چلیں تو ان کے مسجد پہنچنے تک خطبہ جمعہ، نماز جمعہ ختم ہی نہ ہو جائے اور لوگ بلا ارادہ ہی ایک گناہ کے مرتکب نہ ہوں۔ لہٰذا ایک اہم دینی ضرورت کی خاطر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے خطبہ جمعہ سے پہلے لوگوں کو بروقت متنبہ کرنے کے لیے ایک اذان کا اضافہ کیا۔ البتہ اس کے الفاظ وہی رہے جو الہامی تھے۔ ان میں کوئی رد و بدل نہیں کیا گیا۔

۲۔ امدادی امور

امدادی امور سے ہمارا مطلب ایسی باتیں ہیں جن کے متعلق اصولی طور پر واضح احکام موجود ہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور انہیں واضح احکام کی تعمیل کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے کوئی قدم اٹھایا جائے۔ مثلاً:

۱/۸۔عربی غلام:

اسلام غلامی کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ اب ہر وہ اقدام جو غلامی کو کم کرنے میں ممد ثابت ہوگا۔ وہ شرعی ترمیم نہیں بلکہ امدادی امر ہوگا۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اعلان کہ ''آئندہ کوئی عرب غلام نہیں بن سکتا'' اسی قبیل سے تعلق رکھتا ہے۔

۲/۹۔نماز جنازہ کی چار تکبیریں:

اسی طرح اسلام تفرقہ وانتشار کو شرک وکفر قرار دیتا اور شریعت کو تھامے رکھنے اور متحد رہنے کی سخت تاکید کرتا ہے۔ اب ہر وہ بات جو مسلمانوں سے کسی اختلاف کو دور کر کے ان میں اتحاد کی فضا قائم کرے۔ وہ شرعی ترمیم نہیں بلکہ کتاب وسنت کا اتباع ہوگا مثلاً سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ میں چار تکبیروں پر اجماع کرایا (یہ بھی واضح رہے کہ صحابہ کرام کے اجماعی فیصلے بذات خود شرعی حجت ہوتے ہیں۔ ان پر شرعی ترمیم کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا) اس اجماع صحابہ میں جو بات زیر بحث آئی وہ یہ تھی کہ رسول اللہ کی زندگی کا آخری عمل کیا تھا۔ جب یہ معلوم ہوگیا کہ آپ نے سب سے آخر میں جو نماز جنازہ پڑھائی اس میں چار تکبیریں ہوئیں تو چار تکبیروں پر سب صحابہ نے اجماع کر لیا۔ اس اجماع کی بنیاد اتباع سنت ہی تھی۔

۳/۱۰۔نماز تراویح کی جماعت:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ رمضان میں عشاء کے بعد مسجد گئے تو دیکھا کہ بہت سے لوگ فرداً فرداً یا مختلف چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی شکل میں نماز تراویح ادا کر رہے ہیں۔ آپ نے اس انتشار کو ختم کر کے اتحاد کی فضا پیدا کرنے کے لیے ایک ہی جماعت کا حکم دے دیا اور سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو امام مقرر کر دیا۔ تاہم آپ نے یہ حکم نہیں دیا کہ رمضان کا پورا مہینہ اس جماعت تراویح کا التزام کیا جائے۔ آپ کا حکم صرف یہ تھا کہ مسجد میں کئی چھوٹی چھوٹی جماعتیں ہونے سے یہ بہتر ہے کہ جماعت ایک ہی ہو اور یہ بات سنت رسول کے عین مطابق تھی۔ کیونکہ جن تین ایام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز تراویح پڑھائی تھی تو ایک ہی جماعت ہوتی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امام ہوتے تھے اور باقی تمام نماز تراویح ادا کرنے والے صحابہ مقتدی ہوتے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رمضان کا پورا مہینہ نماز تراویح کا التزام دراصل مسلمانوں کا اپنا پیدا کردہ ہے۔ خصوصاً حفاظ کرام کو یہ لالچ ہوتا ہے کہ اس طرح وہ پورا قرآن التزام کے ساتھ سنا سکتے ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قطعاً یہ حکم نہ تھا کہ بلاناغہ پورا رمضان نماز تراویح کی جماعت ہوا کرے۔

پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس حکم پر صحابہ کا اجماع بھی نہ ہوا۔ حتیٰ کہ خود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی شامل نہ ہوتے تھے۔ بخاری کی جس روایت میں آپ کا یہ حکم مذکور ہے۔ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ دوسرے روز پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ آئے اور ایک ہی جماعت دیکھ کر خوش ہوئے اور نیز فرمایا اگر یہ لوگ جس وقت نماز پڑھ رہے ہیں سو جاتے۔ اور جب سوتے ہیں اس وقت یہ نماز پڑھتے تو زیادہ بہتر تھا اس سے صاف واضح ہے کہ خود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پچھلی رات نماز تراویح ادا فرماتے تھے ...... اور باجماعت نماز میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ موطا امام مالک رحمہ اللہ کی روایت کے مطابق آپ نے جب نماز تراویح کی جماعت کا حکم دیا تو گیارہ رکعت (یعنی وتر سمیت) کا ہی حکم دیا تھا۔ موطا ہی میں یزید بن رومان کا یہ اثر بھی موجود ہے کہ دور فاروقی میں بعض صحابہ ۲۳ رکعت (بمعہ وتر) نماز تراویح پڑھتے تھے۔ یہ صحابہ کا اپنا طرزِ عمل تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا حکم نہ تھا۔ سنت نبوی سے ۱۱ رکعت ہی ثابت ہیں۔

۱۱/۴۔ ہجو کی سزا:

اسلام کسی دوسرے کی تحقیر، تذلیل اور تمسخر وغیرہ کو کبیرہ گناہ قرار دیتا ہے۔ کسی کی ہجو کرنا بھی اسی قسم کا جرم ہے۔ جس پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سزا مقرر کر دی۔ اب قبلہ جعفر شاہ صاحب اسے ''شرعی تبدیلی'' قرار دیتے ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ خود اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کی گئی تو آپ نے کوئی سزا مقرر نہ کی بلکہ سیدنا حسان بن ثابت کو جواب دینے کو کہا۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پوزیشن میں تھے کہ کافر ہجو گویوں کو سزا دے سکتے؟ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ خود شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سزا اس لیے مقرر کی تھی کہ اس سے پرانی رنجشیں تازہ ہوتی ہیں اور پرانی رنجشوں کو بھول جانا اور عفو و درگزر سے کام لینا شریعت کی نگاہ میں نہایت مستحسن فعل ہے۔ پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام ''شرعی ترمیم'' کیونکر بن گیا؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۵/۱۲۔غزل میں عورت کا نام:

اسلام فحاشی کا سخت دشمن ہے۔ اور ان تمام محرکات کا بھی جن سے فحاشی کو کسی نہ کسی طرح فروغ حاصل ہوتا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اگر غزلوں میں عورتوں کا نام ذکر کرنے پر سزا مقرر کی تو ان کا یہ اقدام کتاب وسنت کے عین مطابق تھا۔ اب قبلہ جعفر شاہ صاحب کو اعتراض یہ ہے کہ کعب بن مالک کے نعتیہ قصیدہ ''بانت سعاد'' کی تشبیب ایک عورت ''سعاد'' سے ہی شروع ہوتی ہے اور اسے سب سے بہتر نعت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں شمار کیا جاتا ہے۔ تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایسی بات پر کیوں سزا مقرر کر دی جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ اس کچھ بھی نہ کہنے سے ذہن خود بخود اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے غالباً پڑھا ہی نہیں گیا تھا۔ قبلہ شاہ صاحب نے اس کا کوئی ایسا حوالہ درج نہیں فرمایا کہ اس کی تحقیق کی جاسکتی۔ اگر بغرضِ تسلیم یہ ثابت ہو بھی جائے کہ یہ قصیدہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا۔ اس کی نہ تحسین فرمائی نہ مذمت تو بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل مستحسن ہی قرار پائے گا کیونکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام قرآن کریم کی اصولی تعلیم کا موید ہے۔

۳۔مغالطے

مغالطے سے مراد ایسے امور ہیں جن کی ابتدا کو غلط طور پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ جب کہ حقیقتاً ان کی ابتدا دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہی ثابت ہے۔ ایسے امور کو یا تو قبلہ شاہ صاحب اور پرویز صاحب کی لاعلمی پر محمول کیا جاسکتا ہے یا تجاہل عارفانہ اور مغالطہ آفرینی پر۔

۱/۱۳۔صبح کی نماز میں الفاظ ''الصلوٰۃ خیر من النوم''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا اضافہ نہیں بلکہ یہ الفاظ دور نبوی میں بھی کہے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ حضرت ابومحذورہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اذان کہتا تھا اور فجر کی اذان میں حی علی الفلاح کے بعد میں کہتا ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' (نسائی، کتاب الاذان، باب التثویب فی اذان الفجر)

۲۔ انہی محذورہ سے موطا امام مالک میں ایک روایت یوں ہے:

''میں لڑکا تھا۔ میں نے حنین کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فجر کی اذان دی۔ جب میں حی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علی الفلاح پر پہنچا تو آپ نے فرمایا۔اب ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' کا کلمہ ملا دے۔'' (موطا امام مالک مترجم، ص ۹۵، مطبوعہ اسلامی اکیڈمی، اُردو بازار، لاہور)

۳۔ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ نماز صبح کی خبر کرنے کے لیے رسول اللہ کے پاس آئے تو لوگوں نے کہا کہ آپ سو رہے ہیں۔تو بلال رضی اللہ عنہ نے کہا الصلوٰۃ خیر من النوم اس کے بعد فجر کی اذان کے لیے یہ کلمہ مقرر کیا گیا اور ایسا ہی حکم باقی رہا۔'' (حوالہ ایضاً)

اب جس روایت سے یہ مغالطہ پیدا ہوا کہ الصلوٰۃ خیر من النوم کے الفاظ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بڑھائے تھے وہ یوں ہے:

''امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس موذن نماز صبح کی خبر کرنے کو آیا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو سوتا پا کر ''الصلوٰۃ خیر من النوم یا امیر المومنین'' کہا۔سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا اس کلمے کو صبح کی اذان میں کہا کرو۔'' پھر ساتھ ہی اس کی وضاحت بھی کر دی گئی کہ ''سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ تھا کہ اس کلمہ کے کہنے کا اصل موقع صبح کی اذان کے اندر ہے نہ کہ اذان سے باہر کیونکہ اذان کے بعد کسی کے پاس جا کر یہ کلمہ کہنا (جیسا کہ بعض امراء و حکام کی آرزو ہوتی ہے) قطعاً درست نہیں اور یہ کلمہ دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں صبح کی اذان میں ہی کہا جاتا تھا۔'' (حوالہ ایضاً)

۲/۱۴۔قحط کے زمانہ میں چوری کی سزا:

قحط کے زمانہ میں چوری کی حد ساقط کرنا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی ''شرعی ترمیم'' ہرگز نہیں۔اس کی اصل سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتی ہے۔چنانچہ خود جعفر شاہ صاحب نے یہ روایت درج فرمائی ہے کہ ''عباد بن شرجیل نے کسی کھیت سے کچھ غلہ لے لیا۔کھیت والے نے عباد بن شرجیل کو مارا اور اس کا کپڑا بھی چھین لیا۔پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آ کر بتایا تو آپ نے فرمایا:

(مَا عَلَّمْتَهُ إِذَا كَانَ جَاهِلاً وَلَا أَطْعَمْتَهُ إِذَا كَانَ سَاغِبًا) ''اگر یہ نادان تھا تو نے اسے تعلیم نہیں دی اور اگر یہ بھوکا تھا تو تُو نے اسے کھانا نہیں کھلایا۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چور کو کوئی سزا نہیں دلوائی۔خود کھیت والے نے اس کا کپڑا بھی واپس کیا اور (مار کے بدلے) بہت سا غلہ بھی دیا (اسلام دین آسان، ص ۳۵۹)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اب ہم نہیں سمجھتے کہ اگر اسی بنیاد پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے قحط کے زمانہ میں چوری کی حد موقوف کر دی تو یہ "شرعی ترمیم" کیسے بن گئی؟

۳/۱۵۔ غیر شادی شدہ کی سزائے زنا:

جناب جعفر شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد تک غیر شادی شدہ کی سزا کے سو کوڑے کے ساتھ ملک بدری بھی تھی لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں ملک بدری کو روک دیا۔" (اسلام دین آسان، ص ۱۵)

قبلہ شاہ صاحب نے اس دعویٰ کے لیے کوئی حوالہ قلمبند نہیں فرمایا۔ اب ہم بخاری کی ایک روایت پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کا دعویٰ بر خود غلط ہے زید بن خالد جہنی کہتے ہیں کہ:

(سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَأْمُرُ فِيمَنْ زَنَا وَلَمْ يُحْصِنْ جَلْدُ مِائَةٍ وَتَغْرِيبُ عَامٍ قَالَ ابْنُ الشِّهَابِ فَأَخْبَرَنِي عُرْوَةُ بْنِ الزُّبَيْرِ أَنَّ عُمَرَ بْنُ الْخَطَّابَ غَرَّبَ ثُمَّ لَمْ تَزَلْ تِلْكَ السُّنَّةَ) (بخاری، کتاب المحاربین، باب البكران يجلدان و ينفيان)	"میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا۔ آپ اس شخص کے لیے جو کنوارا ہو کر زنا کرے، سو کوڑے لگانے اور ایک سال کی جلا وطنی کا حکم دیتے تے۔ (اسی سند سے) ابن شہاب نے کہا کہ مجھے عروہ بن زبیر نے خبر دی کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جلا وطن کیا۔ پھر یہی طریقہ جاری ہو گیا۔"

اب دیکھیے ایک طرف جعفر شاہ صاحب کی بے حوالہ روایت ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے جلا وطنی کی سزا موقوف کر دی دوسری طرف بخاری کی مستند اور با حوالہ حدیث ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے جلا وطنی کی سزا دی۔ پھر بعد میں یہی دستور چل نکلا۔ اب ان میں سے آپ جو چاہے تسلیم کر لیجیے۔ دراصل کنوارے کی سزا سے جلا وطنی کو موقوف کرنا حنفیہ کا مسلک ہے جسے غلطی سے عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔

www.KitaboSunnat.com

ام ولد کی فروخت پر پابندی:

جہاں تک ام ولد کی خرید و فروخت پر پابندی کا تعلق ہے تو یہ پابندی عمر رضی اللہ عنہ نے نہیں لگائی تھی، بلکہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سنت نبوی ﷺ سے ❶ ہی یہ حکم ثابت ہے۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے:

(عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ وَطِئَ اَمَتَهُ فَوَلَدَتْ لَهُ فَهِيَ مُعْتَقَةٌ عَنْ دُبُرٍ)(احمد ابن ماجه بحواله: نيل الأوطار ۲/۲۲۱)

''ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے اپنی لونڈی سے مباشرت کی پھر اس سے اس کا بچہ پیدا ہو گیا تو وہ لونڈی اس شخص کے مرنے کے بعد آزاد ہو گئی۔''

(عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ ذَكَرْتُ اُمَّ اِبْرَاهِيمَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ اَعْتَقَهَا وَلَدُهَا) (دارقطني بحواله أيضا)

''ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس ام ابراہیم (ماریہ قبطیہ) کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اس کا بچہ اس کی آزادی کا سبب بن گیا۔''

(عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّهُ نَهٰى عَنْ بَيْعِ اُمَّهَاتِ الْاَوْلَادِ وَقَالَ لَا يُبَعْنَ وَلَا يُوْهَبْنَ وَلَا يُوْرَثْنَ يَسْتَمْتِعُ بِهَا السَّيِّدُ مَا دَامَ حَيًّا وَاِذَا مَاتَ فَهِيَ حُرَّةٌ) (مؤطا امام مالك، دارقطني بحواله أيضا)

''ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اولاد والی لونڈیوں کو بیچنے سے منع فرمایا اور کہا کہ نہ وہ بیچی جا سکتی ہیں۔ نہ ہبہ کی جا سکتی ہیں اور نہ ترکہ میں شمار ہو سکتی ہیں۔ جب تک ایسی لونڈی کا مالک زندہ ہے وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور جب وہ مر جائے تو وہ لونڈی آزاد ہے۔''

۵/۱۷۔ زنا بالجبر اور عورت کی سزا:

پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ قرآن میں زنا کی سزا تو موجود ہے لیکن زنا بالجبر کی سزا کے سلسلہ میں قرآن میں کوئی صراحت ہے نہیں۔ یہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے فقہ فی القرآن کا کمال ہے۔ کہ آپ نے ایسی عورت کو سزا نہیں دی۔ (شہکار رسالت، ص ۹۵) حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سنت نبوی ہی کی پیروی کی تھی۔ ترمذی کی درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے:

❶ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ان کرم فرماؤں کی معلومات کا منتہی شبلی نعمانی کی تصنیف ہے اس سے آگے تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(أَنَّ امْرَاَةً خَرَجَتْ عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ تُرِيْدُ الصَّلٰوةَ فَتَلَقَّاهَا رَجُلٌ فَجَلَّلَهَا فَقَضٰى حَاجَتَهُ مِنْهَا فَصَاحَتْ فَانْطَلَقَ وَمَرَّ بِهَا رَجُلٌ فَقَالَتْ اِنَّ ذٰلِكَ الرَّجُلَ فَعَلَ بِي كَذَا وَكَذَا وَمَرَّتْ بِعَصَابَةٍ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ...... فَاَتَوْا بِهِ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَلَمَّا اَمَرَ بِهِ لِيُرْجَمَ قَامَ صَاحِبُهَا الَّذِي وَقَعَ عَلَيْهَا فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَنَا صَاحِبُهَا فَقَالَ لَهَا اِذْهَبِي فَقَدْ غَفَرَ اللّٰهُ لَكِ) (ترمذي۔ أبواب الحدود، باب ماجاء في المرأة اذا استكرهت بالزنا)

''دور نبوی ﷺ میں ایک عورت (صبح کی) نماز کے ارادہ سے نکلی۔ اسے ایک آدمی ملا جس نے اسے ننگا کیا پھر اس سے حاجت پوری کی وہ عورت چیخی تو وہ چلا گیا۔ ایک اور آدمی اس عورت کے پاس سے گزرا تو اس عورت نے کہا اس آدمی نے مجھ سے یہ یہ کام کیا ہے۔ پھر وہ مہاجرین کی ایک جماعت کے پاس سے گزری وہ اس آدمی کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لے آئے۔ جب آپ ﷺ نے اس مرد کو سنگسار کرنے کا حکم دیا تو اس عورت کے خاوند نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! میں اس کا خاوند ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس عورت سے کہا چلی جاؤ اللہ نے تجھے معاف رکھا ہے۔''

اسی مضمون کی حدیث سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، اُردو ترجمہ مکتبہ سعودیہ کراچی، ص: ۳۱۱ پر موجود ہے۔

۶/۱۸۔ قاتل محروم الارث ہے:

اسی طرح پرویز صاحب نے فرمایا کہ ''قرآن کریم نے ترکہ کی تقسیم کے سلسلہ میں وارثوں پر کوئی شرط نہیں لگائی۔ لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ کیا کہ ''قاتل مقتول کا وارث نہیں ہوسکتا'' آپ نے دیکھا کہ اس فیصلے سے کتنے بڑے فتنے کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے جس کی رُو سے ہمارے ہاں جائیدادوں کی خاطر آئے دن قتل ہوتے رہتے ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ سے یہ بھی مستنبط ہوا کہ اسلامی حکومت قرآن کریم کے کسی مطلق حکم کو (یعنی جس میں کوئی شرط عائد نہ کی گئی ہو) مقید کر سکتی ہے۔ یعنی عندالضرورت اس پر شرائط عائد کرسکتی ہے۔'' (ایضاً ص ۹۵)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اب اگر پرویز صاحب حدیث کو نا قابل اعتنا سمجھ کر اس طرف توجہ ہی نہ فرمائیں تو ان پر حقیقت کیونکر منکشف ہوسکتی ہے جو یہ ہے کہ قاتل کا مقتول کے وارث نہ ہونے کا اصول سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی تفقہ فی القرآن کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع فرمائی تھی۔ اب درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمایئے لطف کی بات یہ ہے کہ پہلی حدیث کے راوی بھی خود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔

(عَنْ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ: لَيْسَ بِقَاتِلٍ مِيْرَاثٌ) (مؤطا امام مالک أحمد، ابن ماجه بحواله نيل الأوطار ۶/ ۱۹۴)

''سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے تھے: ''قاتل کے لیے مقتول کی میراث میں کوئی حصہ نہیں۔''

(عَنْ عُمَرِ و بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: لَا يَرِثُ الْقَاتِلُ شَيْئًا) (ابو داؤد بحواله ايضا)

''عمرو بن شعیب اپنے باپ سے وہ اپنے دادا سے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ''قاتل کو (مقتول کی وراثت سے) کچھ نہیں ملے گا۔''

(عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اَلْقَاتِلُ لَا يَرِثُ) (ترمذي، ابن ماجه بحواله مشكوٰة باب الفرائض)

''سیدنا ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''قاتل اپنے مقتول کا وارث نہیں ہوسکتا''

اسی مندرجہ حدیث کو نسائی بیہقی اور دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ (مشکوٰۃ ترجمہ باب الفرائض فصل الثانی، حاشیہ پر حدیث مذکورہ بالا)

۱۹/۷۔ اسیروں کا فدیہ:

قبلہ جعفر شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ''غزوہ تبوک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قیدی کا فدیہ ایک دینار مقرر فرمایا۔ لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مختلف ممالک میں مختلف شرحیں مقرر فرمائیں۔ اب دیکھیے کہ تبوک کی نہ جنگ ہوئی نہ کوئی کافر قیدی [1] بنایا گیا۔ پھر نہ معلوم قبلہ شاہ صاحب نے یہ بے حوالہ روایت کیوں درج فرمادی ہے کہ تبوک کے قیدیوں کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک [2] دینار فدیہ مقرر کیا تھا؟

[1] رحمۃ اللعالمین، ج:۲، ص:۲۰۲، از قاضی سلمان منصور پوری، مطبوعہ غلام علی اینڈ سنز لاہور

[2] یہ جنگ تبوک کے اسیروں اور ان کے فدیہ کی شرح کا قصہ بھی شبلی نعمانی کی تصنیف الفاروق سے بلا تحقیق درج کر دیا گیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فدیہ لینے کا قصہ صرف اساری بدر کے سلسلہ میں پیش آیا تھا لیکن اس وقت بھی کوئی مخصوص رقم متعین نہ کی گئی تھی۔ بعض نادار اور پڑھے لکھے کافروں کا فدیہ یہ طے ہوا تھا کہ وہ دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ بعض نادار اوران پڑھ کافروں کو اس وعدہ پر بھی چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ آئندہ کافروں کے ساتھ جنگ میں شریک نہ ہوں گے۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ سے معمول سے بہت زیادہ رقم فدیہ کے طور پر لی گئی۔ کیونکہ یہ بہت مالدار تھے۔ وقس علی ہذا۔ اب اگر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مختلف ممالک میں فدیہ کی مختلف شرحیں مقرر فرمائیں تو اس سے کون سی سنت رسول یا شرعی حکم مجروح ہوا تھا؟ جس کی بنا پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ پر بھی ''شرعی ترمیم'' کا اطلاق ہو سکے۔

۸/۲۰۔ طواف اور رمل:

پرویز صاحب کہتے ہیں کہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ تھی کہ طواف کے پہلے چکروں میں ذرا تیز چلا جائے۔ (رمل کیا جائے) اور یہ اس لیے تھا کہ کفار مکہ نے کہا کہ یثرب کی آب و ہوا نے مسلمانوں کو کمزور کر دیا۔ تو آپ نے رمل اس لیے تجویز فرمایا کہ کافروں کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ مسلمان ہرگز کمزور نہیں ہوئے۔ لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں کہا۔ کہ اب ہمیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ نہ وہ حالات رہے، نہ وہ مصلحت نہ وہ مخالفین رہے نہ ان کا طنز۔ اب ہمیں معمول کے مطابق طواف کرنا چاہیے۔'' (شہکار رسالت، ص۲۷۹)

پرویز صاحب نے جو کچھ فرمایا، بجا فرمایا۔ لیکن حدیث کا آخری حصہ چھوڑ گئے، جو یوں ہے:

((وَعَنْ عُمَرَ قَالَ: فِيمَ الرَّمَلَانِ وَالْكَشْفُ عَنِ الْمَنَاكِبِ، وَقَدْ اَطَأَ اللّٰهُ الْاِسْلَامَ وَنَفَى الْكُفْرَ وَاَهْلَهُ؟ وَمَعَ ذٰلِكَ لَا نَدَعُ شَيْئًا كُنَّا نَفْعَلُهُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ)) (احمد ابو داؤد، ابن ماجه بحواله منتقي الاخبار، كتاب الحج، باب طواف القدوم والرمل))

''سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کندھے کھول کر اور کندھے ہلا کر تیز تیز چلنا کس لیے؟ اب تو اللہ نے اسلام کو پھیلا دیا اور کفر اور اہل کفر کو مٹا دیا ہے۔ بایں ہمہ ہم اس کام میں سے کچھ بھی نہ چھوڑیں گے، جسے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بجالاتے تھے۔''

اسی مضمون سے ایک دوسری ملتی جلتی حدیث کے راوی ابن عباس رضی اللہ عنہ ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یوں فرمایا تھا:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(وَقَدْ اَهْلَكَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى ثُمَّ قَالَ شَيْءٌ صَنَعَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَلَا نُحِبُّ اَنْ نَتْرُكَهُ) ''اور اللہ نے کفار و مشرکین کو تو ہلاک کر دیا ہے پھر کہا ہر ایسی چیز جسے رسول اللہ ﷺ بجا لائے ہم نہیں چاہتے کہ اسے چھوڑ دیں۔''

یہ روایت احمد، بزار، حاکم، بیہقی اور نسائی میں باختلاف الفاظ موجود ہے۔ (نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار، باب ایضاً)

اب دیکھیے ہمارے یہ دوست کہتے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ حالات کے بدلنے سے سنت رسول میں تبدیلی کر لیتے تھے۔ مگر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ خود یہ فرما رہے ہیں کہ اگرچہ حالات بدل چکے ہیں۔ تاہم ہم ایسی کوئی چیز نہیں چھوڑ سکتے جسے رسول اللہ ﷺ نے سرانجام دیا تھا۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیجیے کہ ان متضاد باتوں میں کس کی بات زیادہ قابل اعتماد ہو سکتی ہے؟

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اتباع سنت کا یہ حال تھا کہ اگر وہ کسی کام کو بالکل بے کار اور عبث سمجھتے پھر بھی اگر انہیں یہ معلوم ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ نے فی الواقع ایسا کہا تھا۔ تو اپنی عقل و دانش کو رد کر دیتے اور سنت رسول کی اتباع کرتے اور زبان سے اقرار بھی کرتے کہ اگرچہ مجھے یہ کام عبث معلوم ہوتا ہے۔ میں اسے صرف اس لیے سرانجام دیتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ کام کیا تھا چنانچہ حج کے دوران حجر اسود کو مخاطب کر کے آپ نے فرمایا:

(عَنْ عَابِسِ بْنِ رَبِيْعَةَ قَالَ رَاَيْتُ عُمَرَ يُقَبِّلُ الْحَجَرَ وَيَقُوْلُ اِنِّيْ لَاَعْلَمُ اِنَّكَ حَجَرٌ مَا تَنْفَعُ وَلَا يَضُرُّ وَلَوْلَا اَنِّيْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يُقَبِّلُ مَا قَبَّلْتُكَ) (متفق علیه بحواله مشکوة، کتاب المناسک باب دخول مکه والطواف فصل ثالث) ''عابس بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ حجر اسود کو بوسہ دے رہے تھے اور کہتے تھے ''میں جانتا ہوں، تو ایک پتھر ہے جو نہ نفع دے سکتا ہے نہ نقصان اور اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا۔''

۴۔ متوازی فیصلے

متوازی فیصلے سے ہماری مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سنت جاری فرمائی لیکن عمر رضی اللہ عنہ نے اس سنت کے علاوہ کوئی دوسرا ایسا طریقہ اختیار فرمایا جو کہ قرآن کریم یا سنت نبوی ﷺ سے ہی استنباط کیا گیا تھا، مثلاً:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۱/۴۔ عراق کی مفتوحہ زمینوں کو قومی ملکیت میں لینا:

اس واقعہ کو منکرین حدیث بڑے شدومد سے پیش کر کے یہ ثابت کیا کرتے ہیں کہ سنت رسول ایک بدلنے والی چیز ہے۔ ورنہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سنت رسول کے خلاف کیسے زمینوں کو قومی تحویل میں لے سکتے تھے؟

ہم اس کے جواب میں صرف اتنا عرض کریں گے کہ شریعت صرف سنت رسول کا نام نہیں بلکہ کتاب وسنت کا نام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدین میں خیبر کی زمین تقسیم کی تھی تو وہ بھی ایک آیت کی رو سے ایسا کیا تھا کہ اموال غنیمت میں سے پانچواں حصہ بیت المال کا باقی سب مجاہدین کا ہے اور عمر رضی اللہ عنہ نے جو مفتوحہ زمینوں کو قومی ملکیت میں لیا تھا۔ تو وہ بھی ایک آیت کے ٹکڑے وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ (۵۹:۱۰) کی رو سے کیا تھا۔ اس اجمال کی تفصیل کو پرویز صاحب نے بھی شاہکار رسالت ص ۶۸۔ ۶۹ پر ''قرآن سے استنباط نتائج'' کی ذیلی سرخی کے تحت دے دی ہے۔ لہٰذا ہمیں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس قرآنی استنباط کو چونکہ تمام صحابہ نے درست تسلیم کر لیا تھا لہٰذا یہ فیصلہ بھی حجت شرعیہ کے مقام پر آ گیا۔ اب صورت یہ ہوئی کہ حالات کے تقاضا کے ماتحت اور آیت قرآنی کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی زمین مجاہدین میں تقسیم کی اور حالات کے ماتحت اور ایک آیت قرآنی کے مطابق سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عراق کی زمینیں قومی تحویل میں لے لیں۔ لہٰذا آئندہ بھی ہر اسلامی حکومت ان دونوں فیصلوں میں سے جو بھی اسے سازگار ہو اختیار کر سکتی ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس اقدام پر ''شرعی ترمیم'' کا اطلاق اس لیے نہیں ہو سکتا کہ یہ ایک متوازن صورت ہے جو قرآن کریم ہی سے مستنبط ہے اور چونکہ اس پر صحابہ کا اجماع ہو گیا۔ یعنی تمام صحابہ نے آپ کے قرآنی استنباط کو درست تسلیم کر لیا گیا۔ لہٰذا یہ شرعی حجت اور ایک متوازی صورت بن گئی۔

۲۲/۴۔ شراب کی تعزیر میں اضافہ:

اس فیصلہ کی دو حیثیتیں ہیں ایک یہ کہ یہ فیصلہ آرڈی نینس کی صورت میں نافذ کیا گیا۔ اس لحاظ سے اس کی حیثیت وقتی اور عارضی ثابت ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ فیصلہ مجلس شوریٰ میں بالاجماع طے پایا تھا کہ شرابی کو ۴۰ کے بجائے ۸۰ کوڑے لگائے جائیں۔ دلیل یہ تھی کہ اکثر شرابی بدمست ہو کر تہمت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تراشیاں کرنے لگتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس فیصلہ کی حیثیت شرعی حجت کی بن جاتی ہے، ۔تو جس طرح مفتوحہ زمین مجاہدین میں تقسیم کردینا بھی شرعی فیصلہ ہے اور قومی تحویل میں لے لینا بھی۔ اسی طرح مجرم کے حالات کے تقاضا کے مطابق اور جرم کی نوعیت کے پیش نظر ۴۰ کوڑے لگانا بھی شرعی فیصلہ ہے اور ۸۰ کوڑے لگانا بھی۔ اسی لیے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے مختلف اوقات میں ان دونوں پر عمل کیا تھا۔

۵۔ درست اجتہادات

درست فیصلوں سے ہماری مراد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ایسے فیصلے ہیں جو حالات کے مطابق درست بھی تھے اور ان سے کوئی شرعی حکم مجروح بھی نہیں ہوتا، مثلاً:

۳/۲۳۔ کتابیہ عورت سے نکاح:

کتابیہ عورت سے نکاح کا جواز قرآن کریم سے ثابت ہے۔ تاہم یہ اجازت ہی ہے۔ حکم نہیں اور ایسی اجازت کو خلیفہ وقت وقتی مصالح کی خاطر مطلوبہ عرصہ کے لیے ختم بھی کرسکتا ہے اور ایسے فیصلہ کی حیثیت محض وقتی فیصلے یا آرڈی نینس کی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس آرڈی نینس کے نفاذ کی وجہ سے جس میں جعفر شاہ صاحب اور پرویز صاحب دونوں نے وضاحت فرمادی ہے کہ ''اس نکاح کی اجازت کی وجہ سے کتابیہ عورتوں سے نکاح کا رواج پڑ گیا۔ جس سے نئے نئے فتنے ابھرنے کا اندیشہ ہوگیا تھا'' اندریں صورت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ یا آرڈی نینس درست معلوم ہوتا ہے۔ تاہم جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ گورنر عراق کو اس کی اطلاع دی تو انہوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے پہلی بات جو پوچھی وہ یہ تھی کہ یہ شرعی حکم ہے یا آپ کی ذاتی رائے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ میری ذاتی رائے ہے۔ حذیفہ بن یمان نے کہا، آپ کی ذاتی رائے کی پابندی ہم پر کوئی ضروری نہیں۔ چنانچہ اس ممانعت کے باوجود لوگوں نے کثرت سے شادیاں کیں۔

البتہ یہ مسئلہ قابل غور ہے کہ کتابیہ عورت سے نکاح پر پابندی کس خلیفہ راشد نے لگائی؟ اس سلسلہ میں جعفر شاہ صاحب کے بیانات متضاد ہیں۔ اسلام دین آسان کے صفحہ نمبر ۱۶ پر آپ فرماتے ہیں کہ یہ پابندی سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے لگائی تھی۔ مگر مقالات کے ص ۹۹ پر آپ فرماتے ہیں کہ:

''مثلاً سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں کتابیہ کو نکاح میں لانے سے روک دیا یہ فقط ایک وقتی آرڈی نینس تھا۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اب چونکہ پرویز صاحب بھی اس پابندی کو سیدنا عمر سے ہی منسوب کرتے ہیں (شہکار رسالت، ص ۲۷۹) لہٰذا یہی قول راجح معلوم ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے غالباً شرعی ترمیم کرنے والے خلفائے راشدین کی تعداد میں اضافہ کی خاطر اس پابندی نکاح کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی ہوا۔ یہ ایک وقتی فیصلہ تھا۔ شریعت کا فیصلہ اپنی جگہ پر اٹل اور قائم ودائم ہے۔

اسی طرح کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ از روئے قرآن اہل کتاب کا کھانا مسلمانوں کے لیے حلال ہے۔ یہ بھی اجازت ہے حکم نہیں اس آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مسلمان اور اہل کتاب ایک دوسرے کی دعوتیں کرتے پھریں۔ یا ایک دوسرے سے بلا تکلف کھانے پینے کی اشیاء کا لین دین کیا کریں۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ عند الضرورت مسلمانوں کے لیے اہل کتاب کا کھانا حلال ہے۔ اسی اصول کے تحت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی بستیوں سے اہل کتاب کے ذبیحہ خانے بند کرا دیئے اور فرمایا کہ اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔ مسلمانوں کے اپنے ذبیحہ خانے بھی کفایت کر سکتے ہیں۔

۵/۲۴ زکوٰۃ کے مصارف اور تالیف قلوب:

قرآن کریم نے زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان فرمائے۔ جن میں ایک مصرف تو تالیف کے لیے خرچ کرنا بھی موجود ہے۔ لیکن قرآن کریم کے ان بتائے ہوئے آٹھ مصارف کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ اگر یہ آٹھ مدات کسی دور میں موجود نہ ہوں تو بہ تکلف یہ آٹھ مدات پوری کرو۔ مثلاً اگر عاملین زکوٰۃ میں سے کوئی یہ خدمت فی سبیل اللہ سر انجام دینا چاہے تو یہ قطعاً ضروری نہیں کہ اسے بھی اس کا حصہ دے کے چھوڑو۔ یا کسی وقت کسی مقام پر فقراء و مساکین کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ تو اس آیت کا یہ مطلب بھی نہیں کہ پہلے فقراء و مساکین پیدا کرو۔ پھر انہیں ان کا حصہ دو۔ نہ ہی اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ پہلے تمام زکوٰۃ کے مال کو پورے آٹھ حصوں میں تقسیم کر کے ہر مد میں برابر تقسیم کر دو۔ بلکہ اس تقسیم میں بھی پیش آمدہ حالات کو سامنے رکھ کر مال کو تقسیم کیا جائے گا۔ قرآن کریم کے اس حکم کا مطلب صرف یہ ہے کہ اگر یہ آٹھ مدات یا ان میں سے جتنی مدات موجود ہوں ان میں سے کسی کو محروم نہ رکھنا چاہیے۔ ان مدات میں زکوٰۃ خرچ کی جا سکتی ہے۔

دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اسلام لانا مصائب کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ معاشرتی تکلیفوں کے علاوہ معاشی پریشانیوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بالخصوص ہجرت کی صورت میں تو ساری جائیداد سے ہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہاتھ دھونا پڑتا۔ ان حالات میں تالیف قلوب کی ایک مد رکھی گئی جس سے نومسلموں کو معاشی پریشانیوں سے نجات دلائی جاتی تھی۔ دورِ فاروقی میں یہ صورت حال بالکل بدل گئی تھی۔ اس دور میں اسلام لانا مصائب کا باعث نہیں بلکہ عزت و افتخار کا باعث بن گیا تھا اور نومسلموں کو بھی فوراً پہلے مسلمانوں کے سے پورے حقوق فوراً حاصل ہو جاتے تھے۔ اس لیے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مصالح امت کی خاطر اس مد کو ختم کر کے یہ حصہ بھی دوسری قابل احتیاج مدات کی طرف منتقل کر دیا اور آپ کا یہ فیصلہ اس لحاظ سے سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق بھی تھا کہ آپ اپنے پانچویں حصے میں سے ایک حصہ اپنے سارے ذوالقربیٰ میں تقسیم نہ فرماتے تھے۔ بلکہ صرف بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب میں تقسیم کر دیتے تھے۔ اور بنو نوفل اور بنو عبد شمس کو چھوڑ دیتے تھے اور تقسیم بھی اس طرح نہیں کہ سب کو برابر برابر دے دیتے۔ بلکہ ان میں سے ضرورت مندوں کی ضرورت کا لحاظ رکھ کر انہیں دیا کرتے تھے۔

۶۔ اجتہادی غلطیاں

اجتہادی غلطیوں سے ہماری مراد آپ کے ایسے فیصلے ہیں جو آپ نے نافذ تو کر دیے لیکن بعد میں آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا، مثلاً:

۶/۲۵۔ وظائف میں اسلامی خدمات کا لحاظ:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں امت کے ضرورت مند افراد کو ان کی ضرورت کے مطابق وظائف دیے جاتے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ وظائف کی مقدار کا تعین اسلام کی خدمت کے مدارج کے مطابق ہونا چاہیے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی یہ رائے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پیش کی تو سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ہم ان لوگوں کی ضروریات کا ہی خیال رکھیں گے اور ان کی اسلامی خدمات کا معاوضہ ان کو اللہ کے ہاں سے ملے گا پھر جب عمر رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت آیا۔ تو آپ نے فوراً اپنی رائے پر عمل درآمد شروع کر دیا اور وظائف کی تعیین کچھ اس طرح کی:

امہات المومنین رضی اللہ عنہن کو بارہ بارہ ہزار درہم سالانہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت کی بنا پر سیدنا عباس، سیدنا علی اور سیدنا حسنین رضی اللہ عنہم کو پانچ پانچ ہزار، دفاعی جنگوں میں شریک ہونے والے مجاہدین کو چار چار ہزار، فتح مکہ سے پہلے ہجرت کرنے والوں کو تین تین ہزار اور فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والوں کے لیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دو ہزار درہم مقرر کیے۔ باقی لوگوں کو ایک ہی درجہ میں رکھا اور وظیفہ سے کوئی محروم نہ رہا۔ (اسلام میں عدل اجتماعی۔ سید قطب شہید صفحہ ۴۷۴-۴۷۵)

اسی معاشی پالیسی کے غلط اثرات آپ کی زندگی میں ہی نمایاں ہونے شروع ہو گئے تھے۔ جب آپ نے طبقاتی تقسیم کا آغاز اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرمالیا تب جا کر آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اور آپ نے ارادہ کیا کہ اگر اگلے سال تک زندہ رہا تو اس پالیسی کو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پالیسی کے مطابق کر دوں گا مگر افسوس ہے کہ اگلے سال کے آنے سے پہلے ہی آپ کی شہادت واقع ہو گئی چنانچہ یہی پالیسی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جاری رہی اور طبقاتی تفاوت بڑھتا گیا۔ بہر حال یہ فیصلہ بھی تدبیری قسم کا ہی تھا جس سے واضح شرعی حکم مجروح نہیں ہوتا تھا۔

۶/۲۶-۶/۲۷۔تطلیق ثلاثۃ اور حلالہ:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جب مسلمانوں میں یہ وبا عام دیکھی کہ وہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کے خلاف بیک مجلس تین طلاق دیتے ہیں تو آپ نے ایسے لوگوں کو ان کی اس حرکت کی سزا یہ دی کہ ایسی تین طلاق کو قانوناً تین طلاق ہی شمار کر کے اسے طلاق رجعی کے بجائے طلاق بائنہ قرار دے دیا۔ اگرچہ آپ کا یہ فیصلہ سیاسی نوعیت کا تھا تاہم ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کچھ باک نہیں ہے کہ آپ کا یہ فیصلہ شرعی تبدیلی یا شرعی ترمیم نہیں بلکہ براہِ راست کتاب اللہ اور سنت رسول کے خلاف تھا۔ آپ اپنے اس فیصلہ کے حق میں یہ دلیل دیتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے طلاق کے سلسلہ میں آسانی رکھی تھی۔ مگر لوگوں نے کتاب اللہ سے کھیلنا شروع کر دیا۔ لہٰذا اب یہ کسی رعایت کے مستحق نہیں رہے۔ نیز فرماتے تھے کہ ﴿مَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا﴾ یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص کے لیے آسانی پیدا کرتا ہے جو اس سے ڈرتا ہے۔ یہ لوگ جو بیک وقت مجلس تین طلاق دینے میں اللہ تعالیٰ سے مطلق نہیں ڈرتے کیونکہ شرعی طریقہ کے مطابق طلاق نہیں۔ لہٰذا یہ لوگ کسی طرح کی رعایت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

سیدنا عمر کی عقل دانش اور سیاسی تدبر سے کسے انکار ہو سکتا ہے تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ بہر حال عام انسان ہی تھے نبی نہ تھے کہ ان کا ہر اجتہاد درست اور قابل احتجاج ہو۔ آپ کے اس فیصلہ کی غلطی کا اس سے زیادہ واضح اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس فیصلہ پر صحابہ کا اجماع نہ ہو سکا اور بڑے بڑے صحابہ کرام مثلاً سیدنا ابن عباس، سیدنا عبدالرحمن بن عوف سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن مسعود وغیرہم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آپ کے اس فیصلہ کے خلاف تھے (اعلام الموقعین اُردو، ص: ۷۹۹، لابن القیم، مطبوعہ اہل حدیث اکادمی، اُردو بازار، لاہور)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ خیال تھا کہ اس آرڈی نینس سے ڈر کر لوگ اپنے اس غیر شرعی فعل سے باز آ جائیں گے۔ یہ کام تو ہو نہ سکا کیونکہ یہ فیصلہ محض سیاسی نوعیت کا تھا اور اس کی شرعی بنیادیں نہایت کمزور تھیں۔ اس کے برعکس اس فیصلہ سے ایک اور بڑا بگاڑ پیدا ہو گیا اور وہ یہ تھا کہ اب لوگ حلالہ کرنے اور کرانے کی راہیں اختیار کرنے لگے۔ جس کے لیے سیدنا عمر کو ایک نیا آرڈی نینس جاری کرنا پڑا جس میں آپ نے حلالہ کرنے اور کرانے والے دونوں کے لیے ''رجم'' کی سزا کا اعلان کیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس آرڈی نینس کے ماتحت کسی محلل یا محلل لہ کو رجم کیا بھی تھا یا نہیں۔ تاہم یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ حلالہ والا آرڈی نینس تطلیق ثلاثہ والے آرڈی نینس کا ہی تتمہ یا دوسرا رخ تھا۔

انسان فطرتاً جلد باز واقع ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے جو طلاق کا طریقہ بتایا وہ اس فطرت کا لحاظ رکھ کر بتایا تھا۔ ایک ہی مجلس میں تین طلاق اسی جلد باز فطرت کا نتیجہ ہے اور جب ایسا ہی واقعہ دور نبوی میں ہوا تو آپ نے اسے ایک ہی طلاق شمار کیا۔ پھر دوبارہ یہ واقعہ ہوا تو آپ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ ''میری زندگی میں کتاب اللہ سے کھیلنے لگے ہو؟'' تاہم طلاق ایک ہی طلاق شمار کی اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ محلل اور محلل لہ، دونوں ملعون ہیں۔ اب سیدنا عمر کا یہ تعزیراتی فیصلہ بھلا انسانی فطرت کو کیسے بدل سکتا تھا؟ نتیجتاً حلالہ کے واقعات رونما ہونے لگے جس کے لیے دوسرا آرڈی نینس جاری کرنا پڑا۔

بعد ازاں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کے مطابق فتویٰ دیا جو یہ تھا کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے والا سنت کے خلاف ہونے کی وجہ سے گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ تاہم تین طلاقیں پڑ جاتی ہیں۔ بعد کے ادوار میں لوگ گناہ کبیرہ کے ارتکاب والی بات بھی بھول گئے اور حنفیوں میں بالخصوص ایک مجلس میں تین طلاق کا دستور چل نکلا۔ اب چونکہ یہ فتویٰ فطرت انسانی کے خلاف ہے اور اس کے مفاسد بے شمار ہیں لہٰذا احناف کا ایک کثیر طبقہ امام صاحب کے اس فتویٰ سے متفق نہیں ہے۔ وہ فقہ مالکیہ کے مطابق اسے ایک ہی طلاق قرار دیتے ہیں۔ رہے اہل حدیث تو وہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ کو۔ خواہ وہ مفید تھا یا غیر مفید، ایک وقتی اور عارضی فیصلہ سمجھتے ہیں۔ جو شریعت کے حکم پر کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ ان کے خیال کے مطابق درست طریقہ کار آج بھی وہی ہے جو سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے ثابت ہے دورِ فاروقی میں بھی سنت رسول کے مطابق طریقہ کار ہی درست تھا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ کی غلطی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ بعد میں آپ کو اس فیصلہ پر بہت ندامت ہوئی۔ امام ابن قیم اپنی تصنیف اغاثۃ اللھفان کے ص ۳۳۶ پر حدیث کی معتبر کتاب مسند اسماعیل کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

(قَالَ عُمَر: مَا نَدِمْتُ عَلٰی شَيْءٍ نَدَامَتِيْ عَلٰی ثَلَاثٍ أَنْ لَا أَكُوْنَ حرمت الطلاق... الخ) ''سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے تین باتوں پر شدید ندامت ہوئی (جن میں سے پہلا یہی طلاق والا مسئلہ ہے) کاش کہ میں طلاق (رجعی) کو حرام نہ کرتا۔''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس اعتراف کا ذکر جعفر شاہ صاحب پھلواروی نے بھی اپنی تصنیف مقام سنت کے ص ۹۷ پر اور مقالات کے ص ۱۲۴ پر کیا ہے۔

نگہ بازگشت:

ایسے (۲۷) امور جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے شرعی تبدیلیاں کیں، کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ ان میں سے:

۱۔ (۷) امور ایسے ہیں جو تدبیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں کچھ تو مطابق شریعت ہیں۔ باقی بھی کم از کم شریعت کے منافی نہیں اور وہ (۷) امور یہ ہیں۔ گھوڑوں پر اور دریائی پیداوار پر زکوٰۃ، عشور، نومسلم کی غیر منقولہ جائیداد کے عوض کفاف۔ خراج کی مختلف ممالک میں مختلف شرحیں، جزیہ کو زکوٰۃ کے برابر مقرر کرنا اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا جمعہ کے خطبہ میں حاضری کے لیے ایک اذان کا اضافہ۔

۲۔ اور درج ذیل (۵) امور ایسے ہیں جو شریعت کے کسی واضح حکم کی تائید کرتے ہیں مثلاً ''آئندہ کوئی عرب غلام نہیں ہوسکتا'' غلامی کو کم کرنے کے لیے ایک موثر قدم ہے۔ انتشار و اختلاف ختم کرنے کے لیے جنازہ کی چار تکبیروں پر اجماع یا تراویح کی جماعت، تمسخر کو روکنے کے لیے ہجو کی سزا مقرر کرنا اور فحاشی کے سد باب کے طور پر غزلوں میں عورتوں کا نام لینے پر سزا کا اعلان۔

۳۔ سیدنا عمر کے ۲ فیصلے متوازی فیصلوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مفتوحہ زمین کو قومی تحویل میں لینا۔ شرابی کی سزا ۸۰ کوڑے مقرر کرنا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۔ اور ۲ فیصلے شرعی اجازت کو وقتی طور پر محدود کرتے ہیں کتابیہ سے نکاح پر پابندی اور زکوٰۃ کے مصارف سے عدم ضرورت کی بنا پر تالیف قلوب کی مد کا اخراج۔

۵۔ وظائف میں اسلامی خدمات کا لحاظ رکھنا اگرچہ تدبیری مسئلہ ہے۔ تاہم اس میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس معاملہ میں اپنی رائے کو درست نہ پایا۔ تاہم اس سے کسی شرعی حکم پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ گویا مندرجہ بالا (۷) امور ایسے ہیں جن پر شرعی تبدیلی کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔

۶۔ تطلیق ثلاثہ والا صرف ایک مسئلہ ایسا ہے جو خلاف سنت ہے۔ ہم اسے خلاف سنت کہتے ہیں۔ لیکن ہمارے کرم فرما اسے ''شرعی تبدیلی'' کا نام دیتے ہیں۔ اسی مسئلہ کے نتیجہ کے طور پر آپ نے حلالہ کرنے اور کرانے والے کی سزا رجم مقرر کی اور یہی وجہ ہے۔ جس پر آخر میں آپ کو شدید ندامت بھی ہوئی اور غلطی کا احساس بھی ہوگیا۔

۷۔ اب بقایا آٹھ امور ایسے ہیں۔ جن کی ابتدا تو دورِ نبوی میں ہوئی لیکن ان حضرات نے اپنی لاعلمی یا تجاہل عارفانہ یا مغالطہ آفرینی کی وجہ سے ان امور کی ابتدا کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دیا ہے اور وہ آٹھ امور یہ ہے:

صبح کی نماز میں الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ۔ قحط میں چوری کی سزا موقوف کرنا، غیر شادی شدہ کی سزا سے جلا وطنی کو موقوف کرنا۔ ام ولد کی خرید و فروخت پر پابندی عائد کرنا۔ زنا بالجبر کی صورت میں عورت پر سے سزا موقوف کرنا۔ طواف میں سے رمل کو موقوف کرنا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اصول کہ قاتل مقتول کا وارث نہیں ہوسکتا اور جنگ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فدیہ مقرر کرنا۔

نتائج:

۱۔ قبلہ جعفر شاہ صاحب نے ۱۶ عدد شرعی تبدیلیوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ نتیجہ پیش فرمایا ہے کہ اگر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ حالات کے تقاضوں کے تحت کتاب و سنت کے احکام میں تبدیلی کر سکتے ہیں تو:

(الف) خود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلوں میں تبدیلی کیوں نہیں کی جا سکتی؟

(ب) دوسری اسلامی حکومتوں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کے تحت کتاب و سنت کی نئی تاویل یعنی تبدیلی کر لیا کریں۔

اب دیکھیے اگر قبلہ شاہ صاحب کے اس پیش کردہ نتیجہ کو خود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہی تسلیم نہ کریں تو دوسرے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیونکہ تسلیم کر سکتے ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے علیٰ وجہ البصیرت یہ سمجھ لیا تھا کہ اب رمل کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس کے باوجود آپ نے رمل کیا اور کہتے جاتے تھے کہ ہم ایسی کوئی چیز چھوڑنے کو تیار نہیں جسے نبی ﷺ بجا لائے تھے۔ اسی طرح آپ نے علیٰ وجہ البصیرت حجر اسود کو یوں مخاطب کیا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جو نہ فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، اس سمجھ کے باوجود آپ نے حجر اسود کو چومنے کا عبث کام کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ''اگر نبی ﷺ نے تمہیں نہ چوما ہوتا تو میں تجھے کبھی نہ چومتا۔''

۱۔ بتائیے سنت رسول ﷺ سے استمساک واعتصام کی کوئی اس سے بہتر مثال مل سکتی ہے؟ ہم نے صرف ان دو واقعات سے استشہاد کیا ہے۔ جن کا ذکر اس مضمون میں آیا ہے۔ ورنہ سنت رسول کی پیروی سے متعلق آپ کی بیسیوں روایات موجود ہیں۔

۲۔ اگر بغرض تسلیم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سنت رسول میں تبدیلیاں کرنا بھی چاہتے تو صحابہ کرام کی موجودگی میں وہ کر بھی نہ سکتے تھے۔ آپ نے تطلیق ثلاثہ کا نفاذ کیا تو صحابہ کبار نے آپ سے اختلاف کیا اور بالآخر آپ کو ندامت ہوئی۔ آپ نے حلالہ کی سزا رجم کا اعلان کیا۔ لیکن کسی کو بھی یہ سزا نہ دے سکے۔ حالانکہ تطلیق ثلاثہ کا لازمی نتیجہ حلالہ کا فروغ ہے۔ آپ نے نمازِ تراویح کی جماعت مقرر کی۔ تو اکثر صحابہ نے یہ نماز اپنے گھروں میں پڑھنا شروع کر دی۔ آپ نے کتابیہ عورت سے نکاح پر پابندی لگائی حالانکہ بظاہر یہ ایک مستحسن اقدام تھا۔ لیکن صحابہ نے قرآنی اجازت کے مقابلہ میں آپ کی اس پابندی کو قطعاً قبول نہ کیا اور عراق کے مفتوحہ علاقوں میں عیسائی عورتوں سے کثرت سے شادیاں کیں۔

۳۔ بدلتے ہوئے حالات کے تحت صرف ایسی تبدیلی ہی گوارا ہو سکتی تھی جس کی شریعت میں گنجائش موجود ہو اور اس پر صحابہ کا اجماع ہو جائے جیسے مفتوحہ زمینوں کو قومی تحویل میں لینا یا خطبہ جمعہ کے لیے ایک اذان کا اضافہ یا شرابی کی سزا میں اضافہ وغیرہ۔

۴۔ اختلافی مسائل کا اختلاف اجماع صحابہ سے ختم کرایا جاتا تھا جیسے نماز جنازہ کی چار تکبیریں یا غسل جنابت کی ایک اختلافی شکل۔ وغیرہ وغیرہ

۵۔ اولیات عمر، خواہ وہ نصف صد ہیں یا کم وبیش صرف تدبیری اور امدادی امور سے تعلق رکھتی ہیں۔ کسی شرعی امر میں جہاں کوئی گنجائش بھی ہو۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد تبدیلی کا کسی کو اختیار نہیں۔ نہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اور نہ ہی کسی دوسری اسلامی حکومت کو۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو خود بھی اس امر کا اعتراف تھا اور اس سلسلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی آپ کے پاسبان تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقالہ: ۷

فرقہ پرستی

اسلام کے مذہبی فرقوں کے عقائد ونظریات کا مختصر جائزہ

شیعہ اور اہلسنت والجماعت: حضور اکرم ﷺ نے جو امت واحدۃ چھوڑی اس کے سب افراد مسلمان ہی کہلاتے ہیں۔ پہلا اختلاف جس نے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کیا سیاسی نوعیت کا تھا۔

یہ لوگ شیعان علی کے نام سے موسوم ہوئے جس کا مطلب ہے علی کے مددگار۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو خلافت سے معزول کر کے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا جائے۔ ۳۵ ہجری میں جب مدینہ سے اکثر صحابہ حج پر گئے ہوئے تھے اس مفسدہ پرداز عنصر نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا اور عامیانہ دباؤ کے تحت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کر لیا بعد میں یہی لوگ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے چمٹے رہے اور جنگ جمل کو بھڑکانے کا سبب بنے۔ اس طرح عبداللہ بن سبا کو اپنے مشن میں بہت حد تک کامیابی ہوگئی۔

بعد میں یہی لوگ ایک مستقل فرقہ بن گئے جو اب صرف شیعہ کہلاتے تھے مابعد کے ادوار میں ان میں مزید بہت سے فرقے پیدا ہو گئے۔ انہوں نے اپنے عقائد میں بھی مزید شدت پیدا کر لی۔ مثلاً

۱۔ تین صحابہ کے سوا باقی سب حضور ﷺ کی وفات کے بعد منافق ہو گئے تھے۔

۲۔ اصل قرآن چالیس پاروں پر مشتمل تھا۔ موجودہ قرآن کریم مکمل نہیں ہے۔ قرآن کریم کا اصل نسخہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس تھا پھر یہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے پاس منتقل ہوا پھر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے پاس۔ علی ہذا القیاس ایک امام سے دوسرے کے پاس ہوتا ہوا بارہویں امام مہدی کے پاس ہے جو بچپن ہی میں غار میں چھپ گئے ہیں وہ آج تک زندہ ہیں اور قیامت کے قریب اس قرآن کے ساتھ ظہور فرمائیں گے۔

۳۔ شیعہ کے ایک غالی فرقہ کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ علی رضی اللہ عنہ کے جسم میں حلول کر گیا تھا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ میں خدائی صفات پیدا ہو گئی تھیں۔

۴۔ ان لوگوں نے سنت کو شرعی حجت تو تسلیم کیا لیکن صرف وہ روایت قبول کرتے تھے جو ان کے کسی امام سے مروی ہو۔ اس طرح انہوں نے احادیث کی اپنی الگ کتابیں تیار کر لیں...... وغیرہ وغیرہ۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ لوگ بھی چونکہ اپنے آپ کو مسلمان ہی کہلاتے اور سمجھتے تھے۔ لہٰذا باقی مسلمانوں نے امتیاز کی خاطر اپنا نام تجویز کر لیا اور وہ تھا اہل السنّت والجماعت یعنی صحابہ کی جماعت سے منسلک رہنے والے اور رسول اللہ کی سنت پر کاربند رہنے والے لوگ۔ ان لوگوں نے اپنے عقائد ونظریات میں کوئی کمی بیشی نہیں کی۔ تاہم محض امتیاز کی خاطر انہیں اپنا نام تبدیل کرنا پڑا۔ اور دونوں فرقوں میں مسلمان کا نام ثانوی حیثیت اختیار کر گیا۔ اہل سنت والجماعۃ کو شیعہ حضرت نے سنی کا نام دیا۔

عقلیت پرست فرقے

جہمیہ:

امت میں دوسرا اختلاف عقل وفکری کی بنیاد پر ہوا۔ اس فتنہ کا آغاز دوسری صدی ہجری کی ابتدا سے ہوا۔ صفوان بن جہم نامی ایک شخص نے ارسطو کے فلسفہ الٰہیات سے متاثر ہو کر اللہ کے متعلق تجریدی تصور پیش کیا۔ یہ اور اس کے ہمنوا لوگ جہمیہ کے نام سے موسوم ہوئے۔ ان کے مخصوص عقائد درج ذیل تھے:

۱۔ اللہ کے متعلق جہت مقرر کرنے کو وہ کفر سمجھتے تھے اور آیت ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ میں استوی کا ترجمہ اِسْتَوْلٰی سے کرتے تھے۔ ایسی تمام آیات جس میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ آنکھ یا پنڈلی کا ذکر ہے ان کی من مانی تاویل کر لیتے تھے۔

۲۔ تقدیر کے مسئلہ میں وہ انسان کے مجبور محض ہونے کے قائل تھے۔ اور جن آیتوں میں انسان کو مختار بتلایا گیا ہے۔ ان کی من مانی تاویل کر لیتے تھے۔

۳۔ قرآن کی من مانی تاویل کرنے کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ احادیث تھیں۔ لہٰذا جو احادیث ان کے مسلک کے خلاف تھیں ان کو ساقط الاعتبار قرار دے کر انکار کر دیتے تھے۔

۴۔ وہ وحی پر عقل کے تفوق اور برتری کے قائل تھے۔ گو زبانی طور پر ان کا دعوی یہی تھا کہ عقل کو وحی کے تابع ہو کر چلنا چاہیے لیکن ہستی باری تعالیٰ میں ان کا تصور اور قرآن کی من مانی تاویلات ہی اس بات کی کافی دلیل ہے کہ وہ عقل پرست تھے۔

معتزلین:

اسی دور میں ایک اور شخص واصل بن عطا نامی کا ظہور ہوا۔ جس نے فلسفہ یونان سے متاثر ہو کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جہمیہ سے ملتے جلتے عقائد پیش کیے۔ واصل بن عطاء اور اس کے پیرو فرقہ معتزلہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ جہمیہ اور معتزلہ نے اللہ کے متعلق تجریدی تصور بالکل الٹ روش اختیار کی۔ وہ انسان کو مجبور محض کی بجائے مختار مطلق سمجھتے تھے۔ لہٰذا

تقدیر سے متعلق جو آیات جہمیہ کے نزدیک قابل تاویل تھیں وہی آیات معتزلہ کے نزدیک اپنے ظاہری معانی میں بالکل درست تھیں اور جو آیات جہمیہ کے نزدیک اپنے ظاہری معانی میں درست تھیں وہ آیات معتزلہ کے نزدیک قابل تاویل تھیں۔

۲۔ اسی طرح جن احادیث میں انسان کو مختار بتایا گیا ہے جہمیہ ان کو ساقط الاعتبار قرار دیتے تھے جبکہ معتزلہ کے نزدیک وہی صحیح اور درست تھیں۔ اور جن احادیث میں انسان کو مجبور بتلایا گیا ہے جہمیہ کے نزدیک وہ درست اور معتزلہ کے نزدیک ساقط الاعتبار تھیں۔

ان دونوں فرقوں میں سے معتزلہ ہی تاریخ میں زیادہ مشہور ہوا کیونکہ اسے عباسی خلفاء کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ مامون الرشید خود معتزلی تھا۔ مسئلہ خلق قرآن اسی کے دور کی پیداوار ہے۔ معتزلہ چونکہ اللہ کی صفات کو بھی حادث سمجھتے تھے۔ لہٰذا ان کے ہاں قرآن بھی مخلوق تھا۔ مامون الرشید جیسا روادار انسان اس مسئلہ میں اتنا شدید تھا کہ وہ قرآن کو اللہ کی طرح قدیم سمجھنے والوں کو مشرک اور گردن زدنی سمجھتا تھا۔ معتزلین کو تاریخ میں عقل پرست فرقہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اب ان عقل پرستوں کے مقابلہ میں جو لوگ آئے وہ علمائے ظاہر کے نام سے موسوم ہوئے یہ لوگ کہتے تھے کہ اگر قرآن میں اللہ کے عرش پر ہونے یا اس کے ہاتھ آنکھ اور پنڈلی کا ذکر ہے تو ہمیں جوں کا توں تسلیم کر لینا چاہیے۔ اب رہا یہ سوال کہ اللہ کا مادی جسم اس کے ہاتھ کان آنکھ اور پنڈلی کیسے ہو سکتی ہے تو وہ کہتے تھے کہ ہم یہ جاننے کے مکلف نہیں۔ کیونکہ اللہ نے خود ہی کہہ دیا کہ لیس کمثلہ شی .... اور نیز یہ فرمادیا کہ: فلا تضربوا للہ الامثال۔

ان علمائے ظاہر میں امام احمد بن حنبل کا نام بالخصوص قابل ذکر ہے جنھوں نے اس مسئلہ قرآن کے سلسلہ میں مامون الرشید کے ہاتھوں قید و بند کی سختیاں بھی جھیلیں اور کوڑوں کی پٹائی بھی برداشت کی مگر پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دی۔ مامون کے بعد معتصم باللہ کے دور میں اس مسئلہ پر مناظرہ کے دوران خلیفہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے عقیدہ اعتزال سے توبہ کی اور امام موصوف کو بہ اعزاز و تکریم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قید سے رہا کر دیا۔ چونکہ معتزلہ کے عقائد اسلام کے مزاج سے لگا نہیں کھاتے تھے۔ لہٰذا سرکاری سرپرستی کا سہارا ختم ہوتے ہی یہ فتنہ اپنی موت آپ ہی مر گیا۔

سر سید احمد خان اور ان کا پیرو:

اس عقیدہ کے فتنہ کا آغاز ہندوستان میں انیسویں صدی عیسوی میں ہوا جس کے سرخیل سر سید احمد خان تھے۔ اس دور میں دنیا میں ہر جگہ کا مسلمان ذہنی معاشی سیاسی غرض ہر لحاظ سے بری طرح پٹ چکا تھا۔ مغربی تہذیب کا دنیا بھر میں دور دورہ تھا جو خالص مادہ پرستی پر مبنی تھی۔ اہل مغرب کسی ایسی بات کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے جو عقل تجربہ اور سائنس کی کسوٹی پر پوری نہ اترتی ہو۔ سر سید موصوف نے یورپ میں رہ کر ہی تعلیم حاصل کی جس کا اثر یہ ہوا کہ آپ نے معتزلہ کے عقائد کی ہمنوائی کے علاوہ اس فکر قرآنی میں درج ذیل باتوں کا اضافہ کر دیا۔

۱۔ انبیاء کے معجزات سے انکار کر دیا اور ایسی تمام آیات کی من مانی تاویلات پیش کیں، جو مضحکہ خیز بھی ہیں اور محیر العقول بھی!

۲۔ فرشتے، جن اور شیطان یا ابلیس کی علیحدہ شخصیت سے انکار کر دیا کیونکہ یہ سائنسی معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ فرشتوں سے مراد کائناتی قوتیں، جنوں سے مراد دیہاتی لوگ اور شیطان یا ابلیس سے مراد انسان کے اندرونی سرکش جذبات تھے۔

سید موصوف ڈارون کے ہم عصر تھے اور اس کے نظریہ ارتقاء سے سخت متاثر تھے جس کے نتیجہ میں انہوں نے

۳۔ آدم کو کوئی خاص فرد ابو البشر یا پہلا نبی ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ آدم سے مراد بنی نوع انسان کا نمائندہ ہے۔

۴۔ قصہ ابلیس و آدم میں جنت سے مراد اس کی بلوغت سے پہلے کی زندگی اور شجر ممنوعہ سے مراد اس کے جنسی جذبات (ان جملہ صفات کا تفصیلی جائزہ ہم ایک الگ مقالہ میں پیش کر رہے ہیں) وغیرہ وغیرہ۔ اب ظاہر ہے کہ اتنے مسائل میں امت کے مسلمہ عقائد و نظریات سے اختلاف کرنے پر سر سید موصوف کو قرآن کی بے شمار آیات کی تاویلات کرنے کی ضرورت پیش آنی چاہیے۔ لہٰذا آپ نے ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الگ تفسیر قرآن لکھ کر اپنے ان نظریات کی اشاعت کی۔

قرآنی آیات کی .... تاویل کے بعد دوسری بڑی ضرورت احادیث کو راستہ سے ہٹانے کی پیش آتی ہے۔ چنانچہ سید موصوف نے ہر اس حدیث کو ساقط الاعتبار قرار دے دیا جو ان کے نظریات و عقائد کے آڑے آتی تھی۔

سر سید کے بعد کچھ ایسے لوگ منظر عام پر آئے جنہوں نے احادیث کو حجت دینی تسلیم کرنے سے یکسر انکار کر دیا۔ یہ لوگ اپنے آپ کو اہل قرآن کہلاتے تھے اور ان کے سرخیل عبداللہ چکڑالوی تھے۔ لہٰذا دوسرے مسلمانوں نے انہیں چکڑالوی کے نام سے موسوم کیا۔ چونکہ احادیث ہی قرآن کے احکام کا عملی نمونہ پیش کرتی ہیں۔ اس نمونہ کو سامنے سے ہٹانے کے بعد لوگ تشتت و انتشار کا شکار ہو کر کئی فرقوں میں بٹ گئے ان کے اختلاف اصولی قسم کے تھے۔ مثلاً ایک نماز ہی کو لیجیے۔ کچھ لوگ دن میں دو نمازیں پڑھتے تو کچھ تین۔ کوئی ایک رکعت نماز پڑھتے کوئی دو رکعت کچھ ایک سجدہ پر اکتفا کرتے تھے تو کچھ دو سجدے ضروری سمجھتے تھے۔ کچھ سلام پھیر کر نماز ختم کرتے تھے تو کچھ ایسے ہی اٹھ جاتے تھے۔ پھر یہ بھی طے نہ پا سکا کہ نماز میں پڑھا کیا جائے؟ اس قسم کے اصولی اختلاف بہر صورت موجود تھے۔ اس تشتت و انتشار کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ فرقے اپنی موجودگی کے باوجود اپنی اہمیت کھو بیٹھے ہیں انہیں کالعدم ہی سمجھنا چاہیے۔

ادارہ طلوع اسلام:

آج کے معتزلین اور سر سید کی مسند پر ادارہ طلوع اسلام براجمان ہے جس نے اہل قرآن کے تجربہ سے فائدہ اٹھا کر احادیث سے کلی طور تو انکار نہیں کیا۔ تاہم احادیث کے مختلف پہلوؤں پر بحث کر کے احادیث کے مجموعہ کو ساقط الاعتبار قرار دینے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا ہے۔ اس کا دعوے تو یہ ہے کہ احادیث جو قرآن کے خلاف ہوں یا سیرت رسول ﷺ اور صحابہ کو داغدار کریں وہ نا قابل اعتبار ہیں۔ لیکن قرآن بھی تو ان کا اپنا ہے۔ ادارہ مذکورہ نے تین...... جلدوں میں مفہوم القرآن لکھ کر سارے قرآن کے مفہوم کو یکسر بدل ڈالا ہے۔ بھلا جو ادارہ قرآن کو موم کی ناک سمجھ کر اس کے ساتھ یہ کچھ کر سکتا ہے وہ احادیث کو جس طرح مانتا ہوگا اس کا اندازہ آپ خود ہی لگا سکتے ہیں۔

ادارہ طلوع اسلام کو معتزلین کے عقائد و نظریات سے بھی اور سر سید احمد کے نظریات سے بھی مکمل طور پر اتفاق ہے۔ علاوہ ازیں اس نے اس فکر قرآنی میں مندرجہ ذیل باتوں کا اضافہ کیا ہے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۔ معاشی لحاظ سے اس نے قرآنی نظام میں ربوبیت کا تصور پیش کیا ہے جو عملی طور پر کمیونزم کا مکمل چربہ ہے اور انفرادی ملکیت کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ تاہم نظریاتی لحاظ سے کمیونزم کے نظریہ سے اختلاف کیا ہے۔

۲۔ سیاسی لحاظ سے اس نے مرکز ملت کا تصور پیش کیا اور کہا ہے کہ خلیفہ وقت کی اطاعت ہی اللہ اور اس رسول کی اطاعت ہے۔ گویا حکمران کو لامحدود اختیار دیے ہیں بلکہ وقت کا حکمران ہی رسول ہے۔

۳۔ تاریخی لحاظ سے اس نے سرسید کے شروع کیے ہوئے کام یعنی ڈارون کی تھیوری کو پروان چڑھایا ہے گویا وہ وحدت انسان کے بجائے وحدت حیات کا قائل ہے اور بنی نوع انسان کا سلسلہ نسب اس کائی کے ذرہ سے ملاتا ہے جس میں آج سے ۲ ارب سال پیشتر زندگی کا آغاز ہوا۔

۴۔ معاشرتی لحاظ سے اس نے مغرب کے نعرہ مساوات مرد وزن سے مرعوب ہو کر عورت کو زندگی کے ہر میدان میں مرد کے برابر قرار دینے کی کوشش کی ہے۔

۵۔ علاوہ ازیں اس نے بعض ایسے حقائق کا بھی انکار کیا ہے جن پر امت مسلمہ کا اتفاق ہے اور جن کے اشارات تو قرآن کریم میں ملتے ہیں مگر تفصیل احادیث میں مذکور ہے مثلاً عذاب قبر حج کے علاوہ قربانی اور وصیت کی تحدید وغیرہ۔

اور ان سب مسائل کو قرآن سے ثابت کرنے کے لیے مذکور کو لغات القرآن، مفہوم القرآن اور مطالب القرآن وغیرہ شائع کرنا پڑیں تاکہ اپنے انداز فکر کو قرآن میں سمویا جاسکے۔

فقہی مذہب اور تقلید:

امت مسلمہ میں تیسرا بڑا اختلاف فقہی بنیادوں پر ہوا۔ اس اختلاف کا آغاز سن ۱۲۰ ہجری یعنی امام ابوحنیفہ کے مسند درس پر متمکن ہونے کے وقت سے لے کر امام احمد بن حنبل کی وفات سن ۲۴۱ ہجری تک ہے۔ اس دور میں چار مشہور فقیہ پیدا ہوئے۔ یعنی امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل۔

ان چاروں ائمہ میں سے امام مالک اور امام احمد بن حنبل زیادہ تر احادیث کا سہارا لیتے اور حتی الوسع قیاس سے گریز کرتے تھے۔ پھر یہ حضرات ضرورت کے بغیر قیاس نہ کرنے کے قائل بھی تھے۔ امام شافعی نے درمیانہ روش اختیار کی وہ قیاس سے استفادہ میں مبالغہ نہ کرتے تھے۔ البتہ امام ابو حنیفہ دوسرے اماموں کے مقابلے میں قیاس سے زیادہ کام لیتے تھے۔ امام رازی فرماتے ہیں: قیاس امام ابوحنیفہ کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اوڑھنا بچھونا تھا اور کثرت قیاس کی وجہ سے آپ مخالفین کا ہدف ملامت بنے رہے۔(حیات ابو حنیفہ، ص ۱۰۲ بحوالہ مناقب امام شافعی للرازی)

سن ۱۲۰ ہجری سے لے کر (۱۵۰ تاریخ وفات تک) تیس سال کے عرصہ میں آپ نے ۶۰ ہزار اور بقول بعض ۳۸ ہزار قانونی مسائل کے جواب دیئے جوان کی زندگی میں ہی الگ الگ عنوانات کے تحت مرتب کیے گئے (المکی، جلد۱، ص ۸۶) اس طرح انہوں نے اس عظیم خلا کو پر کر دیا جو خلافت راشدہ کے بعد شوریٰ کے ختم ہو جانے سے اسلام کے قانون نظام میں واقع ہو چکا تھا۔ آپ نے غیر سرکاری مجلس واضع قانون بنائی تھی۔ اس میں صرف پیش آمدہ مسائل ہی زیر بحث نہیں آتے تھے بلکہ معاملہ کی امکانی صورتیں فرض کر کے ان پر بحث کی جاتی اور اس کا حل تلاش کیا جاتا تھا۔

حکومت وقت کو کسی ایسی فقہی تدوین کی ضرورت تھی۔ چنانچہ امام مالک سے التجا کی کہ ان کی کتاب مؤطا کو ملک کا قانون قرار دیا جائے۔ لیکن امام موصوف نے اس سے انکار کر دیا۔ مزید برآں مؤطا نہایت مختصر کتاب تھی جو شاید ایک صدی سے زیادہ عرصہ کے قانونی خلا کو پر کرنے کے تقاضے بھی پورے نہ کر سکتی۔ لہٰذا مملکت عباسیہ نے اس طرف رجوع کیا اور فقہ حنفی ملک کا سرکاری قانون بن گیا۔

امام موصوف کو حکومت نے عہدہ قضا قبول کرنے کی بھی دعوت دی جسے آپ نے قبول نہیں کیا لیکن آپ کے شاگرد رشید امام ابو یوسف نے آپ کی وفات سے ۱۲ سال بعد یہ عہدہ قبول کیا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ فقہ حنفی ملکی قانون بننے کے علاوہ نسبتاً زیادہ مقبول ہو گئی۔ عدالتوں میں قاضی بھی عموماً وہی رکھے جاتے تھے جو اس سلسلہ سے منسلک ہو جاتے تھے۔

اس دور تک عام مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ وہ کسی خاص امام یا فقہ کی طرف نسبت کرنا پسند نہ کرتے تھے بلکہ کسی مسئلہ میں جس فقہ میں سہولت دیکھتے اسی کو اختیار کر لیتے۔ فقہ حنفی کے عدالتوں میں رائج ہونے کے بعد حکومت نے یہ قانون بنا دیا کہ ہر شخص کو کسی ایک ہی فقہ کا پابند ہونا چاہیے۔ البتہ اسے اختیار رہے کہ جس فقہ کو وہ چاہے پسند کرے۔

تقلید شخصی:

حکومت کی اس روش نے فرقہ وارانہ روش کو ہوا دی۔ پھر جس طرح سیاسی حالات کی بناء پر حنفی مذہب دوسرے مذاہب سے زیادہ مقبول ہو گیا اسی نسبت سے اس میں عصبیت بھی زیادہ آ گئی۔ حنفی لوگ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زبانی طور پر دوسروں کو برحق کہتے لیکن عمداً اور اعتقاداً اس سے انکار کرتے تھے۔ چنانچہ کسی متعصب حنفی نے یہاں تک بھی کہہ دیا کہ

فلعنة ربنا اعداد رمل علی من رد قول ابی حنیفة	یعنی جو شخص امام ابو حنیفہ کے قول کو رد کرے اس پر ہمارے رب کی ریت کے ذروں کے برابر لعنتیں ہوں۔

ان کی دیکھا دیکھی دوسرے مسلمانوں نے بھی اپنی پسند کے اماموں کی طرف نسبت کرنا شروع کر دی اور حنفی مالکی شافعی اور حنبلی کے ناموں سے موسوم ہونے لگے۔ تاہم سب ایک دوسرے کو برحق مسلمان اور اہل سنت والجماعۃ ہی سمجھتے تھے۔ اب ان سب فرقوں میں عصبیت پیدا ہوئی اور اپنے اپنے اماموں کی تقلید شروع ہوگئی۔ تقلید کی تعریف انہی مقلد کی زبانی ملاحظہ فرمایئے:

''والتقلید قبول قول غیر بلا دلیل فکانه جعَلَ قلادۃ فی عنقه'' (شرح قصیدہ امالی از ملا علی قاری)	تقلید کسی کے قول کو بلا دلیل قبول کر لینے کا نام ہے۔ گویا کہ مقلد نے اپنی گردن میں اس کی اطاعت کا پٹہ ڈال دیا۔

ظاہر ہے کہ یہاں دلیل سے مراد قرآن سنت اور اجماع صحابہ ہی ہو سکتے ہیں۔

اس تعریف سے واضح ہے کہ ایسے مقلدین ذہنی طور پر اپنے امام کو امام نہیں بلکہ پیغمبر سمجھتے ہیں۔ کیونکہ پیغمبر ہی ایک ایسی ہستی ہے جس کی ہر بات بلا دلیل قبول کی جانی چاہیے۔ پیغمبر کے علاوہ کوئی ہستی مبرا عن الخطاء نہیں ہوتی۔

پھر ایک ایسا بھی دور آیا اور تقلید کی عصبیت یہاں تک آگے بڑھی کہ ہر مسلمان کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی امام کا مقلد ہو۔ پانچویں صدی ہجری تک یہ عقیدہ اتنا راسخ ہو گیا تھا کہ جو شخص کسی مخصوص امام کا مقلد نہ ہوتا اسے بطور گالی یہ کہا جاتا تھا کہ یہ چاروں مذاہب سے باہر ہے۔ گویا کہ اس کا اسلام ہی مشکوک قرار پاتا تھا۔

یہ تو ہم بتلا چکے ہیں کہ دوسرے اماموں کے مقابلہ میں امام ابوحنیفہ قیاس سے زیادہ کام لیتے۔ امام صاحب جیسے متقی اور دیانتدار شخص کے متعلق یہ بات سوچنی بھی بہت بڑی زیادتی ہوگی آپ خود فرمایا کرتے تھے:

''اذا صح الحدیث فھو مذھبی''	جب صحیح حدیث مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نیز فرمایا:

''اترکوا قولی بخبر رسول اللہ ﷺ'' اگر حضور اکرم ﷺ کی حدیث مل جائے تو میرے قول کو چھوڑ دو۔

آپ نے بعض احادیث کو قبول کرنے میں بے اعتنائی برتی تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ بعینہ یہی وہ دور تھا جب کہ بہت سے جھوٹے راویوں نے بے شمار احادیث گھڑ کر پھیلا دی تھیں اور ایسی وضعی احادیث کی تعداد صحیح احادیث سے بہت زیادہ تھی جو اس بات کی قطعی دلیل تھی کہ امت مسلمہ حدیث کو شرعی حجت قرار دیتی اور قرآن کے بعد اسے دوسرے درجہ پر سمجھتی تھی۔

فقہی دور کے بعد تیسری صدی کے آغاز میں محدثین کا ایک گروہ آگے بڑھا۔ جس کے سرخیل امام بخاری اور ان کے بعد ان کے شاگرد رشید امام مسلم تھے۔ ان بزرگوں نے امام مالک اور امام حنبل کے کام کو آگے بڑھایا اور اپنی پوری زندگیاں احادیث کی تحقیق و تدقیق اور چھان پھٹک میں صرف کر کے احادیث کے ایسے مجموعے تیار کیے جن پر امت مسلمہ رہتی دنیا تک فخر کرتی رہے گی۔ ان بزرگوں نے احادیث کے صرف متون ہی پیش نہیں کیے بلکہ سلسلہ اسناد کا بھی پورا ذکر کیا، تحقیق و تدقیق کے عمل سے آئندہ کے لیے وضعی روایات کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ یہ سب بزرگ جنھوں نے حدیث کی خدمت کو اپنا شعار بنایا اصحاب حدیث یا اہل الحدیث کہلائے۔

اسی دور میں جبکہ اکثر مسلمان اپنے آپ کو کسی نہ کسی امام کی طرف منسوب کر رہے تھے۔ ایک جماعت ایسی بھی تھی جو نہ تو تقلید لازمی جزو سمجھتی تھی اور نہ اپنے آپ کو کسی امام کی طرف نسبت دینا پسند کرتی تھی۔ یہ لوگ براہِ راست کتاب و سنت اور اجماع صحابہ سے استفادہ کرتے تھے اور جس امام کا اجتہاد قرآن و حدیث یا اجماع کے قریب ہوتا اسے قبول کر لیتے تھے۔ یہ جماعت اہل حدیث کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہ دراصل وہی اہل سنت والجماعۃ تھی جو ابتدائے اسلام سے چلی آ رہی تھی۔ چونکہ اس نے عقائد و نظریات میں تقلید کے اضافہ کو گوارا نہیں کیا اس لیے امتیاز کی بناء پر اہل حدیث کے نئے نام سے مشہور ہوئی۔

مقلد اور غیر مقلد:

اب مقلدین حضرات نے تقلیدی امتیاز کو برقرار رکھنے کی خاطر اس جماعت اہل حدیث کا نیا نام غیر مقلد تجویز کیا جو ان کے خیال کے مطابق ایک طرح کی گالی اور اسلام کے متضاد سمجھا جاتا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرسید احمد خان اپنے رسالہ اشاعۃ السنہ (ج ۹ شمارہ ۵ صفحہ ۱۲۸) اہل حدیث کے متعلق اپنی تحقیق ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

دوسری صدی ہجری میں جبکہ اسلام کی نسبت علماء کے خیالات قلم بند ہوئے اور اس کے چار فرقے قائم کیے گئے یعنی حنفی شافعی مالکی اور حنبلی۔ کچھ مسلمانوں کے نام اس مضمون کا مراسلہ جاری کیا کہ وہ ان چار فرقوں میں سے کسی ایک فرقہ کے تمام مسئلوں کو قبول کر لیں۔ چنانچہ اس کے بعد جو لوگ اس کے خلاف کرتے تھے ان کو سزا دی جاتی تھی۔ اس جبری حکم کے بعد آزادانہ رائے کا اظہار مسدود ہو گیا اور مذہبی دست اندازی کا بڑا زور شور ہوا۔ مگر اس وقت بھی بہت سے ایسے آدمی تھے جو اصلی مذہب کے پابند تھے اور ایسے لوگ اس زمانہ میں اہل حدیث کہلاتے تھے جو جناب رسول اللہ ﷺ کے قول کے معتقد تھے اور مندرجہ بالا چاروں فرقوں کے مسئلوں کے پابند نہ تھے۔

پانچویں صدی ہجری میں تقلید کی گرفت کس حد تک مضبوط ہو چکی تھی۔ اس کا نقشہ پروفیسر سلیمان اظہر (بحوالہ تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ) سیرت محمد بن عبدالوہاب کے مقدمہ میں یوں کھینچتے ہیں۔ عربی سے چند لوگ آشنا تھے اور انہوں نے جاہل عوام کو بھیڑوں کا گلہ بنائے رکھنے کے لیے عربی میں موجود اسلامی لٹریچر کے ذریعے اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ ملکی زبان میں نہ کتاب وسنت کے تراجم تھے نہ شروحات۔ لوگ کبھی کبھی قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے لیکن اس میں کیا لکھا ہے؟ اس سے وہ سراسر نا آشنا تھے۔ تقلید و جمود کی بندش اس قدر مضبوط ہو چکی تھی کہ ایک مناظرہ میں خواجہ نظام الدین اولیاء نے جب اپنی تائید میں ایک روایت بطور استدلال پیش کی تو ہندوستان کے سب سے بڑے فقیہ خواجہ رکن الدین صاحب نے کہا میں بھی مقلد ہوں اور آپ بھی مقلد ہیں اس لیے حدیث کی کیا ضرورت ہے؟ امام ابوحنیفہ کا قول پیش فرمائیے۔

ظاہر ہے کہ ایسا عقیدہ اہل حدیث حضرات کو کسی قیمت پر گوارا نہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ صحابہ اور تابعین آخر کس امام کے مقلد تھے؟ کیا نعوذ باللہ ان کا دین نامکمل تھا؟

بریلوی اور وہابی:

ہندوستان میں زیادہ تر حنفی مسلمان ہی آ کر آباد ہوئے یا تھوڑی تعداد میں اہل حدیث مالکی شافعی یا حنبلی مسلمان نہایت قلیل تعداد میں ملتے ہیں۔ چودھویں صدی ہجری کے آغاز میں یہاں حنفی مذہب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مزید تفرقہ سے دوچار ہوا۔ سید احمد رضا خان بریلوی (م ۱۳۴۰ھ) نے عشق رسول ﷺ کے پردے میں چند نئے عقائد کا اضافہ کیا جو درج ذیل ہیں:

۱۔ جس طرح اللہ تعالیٰ حاضر ناظر ہے اسی طرح حضور اکرم ﷺ بھی حاضر ناظر ہیں۔

۲۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کو مکمل طور پر غیب کا علم ہے اسی طرح حضور کو بھی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ذاتی ہے اور آپ ﷺ کا عطائی۔

۳۔ حضور اکرم ﷺ بشر نہیں تھے بلکہ نور تھے۔

۴۔ نیز یہ اہل قبور پکارنے والے کی پکار سنتے اور اس کی حاجت روائی کی استطاعت رکھتے ہیں۔ چونکہ امام ابوحنیفہ ایسے مشرکانہ عقائد کے سخت خلاف دشمن تھے۔ لہٰذا سید صاحب مذکور نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ وہ صرف فقہی مسائل کی حد تک امام ابوحنیفہ کے مقلد ہیں جو عقائد میں ان کے پیچھے لگ گئے وہ بریلوی کہلائے۔ طرفہ تماشا یہ کہ یہی بریلوی حضرات اپنے آپ کو تو اہل سنت والجماعت سمجھتے ہیں اور اپنے سید صاحب کو امام اہل سنت کہتے ہیں۔ دیو بندی حضرات اور اہل حدیث حضرات کو جو ان نئے عقائد کو تسلیم نہیں کرتے وہابی کہہ دیتے ہیں جو ایک طرح گالی ہے۔ وہابی کا لفظ ہندوستان میں پہلے انگریز نے اسماعیل شہید کی تحریک جہاد میں شامل ہونے والوں کے لیے استعمال کیا۔ بعد میں بریلویوں نے اس لفظ کو اپنے مخالفین کے لیے استعمال کیا۔ اسی دور میں ہندوستان میں ایک فرقہ کی نمود ہوئی۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا جبکہ وہ خود اپنے آپ کو فرقہ احمدیہ کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ فرقہ غیر مسلم اقلیت قرار دیا جا چکا ہے۔ لہٰذا اس کی مزید تفصیل کی ضرورت نہیں۔

فرقوں کے نام اور وجہ تسمیہ:

جب کسی جماعت سے ایک فرقہ الگ ہو جاتا ہے تو اپنے مخصوص عقائد کی بناء پر یا تو وہ خود اپنا نام تجویز کر لیتا ہے یا پھر جماعت اس کا نام الگ تجویز کر دیتی ہے تاکہ امتیاز قائم ہو جائے۔ بعینہ اس امتیاز کو قائم رکھنے کے لیے بقایا جماعت کو بھی اپنا نام بدلنا پڑتا ہے یا نیا فرقہ اس کا کوئی الگ نام تجویز کر دیتا ہے۔ بس نام تبدیل کرنے کی یہی چار صورتیں ممکن ہیں۔ ان کی مثالیں دیکھیے!

۱۔ ابتداءً امت مسلمہ کا ہر فرد مسلمان کہلاتا تھا۔ اس جماعت سے ایک فرقہ مخصوص عقائد و نظریات کی بناء پر الگ ہوا۔ وہ خود تو اپنے آپ کو شیعان علی کہتا تھا لیکن جماعت نے اس کو صرف شیعہ کا نام دیا۔ اب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باقی جماعت کے عقائد و نظریات میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ تاہم امتیاز کی خاطر اس نے اپنا نام مسلمان کی بجائے اہل سنت والجماعۃ رکھا لیا۔ جبکہ شیعہ حضرات انہیں سنی کہتے ہیں۔

اسی طرح غلام احمد قادیانی کا فرقہ الگ ہوا تو جماعت نے اس فرقہ کو مرزائی کا نام دیا۔ جبکہ وہ خود اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں اور باقی مسلمانوں کو غیر احمدی۔

سید احمد رضا خان کے پیروکار اپنے آپ کو اہل سنت والجماعۃ ہی کہتے ہیں لیکن دوسرے (لفظ وہابی کا اطلاق دیوبندیوں حنفیوں پر بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا امتیاز کی خاطر انہیں گلابی وہابی کہہ دیتے ہیں) مسلمان انہیں بریلوی کہتے ہیں۔ اور یہ حضرات دوسرے کو یعنی دیوبند حنفی اور اہل حدیث دونوں کو جن میں قدر مشترک مسئلہ توحید ہے۔ وہابی کہہ دیتے ہیں۔

۲۔ جو فرقے تعداد میں قلیل ہوتے ہیں انہی کا نام بدلتا ہے جماعت کا نام نہیں بدلتا۔ یہ نیا فرقہ بعض دفعہ اپنا نام خود تجویز کرتا ہے اور بعض دفعہ جماعت اس کا نام رکھ دیتی ہے۔ عقل پرست فرقے بھی اسی قسم میں شامل ہیں۔ تاہم خود اپنا علیحدہ نام پسند نہیں کرتے۔ مثلاً مولوی عبداللہ کے پیروکار الگ ہوئے تو انہوں نے اپنا نام اہل قرآن رکھا جبکہ عام مسلمان انہیں چکڑالوی کہتے ہیں۔

معتزلین اپنے مخصوص عقائد کی بنا پر الگ ہوئے تو انہوں نے اپنا نام خود کچھ نہیں رکھا بلکہ جماعت نے انہیں معتزلین کا نام دیا۔ یہی صورت ادارہ طلوع اسلام کے پیروکاروں کی ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو الگ فرقہ بھی تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ تاہم چونکہ وہ بھی اپنے مخصوص عقائد و نظریات رکھتے ہیں۔ لہٰذا عام مسلمان انہیں پرویزی کہتے ہیں۔

۳۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ بعض دفعہ مخصوص عقائد و نظریات نہ رکھنے کے باوجود بھی محض امتیاز کی خاطر جماعت اپنا نام بدل لیتی ہے۔ گو یہ بات بھی مستحسن نہیں تاہم ایک ضرورت ہے۔ شیعہ الگ ہوئے تو باقی جماعت طریق سابق پر بدستور قائم رہنے کے باوجود اہل سنت والجماعۃ کہلائی۔ معتزلین الگ ہوئے تو ان کے مقابلے میں جو لوگ آئے علمائے ظاہر کہلائے۔ اہل الرائے کا چرچا ہوا تو یہی جماعت اہل حدیث کہلائی۔ فقہی مذاہب اور تقلید کا چرچا ہوا تو وہی جماعت اہل حدیث یا غیر مقلد کہلائی۔ اور ہندوستان میں بریلویت کا زور ہوا تو یہی جماعت وہابی کہلائی۔ حالانکہ ان کے عقائد نظریات میں بحمد اللہ آج تک کوئی کمی بیشی واقع نہیں ہوئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مختلف فرقوں میں سنت کا مقام:

ادارہ طلوع اسلام کے پیروکاروں یا اہل قرآن کے سوا امت مسلمہ کے تمام فرقے سنت کو اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ تسلیم کرتے ہیں۔ سابقہ ادوار میں گو بعض فرقے بعض احادیث کا انکار بھی کرتے رہے تاویلات بھی کرتے رہے اور ساقط الاعتبار قرار دینے کی کوششیں بھی کرتے رہے۔ تاہم کسی کو سنت کو اس کے جائز مقام سے گرانے کی جرات نہیں ہوئی۔ وجہ یہ ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کا اسوہ حسنہ جس کا بڑا ماخذ یہی مجموعہ احادیث ہے.........ہی آنکھوں سے اوجھل کر دیا جائے تو قرآن بچوں کا کھیل بن جاتا ہے۔ مثلاً یہی معلوم نہ ہو سکے گا کہ ارکان اسلام نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج کی ادائیگی کیونکر کی جائے تو امت میں کسی طرح کی بھی وحدت کا قائم رہنا ممکن نہیں ہے اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری بھی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ صرف قرآنی الفاظ کی ذمہ داری تو کچھ معنی نہیں رکھتی۔ جب تک اس کا مفہوم بھی متعین نہ ہو۔ انہی وجوہ کی بناء پر سنت کو اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ تسلیم کیا جاتا ہے۔ البتہ سنت کی تعبیر میں مختلف فرقوں میں کچھ فرق ہے:

شیعہ حضرات تو صرف ان روایات کو تسلیم کرتے ہیں جو ان کے کسی امام سے مروی ہوں۔ باقی تمام فرقوں کے مجموعہ ہائے حدیث متفق علیہ ہیں۔ اہل حدیث حضرات تو ان میں کسی قسم کی تاویل گوارا نہیں کرتے۔ فقہی مذاہب میں سے امام ابوحنیفہ نے سب سے زیادہ قیاس سے کام لیا ہے۔ چنانچہ ایک سو سے کچھ زائد مسائل میں آپ کے اقوال اور احادیث میں تضاد پایا جاتا ہے۔ گو امام صاحب موصوف نے یہ فرمادیا تھا کہ اگر حدیث مل جائے تو میرے قول کو چھوڑ دیا جائے مگر ان کو چھوڑنے کی بجائے ایسی احادیث کی یا تو تاویل کر لی یا انہیں اسناد کی جرح و تعدیل کی سان پر چڑھا کر اسے ضعیف قرار دے دیا اور بریلوی حضرات کو تو اپنے مخصوص عقائد و نظریات کی بنا پر ایسی تاویل و تعبیر کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود ہم بلا خوف تردید یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ سنت کو جائز مقام پر رکھنے کی وجہ سے تقریباً ۹۰ فیصد مسائل میں امت میں یگانگت پائی جاتی ہے اور یہ یگانگت بالخصوص اصولی مسائل میں ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقالہ:۸

مساواتِ مردوزن

دورِ حاضر کے اہم مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ''مرد اور عورت، مرتبہ و مقام کے لحاظ سے ہر میدان میں برابر ہیں اور اگر نہیں تو انہیں برابر ہونا چاہیے۔'' پھر اسی پر بس نہیں بلکہ آج کا مہذب مرد، عورت کو ''نصف بہتر'' کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ آج کل حسن کے مقابلے تو صرف عورتوں ہی کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا مرد اس میدان میں عورت کی برابری کیونکر کر سکتے ہیں؟

پھر یہ بات کچھ آج کے دور سے مخصوص بھی نہیں۔ جب بھی کوئی بے خدا تہذیب اپنے جوبن پر آئی تو وہ عورت کو گھر سے نکال کر بازار لے آئی اور اس کی عصمت ایک فردِ ختنی چیز بن کر رہ گئی۔ اس سے جہاں ایک طرف فحاشی کو فروغ حاصل ہوا تو دوسری طرف عائلی نظام کے انجر پنجر تک ہل گئے اور بہت سے جدید معاشرتی مسائل پیدا ہو گئے۔

موضوع کا تعیّن:

آج کی عورت معاشی، معاشرتی اور سیاسی میدانوں میں اپنی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے مردوں کے برابر حقوق کا مطالبہ کر رہی ہے۔ وہ کیا کچھ مانگتی ہے اور اس کا یہ مطالبہ درست ہے یا غلط؟ ہم سردست اس طویل بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ ہم اس وقت صرف دو باتوں کا جائزہ لیں گے:

(۱) آیا قرآن نے مرد و عورت کو ہر مقام پر برابر رکھا ہے یا کسی میدان میں مرد کی فوقیت یا بالادستی بھی تسلیم کی ہے۔

(۲) طلوعِ اسلام پکار پکار کر یہ کہتا ہے کہ ''اس کا مخاطب جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے، جو اسلام سے متنفر ہوتا جا رہا ہے۔ پرویز صاحب کی زندگی بھر یہ کوشش رہی کہ وہ اس جدید، تعلیم یافتہ اور اسلام بیزار طبقہ کو قریب تر لانے کی کوشش کریں۔ آپ نے اس کا طریق یہ اپنایا کہ قرآنی آیات کی تاویل اسی ''مہذب طبقہ'' کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خواہش کے مطابق فرمایا کرتے اور اس فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ جن قرآنی آیات سے مرد کی فوقیت کا کوئی پہلو نکلتا ہے، اس کی آپ نے کیا تاویلات پیش فرمائی ہیں اور وہ کس حد تک درست ہیں؟

اسلام کے عطا کردہ حقوق:

پیشتر اس کے کہ ہم اصل موضوع کی طرف آئیں، ضروری معلوم ہوتا ہے، اس بات کا بھی جائزہ لے لیا جائے کہ اسلام سے پہلے دور جاہلیت میں عورت کی حیثیت کیا تھی اور اسلام نے عورت کو کیا کیا حقوق عطا کیے؟ اور وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ دور جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا اور اس کی وجوہ دو تھیں:

(الف) بچی پر خرچ کرنے میں بخل

(ب) سسر بننے کی عار سے بچاؤ......

۲۔ عورت متروکہ میراث سمجھی جاتی تھی، جو دوسری جائیداد کی طرح ورثہ میں تقسیم ہوتی تھی۔ اور اس کے بیٹے ہی اسے اپنے نکاح میں لے آتے تھے۔ اسلام نے ان دونوں باتوں کی مخالفت کی اور باپ کی منکوحہ سے نکاح کو حرام قرار دیا۔

۳۔ عورت پہلے محروم الارث تھی۔ اسلام نے اس کو وراثت میں باقاعدہ حصہ دار بنایا۔

۴۔ دور جاہلیت میں ایک مرد دس دس تک بیویاں رکھ سکتا تھا۔ اسلام نے اس تعداد کو چار تک محدود کر دیا۔

۵۔ عورت نکاح کے معاملہ میں بالکل بے بس تھی۔ اسلام نے اسے شوہر کے انتخاب کا حق دیا۔

۶۔ مرد جب چاہتا عورت کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیتا۔ اسلام نے طلاق پر کڑی پابندیاں عائد کر دیں اور ساتھ ہی شوہر پر دوران عدت کے قیام وطعام کی ذمہ داری ڈال دی۔

۷۔ اسلام نے حق مہر کو فرض قرار دیا جبکہ اس سے پیشتر اسے ضروری نہ سمجھا جاتا تھا۔

۸۔ اسلام نے عورت کو حق ملکیت دیا جبکہ پہلے وہ خود مملوکہ اور متروکہ مال تصور ہوتی تھی۔ اب عورت خاوند سے علیحدہ اپنا مال یا جائیداد رکھ سکتی اور حسب خواہش وضرورت اسے خرچ کر سکتی ہے۔

۹۔ ایلاء، ظہار اور طلاق کے ذریعہ عورتوں کو خاصا پریشان اور تنگ کیا جاتا تھا وہ لوگ نہ عورت کو بساتے نہ آزاد کرتے تھے۔ اسلام نے ان حرکتوں کا شدید نوٹس لیا اور کڑی پابندیاں عائد کر دیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۰۔ اسلام میں عورت کو نکاح ثانی کی اجازت ہی نہیں دی گئی، بلکہ اسے ایک مستحسن فعل قرار دیا گیا اور بے شوہر کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا۔

۱۱۔ اسلام میں عورت کو معاشی لحاظ سے بالکل آزاد کر دیا اور اخراجات کی تمام تر ذمہ داری مردوں کے ذمہ ڈال دی اگر عورت مالدار ہے اور اس کا شوہر غریب، تو بھی اخراجات کی ذمہ داری مرد ہی کے سر پر ہوگی۔ ہاں اگر عورت اپنی مرضی سے چاہے تو خاوند اور اولاد پر خرچ کر سکتی ہے اور یہ از راہ احسان ہوگا۔

۱۲۔ اس دور میں لونڈی غلاموں کا رواج عام تھا۔ مالک غلاموں سے تو مزدوری کروالیا کرتے تھے، جبکہ لونڈیوں کو فحاشی کے ذریعہ کمالانے پر مجبور کرتے تھے۔ اسلام نے اس بدرسم کو حکماً بند کر دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

مرد کی فوقیت کے گوشے

ان تمام تر اصلاحات وحقوق کے باوجود زندگی کے چند گوشے ایسے بھی تھے، جن میں قرآن نے مرد کی بالادستی کو تسلیم کیا ہے۔ ان میں سب سے اہم گوشہ عائلی نظام کی سربراہی ہے۔ گھر کے انتظامی امور میں مرد کو اس کی بیوی اور اس کی اولاد سب پر فوقیت حاصل ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی وحدت بھی اس وقت تک تعمیری نتائج پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا سربراہ ایک نہ ہو۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی گوشے ہیں جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ایسے مقامات پر ''طلوع اسلام'' کیا توجیہات پیش کرتا ہے۔

مرد کی فوقیت اور ''طلوع اسلام''

مرد اور عورت کا درجہ برابر ثابت کرنے میں ''طلوع اسلام'' نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ پرویز صاحب نے معاشرہ کے ایک فرضی کردار ''طاہرہ'' کو اپنی بیٹی منتخب فرمایا ہے اور خود اس کے والد بنتے ہیں۔ طاہرہ کی طرف سے سوالات بھی ان کے اپنے ذہن کی پیداوار ہیں اور جوابات تو بہر حال ہیں ہی۔ آپ نے ''طاہرہ کے نام خطوط'' نامی کتاب لکھ کر ماڈرن عورتوں کو یقین دلایا ہے کہ قرآن کی رُو سے تمہارا مرتبہ مردوں سے کسی صورت کم نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں پرویز صاحب نے جن نکات پر روشنی ڈالی ہے، وہ یہ ہیں:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ا۔عورت کی پیدائش:

عورت کی پیدائش کے متعلق قرآن کریم میں مذکور ہے:

﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً﴾ (سورۃ النساء:۱)

''اے لوگو! اس رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، پھر اس سے اس کی بیوی بنائی پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔''

اس آیت میں نفس واحدة سے مراد آدم علیہ السلام ہیں اور نفس واحدة کے زوج سے ان کی بیوی حوا ہیں۔ پھر ان دونوں کے ملاپ سے بنی نوع انسان پیدا ہوئی۔ لیکن پرویز صاحب ''نفس واحدة'' سے مراد وہ پہلا جرثومہ حیات لیتے ہیں جو سمندر کے کنارے کی کائی میں آج سے اربوں سال پہلے پیدا ہوا تھا اور ''خلق منها زوجها'' سے مراد اس جرثومہ کا دو ٹکڑوں میں بٹ جانا ہے۔ پھر ان دونوں ٹکڑوں کے امتزاج سے اللہ نے بہت سی خلقت پھیلا دی۔

اس تاویل سے آپ نے تو یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ پیدائش کے لحاظ سے مرد و عورت دونوں کی حیثیت یکساں ہے۔ مگر ہمیں افسوس ہے کہ یہ توجیہ و تاویل حقائق کے خلاف ہے، کیونکہ:

۱۔ آج بھی جراثیم کی پیدائش کا سلسلہ اسی طرح چل رہا ہے کہ ایک جرثومہ کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں، پھر ان دونوں میں سے ہر ایک کے اور یہ سلسلہ بدستور آگے چلتا ہے۔ ان میں امتزاج ہوتا ہی نہیں۔

۲۔ قرآن نے لفظ ''زوج'' استعمال فرمایا ہے، یعنی آگے نسل انسانی توالد و تناسل کے واسطہ سے بڑھی ہے۔ لہٰذا ان دو ٹکڑوں میں سے کسی پر بھی ایک دوسرے کے ''زوج'' کا لفظ استعمال نہیں ہو سکتا۔

ان وجوہ کی بناء پر پرویز صاحب کی بحیثیت پیدائش مرد و عورت کی یکساں حیثیت ثابت کرنے کی دلیل درست نہیں۔

۲۔مرد کی حاکمیت:

قرآن مجید میں ہے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ وَ الّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَ اهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَ اضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ﴾

(سورة النساء:۳۴)

''مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس لیے بھی کہ وہ اپنے اموال سے (بیوی بچوں پر) خرچ کرتے ہیں۔ پس نیک عورتیں وہ ہیں جو فرمانبردار ہیں اور مرد کی غیر موجودگی میں اللہ کی حفاظت میں مال و آبرو کی حفاظت کرتی ہیں اور جن عورتوں سے تمہیں نافرمانی کا ڈر ہے تو انہیں سمجھاؤ، انہیں خوابگاہوں میں علیحدہ رکھو اور انہیں زدوکوب کرو، پھر اگر وہ فرمانبردار بن جائیں تو ان کو ایذا دینے کا کوئی بہانہ نہ ڈھونڈو۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مردوں کی قوامیت کے درج ذیل پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے:

۱۔ مرد کے عورت پر قوام یا حاکم ہونے کی دو وجوہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ مردوں کو عورتوں پر (بلحاظ جسم وقوت) فضیلت حاصل ہے اور دوسرے اس لیے کہ بیوی بچوں پر اخراجات کی ذمہ داری مردوں کے ذمہ ڈالی گئی ہے۔

۲۔ نیک عورتوں کی بھی دو صفات بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مردوں کی فرمانبردار ہوتی ہیں۔ دوسرے مرد کی غیر موجودگی میں اپنی عصمت کی حفاظت کرتی ہیں۔

۳۔ اور نافرمان عورتوں کے لیے بتدریج تین اقدامات بتلائے گئے ہیں۔ یعنی پہلے انہیں زبانی سمجھایا جائے۔ اگر باز نہ آئیں تو پھر ان سے مرد علیحدہ رہیں۔ اگر پھر بھی باز نہ آئیں تو ان کو مار کر درست کریں۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو سب باتیں چھوڑ دیں اور انہیں ایذا نہ دیں۔

اس پوری آیت میں مردوں کی عورتوں پر بالادستی کا ذکر ہے اور اس آیت کا ہر ایک حصہ دوسرے کی بھرپور تائید کر رہا ہے۔ اب یہ باتیں اس مفہوم میں بھلا پرویز صاحب کو کیسے گوارا ہو سکتی تھی؟ لہٰذا اس آیت کی تشریح سے پیشتر آپ نے درج ذیل نکات پیش کر کے دل کا غبار ہلکا کیا ہے۔

۱۔ مروجہ تراجم سب غلط ہیں۔ کیونکہ یہ عربی تفسیروں کا سا ہی مفہوم بیان کرتے ہیں۔

۲۔ عربی کی تفسیریں بھی غلط ہیں۔ کیونکہ وہ روایات کی تائید میں لکھی گئی ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۔ اور روایات بھی سب غلط ہیں اگر یہ صحیح ہوتیں تو رسول اللہ ﷺ کو چاہیے تھا کہ ایک مستند نسخہ امت کے حوالے کر جاتے جیسا کہ قرآن حوالے کر گئے تھے۔

لہٰذا اس آیت کا جو مفہوم یا تراجم، یہ تفسیریں (خواہ کسی زبان کی ہوں) اور یہ روایات، جو پیش کرتی ہیں سب کچھ یکسر غلط ہے۔

اس تردید کے بعد آپ نے جو صحیح مفہوم پیش فرمایا، اس کے نکات درج ذیل ہیں:

۱۔ اس آیت میں بات میاں بیوی کی نہیں، بلکہ معاشرہ کے عام مردوں اور عام عورتوں کی ہو رہی ہے۔

۲۔ ''قام الرجل علی النسآء'' کے معنی ''مرد نے عورت کو روزی مہیا کی'' اور یہ مرد کی ذمہ داری ہے۔ اس میں فضیلت کی کوئی بات نہیں۔

۳۔ ''فضل اللہ بہ بعضکم علی بعض'' کے معنی ایک کی دوسرے پر فضیلت ہے، مرد کی عورت پر، عورت کی مرد پر۔ مرد اپنے دائرہ کار کے لحاظ سے افضل اور عورت اپنے دائرہ کار کے لحاظ سے افضل ہے۔

گویا آپ نے آیت مندرجہ بالا کے پہلو نمبر 1 سے مرد کی فضیلت یا حاکمیت کو یوں خارج کر کے طاہرہ بیٹی کو خوش کر دیا۔ اب سوال یہ ہے کہ:

۱۔ اگر سب تراجم، تفسیریں اور روایات غلط ہیں، تو آپ کی اس تشریح کی صحت کی کیا دلیل ہے؟

۲۔ لغوی لحاظ سے بھی ''قوام'' کا معنی ''رزق مہیا کرنے والا'' نہیں۔ بلکہ ''قائم رہنے یا رکھنے والا'' ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ﴾ ''ہمیشہ انصاف پر قائم رہو۔''

(سورۃ النساء:۱۳۵)

امام راغب ''قَوّٰمونَ عَلَى النِّسآءِ'' کا معنی راعی اور محافظ بیان کرتے ہیں اور صاحب منجد اس کا معنی ''خوبصورت قد والا، معاملہ کا ذمہ دار، کفیل، معاملہ کی ذمہ داری پوری کرنے پر قادر، امیر'' بتاتے ہیں۔ پرویز صاحب خود بھی ''قام الرجال علی المرأۃ'' کے معنی لغات القرآن میں ''مرد نے عورت کی کفالت کی، اس کی ضروریات کو پورا کیا اور ان کا ذمہ دار ہوا'' لکھتے ہیں۔ گویا اس لفظ میں رزق مہیا کرنے سے زیادہ ذمہ داری اور نگہداشت کا پہلو نکلتا ہے اور یہی بات ہم کہتے ہیں۔

۳۔ کون کس پر افضل ہے؟ اس بات کا جواب خود اسی آیت میں اہے۔ ''قَوّٰمونَ عَلَى النِّسآءِ''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ساتھ ہی "بما" آیا ہے۔ جو ایک تو اس کی وجہ بیان کر رہا ہے اور دوسرے یہ وضاحت کر رہا ہے کہ یہ فضیلت مردوں کو حاصل ہے اور عورتوں پر حاصل ہے۔

۴۔ فضیلت کی دوسری وجہ اللہ تعالیٰ نے یہ بتلائی ہے کہ مرد عورت کے ذریعہ معاش کا وسیلہ ہے اور پرویز صاحب نے اس کتاب کے صفحہ 39 پر بیان فرمایا ہے کہ "یہ معیار تمہارا اپنا پیدا کردہ ہے، اللہ نے ایسا نہیں کہا۔"

پھر فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں:

"اگر یہ اصول صحیح مان لیا جائے کہ کمانے والوں کو کھانے والوں پر فضیلت ہوتی ہے تو بڑے بڑے مدبرین، مفکرین اور ایجادات کرنے والوں پر کاشتکاروں کو ہمیشہ فضیلت ہونی چاہیے اور میدان جنگ میں لڑنے والوں کا درجہ مزدوروں سے بہت نیچا ہونا چاہیے کیونکہ مفکر، مدبر اور سپاہی اناج پیدا نہیں کرتے۔"

غور فرمایا آپ نے کہ عقل کجرو انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے؟ کاشتکار زرِ نقد وصول کر کے اپنا غلہ بیچ دیتا ہے۔ جب اس نے پورا عوض لے لیا تو اب فضیلت کی کیا بات باقی رہ گئی؟ یہی حال مزدور کا ہے۔ لیکن خاوند اخراجات کے عوض بیوی سے کیا لیتا ہے؟ جیسی ضرورت مرد کو عورت کی ہے ویسی ہی عورت کو مرد کی بھی ہے۔ جنسی اشتہاء مرد و عورت دونوں میں ایک جیسی ہوتی ہے۔ اب مرد کا عورت پر خرچ کرنا فضیلت نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اس فضیلت کی اصل وجہ یہ ہے کہ عورت اگرچہ مالدار ہو اور خاوند غریب ہو، تب بھی اخراجات کی ذمہ داری مرد ہی کے ذمہ رہے گی۔ الا یہ کہ عورت اپنی خوشی اور رضامندی سے کچھ خرچ کرے اور یہ اس کا احسان ہوگا۔

۳۔ عورت کی فرمانبرداری:

اب اس آیت کے دوسرے حصہ کی طرف آیئے جو یہ ہے:

﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ (سورۃ النساء:۳۴)

"پس جو نیک بیبیاں ہیں تو وہ مردوں کی فرمانبردار ہیں اور مردوں کی غیر موجودگی میں اللہ کی حفاظت میں اپنے مال و آبرو کی خبرداری کرتی ہیں۔"

اب پرویزی نکتہ آفرینیاں ملاحظہ فرمایئے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۔ ''مردوں کے مالوں سے عورتوں کی ضروریات زندگی پوری ہوں گی، اور ان کی صلاحیتیں نشو ونما پائیں گی۔ (فالصّٰلحٰت)

۲۔ ''وہ اپنی صلاحیتوں کو اس مصرف میں لائیں جس کے لیے وہ خاص صلاحیتیں پیدا کی گئی ہیں یہ معنی ہیں۔ ''قٰنتٰت'' کے۔''

۳۔ ''حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ'' یعنی جب اللہ کے قانون نے اس طرح عورتوں کی حفاظت (پرورش) کا سامان بہم پہنچا دیا کہ وہ اس چیز کی حفاظت کر سکیں جو پوشیدہ طور پر ان کے سپرد کی گئی ہے (یعنی جنین کی حفاظت)۔

سو یہ ہے وہ ''صحیح مفہوم'' جو آپ کو نہ کسی ترجمہ میں مل سکتا ہے، نہ عربی یا غیر عربی تفسیر میں، اور نہ ہی کسی روایت میں مل سکتا ہے۔ اس حد تک تو پرویز صاحب کی یہ بات یقیناً درست ہے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آیا ان کی یہ تشریح بھی درست ہے یا نہیں؟ تو یہ یقیناً غلط ہے اور اس کی وجوہ درج ذیل ہیں:

۱۔ نکتہ نمبر ۱ میں ضروریات زندگی کے پورا ہونے سے جو صلاحیتوں کے نشو ونما پانے کو لازم وملزوم قرار دیا گیا ہے، یہ اصول غلط اور مشاہدہ کے خلاف ہے۔ ''صٰلحٰت'' عورتوں کی ایک مستقل اور علیحدہ صفت ہے۔ جس کا ضروریات زندگی کے پورا ہونے نہ ہونے سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ ایسی عورت بھی صالح ہوسکتی ہے جس کی ضروریات پوری نہ ہو رہی ہوں اور ایسی عورت، جس کی ضروریات زندگی پوری ہو رہی ہوں، وہ مفسدہ بھی ہوسکتی ہے۔

۲۔ ''قٰنتٰت'' پر بحث کرتے ہوئے پرویز صاحب نے خود لغات القرآن میں آخری نتیجہ یہ پیش کیا ہے کہ ابن الفارس نے ان کے بنیادی معنی ''اطاعت کرنا'' لکھے ہیں اور منجد میں اس کے معنی یہ درج ہیں ''اطاعت کرنا، کمال خاموشی کے ساتھ نماز میں کھڑا ہونا۔ خدا تعالیٰ کے آگے خشوع وخضوع کرنا۔'' لہٰذا پرویز صاحب کا یہ معنی کہ ''اپنی مضمر صلاحیتوں کو مصرف میں لانا'' ان کی ذاتی اختراع ہے۔ جو صرف مطلب برآری کے لیے کر لیا گیا ہے۔

۳۔ اللہ کا معنی ''اللہ کا قانون'' کرنا بھی آپ کے مخصوص تجریدی نظریہ ارسطو کی غمازی کر رہا ہے۔ جسے لغت سے کچھ تعلق نہیں۔

۴۔ جنین کے لیے قرآن نے ہر مقام پر حمل کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ پھر آخر اس مقام پر ''غیب'' کا لفظ لانے کی کیا مصلحت تھی؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ تفسیر فرمانے کے بعد پرویز صاحب نے ایک اور نکتہ پیدا کیا ہے کہ:

''یہ صفات (یعنی صالحات، قانتات اور حافظات) قرآن نے سورہ احزاب (۳۳:۳۵) میں مردوں اور عورتوں کے لیے مشترکہ طور پر بیان فرمائی ہیں۔ تو اگر قانتات کے معنی عورتوں کو مردوں کا فرمانبردار لیا جائے تو کیا پھر قانتین کے معنی یہ ہوں گے کہ مرد بھی عورتوں کی فرمانبرداری کریں؟''

اب دیکھیے اس مقام پر آپ نے متعلق آیت درج نہیں فرمائی، بلکہ کسی دوسرے مقام (یعنی صفحہ 41) پر درج فرمائی ہے۔ وجہ یہ کہ یہاں ''قانتین اور قانتات'' یعنی ''مردوں اور عورتوں کے مطیع و فرمانبردار ہونے'' کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے اور آیت کے الفاظ درج کرنے سے چونکہ اصلیت کھل سکتی تھی، لہٰذا صرف ترجمہ پر اکتفا فرمایا ہے۔ جبکہ زیر بحث آیت میں چونکہ پہلے مردوں کا ذکر چل رہا ہے، لہٰذا اس مقام پر ''قانتات'' کے ساتھ ''قانتین'' کے لفظ بھی موجود ہوتے تو پرویز صاحب کا مقصد پورا ہو سکتا تھا۔ مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔

۴۔ مردوں کا عورتوں کو سزا دینے کا اختیار:

اب مندرجہ بالا آیت کے تیسرے حصہ کی طرف آیئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَ اهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَ اضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا﴾	''اور جن عورتوں سے سرکشی کا تمہیں خطرہ ہو تو ان کو نصیحت کرو اور ان کو خوابگاہوں میں اکیلا چھوڑ دو اور ان کو زدوکوب کرو پھر اگر اطاعت کر لیں تو ان کو ایذا دینے کا کوئی بہانہ نہ ڈھونڈو''

(سورۃ النساء:۳۴)

اب اس حصہ آیت کی تفسیر میں پرویز صاحب نے جو نکات پیش فرمائے، وہ یہ ہیں:

۱۔ ''بات میاں بیوی کی نہیں ہو رہی بلکہ معاشرہ کے عام مردوں اور عورتوں کی ہو رہی ہے یعنی معاشرہ کے مرد معاشرہ کی عورتوں کو رزق مہیا کریں۔

۲۔ اس کے بعد بھی اگر عورتیں اپنے خصوصی فرائض سے بلا عذر سرکشی اختیار کریں، جیسا کہ آج کل بعض مغربی ممالک میں ہو رہا ہے کہ عورتوں نے مرد بننے کے چاؤ میں بلا عذر اپنے فرائض کو چھوڑ دیا۔ جس سے نسل انسانی کا سلسلہ ہی منقطع ہو جاتا ہے، تو معاشرہ ایسا انتظام کرے کہ ان کو سمجھائے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۔ اگر عورتیں سمجھانے پر باز نہ آئیں تو پھر انہیں ان کی خواب گاہوں میں چھوڑ دیا جائے، یہ ایک قسم کی نظر بندی کی سزا ہوگی۔

۴۔ اور اگر عورتیں اس پر بھی باز نہ آئیں تو پھر انہیں عدالت کی طرف سے بدنی سزا بھی دی جا سکتی ہے۔

دیکھا آپ نے کہ:

۱۔ آیت کے چند اکٹھے اور مربوط الفاظ میں ضمیریں کبھی تو معاشرہ کی طرف موڑی جا رہی ہیں اور کبھی عدالت کی طرف، یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''فعظوھن'' کی ضمیر آخر معاشرہ کی طرف کیوں ہے، عدالت کی طرف کیوں نہیں؟ اور ''واضربوھن'' کی ضمیر، معاشرہ کو چھوڑ کر عدالت کی طرف کیوں چلی گئی؟

۲۔ اگر معاشرہ کے عام مرد، معاشرہ کی عام عورتوں کو رزق مہیا کرنے لگیں تو اس سے زیادہ فحاشی کی صورت اور کیا ہو سکتی ہے جبکہ اس حصول رزق کا مقصد بھی، بقول پرویز صاحب، عورتوں کی مضمر صلاحیتوں کو نشو و نما دینا ہو؟

۳۔ ''فعظوھن'' کے تحت اب معاشرہ پر ایک اور ذمہ داری یہ بھی آن پڑی کہ وہ ایسی سرکش عورتوں کو سمجھایا کرے جو مرد بننے کے چاؤ میں اپنے فرائض منصبی چھوڑ دیتی ہیں۔ کیونکہ اس سے نسل انسانی منقطع ہو جاتی ہے۔ لیکن پرویز صاحب کی یہ بات بھی مشاہدہ کے خلاف ہے۔ یورپ کی عورتیں، مرد اس لحاظ سے بنتی ہیں کہ وہ مردوں میں آزادانہ اختلاط رکھتی اور ان کی ہی وضع اختیار کرتی ہیں۔ لیکن جہاں تک ان کے ''فرائض منصبی'' پورا کرنے کا تعلق ہے تو یہ کام وہ نکاح سے بھی زیادہ کرتی ہیں۔ چنانچہ لاتعداد حرامی بچے بھی پیدا ہوتے ہیں، ایسے حرامی بچے نجی یا سرکاری تحویل میں پرورش بھی پاتے رہتے ہیں، نسل انسانی بھی بدستور چلتی رہتی ہے اور اس میں انقطاع بھی نہیں ہوتا۔ تو پھر یہ نشوز کیا ہوا؟۔

۴۔ عورتوں کو ان کی خواب گاہوں میں چھوڑنے کا مطلب ''نظر بندی'' بھی خوب لطیفہ ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ نظر بندی کرے گا کون؟ معاشرہ یا حکومت؟ کیونکہ یہاں میاں بیوی کا تو ذکر ہی نہیں۔

اپنے بیانات کی خود تردید:

لطف کی بات یہ ہے کہ خود پرویز صاحب نے ''مفہوم القرآن'' میں ''وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ'' کا مطلب (مفہوم) یہ لکھا ہے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''تو اگلا اقدام یہ ہونا چاہیے کہ ان کے خاوند ان سے علیحدگی اختیار کرلیں اور اس نفسیاتی اثر سے ان میں ذہنی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کریں۔''

گویا ''مفہوم القرآن'' کی اس وضاحت نے آپ کے سب کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ چنانچہ جب یہ ثابت ہوگیا کہ یہاں بات خاوند اور بیوی کی ہورہی ہے تو معلوم ہوا کہ:

۱۔ خاوند ہی اپنی بیوی کو رزق دینے کے ذمہ دار ہیں، نہ کہ عام معاشرہ کے عام مرد معاشرہ کی عام عورتوں کو۔

۲۔ ''قٰنتٰت'' سے مراد بیویوں کا خاوندوں کے لیے فرمانبردار ہونا ہے۔

۳۔ ''نشوز'' کا معنی خاوند کی حکم عدولی اور سرکشی ہے، نہ کہ عورت کے اپنے جنسی فرائض سے سرکشی ہے۔

۴۔ ''فعظوھن. واھجروھن. واضربوھن''میں مخاطب عورتوں کے خاوند ہیں۔یعنی سرکشی کی صورت میں وہی انہیں نصیحت کریں، پھر وہی ان سے ہم بستری چھوڑ دیں، پھر بھی باز نہ آئیں تو وہی انہیں مار بھی سکتے ہیں۔

۵۔ ''وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ'' کا مطلب ''خاوندوں کا عورتوں سے ہم بستری نہ کرنا ہے۔'' نہ کہ (معاشرہ یا حکومت) کا انہیں نظر بند کرنا۔

۶۔ روایات وتفاسیر میں جو کچھ درج ہے وہ سب ٹھیک ہے اور پرویز صاحب نے جو کچھ لکھا، وہ غلط ہے۔

۵۔عورت کی شہادت:

قرآن کریم میں سورۃ البقرۃ کی آیت 282 میں ایک مرد کے بجائے دو عورتوں کی شہادت کو قابل قبول قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات بھی چونکہ عورتوں کے حقوق سے تعلق رکھتی ہے۔لہٰذا پرویز صاحب طاہرہ بیٹی کو دلاسہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کی شہادت عورتوں کے ناقابل اعتماد یا ناقص العقل ہونے کی دلیل نہیں۔ بلکہ ڈاکٹر ہارڈنگ کی تحقیق کے مطابق اگر ایک دائرے یعنی جزئیات کی کماحقہ تبیین میں عورتیں مردوں سے پیچھے ہیں۔تو دوسرے دائرہ یعنی انسانی تعلقات کے مسائل کے باب میں مرد عورتوں سے پیچھے ہیں۔ایک کے دائرے میں ایک کی کمی ہے تو دوسرے دائرے میں دوسرے کی (فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عَلٰی بَعْضٍ) معاشرہ میں ایک دوسرے کی کمی باہمی تعاون سے پوری ہو سکتی ہے‘‘۔

اس اقتباس میں جہاں تک ڈاکٹر ہارڈنگ کی تحقیق کا تعلق ہے، یہ نہ ہمارے لیے حجت ہے نہ ہی اس کا جواب دینا ہم ضروری سمجھتے ہیں، البتہ اس تحقیق پر پرویز صاحب نے جو خود ساختہ آیت۔ (فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ) فٹ فرمائی ہے اور نتیجہ یہ پیش کیا ہے کہ ’’بعض امور میں عورت افضل ہے اور بعض میں مرد‘‘ تو اس کا جواب ہمیں قرآن کریم ہی سے مل جاتا ہے اور وہ آیات درج ذیل ہیں:

۱۔ ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ ’’مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔‘‘

(سورۃ النساء: ۳۴)

۲۔ ﴿وَ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ (سورۃ البقرۃ: ۲۲۸)

۳۔ ﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ﴾ (سورۃ البقرۃ: ۲۲۳)

..........وغیرہ! تفصیل آخر میں دی گئی ہے۔

لہٰذا ’’فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ ‘‘ کا مطلب یہی ہے کہ مردوں کو عورتوں پر بالادستی حاصل ہے۔ اب اس ’’بعض علیٰ بعض‘‘ سے یہ نتیجہ حاصل کرنا کہ ’’کہیں مرد برتر ہیں تو کئی پہلو میں عورت‘‘ ڈاکٹر ہارڈنگ کی تحقیق پر پرویزی نظریہ تو کہلا سکتا ہے مگر قرآنی تصریحات اس کا ساتھ نہیں دیتیں۔

دوسرا نکتہ آپ نے یہ پیش فرمایا کہ:

’’قرآن نے دو عورتوں کے سلسلہ میں یہ نہیں کہا کہ ان دونوں کی شہادت یکے بعد دیگرے لی جائے تاکہ وہ دو شہادتیں مل کر ایک مرد کی شہادت کے برابر ہو جائیں۔ کہا یہ ہے کہ اگر ایک کو گھبراہٹ کی وجہ سے کہیں الجھاؤ پیدا ہو جائے‘‘ (تَضِلَّ کا مفہوم بیان ہو رہا ہے۔ مؤلف) تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ یعنی اگر شہادت دینے والی عورت کو گھبراہٹ لاحق نہ ہو تو دوسری عورت کی دخل اندازی کا موقعہ ہی نہ آئے گا اور اس اکیلی کی شہادت کافی قرار پائے گی۔‘‘

اس اقتباس کی رو سے پرویز صاحب نے ایک مرد کے عوض دو عورتوں کے عدالت میں حاضر ہونے تک کی بات کو درست تسلیم کر لیا ہے۔ اب حقوق کی بحث تو یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ پھر یہ عورت کے حق کا دفاع کیا ہوا؟

رہی یہ بات کہ اگر ایک عورت گھبراتی نہیں تو دوسری کی شہادت کا موقعہ ہی نہ آئے گا اور پہلی کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شہادت مکمل سمجھی جائے گی۔ یہ بات بھی آپ کے اپنے بیان کے خلاف ہے اور وہ بیان یہ ہے کہ عورت کسی معاملہ کی جزئیات کو سمجھنے اور بیان کرنے میں قاصر ہوتی ہے۔ لہٰذا دونوں کا بیان عدالت میں ضروری ہوا کہ اگر ایک عورت کچھ جزئیات بتلانا بھول جائے تو دوسری کے بیانات سے یہ کمی پوری ہو جائے۔ پھر جو نصابِ شہادت قرآن نے مقرر کر دیا ہے اس میں سے ایک عورت کو خارج کر دینا کیا قرآن کی تحریف نہیں ہے؟ اب اس کی تحریف کی مزید وضاحت بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں:

''لڑکیوں کی پرورش زیورات میں کی جائے تو وہ غیر مبین رہیں گی اور اگر زیور تعلیم سے آراستہ کر دیا جائے وہ غیر مبین نہیں رہیں گی۔ اس صورت میں دوسری عورت کو ساتھ کھڑا کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ قرآن کے اس قسم کے احکام بعض شرائط کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں۔ جب وہ شرائط باقی نہ رہیں تو وہ احکام بھی نافذ العمل نہیں رہتے۔ جیسے جب پانی مل جائے تو تیمم کا حکم ساقط العمل ہو جاتا ہے۔''

دیکھا آپ نے قیاس مع الفارق کی کیسی بدترین مثال پیش کی گئی ہے۔ تیمّم کا حکم اس طرح ہے کہ اگر پانی نہ ملے تو تیمّم کیا جا سکتا ہے۔ اصل حکم پانی سے وضو کرنا ہے نہ کہ تیمّم کرنا۔ تیمّم رخصت ہے حکم نہیں۔ آپ نے اس حکم کو بدل کر یوں فرمایا کہ اگر پانی مل جائے تو تیمّم ساقط العمل ہو جاتا ہے۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ وضو کے مسئلہ میں یہ استثناء تو مجبوری کی شکل میں ہے۔ لہٰذا قرآن نے اس کا وضاحت سے ذکر کر دیا۔ لیکن شہادت دینے کے معاملہ میں تعلیم یافتہ نہ ہونا کونسی مجبوری ہے، جو اس کے لیے استثناء تلاش کیا جائے؟ پھر اگر یہ ایسی ہی مجبوری تھی تو قرآن نے جیسے وضو کے مسئلہ میں پانی نہ ملنے کی صورت میں خود ہی تیمّم کی رخصت دی ہے۔ اسی طرح اگر عورت تعلیم کے ذریعہ ایک شہادت سے مستثنیٰ ہو سکتی تھی تو قرآن نے اس کا ذکر کیوں نہ کیا؟

یہ ہے قرآن کے اس ادنی طالب علم کے اجتہاد کی مثال۔ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ مرکز ملت، امت مسلمہ کے لیے شریعت سازی کے فرائض بجالائے گا اور بزعم خود پرویز صاحب مرکز ملت کی گدی پر براجمان رہے ہیں۔ جیسا کہ اس کی تفصیل ''محدث'' کے کئی مقامات پر زیر بحث آ چکی ہے۔

۶۔ مذکر کے صیغے:

طاہرہ بیٹی نے اپنے باپ جناب پرویز صاحب سے سوال کیا کہ:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''قرآن میں جہاں کہیں مردوں اور عورتوں کو مشترکہ طور پر خطاب کیا گیا ہے وہاں صیغہ جمع مذکر کا ہی استعمال ہوا ہے تو اس سے خواہ مخواہ مردوں کی بالادستی کا تصور قائم ہو جاتا ہے؟''

اس کے جواب میں آپ اپنی بیٹی کو تسلی دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ صرف قرآن ہی کا معاملہ نہیں بلکہ ہر معاشرہ اور ہر زبان میں یہی دستور چلا آتا ہے۔ تم دیکھتی نہیں کہ جب کوئی مقرر کسی مجمع کو خطاب کرتا ہے تو پہلے ایک بار یہ کہہ لیتا ہے کہ ''خواتین و حضرات!'' پھر آگے سارے صیغے مذکر کے استعمال کرتا چلا جاتا ہے اس وقت تو تمہیں ایسا کبھی خیال نہیں آیا۔ لیکن قرآن میں ﴿یاایها الذین آمنوا﴾ دیکھ کر تمہیں ایسا خیال کیوں آنے لگا؟''

۷۔ جنتی معاشرہ:

بیٹی کا سوال یہ ہے کہ:

''قرآن کی رو سے جنتی مردوں کو تو اچھی اچھی عورتیں ملیں گی، لیکن جنتی عورتوں کو کیا مرد بھی ملیں گے؟''

ظاہر ہے کہ یہ سوال بھی اس احساس کمتری کی پیداوار ہے، جو مردوں کی بالادستی کو اجاگر کر رہا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ بیٹی کے اس تصور کو سوال کی شکل دینے والے بھی والد صاحب خود ہی ہیں۔ جنہوں نے ''حور عین'' کا ترجمہ ''اچھی اچھی عورتیں'' کر لیا ہے۔

''حُور'' بمعنی ''ایسی عورتیں جن کی آنکھوں کی پتلی بہت سیاہ اور سفیدی بہت سفید ہو'' اور ''عین'' بمعنی ''ایسی عورتیں جن کی آنکھیں موٹی موٹی ہوں'' اور یہ دونوں باتیں خوبصورتی کی علامت ہیں، اور یہ جنت ہی میں ہوں گی۔ اب پرویز صاحب نے ان الفاظ کا ترجمہ ''اچھی اچھی عورتیں'' کر کے بیٹی کو یوں مطمئن کیا کہ ''فرض کرو جنت میں حامد کو عائشہ ملتی ہے تو کیا عائشہ کو حامد بطور خاوند نہ ملے گا؟ گویا عورتوں کو بھی یقیناً ''اچھے اچھے مرد'' مل جائیں گے۔

پھر جنت کا مفہوم یہ بیان فرماتے ہیں کہ:

''یہ جنت دنیا میں ہی مل جاتی ہے۔ جنت کی عورتوں کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ نگاہ نیچی رکھنے والی ہوں گی اور یہاں بھی مومن عورتوں کو یہی حکم ہے۔ جنت کی عورتیں بھی اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والی ہوں گی۔ یہاں بھی مومن عورتوں کو یہی حکم ہے۔ مزید برآں اصل بات خیالات کی ہم آہنگی ہے اور اسی وجہ سے مشرکوں سے نکاح حرام ہے۔ یہ باتیں حاصل ہو جائیں تو یہی دنیا دراصل جنتی معاشرہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بن جاتا ہے۔ جس میں اگر مردوں کو پاکیزہ عورتیں ملتی ہیں تو عورتوں کو بھی پاکیزہ مرد ہی ملتے ہیں۔ اب بتاؤ، طاہرہ! تمہارہ وہ اعتراض کہاں باقی رہتا ہے؟

اب آپ ہی بتائیں کہ طاہرہ بیٹی کیا بتلائے؟

گویا پرویز صاحب، بعد از مرگ ملنے والی جنت کو اسی دنیا میں کھینچ لائے، اور یوں ثابت کر دکھایا ہے کہ اگر مردوں کو ''اچھی اچھی عورتیں'' ملیں گی تو عورتوں کو بھی ''اچھے اچھے مرد'' ہی ملیں گے۔ لہٰذا تمہارے حقوق مردوں کے برابر ہی ہیں۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔

۸۔ تعدد ازواج:

تعدد ازواج کے موضوع پر چونکہ ''طلوع اسلام'' کی طرف سے ''قرآنی فیصلے'' میں علیحدہ بھی مضمون شائع ہوا ہے۔ اور میں اس کا جواب بھی الگ لکھ چکا ہوں لہٰذا یہاں تکرار کی ضرورت نہیں۔

۹۔ حق طلاق مرد کو ہے:

شریعت اسلامیہ میں طلاق ایک مکروہ چیز ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے زوجین کے اختلاف کی صورت میں زوجین کے لیے ایک ایک ''حکم'' تجویز کرنے کا حکم دیا ہے کہ وہ امکانی حد تک ان کے اختلاف دور کر دیں اور ان میں صلح صفائی کرا دیں۔ تاہم اگر اختلافات دور نہ ہو سکیں تو آخری حق طلاق مرد کو دیا گیا ہے، لیکن پرویز صاحب فرماتے ہیں:

''لیکن اگر ثالثی بورڈ کی کوششیں ناکام رہیں اور وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ ان کی باہمی رفاقت ممکن نہیں، تو وہ اپنی رپورٹ عدالت کے سامنے پیش کریں گے اور اگر انہی کو آخری فیصلہ کا اختیار ہو گا تو خود ہی فیصلہ کر دیں گے اس طرح معاہدہ نکاح فسخ ہو گا۔

دیکھا آپ نے کہ اس مفکر قرآن نے بلا دلیل، مرد سے حق طلاق چھین کر عدالت کو تفویض کر دیا ہے، یا پھر دوسری صورت یہ بتلائی ہے کہ اس حق طلاق میں میاں بیوی دونوں برابر کے حصہ دار ہیں۔

اب دیکھیے ان دونوں باتوں کی تردید کے لیے قرآن کی درج ذیل آیت کافی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ﴾ (سورۃ البقرۃ:۲۳۰)

''پھر اگر وہ (شوہر) اس عورت کو (تیسری) طلاق دے دے تو اس کے بعد جب تک عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے، اس (پہلے شوہر) پر حلال نہ ہوگی۔''

دیکھیے اس آیت میں ''طلق'' واحد مذکر غائب کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا طلاق دینے والی اتھارٹی نہ عدالت ہوسکتی ہے نہ معاشرہ اور نہ ہی بیوی کو اس معاملہ میں شریک بنایا جاسکتا ہے۔

یہ عدالت کا شوشہ اس لیے چھوڑا گیا ہے کہ اسلام نے عورت کو بھی خلع کا حق دیا ہے۔ لیکن یہ چونکہ عدالت کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے، لہٰذا مرد و عورت کے حقوق میں یکسانی پیدا کرنے کی خاطر عدالت کو اس میں لاگھسیڑا ہے یا پھر مرد و عورت میں، برابر کا حصہ دار قرار دینے سے، اس یکسانی کی کوشش کی جارہی ہے۔

۱۰۔عدّت صرف عورت کے لیے:

اس مسئلہ میں پرویز صاحب نے چھاتی پر پتھر رکھ کر یہ تسلیم کرلیا ہے کہ:

''بس یہ ایک حق فائق ہے جو مردوں کو دیا گیا ہے یعنی مرد کے لیے عدت نہیں اور عورت کے لیے عدّت ہے۔ عام اصول تو یہ ہے کہ ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ جو حقوق مردوں کے عورتوں پر ہیں ویسے ہی حقوق عورتوں کے مردوں پر ہیں۔ لیکن عدت کے زمانے میں اس کا شوہر اس سے پھر شادی کرسکتا ہے۔ ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾

اب یہ جو مرد کی فضیلت عورت پر ایک درجہ زیادہ ہے۔ اس ایک درجہ کے پرویز صاحب نے پھر دو درجے بنا لیے۔ ایک یہ کہ عورت پر عدت ہے اور مرد پر نہیں اور دوسرے یہ کہ مرد عدت کے دوران اپنی مطلقہ بیوی سے نکاح کرسکتا ہے۔ اور قابل ذکر کام یہ کیا کہ ﴿لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ کو صرف عدت کے زمانے کے ساتھ محصور کردیا کہ اس عدت کے زمانہ میں تو مرد کو عورت پر درجہ ہے۔ آگے پیچھے نہیں اب دیکھیے کہ آیت کا تسلسل اس طرح ہے:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ (سورۃ البقرۃ:۲۲۸)

''اور عورتوں کا حق مردوں پر ویسا ہی ہے جیسے دستور کے مطابق (مردوں کا حق) عورتوں پر ہے، البتہ عورتوں پر مردوں کو فضیلت ہے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اب یا تو یہ مان لیجیے کہ مرد وعورت کے حقوق کی برابری کا تعلق بھی محض زمانہ عدت سے ہے، زمانہ عدت میں تو ان کے حقوق برابر ہوتے ہیں۔ لیکن آگے پیچھے عام حالات میں برابر نہیں ہوتے۔ یا پھر یہ تسلیم کر لیجیے کہ عورتوں پر مردوں کو جو درجہ ہے وہ بھی صرف عدت کے زمانہ کے ساتھ مختص نہیں۔ بلکہ عام حالات میں بھی یہ فضیلت قائم اور استوار ہے اور اس بات کے باوجود بھی کہ عورتوں کے حقوق مردوں پر اور مردوں کے حقوق عورتوں پر ایک جیسے ہی ہیں، مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے۔

۱۱۔ عورت کی فضیلت بواسطہ حق مہر:

پرویز صاحب اپنی بیٹی طاہرہ کو دلاسہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اسلام کے نزدیک زندگی کے تمام شعبوں میں مرد اور عورت دوش بدوش چلتے ہیں۔ لیکن نکاح کے معاملہ میں اس نے عورت کی حیثیت مرد سے اونچی رکھی ہے۔ اس نے مرد سے کہا ہے کہ اگر وہ نکاح کرنا چاہتا ہے تو تنہا اپنے آپ کو عورت کے برابر نہ سمجھ لے اسے اپنے ساتھ کوئی تحفہ بھی دے تاکہ اس طرح اس کا وزن عورت کے برابر ہو سکے۔ اس کے پاسنگ کو جس سے مرد کے وزن کی کمی پوری ہوتی ہے، مہر کہتے ہیں، لہٰذا یہ مساوات یوں بنتی ہے۔'': مرد + مہر = عورت۔

قرآن نے یہ کہیں نہیں کہا کہ نکاح کے وقت عورت اپنے ساتھ کچھ لے کر آئے اس نے مرد سے کہا کہ وہ اپنی قیمت کی کمی مہر سے پوری کرے، اگر اس کے پاس دینے کو کچھ نہیں تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح آٹھ دس سال تک بیوی کے باپ کا اجر بن کر رہے۔

اب دیکھیے مرد کے ذمہ صرف حق مہر ہی نہیں بلکہ عورت کا نان ونفقہ یعنی قیام وطعام کے پورے اخراجات بھی ہیں اور یہ مہر اور نان ونفقہ کے اخراجات مرد کی فضیلت کے حق میں جاتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ﴾ (سورۃ النساء: ۳۴)

دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ خرچ کرنے والا یا رزق بہم پہنچانے والا، مرزوق سے ہمیشہ افضل ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر نکاح کی مساوات بنانا ہی ہے تو وہ یوں بنتی ہے:

''مرد = عورت + حق مہر + نان ونفقہ یا قیام وطعام وپوشاک کے اخراجات''

اب اس مساوات میں دیکھ لیجیے کہ کمی کدھر ہے اور فضیلت کدھر؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ تو یہ شریعت کا قانون یا دستور نہیں، بلکہ اس سے اصل مقصد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت اوران کی طبیعت کی سختی کو بکریوں کے ریوڑ چرانے سے نرم کرنا تھا اور یہ سب باتیں بذریعہ وحی خفی، حسب منشائے الٰہی طے پائیں۔ عام دستور یہی ہے کہ حق مہر کچھ نہ کچھ ہونا ضرور چاہیے خواہ یہ ایک لوہے کا چھلاّ ہی کیوں نہ ہو اور خواہ یہ نکاح کے وقت ادا کر دیا جائے یا بعد میں۔ حق مہر کی مالیت کا شریعت نے کوئی تعین نہیں کیا اور یہ ہر ایک کی حیثیت کے مطابق ہی ہونا چاہیے۔ حق مہر کے عوض آجر بن کر رہنے کی کوئی دوسری مثال آپ کو نہ مل سکے گی۔

12۔ بچپن کی شادی:

پرویز صاحب بچپن کی شادی کو از روئے قرآن ناجائز قرار دیتے ہوئے، فرماتے ہیں:

"دین کا فیصلہ یہ ہے کہ نکاح کی عمر ہی بلوغت کی عمر ہے۔ (۶:۴) یعنی بالغ ہونے سے پہلے لڑکی اور لڑکے کی شادی ہو ہی نہیں سکتی اور صرف بلوغت ہی شرط نہیں بلکہ نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں فریقین کی رضا ورغبت نہایت ضروری ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب یہ معاہدہ انتخاب اور رضا مندی سے ہوگا، تو فریقین ایک دوسرے کے مزاج، افتاد، طبیعت، تعلیم وتربیت، ماحول، عادات وخصائل ہر بات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کریں گے۔ اگر ہماری خود ساختہ شریعت ہمارے لیے سند نہ بنتی تو ارشد اور صغیرہ کی شادی اس بارہ برس کی عمر میں ہو ہی نہیں سکتی۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ خود ساختہ شریعت سے پرویز صاحب کی مراد، احادیث ہیں۔ لٰہذا ہم پرویز صاحب کی منشا کے مطابق قرآن ہی سے بچپن کی شادی کا جواز پیش کریں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالّٰٓـِٔيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ (سورۃ الطلاق:۴)	"اور تمہاری مطلقہ عورتیں جو حیض سے ناامید ہو چکی ہوں، اگر تمہیں ان کی عدت کے بارے میں شک ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے۔ اور ان کی بھی جنہیں ابھی حیض شروع ہی نہیں ہوا۔ اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل تک ہے۔"

اب دیکھیے آیت بالا میں بوڑھی، جوان اور بچی سب طرح کی عورتوں کا ذکر ہے۔ بوڑھی اور بچی کی عدت تین ماہ ہے اور جوان (یعنی بالغ جو قابل اولاد ہو) کی عدت، اگر اسے حمل ہے، تو وضع حمل تک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ عدت کا سوال طلاق کے بعد ہی پیدا ہوسکتا ہے اور طلاق کا نکاح کے بعد۔ گویا نابالغ کا نکاح بھی از روئے قرآن جائز ہے۔

13۔ عورت اور ولایت:

اس آیت سے دوسرا نتیجہ حق ولایت کا بھی نکلتا ہے یعنی نابالغ لڑکے یا لڑکی کا والد اس بچے کی طرف سے انتخاب کا حق رکھتا ہے اور اسکا نکاح کرسکتا ہے۔ لہٰذا ''ارشد اور صغیرہ کی شادی'' قرآن کی رُو سے درست تھی اور اس میں ''خود ساختہ شریعت'' کا بھی کچھ دخل نہ تھا۔ اس کے علی الرغم پرویز صاحب کا فتوی یہ ہے کہ:

''چونکہ کم سنی میں نکاح نہیں ہوسکتا۔ اس لیے نکاح کے لیے ولی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

اور تیسرا نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کم از کم عورت کے لیے ولایت شرط ہے۔ کیونکہ آیت مذکورہ بالا میں بچیوں کے نکاح، طلاق اور عدت کا ذکر ہے اور کنواری لڑکی کے لیے، خواہ وہ بالغ ہو چکی ہو، ولایت کی شرط اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ نکاح کے سلسلہ میں اپنی رضا مندی برملا ظاہر کرنے سے اس کی فطری شرم وحیا مانع ہوتی ہے۔

ان تصریحات سے بھی مرد کا عورت پر فوقیت کا پہلو ہی سامنے آتا ہے۔

مرد کی فوقیت کے چند دوسرے پہلو

اب ہم کچھ ایسے امور کا ذکر کریں گے، جن سے مرد کی فوقیت ثابت ہوتی ہے۔ اور ان میں سے اکثر قرآن میں مذکور ہیں، مگر پرویز صاحب نے ان سے تعرض نہیں فرمایا اور وہ یہ ہیں:

ا۔ کوئی عورت نبی نہیں ہوئی:

قرآن میں ستائیس انبیاء اور رسل علیہم السلام کے نام مذکور ہیں اور یہ سب مرد ہیں۔ قرآن میں یہ بھی مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر بستی کی طرف ہر زمانہ میں نبی بھیجے۔ جن میں سے بیشتر کا نام قرآن میں مذکور نہیں، لیکن قرآن میں کہیں خفیف سا اشارہ تک نہیں پایا جاتا کہ کسی عورت کو بھی نبی بنا کر بھیجا گیا ہو۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔کوئی عورت حاکم بھی نہیں بن سکتی:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا اَطِيعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيعُوا الرَّسُولَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنكُمْ﴾ (سورۃ النساء:۵۹)

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور تم میں سے جو ارباب حکومت ہیں ان کی بھی۔''

ممکن ہے یہ کہہ دیا جائے کہ اولی الامر جمع مذکر کا صیغہ ہے، جس میں عورتیں بھی شامل ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ امکان بدیں صورت باقی نہیں رہتا کہ دور نبوی بلکہ قرون اولیٰ میں بھی کسی عورت کے حاکم یا افسر ہونے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

۳۔عورتیں مردوں کی کھیتیاں ہیں:

﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ﴾

(سورۃ البقرۃ:۲۲۳)

''عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔''

اس آیت کی جو توجیہہ بھی کی جائے گی، اس سے مرد کی فوقیت ہی ثابت ہوگی۔

۴۔نکاح کے بعد عورت ہی مرد کے گھر آتی ہے:

اس کی اصل وجہ تو یہ ہے کہ قیام کی ذمہ داری مرد کے سر ہے تاہم اس سے بھی مرد کی فوقیت ظاہر ہوتی ہے۔

۵۔اولاد کا وارث مرد ہوتا ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ عَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (سورۃ البقرۃ:۲۳۳)

''اور ان عورتوں کی خوراک اور پوشاک باپ کے ذمہ ہے۔''

اس آیت میں ''مولود لہ'' کا لفظ قابل غور ہے۔ جس سے صاف واضح ہے کہ مولود (لڑکا ہو یا لڑکی) کا وارث باپ ''مولود لہ'' ہوتا ہے نہ کہ ماں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۶۔ تکمیل شہادت:

کسی بھی قضیہ اور متنازعہ امر کی شہادت، خواہ وہ حدود سے تعلق رکھتا ہو یا تعزیرات سے یا نجی معاملات سے، تکمیل نہیں ہوسکتی، جب تک اس میں مردوں کی شمولیت نہ ہو۔ حدود کے قضایا میں عورت کی شہادت مقبول نہیں۔ لین دین کے معاملات میں بصورت مجبوری عورت کی شہادت مقبول ہے وہ بھی اس صورت میں کہ ایک مرد کے عوض دو عورتیں ہوں۔ طلاق کا معاملہ جو خاص عورتوں سے متعلق ہے، اس میں بھی دو مردوں کی شہادت مقبول ہے۔ غرض کوئی قضیہ ایسا نہیں جو مرد کی شہادت کے بغیر ثبوت کو پہنچ سکے جبکہ تمام قضایا عورت کی شہادت کے بغیر بھی پایہ ثبوت کو پہنچ جاتے ہیں۔

۷۔ اہل کتاب سے نکاح:

مرد تو کتابیہ عورت سے بوقت ضرورت نکاح کر سکتا ہے، لیکن عورت کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ عندالضرورت کسی اہل کتاب سے نکاح کرے۔

یہاں ہم نے زندگی کے بیس گوشوں کا تذکرہ کیا ہے جبکہ استفسار سے ان میں مزید اضافہ بھی ہوسکتا ہے۔ ان تمام گوشوں میں قرآن مجید سے مرد کی برتری ثابت ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی مفکر قرآن ہر بات میں مرد اور عورت میں یکسانی کی کوشش کرنے لگ جائے تو اسے قرآنی آیات کی تاویل میں جتنی ذہنی کاوش کرنی پڑے گی اور جیسی کچھ وہ تاویلات ہوسکتی ہے، وہ ظاہر ہے۔

ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ مذکورہ بالا تمام تر گوشوں میں عورت کا اپنا قصور نہیں۔ کیونکہ ایسے معاملات میں شریعت نے اسے اس کی جسمانی ساخت اور جبلی فطرت کے لحاظ سے مجبور و معذور سمجھا ہے۔ پھر کچھ امور کا تعلق شرعی مصالح سے بھی ہے۔ لہٰذا ان نکات کے باوجود بھی عورت کو کمتر درجہ کی مخلوق قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بہت سے معاملات میں عورت کو شریعت نے مرد کے برابر بھی قرار دیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت پھر بھی باقی رہ جاتی ہے کہ ایک آدمی ایک کام نہیں کرسکتا اور دوسرا وہ کام کرسکتا ہے اور پھر اسے احسن طریقے سے سرانجام بھی دیتا ہے، تو دوسرے کو پہلے سے بہر حال افضل سمجھا جائے گا۔

عورت کی برتری:

پھر کچھ امور ایسے بھی ہیں جن میں عورت کا درجہ مرد سے بھی بڑھ کر ہے۔ اس بات کے باوجود کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باپ اپنی اولاد کا جائز وارث ہے، اولاد کو یہ حکم ہے کہ وہ اپنی ماں کی خدمت باپ سے زیادہ کرے۔ بلکہ ماں کی خدمت کا حق باپ سے تین گنا زیادہ ہے۔ اس طرح عورت ہر مرد کے لیے قابل احترام ہستی ہے اور اس کا فرض ہے کہ مشکل وقت میں عورتوں کی تکالیف کا لحاظ رکھے۔ لیکن یہ باتیں منکرین حدیث قسم کے لوگوں کے کام کی نہیں ہیں۔ ہم ان باتوں کا ذکر اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر ہم عورت کو بعض امور میں مرد سے فروتر سمجھتے ہیں تو بعض دوسرے امور میں اسے مرد سے بالاتر بھی سمجھتے ہیں کیونکہ ہماری پوری شریعت نے ہمیں یہی کچھ بتلایا ہے جس میں ہم کسی طرح کی تاویل کے قائل نہیں۔

❀......❀......❀

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقالہ:۹

جنت ارضی یا جنت الماویٰ

صاحب مضمون مولانا عبدالرحمٰن کیلانی زید مجدہ کا یہ مقالہ دراصل محمد صادق صاحب (کراچی) کے اس مراسلہ کا جواب ہے۔ جس میں انہوں نے لکھا ہے: ''حال ہی میں ماہنامہ ''المعارف'' لاہور (شمارہ دسمبر۱۹۸۲ء) میں جناب شہیر نیازی صاحب کا مضمون ''آدم جنت ارضی میں'' پڑھ کر ذہنی الجھن میں مبتلا ہو گیا ہوں کہ قرآن و احادیث صحیحہ کی رو سے صحیح حقیقت کیا ہے؟ چنانچہ میں اس مضمون کی عکسی نقل آپ کے پاس بغرض علمی تبصرہ بھیج رہا ہوں۔ ازراہ کرم مضمون کے تمام وضاحت طلب یا قابل تشریح پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالیں اور ''محدث'' کے آئندہ شمارہ میں اس کو ضرور شائع کریں تاکہ مجھ جیسے سطحی علم رکھنے والے اصحاب بھی بھرپور استفادہ کر سکیں۔ والسلام (ادارہ)

اسلام میں جب سے عقل پرست فرقوں کا آغاز ہوا ہے، ان کی یہی عادت رہی ہے کہ قرآن و حدیث یا اسلامی روایات میں جہاں کہیں کوئی بات اپنی عقل کے خلاف دیکھی تو اس کی مختلف توجیہات و تاویلات پیش کر کے اسے مطابق عقل و عادت بنا کے ہی دم لیا۔ ایسی ہی باتوں میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ جس جنت میں اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا کو رہنے کا حکم دیا تھا وہ آسمان پر تھی یا زمین پر؟

چونکہ اس مسئلہ کا انسان کی ہدایت سے کوئی تعلق نہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کو یہ تفصیل بتلانے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ قرآن و حدیث میں ایسے واضح الفاظ کہیں بھی نہیں ملتے، جن سے واضح طور پر اس بات کا فیصلہ کیا جا سکے۔ تاہم قرآن و حدیث سے ہی کچھ ایسے اشارات اور دلائل ضرور مل جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنت سماوی تھی، ارضی نہ تھی، لیکن عقل پرست حضرات اسے کسی صورت جنت الماویٰ ماننے کو تیار نہیں۔ لہٰذا تاویلات و توجیہات کا سہارا لینے لگے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی ایسی توجیہات و تاویلات میں بھی بہت زیادہ اختلاف رونما ہوئے۔

معتزلین اور قدریہ نے جنت سماویہ سے انکار کیا تو زمین میں اس جنت کی جگہ بھی متعین کر دی کہ وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یا تو فلسطین میں تھی یا فارس و کرمان کے درمیان تھی۔ سرسید مرحوم کی تاویل لاجواب ہے، وہ جنت سے مراد بلوغت یا عقل و تمیز سے پہلے کی زندگی مراد لیتے ہیں۔ شجر ممنوعہ سے مراد عقل و تمیز کا درخت ہے اور ہبوط آدم سے مراد عقل و تمیز کے بعد کی مکلّف زندگی ہے۔ گویا ان کے نزدیک یہ جنت کوئی مادی شے تھی ہی نہیں جس کے متعلق یہ سوال پیدا ہو سکے کہ وہ ارضی ہے یا سماوی؟

شہیر نیازی صاحب بھی جنت ارضی کے قائل ہیں۔ لیکن معتزلین کا بتلایا ہوا مقام ان کے خیال میں درست نہیں۔ وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ ان علاقوں میں تو آج بھی نسل آدم آباد ہے، پھر جنت سے اخراج کیا ہوا؟ بالفاظ دیگر آپ نے معتزلین کے خیال کی تردید فرمادی۔ آپ کے خیال کے مطابق یہ جنت ایک نہیں بلکہ دو تھیں۔ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ پہلی جنت سے جب نکالا (جو پہاڑ پر واقع تھی) تو فرمایا "قلنا اهبطوا" اس حکم کے مطابق آدم اور حوا جنت نمبر 2 میں آ گئے جو ایک جزیرہ پر واقع تھی۔ اس جنت میں آدم و حوا کی اولاد بھی پیدا ہوئی، اسی لیے جب یہاں سے نکلنے کا حکم دیا تو فرمایا ﴿قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا﴾ تم سب کے سب اس جنت سے نکل جاؤ۔ چنانچہ آدم و حوا دوسری بار اس دوسری جنت سے نکلے۔ ان کے نکلنے کے بعد یہ دونوں جنت کے قطعے آتش فشانی کی وجہ سے بحراوقیانوس میں غرق ہو چکے ہیں۔ آپ کی ان معلومات کا ماخذ مصریوں کی وہ تاریخ ہے جو وہ مندروں پر لکھا کرتے تھے۔

آپ کی تحقیق اس لحاظ سے بے مثال ہے کہ آپ نے قرآن ہی کے الفاظ ﴿قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا﴾ سے یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ جنت ارضی ایک نہیں بلکہ دو تھیں۔ آدم و حوا ایک بار نہیں بلکہ دوبار ان جنتوں میں سے نکالے گئے اور نیز یہ کہ ان جنتی قطعات کے ڈوبنے سے پیشتر انہیں کسی حفاظتی مقام پر نکل جانے کو کہہ دیا گیا تھا۔ نیازی صاحب نے قرآن کے ان الفاظ پر جو لغوی تحقیق پیش کر کے یہ نتائج نکالے ہیں، سب سے پہلے ہم اسی کا جائزہ لینا چاہتے ہیں، فرماتے ہیں:

ھبط کی لغوی تحقیق:

"تیسری ضروری اور اہم چیز اس سلسلے میں لفظ "اھبطوا" کا استعمال ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی کسی اونچی جگہ سے نیچے آنے کے ہیں، یہاں تک کہ سواریوں پر سے اترنے کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اللہ علیم و خبیر ہے، اسے معلوم تھا کہ لوگ "اھبطوا" کے سلسلے میں اونچائی سے مراد آسمان لیں گے، لہٰذا دوسری جگہ "اِهْبِطُوا مِصْرًا" (یعنی مصر میں جا کر اترو) کہہ کر یہ واضح کر دیا کہ آدم کو آسمان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے پھینکا نہیں گیا، بلکہ ایک سرسبز پہاڑ کی چوٹی سے، جو جنت نظیر تھا، اتارا گیا، اللہ تعالیٰ کسی کو معاف کرنے کے بعد سزا نہیں دیتا۔ جب توبہ قبول ہوگئی تھی تو یہ نکلنا رحمت تھا نہ کہ زحمت، بنی اسرائیل مصر کی قید سے چھٹ کر آئے تھے اور یہ ایک تنبیہ تھی۔ جا کر اترنا تو سوائے سواریوں کے اور کسی چیز سے اترنے کے معنی یہاں دیتا نہیں ہے۔ قافلے کا لڑنا، لوگوں کا اترنا اور پڑاؤ کرنا جیسا وسیع مفہوم صرف ایک لفظ ''اهبطوا'' میں پوشیدہ ہے۔''

اس اقتباس سے هبط کے متعلق لغوی تحقیق یہ ہوئی کہ:

1۔ اس کا معنی اونچی جگہ سے نیچے آنا یا سواری سے اترنا ہے۔

2۔ اگر یہ لفظ جنت سماوی سے متعلق ہو تو اس کا معنی ''پھینکنا'' کرنا چاہیے اور اگر کسی پہاڑ کی چوٹی پر یہ جنت ہو تو اس کا معنیٰ ''اتارنا'' کرنا چاہیے۔

3۔ یہ لفظ بطور رحمت بھی استعمال ہو سکتا ہے۔

4۔ اس لفظ کا لغوی مفہوم بڑا وسیع ہے جیسے قافلہ کا لڑنا، پڑاؤ کرنا، لوگوں کا اترنا وغیرہ۔

اب دیکھیے هبط کی لغوی بحث میں جو باتیں امتیازی خصوصیت کی حیثیت رکھتی ہیں ان کا نیازی صاحب نے ذکر ہی نہیں کیا، مثلاً:

1۔ (هبط) لازم ومتعدی (میں صرف مادی لحاظ سے کسی بلند جگہ سے نیچے اترنے کا مفہوم ہی نہیں بلکہ قدر ومنزلت کے لحاظ سے گر جانے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ ''هبط الثمن'' بمعنی ''قیمت گر گئی'' ''هبطه الزمان'' ''اُسے زمانہ نے گرا دیا'' یعنی پہلے امیر تھا اب غریب ہوگیا۔ ''هبط'' بمعنی برائی میں پڑنا، نقصان اور ذلت۔ ''جس اترنے میں ذلت ہو، وہاں هبوط کا لفظ آتا ہے۔ عزت کا اترنا، اتارنا ہو تو نزول اور انزال استعمال ہوتا ہے، جیسے قرآن، بارش، ملائکہ وغیرہ۔

2۔ اس مادی یا معنوی نزول کے علاوہ ''هبط'' کی دوسری امتیازی خصوصیت ''اضطرار'' ہے۔ امام راغب کے الفاظ میں ''الهبوط'' کے معنی کسی چیز کے قہراً یا بے اختیاری کی حالت میں نیچے اتر آنا کے ہیں، جیسا کہ پتھر بلندی سے نیچے گرتا ہے۔''

پھر کبھی تو اس لفظ میں یہ سب خصوصیات بیک وقت پائی جاتی ہیں، جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿وَ اِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ ﴾ (سورۃ البقرۃ:۷۴) ''پھر پتھروں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔''

اور کبھی اس لفظ میں نیچے آنے کے علاوہ ذلت کے ساتھ کسی جگہ یا مقام سے نکلنے یا نکالے جانے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔

جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالَ فَاهۡبِطۡ مِنۡهَا فَمَا يَكُوۡنُ لَكَ اَنۡ تَتَكَبَّرَ فِيۡهَا فَاخۡرُجۡ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيۡنَ﴾ (سورۃ الاعراف:۱۳) ''اللہ نے ابلیس سے فرمایا، بہشت سے اتر جا، تجھے شایان نہیں کہ یہاں تو غرور کرے، پس نکل جا تو ذلیل ہے۔''

اس آیت میں یہ لفظ (Get Out) کے معنی دے رہا ہے۔ گویا ''ھبط'' میں یا تو اضطرار کا پہلو ضروری ہوتا ہے یا تحقیر کا اور یا پھر دونوں باتیں بیک وقت پائی جاتی ہیں۔ نزول اور خروج کے ہبوط کا یہ امتیازی فرق اتنا مشہور ہے کہ ایک اردو شاعر نے بھی درج ذیل شعر میں یہ فرق واضح کر دیا ہے:

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچہ سے ہم نکلے

ایک تیسرے مقام پر یہ لفظ قرآن میں یوں استعمال ہوا ہے:

﴿قِيۡلَ يٰنُوۡحُ اهۡبِطۡ بِسَلٰمٍ مِّنَّا﴾ (سورۃ هود:۴۸) ''اے نوح علیہ السلام، سلامتی کے ساتھ (کشتی سے) نیچے اتر آؤ۔''

اس آیت میں مادی طور پر نزول اور اضطرار دو باتیں پائی جاتی ہیں۔ ذلت و تحقیر کے پہلو کو 'بسلام منا'' کے الفاظ نے خارج از بحث قرار دے دیا۔

چوتھے مقام پر ہے:

﴿اِهۡبِطُوۡا مِصۡرًا فَاِنَّ لَكُمۡ مَّا سَاَلۡتُمۡ وَ ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَ الۡمَسۡكَنَةُ وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (۶۱:۲) ''کسی شہر میں اترو، تمہیں وہ کچھ مل جائے گا جو تم مانگتے ہو اور ذلت اور محتاجی ان پر چمٹا دی گئی۔ وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گئے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس آیت میں ذلت اور اضطرار دو باتیں پائی جاتی ہیں لیکن مادی طور پر بلندی سے نیچے آنے کا مفہوم نہیں ہے۔

اب یہ لغوی مفہوم سامنے رکھیے اور نیازی صاحب کی یہ توجیہ سامنے لائیے کہ حضرت آدم وحوا از راہ کرم واحسان، اس پہاڑ کی چوٹی سے اتار کر بحفاظت تمام کسی دوسرے مقام پر بھیجے جارہے ہیں۔ جس پہاڑ پر ان کے خیال کے مطابق جنت نمبر 1 تھی اور جو آدم وحوا کے چلے جانے کے بعد پھٹنے والا تھا۔ نیازی صاحب نے ہبوط کے معنوں میں اس کرم واحسان یا رحمت کی توجیہ یہ بیان فرمائی کہ اللہ کسی کو معاف کرنے کے بعد سزا نہیں دیتا۔ اب نیازی صاحب کو توجیہ قبول کرنے میں مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ہبوط تو پہلے ہو چکا ہے اور قصور کی معافی بعد میں ہوتی ہے۔ ہبوط کا ذکر سورہ بقرہ کی آیت نمبر 36 میں ہے اور توبہ کی قبولیت کا ذکر آیت نمبر 37 میں ہے۔ بالفاظ دیگر جنت سے نکالے جانے کے بعد جب آدم و حوا نے زمین میں رہائش اختیار کر لی، تب آدم علیہ السلام نے اپنے اللہ سے کلمات توبہ سیکھے اور توبہ قبول ہوئی، گویا ہبوط جرم کی سزا کے طور پر ہوا تھا، اس وقت احسان یا رحمت کا کون سا موقعہ تھا؟

جنت نمبر ۲ اور دوسری بار اخراج کی دلیل:

''دوسری بار آدم وحوا سے کہا گیا کہ ''اھبطوا'' اور اسی تسلسل میں فرمایا گیا ''اھْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا'' آخر یہ دو دفعہ اخراج کیوں ہوا، اس میں یہ واقعہ بھی موجود ہے کہ جو آدم کے صرف دو ہونے اور اس کے بعد اہل وعیال سمیت نکلنے کے درمیان فطرت کا تقاضا ہے۔ عربی اس قدر فصیح زبان ہے کہ چار اور پانچ کے عدد کے لیے بھی الفاظ موجود ہیں۔ جمیعاً کا لفظ اچھی خاصی انسانی تعداد کی طرف واضح اشارہ کر رہا ہے اور پھر دوسری دفعہ مع ان کی اولاد کے اس جزیرے سے نکالا گیا، جہاں کبھی یہ خوبصورت باغ تھا اور وہ جزیرہ جواب سمندری آتش فشاں پہاڑوں کی وجہ سے ڈوبنے والا تھا، انہیں نکال لیا گیا۔''

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ:

۱۔ چونکہ قرآن نے ''اھبطوا'' کا لفظ دوبارا استعمال فرمایا ہے، لہٰذا یہ اخراج دوبار ہوا اور دونوں بار ہی دو مختلف جنتوں سے ہوا۔

۲۔ دوسری بار جو ''اھبطوا'' کے ساتھ ''جمیعا'' کا لفظ بھی ہے جو چار پانچ تو درکنار، اچھی خاصی تعداد کو ظاہر کر رہا ہے۔ آدم اور حوا دو سے اتنی خاصی تعداد ان کے بچوں کی ہی ہو سکتی ہے جو کہ جنت نمبر 1

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے قیام کے دوران پیدا ہوئے، پھر جتنی مدت بچوں کی اتنی خاصی تعداد کی پیدائش کے لیے درکار تھی وہی ان دونوں طرح کے اخراج کا درمیانی وقفہ ہے۔

اب دیکھیے نیازی صاحب، قرآن کریم کی جس فصاحت و بلاغت کی داد فرما رہے ہیں، ہمیں افسوس ہے کہ نیازی صاحب خود اس سے بے بہرہ ہیں۔ عربی زبان میں فصاحت یہ ہے کہ تثنیہ کے لیے الگ صیغہ موجود ہے۔ اور جمع کا صیغہ نمبر۲ سے نہیں بلکہ تین سے شروع ہوتا ہے۔ تین یا اس سے زائد جتنی بھی تعداد ہو اس کے لیے 'اهبطوا' ہی آئے گا۔ چار یا پانچ کے لیے کوئی علیحدہ صیغہ عربی زبان میں موجود نہیں ہے، البتہ چار یا پانچ کے لیے عربی میں اربع اور خمس کے الفاظ ضرور موجود ہیں، لیکن یہ عربی کی کوئی خصوصیت نہیں۔ چار یا پانچ کے لیے ہر زبان میں ہی الفاظ موجود ہیں۔ البتہ ایک لفظ 'بضع' کا بھی آتا ہے جس کے معنی ہیں ''چند'' اور اس کا اطلاق ۳ سے ۹ تک ہوتا ہے مگر اس لفظ کا استعمال ''اهبطوا'' میں کچھ تبدیلی نہیں لاتا۔ ہاں اس سے زائد اگر کوئی بات نیازی صاحب کے علم میں ہے تو اسے واضح کر دینا چاہیے تھا تا کہ لوگ اس سے مستفید ہو سکتے۔

یہ تو آپ دیکھ چکے کہ نیازی صاحب کا سارا پلان لفظ 'جمیعا'' کے گرد گھومتا ہے جس کے معنی آپ نے ''سب کے سب'' کئی بار دہرائے ہیں، اب مشکل یہ ہے کہ 'جمیعا'' کے معنی وہ ہیں ہی نہیں جو نیازی صاحب سمجھے بیٹھے ہیں بلکہ اس کے معنی ہیں 'ایک ساتھ'' یا ''اکٹھے مل کر'' یا ''جمع ہو کر''۔

﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا﴾ ''ہم نے کہا تم سب جنت سے ایک ساتھ اترو۔''

(سورۃ البقرۃ:۳۸)

جیسے کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ﴾ ''یہ اکٹھے مل کر تم سے کبھی لڑ نہ سکیں گے (یعنی میدان مقابلہ میں آمنے سامنے) مگر بستیوں کے قلعوں میں یا دیواروں کی اوٹ میں۔''

(سورۃ الحشر:۱۴)

اور جہاں ''سب کے سب'' کا مفہوم ادا کرنا ہو تو وہاں ''جمیعا'' کا لفظ نہیں آتا بلکہ أجمعون یا أجمعین آتا ہے، جیسے فرمایا:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ﴾ (سورۃ الحجر:۳۰) ''تو سب کے سب فرشتوں نے (آدمؑ کو) سجدہ کیا۔''

اس آیت میں ''کلھم'' تاکید مزید کے لیے، ورنہ اُجمعین اور اجمعون ''سب کے سب'' کے معنوں میں ہی استعمال ہوتے ہیں۔

گویا ''اھبطوا'' میں تین افراد (آدم، حوا اور ابلیس) کو صرف اترنے کا حکم ہے اور ''اَھْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا'' میں یہ وضاحت ہے کہ تمہیں سب کو اکٹھا مل کر ایک ساتھ ہی اترنا ہوگا۔ یہ نہیں کہ باری باری اترتے رہو۔''

قرآن میں تکرار کی وجہ:

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ قرآن میں ''اھبطوا'' کا استعمال دوبار کیوں ہوا؟ تو اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ پہلی بار ''اھبطوا'' کے مابعد کی زندگی کے ایک پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے اور دوسری بار دوسرے پہلو کو۔ پہلی بار اس ہبوط کی وجہ بتلائی کہ چونکہ تم ایک دوسرے کے دشمن بن چکے ہو لہٰذا یہاں سے نکل جاؤ یا اتر جاؤ۔ جنت میں ایسی مخاصمت کی کوئی گنجائش نہیں۔ لہٰذا اب تمہارا مستقر زمین کو بنایا جاتا ہے اور دوسری بار ہبوط کے حکم کے بعد آئندہ کے لیے رشد و ہدایت کا لائحہ عمل بیان فرمایا کہ اس زمین میں تمہارے پاس میری طرف سے رسول آتے رہیں گے۔ (سورۃ البقرہ:۳۹)

ہبوط ایک ہی بار ہوا اور جنت بھی ایک ہی تھی۔ اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ سورۃ اعراف میں بھی یہی ہبوط آدم کا قصہ سورہ بقرہ میں بیان شدہ قصہ سے زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے لیکن وہاں ایک دفعہ ہی ہبوط کا ذکر آیا ہے۔ اس مقام پر درج ذیل آیت میں:

﴿قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ﴾ (سورۃ الاعراف:۲۴) ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اتر جاؤ، تم سب ایک دوسرے کے دشمن ہو، اب تمہارے لیے اس میں ٹھکانا اور ایک وقت تک زندگی کا سامان ہے۔''

تو موجود ہے لیکن ''اَھْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا'' یعنی نہ دوسری بار کے ہبوط کا ذکر ہے اور نہ جمیعا کا۔ لہٰذا جمیعا سے متعلق نیازی صاحب کی بیان کردہ مدت اور وقفہ کا مسئلہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شجر ممنوعہ:

شجر ممنوعہ کا نام نہ قرآن میں مذکور ہے نہ احادیث میں۔ تفاسیر میں مفسرین نے اپنے اپنے خیال کے مطابق اس درخت کا نام تجویز کیا ہے۔

نیازی صاحب ان سب کا رد کرنے کے بعد اپنی تحقیق ان الفاظ میں پیش فرماتے ہیں کہ:

''قرآن کریم اپنی تفسیر خود اپنے آپ فرماتا ہے۔ مندرجہ بالا آیات سے شجر ممنوعہ کے پھل کی تاثیر سامنے آگئی اور وہ یہ کہ حضرت آدم وحوا پھل کھانے سے پہلے مرد وعورت کے فرق اور ضرورت سے ناواقف تھے جب انہوں نے پھل کھایا تو ان کے ستر ایک دوسرے پر کھل گئے اور انہوں نے ایک دوسرے کو جنس مخالف کی حیثیت سے پہچان لیا اور وہ برائے نام نہیں، بلکہ سچ مچ کے میاں بیوی بن گئے۔ اس لیے اس شجر کو سوائے شجر تشخیص جنس (Sex Tree) کے کچھ بھی قرار نہیں دے سکتے۔''

شجر ممنوعہ کی یہ تعبیر نیازی صاحب سے پیشتر بھی کئی حضرات پیش فرما چکے ہیں۔ لیکن اس تعبیر پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس درخت کا پھل کھانا جرم تھا اور یہ پھل جنسی شہوت (سیکس) تھی۔ آدمؑ نے اس پھل کھانے کے جرم سے توبہ استغفار کی، جو قبول بھی ہوگئی۔ لیکن یہ پھل آپ بعد میں بھی کھاتے رہے اور آپ کی ساری اولاد آج تک یہ پھل کھا رہی ہے، تو پھر یہ جرم کیسا تھا اور معافی کیسی ہوئی تھی؟

اگرچہ نیازی صاحب نے اس شجر کو جنت نمبر 1 کے ساتھ ہی جزیرہ میں ڈبو کر ختم کر دیا ہے مگر جرم اس درخت کا وجود تو نہ تھا بلکہ اس کا پھل کھانا تھا اور وہ پھل آج تک کھایا جا رہا ہے۔ پھر اس درخت کو ڈبونے کا فائدہ بھی کیا تھا؟

ارضی جنت کیوں؟

گو نیازی صاحب کے دو عدد جنتوں اور دو بار خروج کا فلسفہ شجر ممنوعہ کا ذکر چھیڑے بغیر بھی حل ہو جاتا ہے۔ تاہم آپ نے یہ ذکر اس طرح چھیڑا کہ اس شجر ممنوعہ کا وجود صرف جنت ارضی میں ہی ہو سکتا ہے اور اگر ہم جنت ارضی کے بجائے جنت آسمانی فرض کرلیں تو اس پر بہت سے اعتراض وارد ہوتے ہیں، مثلاً کیا یہ درخت آدم علیہ السلام سے پہلے بھی موجود تھا؟ اگر تھا تو فرشتوں کو بھی اس کی ممانعت تھی یا نہیں؟ جنت میں تو سوائے خیر کے کچھ نہیں۔ یہ درخت کیوں پیدا کیا گیا؟ کیا یہ درخت آج بھی موجود ہے؟ اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اگر موجود ہے تو جنتیوں کی پریشانی کا باعث تو نہ ہوگا؟ آسمانی جنت تو ایک دائمی نعمت ہے۔ اس میں شجر ممنوعہ کا کیا کام؟ وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح کے کچھ مزید سوالات۔ جنہیں آپ ''بنیادی سوالات'' کا نام دیتے ہیں۔ نیازی صاحب نے تخلیق آدم کے سلسلہ میں بھی اٹھائے ہیں، مثلاً آدم علیہ السلام کو کہاں پیدا کیا گیا؟ جنت کا کیا مفہوم ہے؟ یہ جنت زمین پر تھی یا آسمان پر؟ اگر یہ آسمان پر تھی تو آدمؑ کے لیے زمین سے مٹی منگوانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کیا اللہ تعالیٰ اس مٹی کو منگائے بغیر تخلیق آدم پر قادر نہ تھا؟ آدم علیہ السلام سے پہلے کرہ ارض وجود میں نہ تھا، چرند پرند موجود نہیں تھے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ایسے ہی بے کار اور لایعنی سوالات کا انبار لگا دیا ہے جن سے کسی کو ذہنی انتشار میں تو مبتلا کیا جا سکتا ہے۔ مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔

پھر جس طرح کے یہ عقلی قسم کے سوال ہوتے ہیں اسی طرح کے ان کے عقلی جوابات ہوتے ہیں۔ عقلی قسم کے سوال و جواب میں دراصل مقابلہ تو فریقین کی عقلوں کا ہوتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ کون صاحب عقل جوہر دکھانے میں کامیاب رہے ہیں۔ اس سے مسئلہ زیر بحث کے درست یا غلط ہونے پر کم ہی استشہاد کیا جا سکتا ہے۔

بالکل اسی قسم کے سوالات اور اعتراضات ان لوگوں کی طرف سے بھی پیش کیے جاتے ہیں جو جنت سماوی کے قائل ہیں، مثلاً وہ کہتے ہیں کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ اس باغ کو کس نے بویا اور کس نے لگایا؟ جن و ملائکہ تو دنیاوی باغ لگایا نہیں کرتے اور نہ ان کا لگایا ہوا باغ آج تک کسی انسان نے دیکھا ہے اور آدم سے پیشتر انسانی آبادی نہیں، جس کے متعلق کہا جا سکے کہ شاید اس نے لگایا ہوا اور اگر آدمؑ نے اس باغ کو خود بویا اور لگایا تھا تو پھر اس میں آباد ہونے کی اجازت اور اخراج ہونے کا کیا مطلب؟ نیز اگر یہ باغ آدم علیہ السلام کا خود کاشتہ تھا تو آپ نے شجر ممنوعہ کیوں لگایا؟ پھر آپ اس کی تاثیر سے کیوں ناواقف رہے؟ جس کے کھانے پر اللہ کی طرف سے عتاب نازل ہوا؟ اسی شجر ممنوعہ کو ابلیس نے ''شجرة الخلد'' بتلایا۔ تو اس فانی باغ میں ''شجرة الخلد'' کا کیا کام؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان سوالات سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ جس طرح کے سوالات نیازی صاحب نے اٹھائے ہیں، دوسرا فریق بھی ایسے بے شمار سوالات اٹھا سکتا ہے، لہٰذا ایسے سوالات کا جواب دینا جن کے متعلق قرآن و حدیث میں کوئی وضاحت نہ ہو اور ان کا جواب انسانی علم کی دسترس سے بھی باہر ہو۔ ایک عبث فعل ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آدم جنت سماوی میں:

یہ تو آپ دیکھ چکے ہیں کہ جنت ارضی کے قائلین کے پاس اپنے دعوے کے ثبوت کے لیے سوائے چند عقلی دلائل یا اعتراضات کے کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہے۔ انہیں نقلی بنیاد اگر ملتی ہے تو تورات سے، جس میں یہ مذکور ہے کہ یہ جنت عدن میں تھی، لیکن تورات ساتھ یہ بھی بتلاتی ہے کہ اس جنت میں آدمؑ وحوا اور ابلیس کے علاوہ سانپ اور مور بھی تھے اور ابلیس انہیں کی معرفت آدم وحوا کو بہکاتا پھسلاتا رہا، للہذا تورات کی یہ حکایت کسی فریق کے لیے بھی قابل تسلیم نہیں۔

ہم یہ بھی بتلا چکے ہیں کہ قرآن وحدیث میں ایسے صریح الفاظ کہیں نہیں ملتے جو اس نزاع کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوں تاہم بعض ایسے اشارات اور دلائل ضرور مل جاتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ جنت ارضی نہیں بلکہ جنت الماویٰ ہی تھی جس میں آدم وحوا کو رہائش اختیار کرنے کو کہا گیا، للہذا جمہور علمائے اسلام کا یہی مسلک ہے کہ یہ جنت وہی جنت الماویٰ ہے جس کا وعدہ آخرت میں مسلمانوں کے لیے کیا گیا ہے کیونکہ آیات واحادیث کا ظاہر اسی پر دلالت کرتا ہے۔ مثلاً:

دلیل اوّل:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ قُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ (سورہ البقرۃ:۳۵) ''ہم نے کہا اے آدمؑ! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔''

اس جگہ جنت کو عربی قاعدہ سے ''الجنة'' الف لام کے ساتھ ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اسی مشہور جنت کا ذکر ہے جس کو جگہ جگہ قرآن عزیز میں قیام قیامت کے بعد مومنوں کا مستقر بتلایا گیا ہے ورنہ اگر نئے مقام کا تذکرہ ہوتا یعنی یہ ارضی باغ ہوتا تو پہلے اس کی حقیقت کا اظہار ہوتا۔ پھر اس کو جانی پہچانی چیز کی طرح ال کے ساتھ ذکر کیا جاسکتا تھا۔

دلیل دوم:

ارشاد باریٰ تعالیٰ ہے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ﴾ (سورۃ البقرۃ:۳۶)

''ہم نے کہا نیچے اترو کیونکہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ اب تمہارے لیے زمین میں مستقر اور ایک وقت تک فائدہ اٹھانا ہے۔''

اب دیکھیے ''ھبط بالبلد'' بمعنی ''شہر میں اترنا'' اور ''ھبط بالواد''، ''وادی میں اترنا''۔ یہ بلندی سے پستی کی طرف آنے کے بغیر بھی ممکن ہے، لیکن زمین میں اترنا اس بات کا متقاضی ہے کہ یہ اترنا کسی بلندی یا آسمان سے ہو۔ ارض کی ضد سماء ہے جس کے معنی آسمان بھی ہے اور بلندی بھی۔ اسی طرح ارض کا معنی زمین بھی ہے اور پستی بھی۔ گویا ہبوط اور ارض دونوں لفظ مل کر اس جنت کو سماوی قرار دیتے ہیں۔

دلیل سوم:

الجامع الصغیر میں ایک طویل حدیث کا درج ذیل حصہ ملاحظہ فرمائیے:

(يجمع الله الناس فيقوم المؤمنون حين تزلف لهم الجنة فياتون آدم فيقولون يابانا استفتح لنا الجنة فيقول: و هل أخرجكم من الجنة الاخطيئة أبيكم)

''اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) لوگوں کو جمع کرے گا، پس اہل ایمان کھڑے ہوں گے، جب جنت ان کے قریب ہوگی، پھر وہ آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے، ''اے ہمارے باپ! ہمارے لیے اس جنت کو کھولیے'' اس پر حضرت آدم علیہ السلام فرمائیں گے، ''کیا تم کو اس جنت سے تمہارے باپ کی خطا کاری نے ہی نہیں نکالا تھا؟''

ان دلائل سے بخوبی یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ بلاشبہ جنت الماویٰ میں ہی پیش آیا تھا۔

اب ہم ایک ایسی دلیل پیش کرتے ہیں جس کی رو سے نیازی صاحب نے خود بھی دبی زبان سے یہ حقیقت تسلیم کر لی ہے کہ یہ جنت ارضی نہ تھی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ (سورۃ البقرہ:۳۶)

''ہم نے کہا، جنت سے اتر جاؤ کیونکہ تم سب ایک دوسرے کے دشمن ہو۔''

گویا اللہ تعالیٰ نے جنت سے نکالنے کا سبب یہ بتلایا کہ جنت لڑائی جھگڑا کرنے کی جگہ نہیں اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تمہاری آپس میں دشمنی ہو چکی ہے، لہٰذا یہاں سے نکل جاؤ لیکن نیازی صاحب فرماتے ہیں:

''ایک جگہ ''اھطبوا'' کے ساتھ ہی خداوند کریم نے فرمایا کہ نیچے جا کر کھیتی باڑی کرو، اب تم میں سے بعض، بعض کے دشمن رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ جہاں زر، زن اور زمین موجود ہوں گے جھگڑے لازماً ہوں گے۔ ہابیل اور قابیل کا جھگڑا ابھی زمین اور زن سے تعلق رکھتا تھا۔''

اس اقتباس سے واضح ہے کہ دشمنی پیدا ہو جانے کے بعد تو زمین ہی مناسب مستقر ہے۔ لیکن جب تک دشمنی کی فضا پیدا نہ ہو اور لڑائی جھگڑا کا امکان ہی نہ تھا تو اس وقت الجنۃ ہی بہتر اور مناسب مستقر تھا۔

❀......❀......❀

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقالہ:۱۰

نظریہ ارتقاء

کسی چیز کے بتدریج آگے بڑھنے کا نام ارتقاء ہے۔ انیسویں صدی عیسوی میں ڈارون نے یہ نظریہ پیش کیا کہ بندر اور انسان ایک ہی مخلوق ہے کیونکہ حس وادراک کے لحاظ سے ان دونوں میں کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔ گویا ڈارون کے نظریے کے مطابق انسان بندر کا چچیرا بھائی ہے۔ کچھ انتہا پسندوں نے انسان کو بندر ہی کی اولاد قرار دیا۔ کچھ مفکرین کا یہ بھی خیال ہے کہ انسان بندر کی اولاد نہیں بلکہ بندر انسان کی اولاد ہے۔ ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے مذہبی دنیا میں ایک طرح کا اضطراب پیدا کر دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ زندگی کی ابتدا ساحل سمندر پر پایاب پانیوں سے ہوئی۔ پانی کی سطح پر کافی نمودار ہوئی۔ پھر اس کائی کے نیچے سے حرکت پیدا ہوئی۔ یہ زندگی کی ابتدا تھی۔ پھر اس سے نباتات کی مختلف شکلیں بنتی گئیں۔ جرثومہ حیات ترقی کر کے حیوانچہ بن گیا۔ پھر یہ حیوان بنا۔ یہ حیوان ترقی کرتے کرتے پرداراور بازوؤں والے حیوان میں تبدیل ہوا۔ پھر اس نے فقری جانور کی شکل اختیار کی۔ پھر انسان کے مشابہ حیوان بنا اور اس کے بعد انسان بنا۔

جس میں عقل وفہم اور تکلم کی صلاحیتیں نہیں تھیں۔ بالآخر وہ فہم وذکاء کا حامل انسان بن گیا۔ ہمارے ہاں مغربی تہذیب سے مرعوب مفکرین قرآن نے اسے اپنالیا۔ سرسید احمد خان جو ڈارون کے ہم عصر تھے۔ وہ اس نظریہ سے متاثر ہو گئے۔ انہوں نے اس نظریہ کو فطرت کے مطابق پایا تو اسے قبول کر لیا۔ آج کل ادارہ طلوع اسلام سرسید کی تقلید میں اس نظریہ کے پرچار میں سرگرم ہے۔

۱۔ نفس واحدہ سے مراد پہلا جرثومہ حیات؟

اب دیکھیں۔ انسان کی پیدائش کے بارے ہمیں قرآن سے کیا رہنمائی ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّ نِسَآءً﴾ (النساء:۱)

''اے لوگو! اللہ سے ڈرو جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا پھر اس سے اس کا جوڑا بنایا۔ پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں (روئے زمین پر) پھیلا دیئے۔''

یہ آیت اپنے مطلب میں واضح ہے کہ نفس واحدہ سے مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ لیکن ہمارے یہ دوست نفس واحدہ سے مراد پہلا جرثومہ حیات لیتے ہیں۔ یہ جرثومہ کٹ کر دو حصے ہو گیا۔ پھر ان میں سے ہر ایک بڑا ہو کر پھر کٹ کر دو ہو گیا۔ اس طرح زندگی میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ جو جمادات سے نباتات، نباتات سے حیوانات اور حیوانات سے انسان تک پہنچی ہے۔

یہ تصور اس لحاظ سے غلط ہے کہ ﴿خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ کے الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ اس جوڑے سے آئندہ نسل توالد و تناسل کے ذریعہ چلی تھی۔ جبکہ جرثومہ حیات کی یہ صورت نہیں ہوتی۔

۲۔ علق کا مفہوم:

دوسری آیت یہ ہے:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ (العلق:۱،۲)

(اے محمد ﷺ!) اپنے رب کا نام لے کر پڑھیے جس نے پیدا کیا۔ انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔

اس آیت میں ﴿علق﴾ کا لغوی معنی جما ہوا خون بھی ہے اور جونک بھی۔ ہمارے یہ دوست اس سے دوسرا معنی مراد لیتے ہیں، اسے رحم مادر کی کیفیت قرار نہیں دیتے بلکہ اس سے ارتقائی زندگی کے سفر سے وہ دور مراد لیتے ہیں جب جونک کی قسم کے جانور وجود میں آئے۔

۳۔ اطوار مختلفہ:

﴿وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۝﴾ (سورہ نوح:۱۴)

(۱) حالانکہ اس نے تم سب کو مختلف حالات میں پیدا کیا ہے)۔ (تفسیر ثنائی)

(۲) حالانکہ اس نے طرح طرح کی حالتوں میں پیدا کیا ہے۔)۔ (فتح محمد جالندھری)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۳) حالانکہ اس نے تم کو طرح طرح سے بنایا ہے۔ تفہیم القرآن ...... (اور اس سے مولانا مودودی نے وہی تخلیقی مراحل مراد لیے جو رحم مادر میں ہوتے ہیں۔

پرویز صاحب اس آیت سے ارتقائے زندگی کے مراحل مراد لیتے ہیں۔ لیکن کوئی ایسی وجہ نہیں اس سے رحم مادر کے مراحل مراد نہ لیے جائیں بلکہ سورۃ علق کی مندرجہ بالا آیت اس کی وضاحت بھی کر رہی ہے اور کوئی ایسا قرینہ بھی موجود نہیں جس سے پرویز صاحب کے نظریہ کی تائید ہو سکے۔

۴۔ زمین سے روئیدگی:

﴿وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًاۙ﴾ (سورہ نوح:۱۷)

(۱) اور خدا ہی نے تم کو پیدا کیا۔ (فتح محمد)

(۲) اللہ نے تم زمین سے پیدا کیا۔ (تفسیر ثنائی)

(۳) اور اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اُگایا۔ (تفہیم القرآن)

پرویز صاحب اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔ اور ہم نے تمہیں زمین سے اگایا ایک طرح کا اگانا اور اس سے مراد یہ لیتے ہیں کہ انسان نباتات اور حیوانات کے راستے سے ہوتا ہوا وجود میں آیا۔

آیت مندرجہ بالا میں نبت کا لفظ لغوی اعتبار سے ہر بڑھنے والی چیز پر بولا جاتا ہے۔ نباتات اور حیوانات اور انسان سب پر اس کا یکساں اطلاق ہوتا ہے۔ (امام راغب) اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جب کوئی چیز خوب پھل پھول رہی ہو تو یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ (المنجد) نبت ثدی الجاریة ''لڑکی کے پستان ابھر آنا'' (منتہی الارب) اسی طرح جب ایک بچہ کی اس طرح پرورش ہو رہی ہو کہ وہ اپنی اصل عمر سے بڑا اور خوب پلا پوسا معلوم ہوتا ہو تو انبت کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا﴾ (سورہ آل عمران:۳۷)
تو اللہ نے مریم کو پسندیدگی کے قابل قبول فرمایا اور اسے اچھی طرح پرورش کیا۔

اندریں صورت حال یہ آیت بھی نظریہ ارتقاء کی کوئی موثر دلیل نہیں ہو سکتی۔

۵۔ قصہ آدم کے سلسلہ میں پرویز صاحب نے درج ذیل آیت کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے کہ:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾ اور ہم نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر تمہاری شکل وصورت بنائی پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔

(سورہ اعراف:۱۱)

اس سے آپ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آیت مذکورہ میں جمع کا صیغہ اس بات کی دلیل ہے کہ آدم سے پہلے بنی نوع انسان موجود تھی کیونکہ ملائکہ کے سجدہ کا ذکر بعد میں ہوا ہے۔ پھر سورہ اعراف کی آیات ۱۱۔۲۵ تک توجہ دلائی ہے جہاں کہیں آدم اور اس کی بیوی کے لیے تثنیہ کا صیغہ آیا ہے لیکن اکثر مقامات پر جمع کا صیغہ ہے۔

اس کے جواب میں اتنا ہی عرض کریں گے کہ آپ اگر آیات ۱۱۔۲۵ کی بجائے ۶۔۲۵ پر غور کرنے کو فرما دیتے تو تثنیہ کے صیغہ کی حقیقت معلوم ہو جاتی۔

ابتدا میں حضور اکرم ﷺ کے دور کے تمام موجود انسانوں کو مخاطب کیا گیا ہے کہ اپنے رب سے نازل شدہ وحی کی تابعداری کرو۔ پھر آگے چل کر آدم اور ان کی اولاد ہے نہ کہ آدم اور ان کے آباء واجداد یا بھائی بند جو آپ کے خیال میں اس جنت میں رہتے تھے جس کے متعلق اللہ نے فرمایا:

﴿وَ یٰاٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُکَ الْجَنَّةَ﴾ (الاعراف:۱۹) ''اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔''

اگر جنت میں اس آدم کی سابقہ نسل بھی رہتی تو محض آدم اور اس کی بیوی کو جنت میں رہنے کی ہدایت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔

اس آیت کا دوسرا پہلو جس کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے صرف آدم علیہ السلام کو بطور خصوصی تخلیق پیدا کیا تھا تو آیت بالا میں کم کی ضمیر جمع کیوں استعمال ہوئی ہے؟

تو ہم عرض کریں گے کہ محاورہ عرب میں موقع ومحل کے لحاظ سے واحد کے لیے جمع استعمال کی اور بھی کئی مثالیں پائی جاتی ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (سورۃ الزمر:۳۳) ''اور جو شخص سچی بات لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی وہی لوگ متقی ہیں''

تخلیق آدم سے متعلق درج ذیل آیت مفہوم میں بالکل صاف ہے۔ ارشاد باری ہے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا﴾ ''بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔''

(سورۃ الدھر:١)

اب دیکھیے دہر سے مراد وہ زمانہ ہے جس کا آغاز ابتدائے آفرینش سے ہوا ہے اور عصر سے مراد وہ زمانہ ہے جس کا آغاز تخلیق آدم سے ہوا ہے کیونکہ انسانی افعال و اعمال پر اللہ نے عصر کو بطور شہادت پیش کیا ہے دہر کو نہیں۔ ارشاد باری ہے کہ اس دہر میں انسان پر ایسا وقت بھی آیا ہے جبکہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ اگر وہ نباتات، حیوانات یا بندر کی اولاد ہوتا تو یہ چیزیں تو سب قابل ذکر ہیں۔ آخر ان کا نام لینے میں کیا حرج تھا؟ ہمارے خیال میں یہی ایک آیت ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو کلی طور پر مردود قرار دینے کے لیے کافی ہے۔

تخلیق آدم اور قرآن:

اب دیکھیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کے جو مختلف مراحل بیان فرمائے ہیں وہ یہ ہیں:

١۔ تراب بمعنی خشک مٹی (المومن:٦٤)

٢۔ ارض بمعنی عام مٹی یا زمین www.KitaboSunnat.com

٣۔ طین بمعنی گیلی مٹی گارا (الزمر:٧١)

٤۔ طین لازب بمعنی لیس دار اور چیک دار مٹی (الصفت:١١)

٥۔ حمامسنون بمعنی بدبودار کیچڑ (الحجر:٢٦)

٦۔ صلصال بمعنی ٹھیکرا۔ حرارت سے پکائی ہوئی مٹی (ایضاً)

٧۔ صلصال کالفخار۔ بمعنی ٹن سے بجنے والی ٹھیکری۔ (الرحمٰن:١٤)

یہ ساتوں مراحل بس جمادات میں پورے ہو جاتے ہیں۔ مٹی میں پانی کی آمیزش ضرور ہوئی لیکن پھر وہ پوری طرح خشک کر دیا گیا۔ غور فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق انسان کے جو سات مراحل بیان فرمائے ہیں وہ سب کے سب ایک ہی نوع جمادات سے متعلق ہیں۔ ان میں کہیں نباتات اور حیوانات کا ذکر آیا ہے؟ اگر انسان کی تخلیق نباتات اور حیوانات کے راستے سے ہوتی تو ان کا بھی تو ذکر ہونا چاہیے تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھر قرآن میں یہ مذکور ہے:

﴿قَالَ يٰٓاِبۡلِيۡسُ مَا مَنَعَكَ اَنۡ تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِيَدَىَّ﴾ (سورہ ص:۷۵)

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابلیس! تجھے اسے سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا۔''

اب اللہ کے ہاتھوں سے اس لیے انکار کر دیا جائے کہ اللہ کے متعلق تجریدی تصور ہی راہ صواب ہے۔ یا یَدْ سے مراد قوت وقدرت ہے۔ حدیث اگر آیت کی تائید کرے تو اسے ظنی کہہ دیا جائے اور اگر تورات بھی تائید کرے تو اس کی ہر ایسی آیت کو محرف قرار دیا جائے۔ جو آپ کے قرآنی فکر سے متصادم ہو۔ یہ سب کچھ لینے کے بعد نظریہ ارتقاء جیسے نا قابل اعتماد نظریہ کو صحیح قرآنی فکر قرار دیا جائے تو دلائل کی بات رہ کہاں جاتی ہے؟

قصہ آدم وابلیس

جنت، شجر ممنوعہ اور ہبوط آدم:

اب پرویز صاحب کی زبانی سنیے کہ آدم وابلیس کی تمثیلی داستان کیا ہے؟ اور جنت، ابلیس، آدم اور ملائکہ وغیرہ سے کیا مفہوم ہے؟ فرماتے ہیں:

جنت کی زندگی سے مراد نوع انسانی کی زندگی کا وہ ابتدائی دور ہے جس میں رزق کی فراوانیاں تھیں، سرسید جنت سے مراد انسان کا عہد طفلی، شجر ممنوعہ سے مراد عقل وشعور اور ہبوط آدم سے مراد عقل وشعور کے بعد زندگی لیتے ہیں۔ پرویز صاحب اس مسئلہ میں سید صاحب سے پورا پورا اختلاف رکھتے ہیں اور بالکل نئی تاویلات پیش فرماتے ہیں ...... (انسان ملکیت کے لفظ سے نا آشنا تھا جس کا جہاں جی چاہتا سامان زیست لے لیتا۔ جس کا پہلا دور قبائلی زندگی کا تھا۔ یعنی اب نوع انسان مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر الگ الگ ہوگئی۔

عربی زبان میں الگ الگ ہونے کو مشاجرت کہتے ہیں۔ اسی کا نام وہ شجر ہے جس کے قریب جانے سے انسان کو روکا گیا تھا۔ (ابلیس وآدم، ص:۵۱،۵۲)

اب دیکھیے کہ (۱) اگر جنت سے مراد رزق کی فروانیاں ہی ہے تو اس سے تو انسان کے سب آباؤ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اجداد اور دیگر حیوانات فائدہ اٹھا رہے تھے۔ آدم وحوا کو جنت میں آباد کر کے خدا نے اس جوڑے پر کون سا احسان فرمایا تھا؟

۲۔ مشاجرت کے معنی تو واقعی الگ الگ ہونے کے ہیں لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ آیا مشاجرت اور شجر کے ایک ہی معنی ہیں؟ شجر اسم جنس ہے اور شجرۃ کسی ایک درخت کو کہتے ہیں الگ الگ بننے کو نہیں کہتے۔ جب کبھی یہ لفظ بطور اسم استعمال ہوگا اس کے معنی درخت ہی ہوں گے۔

۳۔ جس کسی آدمی کو اللہ نے اس شجر یا مشاجرت سے منع کیا تھا۔ یعنی الگ الگ ٹکڑوں میں بٹ جانا وہ تو پہلے ہی واقع ہو چکی تھی۔ ایک چیز کے ہو جانے کے بعد یہ کہنا کہ ایسا نہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟

ابلیس اور ملائکہ:

انفرادی عقل کا یہ تقاضا کہ دنیا میں سب کچھ میرے ہی لیے ہونا چاہیے ابلیس کہلاتا ہے۔ ملائکہ یعنی کائنات کی قوتیں (جن سے رزق پیدا ہوتا ہے) انسان کے تابع فرمان ہیں...... وہ سب اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ (ص ۵۲، ایضاً)

وہ جذبہ جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ابلیس نے آدم کے کان میں افسوں پھونک دیا وہ اسے حیات جاوید عطا کرے گا اور اس کا ذریعہ بتلایا اور اس کا ذریعہ بتلایا اولاد۔ یہ ہے مفہوم اس تمثیلی بیان کا جس میں کہا گیا ہے کہ اس حیات جاوید کے حصول کی تمنا میں انسان کے جنسی ترغیبات ابھر کر سامنے آگئے۔ (ابلیس وآدم، ص: ۵۳)

۱۔ اب دیکھیے ابلیس کی کئی تعبیریں یہ لوگ کرتے ہیں۔ کہیں اس سے مراد عقل بے باک ہوتی ہے جو وحی کے تابع نہ ہو۔ کہیں ابلیس سے سرکشی اور بغاوت مفہوم لیا جاتا ہے۔ کہیں اسے ذاتی مفاد سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ یہ لفظ بس موم کی ناک ہے جدھر چاہیں موڑ لیں۔ البتہ ان سب معانی میں ایک بات بطور قدر مشترک ضرور پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ابلیس کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابلیس نے خدا کے سامنے جھگڑا ہی یہ کھڑا کیا تھا کہ میں آدم سے افضل ہوں۔ اگر انسان کے علاوہ ابلیس کا تصور ممکن نہیں تو یہ جھگڑا آخر کس نے کیا اور کس سے کیا؟

۲۔ یہی حال ملائکہ کا ہے لیکن اس سے مراد انسان کے اندر نیکی کی قوتیں سمجھا جاتا ہے کبھی اسے ملکہ فطری سے تعبیر کیا جاتا ہے کبھی کائنات کی خارجی قوتوں سے۔ اس مقام پر ان قوتوں کو رزق سے محدود کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیا گیا ہے۔ان سب تعبیروں میں قدر مشترک یہ بھی ہے کہ ملائکہ اپنا خارجی وجود یا تشخص نہیں رکھتے جبکہ قرآن مجید سے یہ بات ثابت ہے کہ ان کا خارجی وجود ہے اوران پر ایمان لانا ایمان بالغیب کا ایک حصہ ہے۔

۳۔ ابلیس کے فریب سے آدم اوراس کی بیوی نے درخت کا پھل چکھ لیا تھا۔ پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ وہ پھل جنسی ترغیبات تھیں جس کے ذریعہ اولاد پیدا ہوتی ہے اور انسان بزعم خود حیات جاوید حاصل کر لیتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا کہ (اس نظریہ کے مطابق) جنسی ترغیبات توانسان سے بہت پہلے بندر میں بھی اوراس سے پہلے دیگر حیوانات میں موجود تھیں۔اوراس سے بہت عرصہ بعد انسان غیر انسانی اور نیم انسانی حالتیں طے کرتا ہوا انسان بنا ہے۔توالد تناسل اور اولاد کا سلسلہ بھی بندروں میں موجود تھا پھر اس مقام پر ابلیس نے آدم کو جنسی ترغیبات کی یہ کیا پٹی پڑھائی تھی؟

نظریہ ارتقاء اور اسلامی تعلیمات کا تقابل:

۱۔ قرآن انسان سے متعلق اشرف المخلوقات کا تصور پیش کرتا ہے جبکہ نظریہ ارتقاء اسے بندر کی اولاد قرار دے کر اسے پست مقام پر لے آتا ہے۔بندر انسان کے بمقابلہ حقیر تر اور ذلیل تر مخلوق ہے جس کا اعتراف سرسید نے بھی کیا ﴿کُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِیْنَ﴾ کی تفسیر کے تحت کیا ہے۔

مغربی مفکرین کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ انہوں نے جب بھی انسان سے متعلق اپنے نظریات پیش کیے ہیں تو اسے حیوانی سطح سے اوپر نہیں اٹھنے دیتے۔ارسطو نے انسان کو حیوان ناطق کہا ڈارون نے اسے بندر کی اولاد قرار دیا۔سگمنڈ فرائڈ نے اسے جنسی حیوان کہا اور مارکس ولینن نے انسان کو معاشی حیوان کہا جبکہ قرآن انسان کو تمام مخلوقات سے بلند مقام پر فائز کرتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا﴾ (سورۃ الاسراء:۷۰)	”یقیناً ہم نے اولاد آدم کو بڑی عزت دی اور انہیں خشکی اور تری کی سواریاں دیں اور انہیں پاکیزہ چیزوں کی روزیاں دیں اور اپنی بہت سی مخلوق پر انہیں فضیلت عطا فرمائی۔“

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ نظریہ ارتقاء وحدت حیات کا تصور پیش کرتا ہے جبکہ قرآن مجید ﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ کہ کر وحدت امت کا تصور پیش کرتا ہے۔ وحدت امت سے مراد یہ ہے کہ جو حقوق اللہ نے انسان کو دیے ہیں دوسری کسی مخلوق کو نہیں دیے۔ مثلاً انسان حلال جانوروں کو ذبح کر کے کھا سکتا ہے اور ان سے اور بھی کئی طرح سے استفادہ کر سکتا ہے لیکن نظریہ وحدت حیات انسان کو ایسے حقوق عطا نہیں کرتا اسی بناء پر ہندوؤں کے ہاں اہنا سار کا اصول کارفرما ہے اور وحدت انسان کو ایسے حقوق عطا نہیں کرتا۔ اسی بنا پر ہندوؤں کا ہاں اہنسا کا اصول کارفرما ہے اور وحدت الوجود کے قائلین جانوروں کو بھی بالکل اپنے ہم مرتبہ تصور کرتے ہیں۔

۳۔ اسلامی تعلیمات کا انحصار ایمان بالغیب پر ہے۔ ایمان بالغیب کے اجزاء یہ ہیں:

اللہ پر ایمان، فرشتوں کے خارجی وجود پر ایمان، نبیوں پر ایمان، الہامی کتابوں اور یوم آخرت پر ایمان جبکہ نظریہ ارتقاء ایمان بالغیب کے اکثر اجزاء کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ جیسا کہ اس کتاب میں متفرق مقامات پر ذکر آیا ہے۔

۴۔ نظریہ ارتقاء الحاد کی راہوں پر ڈال دیتا ہے۔ اس کا سب سے پہلے اثر اس نظریہ کے بانی ڈارون پر ہوا۔ اشتراکی دہریت پسند اس نظریہ کا پرچار صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ نظریہ مذہب سے دور لے جاتا ہے حالانکہ اشتراکی فلسفہ کی بنیاد نظریہ اضداد یا جدلی نظریہ پر ہے جو نظریہ ارتقاء کے مخالف ہے۔ تاہم یہ لوگ نظریہ ارتقاء کا پرچار محض اس لیے کرتے ہیں کہ اس سے مذہب سے تنفر اور اشتراکیت کے لیے راستہ ہموار ہو سکے جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ نظریہ ارتقاء اسلام کے بنیادی عقائد سے براہِ راست متصادم ہے۔

نظریہ ارتقاء کا مستقبل:

نظریہ ارتقاء کا مطالعہ کرنے سے ازخود یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ انسان جو ارتقائی منازل طے کرتا ہوا حیوانیت سے گزر کر درجہ انسانیت تک پہنچا ہے تو اب اس کی اگلی منزل کیا ہوگی؟ یہ نظریہ اگلی منزل کی کوئی نشاندہی نہیں کرتا۔ البتہ مغربی مفکرین یہ بات ضرور کہتے ہیں کہ اب انسان کی اگلی منزل طبعی نہیں بلکہ ذہنی ہوگی۔ پرویز صاحب اس سوال کے جواب میں پروفیسر جوڈ کا اقتباس نقل کرتے ہیں:

''انسانیت کے ارتقاء کی اگلی منزل طبعی نہیں بلکہ ذہنی اور نفسی ہوگی۔ پہلے پہل انسان ارتقاء کی منزلیں طے کر کے حیوانیت سے انسانیت کے درجہ پر آیا۔ پھر اس نے صنعت و حرفت کی مدد سے اپنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آپ کو آلات واسباب سے آراستہ کیا۔ ہمارے اس دور میں انسان نے صنعت وحرفت پر پورا کمال حاصل کرلیا ہے۔اب اس کے لیے ضروری ہوگیا ہے کہ وہ اس منزل سے آگے بڑھے اور جس طبعی ارتقاء نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ حیوان سے ترقی کر کے انسان کے درجے میں قدم رکھے پھر اس کی جبلی ضرورتوں نے اوزار وآلات بنوائے اور وہ مشین اور اسٹیم کا خالق بنا۔اسی طرح وہ آج مجبور ہے کہ اپنا قدم آگے بڑھائے اور اس کا یہ قدم مادی نہیں بلکہ ذہنی اور نفسی ترقی کی طرف ہوگا۔'' (قرآنی فیصلے،ص:۳۴۰)

مندرجہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ انسان کے اس فجائی ارتقاء نے جس سے اسے قوت اختیار وارادہ حاصل ہوا تھا اس کے مادی ارتقاء کو ختم کر دیا ہے۔بالفاظ دیگر ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی آخری منزل بس انسان ہی ہے۔

۲۔ اگر طبعی ارتقاء ہی نے حیوانی زندگی کو مجبور کیا تھا کہ وہ انسانی زندگی میں قدم رکھے تو حیوانی زندگی تو آج بھی موجود ہے لیکن کیا طبعی ارتقاء نے کسی حیوان کو مجبور کیا ہے کہ وہ انسانی زندگی میں قدم رکھے؟ اگر ایسا نہیں اور یقیناً ایسا نہیں تو یہ نظریہ ازخود غلط قرار پاتا ہے۔

۳۔ ذہنی ترقی تو واضح ہے کبھی پتھر کا زمانہ تھا پھر دھات کا زمانہ آیا، پھر صنعت وحرفت کا۔آج ایٹمی دور ہے لیکن اس میں نفسی ترقی کی کیا بات ہوئی؟

صراط مستقیم کیا ہے؟

پرویز صاحب کا نظریہ ارتقاء سے متعلق ایک مضمون پڑھنے کے بعد کسی نے سوال کیا کہ:

'' آپ نے لکھا کہ انسان سلسلہ ارتقاء کی اوپر کی کڑی ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ انسان میں مادی تغیرات سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ مادہ پرست بھی یہی کہتے ہیں۔ یہ کس طرح درست ہوسکتا ہے؟ اگر یہ ارتقاء مادی ہے تو انسان کا مزید ارتقاء بھی مادی ہونا چاہیے۔کیا صراط مستقیم پر چلنے کے معنی یہی ہیں؟ یعنی جس خط پر اس وقت تک ارتقاء ہوتا چلا آیا ہے اسی پر آگے ارتقاء ہو۔ (قرآنی فیصلے،ص:۳۴۵)

اس خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صراط مستقیم سے مراد پرویز صاحب کے نزدیک وہ لائن ہے جس پر زندگی سفر کرتی ہوئی پہلے جرثومہ حیات سے انسان تک پہنچی ہے اور اس صراط مستقیم کی اتنی منازل انسان طے کر چکا ہے اب یہ صراط مستقیم آگے کہاں تک جاتا ہے۔اس کی تفصیل بھی پرویز صاحب کی زبانی ملاحظہ فرمائیے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''آپ نے صراط مستقیم سے جو مفہوم اخذ کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں۔ قرآن کی یہ جامع اصطلاح بڑے اہم نکات کی حامل ہے۔ جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں قرآن سے پہلے ذہن انسان کی دوری حرکت کا قائل تھا جس میں آگے بڑھنے کا تصور نہ تھا۔ قرآن نے زندگی کا حرکیاتی (Dynamic) تصور پیش کر کے بتایا کہ حیات کسی چکر میں گردش نہیں کر رہی بلکہ اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ لہٰذا اس کی حرکت آگے بڑھنے والی ہے۔ صراط مستقیم سے اس غلط فلسفہ حیات (یعنی زندگی کے چکر میں گردش کرنے) کا ابطال ہو گیا اور اس صحیح مقصود حیات (یعنی زندگی کے آگے بڑھنے) کا اثبات ہو گیا پھر چونکہ مستقیم میں توازن قائم رکھنے کا پہلو بھی مضمر ہے۔ اس لیے یہ حقیقت بھی سامنے آ گئی کہ زندگی توازن قائم رکھنے کا پہلو بھی مضمر ہے۔ اس لیے یہ حقیقت بھی سامنے آ گئی کہ زندگی مختلف قوتوں میں توازن قائم رکھتے ہوئے آگے بڑھنے کا نام ہے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بتایا کہ صراط مستقیم پر چلنے سے مراد یہ نہیں کہ زندگی اپنی موجود سطح پر چلتی رہے گی۔ زندگی کی راہ سیدھی بھی ہے اور بلندیوں کی طرف جانے والی بھی۔ یعنی ایسا خط جو کسی نچلے نقطے سے اوپر کے نقطے کی طرف جائے ﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ﴾ (الانشقاق:۱۹)'' کہ تم طبقاً طبقاً اوپر چڑھتے چلے جاؤ گے۔ اس سے زیادہ واضح الفاظ میں بتا دیا کہ صراط مستقیم تمہارے اس نشو و نما دینے والے رب کی راہ قانون ہے جو ذی معارج (۷۰:۳) ہے یعنی سیڑھیوں والا خدا۔ سیڑھی سیدھی بھی ہوتی ہے اور اوپر لے جانے کا ذریعہ بھی۔ گھسٹتے ہوئے اوپر جانے کا ذریعہ نہیں بلکہ ابھرتے ہوئے (Jump کرتے ہوئے) اوپر چڑھنے کا ذریعہ، یہ وہ ذریعہ ہے جس سے انسان اقطار السموت والارض یعنی موجود زمان و مکان کی حدود سے آگے بھی نکل سکتا ہے۔'' (ایضاً، ص:۳۴۲)

سو یہ ہے وہ صراط مستقیم جس پر آئندہ زندگی کا ارتقاء ہوگا۔ گویا آپ کے خیال میں قرآن صرف نظریہ ارتقاء کی یہ پیچیدگی حل کرنے کے لیے نازل ہوا تھا کہ آئندہ زندگی کا سفر کس لائن پر ہوگا اور وہ لائن کیسی ہوگی؟ غور فرمائیے کہ انسان کے اولین مخاطب جوان پڑھ تھے انہوں نے اس فلسفیانہ پیچیدگیوں کو سمجھ لیا ہوگا؟ بہر حال آپ نے سیاق و سباق سے قطع نظر کرتے ہوئے کوئی آیت کہیں سے لی اور کوئی کہیں سے اور یہ ثابت کر دیا کہ زندگی کی صراط مستقیم جو انسانی زندگی تک زمین ہی پر تھی۔ اب وہ اوپر کی طرف چڑھے گی۔ مگر سوال یہ ہے کہ زندگی کو اس صراط مستقیم کے ذریعہ اوپر چڑھنے کا فائدہ کیا ہوگا۔ آپ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے نزدیک اوپر کوئی خدا تو نہیں وہ تو ہر جگہ موجود ہے پھر اوپر جا کر زندگی کرے گی کیا؟

ایک روحانی بزرگ صراط مستقیم کا تصور کچھ اس طرح پیش کرتے تھے کہ ذاتِ باری تعالیٰ سے ہر ایک جاندار ایک روحانی شعاع کے ذریعے منسلک ہے۔ اور اس کی دلیل میں وہ یہ آیت پیش کرتے تھے:

﴿مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا﴾ (سورہ ھود:٥٦) ''زمین پر جو کوئی چلنے پھرنے والا ہے اللہ اس کی چوٹی کو پکڑے ہوئے ہے۔''

ان کے تصور کے مطابق اس روحانی شعاع کا ایک سرا ہر جاندار کے دماغ میں پیوست اور دوسرا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہی روحانی شعاع صراط مستقیم ہے اور اسی پر روحانی سفر ہوگا۔ اس زمین سے اوپر ہوائی کرہ کے بعد سب سے پہلے جہنم آتا ہے پھر اعراف، پھر جنت، پھر عالم لاہوت، ملکوت مثال اور عالم امر ہیں۔ پھر اس کے بعد عرش الٰہی ہے اور اس سے اوپر ذات باری تعالیٰ۔ اور بزعم خویش یہ بزرگ یہ روحانی سفر طے بھی کر چکے تھے۔ ان کی صراط مستقیم سے متعلق یہ تحقیق یا ان کی دوسری تحقیقات ٹھیک ہوں یا غلط، اس سے ہمیں سروکار نہیں، البتہ ایک بات ان کی قابل فہم ہے اور وہ یہ کہ وہ خدا کو اوپر سمجھتے تھے۔ لہٰذا ان کی صراط مستقیم کا رخ اوپر کی طرف ہی ہونا چاہیے تھا۔ مگر پرویز صاحب کے نزدیک خدا اوپر تو ہے نہیں بلکہ ہر جگہ موجود ہے۔ پھر انہیں صراط مستقیم کو اوپر کی طرف لے جانے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ اور یہ سوال بھی تا حال حل طلب ہے کہ اس صراط مستقیم کے ذریعہ ارتقاء کی اگلی منزل کیا ہوگی؟ اس سلسلہ میں آپ فرماتے ہیں:

ارتقاء کی اگلی منزل:

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ نہ تو انسان خالص طبعی ارتقاء کی آخری کڑی ہے (بلکہ اس کی انسانیت طبعی ارتقاء کے سلسلہ علت و معلول سے الگ ہے) اور نہ ہی اس کا مزید ارتقاء طبعی ہوگا۔ طبعی ارتقاء کی پیداوار صرف اس کا جسم ہے۔ اس میں جوہر انسانیت غیر طبعی ہے۔ جسم انسانی میں اس جوہر انسانیت کے فیصلوں کے لیے معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ۔ اس کے بعد مزید ارتقاء جسمانی نہیں بلکہ جوہر انسانیت کا ہوگا جسے ہم موت کہتے ہیں۔ وہ درحقیقت جوہر انسانیت کا جسم کے آسرے کو چھوڑ دینے کا نام ہے۔ جوہر انسانیت (انسانی اختیار و ارادہ) کی نشوونما و ارتقاء قرآنی نظام ربوبیت سے ہوتی ہے۔ زندہ وہ ہے جس کے اختیار و ارادے کی قوتیں (قرآن کی روشنی میں) تمام خارجی کائنات کو (جس میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خود اس کا جسم بھی شامل ہے۔) مسخر کیے جاتی ہیں نہ کہ وہ جس کے جسم کی طبعی مشینری چل رہی ہے جو اس طرح زندہ ہے وہ موت سے مر نہیں سکتا، اسی کا نام ارتقاء کی اگلی منزل طے کرنا ہے۔(ایضاً ص:۳۴۸)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ ارتقاء کی اگلی منزل موت ہے جب جسم کا آسرا ختم ہو جائے گا۔

۲۔ لیکن یہ ارتقاء کی منزل وہی طے کر سکے گا جس کا جوہر انسانیت نشو و نما یافتہ ہو...... جو قرآنی نظام ربوبیت کے اختیار کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ موت تو سب کو آتی ہے اور جسم کا آسرا بھی ختم ہوتا ہے۔ جو لوگ نظام ربوبیت کے ذریعہ اپنے جوہر انسانیت کی نشو و نما کر لیں گے وہ تو ارتقاء کی اگلی منزل طے کر جائیں گے۔ اور جو اس نظام کو اختیار نہیں کرتے یا اس پر ایمان نہیں لاتے ان کا کیا بنے گا؟

آخرت کا تصور:

جسم کا کام انسانی قوتِ فیصلہ (نفس) کے لیے معلومات فراہم کرنا اور اس کے فیصلوں کو جاری کرنا ہوگا (یعنی قرآنی نظام ربوبیت یا قانونی معاشرے میں) اس قوت میں جس قدر پختگی اور وسعت ہوتی جائے گی اسی قدر انسانی زندگی ابدیت سے ہمکنار ہوتی جائے گی۔ جب جسمانی نظام طبعی قانون کے تحت مضمحل ہو کر منتشر ہو جائے گا (جسے موت کہتے ہیں) تو اس پختگی اور وسعت یافتہ قوت (نفس) کا کچھ نہیں بگڑے گا اس کے بعد اسے معلومات فراہم کرنے اور اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے والا اور نظام مل جائے گا۔ (ایضاً ص:۳۴۷)

اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت نظریہ ارتقاء کا اصول بقاءِ للاصلح لاگو ہوگا۔ پھر جس انسان نے اپنے نفس کو قرآنی نظام ربوبیت کے ذریعہ جس قدر پختہ کر لیا ہوگا اسی قدر اس کا نفس ابدیت (Survival of the Fittest) سے ہمکنار ہوگا۔ اس نظریہ کا دوسرا پہلو یہ بھی نکلتا ہے جن لوگوں نے اس نظام کے ذریعہ اپنے نفس کو پختہ نہیں بنایا وہ ختم ہو جائیں گے اور تربیت یافتہ نفوس جو ابدیت سے ہمکنار ہونے والے ہیں۔ ان کو معلومات فراہم کرنے کے لیے (نیا جسم نہیں) بلکہ نیا نظام بھی مل جائے گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اخروی زندگی:

اب کسی صاحب نے اس نئے نظام کے متعلق آپ سے مزید روشنی ڈالنے کی درخواست کی تو آپ نے اس کی وضاحت بدیں الفاظ فرمائی:

زندگی کی موجودہ منزل میں انسان کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ زندگی کی آئندہ منزل کے متعلق کچھ معلوم کر سکے۔ ہمارے ذرائع معلومات، ہمارے حواس و احساسات ہیں اور ان کا تعلق محسوسات و مدرکات سے ہے۔ لہٰذا ذرائع معلومات سے کچھ معلوم نہیں کر سکتے۔ آنے والی زندگی کیسی ہوگی؟ اس نظام کا کیا ہوگا؟ اس کی شکل صورت کیا ہوگی؟ ہم نہیں جان سکتے۔ اس پر البتہ ہمارا ایمان ہے کہ زندگی کا سلسلہ غیر منقطع ہے۔ اس لیے زندگی کے بعد دوسری زندگی بھی یقینی ہے۔ اب تو سائنس کی تحقیقات کا رخ بھی اس طرف ہے کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا امکان یقینی ہے۔

علاوہ ازیں اس زندگی میں اس کاوش کی ضرورت بھی نہیں کہ آنے والی زندگی کی کیفیت کیا ہوگی؟ آنے والی زندگی کا تعین قانون مکافات عمل کے لیے ضروری ہے اور جس شخص کا ایمان ہے کہ مسلسل زندگی ہے۔ اس کا یہ ایمان قانون مکافات عمل کی غیر منقطع ہمہ گیری کے لیے کافی ہے۔ یہی وہ ایمان ہے جس پر اسلامی تصور حیات کی عمارت اٹھتی ہے۔ (ایضاً ص ۳۱۰)

سائل نے جو نئے نظام پر روشنی ڈالنے کے لیے کہا تو اس کا جواب آپ نے دو صورتوں میں دیا ہے۔

۱۔ ہم موجودہ احساسات سے اس نظام کو سمجھ نہیں سکتے۔

۲۔ اس نظام کو سمجھنے کی ہمیں اس دنیا میں کوئی ضرورت نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن نے جو آخرت، یوم جزا و سزا، جنت و دوزخ کی لاتعداد تفصیلات بیان کی ہیں اور حضور اکرم ﷺ نے اپنی مکی زندگی کا بیشتر حصہ اس نئے نظام کو ہی ذہن نشین کرانے پر صرف کر دیا۔ کیا اس سے ہم صرف اس وجہ سے قطع نظر کر لیں کہ وہ نیا نظام ہمارے حیطہ ادرک سے باہر ہے۔ وحی سے روشنی حاصل کرنے اور ایمان بالآخرت کا کیا مطلب ہے؟ اب نئے نظام کے ادراک کی ضرورت تو یہ ہے کہ اسی ادراک اور عقیدہ کی بناء پر ہماری یہ دنیوی زندگی بگڑتی یا سنورتی ہے۔ اگر انہیں جاننے کی ضرورت ہی نہیں تو قرآن نے اتنی تفصیلات کیوں بیان کی ہیں؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آپ زندگی کی غیر منقطع ہونے پر ایمان صرف اس لیے نہیں رکھتے ہیں کہ اس پر اسلامی تصور حیات کی عمارت اٹھتی ہے بلکہ اس کی دوسری وجوہ بھی آپ نے بیان فرمادی ہیں۔

۱۔ اب تو سائنس کی تحقیقات کا رخ بھی اس طرف ہے کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا امکان یقینی ہے۔

۲۔ مکافات عمل کا وہ بے لچک قانون جو کائنات میں جاری وساری ہے اور جسے مادہ پرست بھی تسلیم کرتے ہیں۔

ہمارا اس خیال کو بدظنی پر محمول نہ کیا جائے۔ اگر وحی پر ایمان لانے کی بات درست ہو تو پھر نئے نظام کی تفصیل میں ہمارے موجودہ حواس پر انحصار کی ضرورت بھی کب پیش آتی ہے؟ ایمان بالغیب تو اسی چیز کا نام ہے کہ جو باتیں ہمارا حیطہ ادراک سے باہر ہیں۔ انہیں ہم صرف اس لیے درست تسلیم کریں کہ وہ بذریعہ وحی ہم تک پہنچی ہیں۔

طلوع اسلام کا تضاد:

پرویز صاحب بہرحال اس بات کے قائل ہیں کہ زندگی غیر منقطع ہے اور موت کے بعد بھی جاری رہے گی۔ لیکن آپ کے استاد جناب حافظ اسلم صاحب مرنے کے بعد اور قیامت تک درمیانی عرصہ یعنی برزخ میں کسی طرح زندگی کے قائل نہیں۔ قرآنی فیصلے میں ایک طویل مضمون عذاب قبر کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں حافظ صاحب موصوف نے بدلائل ثابت کیا ہے کہ ازروئے قرآن برزخ میں کوئی زندگی نہیں جبکہ پرویز صاحب زندگی کے غیر منقطع ہونے کے قائل ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقالہ:۱۱

کیا آغا خانی مسلمان ہیں؟ [1]

حصہ اوّل

اس حصہ میں ایسے عقائد ونظریات کا ذکر ہے جن میں کم ازکم نام کی حد تک تمام مسلمانوں اور اسماعیلیوں میں اشتراک موجود ہے:

الف: ارکانِ اسلام

۱۔کلمہ شہادت:

اسلام میں داخل ہونے کے لیے کلمۂ شہادت کا زبان سے اقرار کرنا ضروری ہے۔اس کلمہ کے دو اجزا ہیں یعنی أشهد أن لا اله الا الله اور أشهد أن محمداً رسول الله اور اگر کوئی مسلمان بھی ان دونوں اجزا یا دونوں میں سے کسی کا زبانی یا معنوی طور پر انکار کر دے، یا اس سے ایسے اعمال سرزد ہوں جن سے اس کلمہ کے کسی جزو کی تردید ہوتی ہو تو وہ شخص دائرۂ اسلام سے خارج سمجھا جائے گا۔

قادیانیوں نے اس کلمہ کے دوسرے جزو کا معنوی طور پر انکار کیا۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو تا قیامت واجب الاتباع تسلیم کرتے ہوئے ایک اور ''نبی کی نبوت'' کو تسلیم کر لیا تو پاکستان کی عدالتِ عالیہ نے اس فرقہ کو ۱۹۷۵ء میں غیر مسلم قرار دے دیا تھا۔

تمام اہل سنت کے برعکس آغا خانی (اسماعیلیہ) فرقہ کے کلمہ شہادت کے اجزا دو نہیں بلکہ تین ہیں:

أشهد أن لا اله الله وأشهد أن محمد رسول الله وأشهد أن أمير المؤمنين علي الله۔ [2]

علاوہ ازیں ان کے ہاں پہلے دو اجزا (جو سب مسلمانوں میں مشترک ہیں) کا بھی وہ مفہوم نہیں، جو دوسرے مسلمانوں کے ہاں پایا جاتا ہے۔کلمہ کے پہلے جزء لا الہ الا اللہ کا عام مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے سوا

---

[1] یہ مضمون ماہنامہ ''محدث'' مارچ ۲۰۰۵ء میں طبع ہوا۔

[2] گلشن مالا، منظور شدہ درسی کتاب، مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے ہند ممبئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کوئی معبود یا عبادت کے لائق نہیں۔ اگر چہ بعض مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کی بعض صفات الوہیت، یعنی مشکل کشائی اور حاجت روائی وغیرہ میں اپنے زندہ یا فوت شدہ بزرگوں اور پیروں کو بھی شامل کر لیا تاہم غیر اللہ کو سجدہ کرنا ایسا عمل ہے جسے مسلمانوں کے تمام فرقے حرام سمجھتے ہیں مگر اسماعیلی اپنے حاضر امام کو سجدہ کرتے اور اس کا کارِ ثواب اور اصل عبادت سمجھتے ہیں۔ درج ذیل اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

(i) ''اس دنیا میں جو مومن پہلے تھے اور جو مومن اس وقت ہیں اور جو آئندہ ہوں گے سب مومن ''شاہ پیر''❶ کی عبادت کرتے تھے، کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔''

(ii) ''پیر شاہ ہمارے گناہ بخش دیتے ہیں...... امام حاضر کو ہم ''پیر شاہ'' کہتے ہیں۔❷

(iii) امام (علی) کے ظاہر ہونے کے بعد اللہ نے اسلام کو مقبول کیا اور پیغمبر کا دور ختم ہوا، اس کے بعد کوئی پیغمبر اس دنیا میں نہیں آیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ امام کا ظہور اللہ کا ظہور ہے جس کی پہچان اللہ کی پہچان ہے جس کی بندگی اللہ کی بندگی ہے جس کی حمد اللہ کی حمد ہے جس کی بیعت اللہ کی بیعت ہے جس کی فرمانبرداری اللہ کی فرمانبرداری ہے۔''❸

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسماعیلیہ نے زبانی اقرار کے باوجود، اپنے حاضر امام میں تمام صفاتِ اُلوہیت ماننے کی بنا پر معنوی طور پر لا الہ الا اللہ کی تردید کر دی ہے، اور عملی طور پر جس کی تردید کی، اس کا بیان آگے آئے گا۔

اب کلمہ شہادت کے دوسرے جز محمد رسول اللہ کی طرف آیئے۔ اس کا عام مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحیح اور ثابت شدہ تمام اقوال و افعال قیامت تک کے لیے تمام مسلمانوں کے لیے واجب الاتباع ہیں۔ آپ ﷺ کے قول یا فعل کے مقابلے پر کسی کا قول یا فعل ترک کر دیا جائے گا۔ اسماعیلیہ کا زبانی دعویٰ یہی ہے کہ جیسا کہ اسماعیلیہ❹ تعلیمات پرائمر کے ص ۵ پر ''ذہنی مشق'' کے عنوان کے نیچے یوں لکھا ہوا ہے:

---

❶ گنان برہم پرکاش، مجموعہ مقدس گنان، ص ۲۹۷ از پیر شمس الدین، مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے ہند ممبئی

❷ شکشن مالا کے جی سبق نمبر ۴، ص ۱۲ منظور شدہ درسی کتاب مذہبی نائٹ سکول مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن ہند

❸ کلام الٰہی اور فرمان امام، ص ۵۴ از عالی جان سلطان پنجم نور محمد

❹ شائع کردہ ہز ہائی نس آغا خان شیعہ امامی اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے پاکستان، کراچی نمبر ۳

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلام:

اللہ	قرآن شریف
رسول ﷺ	حدیث شریف
حاضر امام	فرمان مبارک
پیر	گنان شریف

مگر عملاً حاضر امام کے فرمانِ مبارک کے مقام کے بالمقابل حدیث شریف کا تو ذکر ہی کیا، وہ فرمانِ مبارک قرآن کے مقابلہ میں یا تو اس کے ہم پلہ ہوتے ہیں یا اس سے بلندتر درجہ رکھتے ہیں۔ درج ذیل اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ ''قرآن شریف کی صحیح سمجھ اور اس کے چھپے بھیدوں کے صحیح معنی اور صحیح علم امام حاضر کو ہی ہوتا ہے۔ امام حاضر قرآن ناطق (بولتا ہوا قرآن) ہے، اس لیے اس کے فرمانوں کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔''[1]

۲۔ ''نزول وحی کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد زمانہ کے اماموں کی معرفت ان کے فرمانوں کی شکل میں جو ہدایات کی جاتی ہیں وہ اللہ کے کلام کے برابر ہیں۔''

۳۔ ''اللہ نے حضرت پیغمبر کی معرفت تیس پارے نازل کیے۔ (باقی دس پارے) زمانہ کے اماموں کی معرفت ان کے فرمانوں کی شکل میں ظاہر ہو رہے ہیں۔''[2]

درج بالا ہر دو اقتباسات میں فرامین حاضر امام کو قرآن کے ہم پلہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن درج ذیل فرمان میں، فرمان تو درکنار گنان کا درجہ بھی قرآن سے بڑھا دیا گیا ہے۔

ملاحظہ فرمایئے:

۴۔ ''آپ لوگوں کے لیے جو علم ہے وہ گنان ہے۔ قرآن شریف کو تیرہ سو سال ہو چکے ہیں۔ وہ ملک عرب کی آبادی کے لیے ہے۔ جبکہ گنان کو سات سو سال ہوئے ہیں اور تم لوگوں کے لیے گنان ہے اور اسی پر عمل کرنا۔''[3]

---

[1] گلشن مالا iii سبق ۲، ص ۸، درسی کتاب مذہبی نائٹ سکول، مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے ہند ممبئی

[2] کلام الٰہی اور فرمان امام، ص ۶۲، از عالی جاہ سلطان پنجم نور محمد، مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے ہند تنزانیہ

[3] کلام امام مبین آغا خان سوم کے فرامین کا مجموعہ حصہ نمبر ۱، فرمان نمبر ۱۳۱، ص ۸۱، اسماعیلیہ ایسوسی ایشن ممبئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرآن کو چھوڑنے اور گنان کو اپنانے کی وجہ بھی خوب بتلائی ہے۔ آنجہانی سر آغا خان سوم سلطان محمد شاہ اپنے فرامین کی قرآن پر بالا دستی کا اظہار یوں فرماتے ہیں:

۵۔ ''دین کی ہدایت کے لیے صرف کتابیں اور تحریری الفاظ ہی کافی نہیں۔'' (لندن جماعت خانہ: ۱۱رجون ۱۹۵۱ء) [1]

۶۔ ''اسماعیلیوں کے پاس ہدایت کے لیے کوئی تحریری کتاب نہیں بلکہ حیاتِ امام ہے۔'' (بمبئی، ۲۸ دسمبر ۱۹۴۵ء) [2]

غور فرمایئے کہ جب فرامین مبارک بلکہ گنان شریف کے مقابلہ میں قرآن شریف کی بھی کچھ حیثیت نہ ہو تو حدیث شریف کس کھیت کی مولی ہوئی؟

اب اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اسماعیلی رسول اللہ ﷺ سے اپنے امام حاضر کا درجہ بلند تر سمجھتے ہیں۔ درج ذیل سوال جواب ملاحظہ ہو:

سوال: ''پیغمبر'' یعنی ناطق اور ''اساس'' یعنی امام..... ان دونوں میں کس کا درجہ بڑا ہے؟

جواب: اساس کا درجہ بڑا ہے، کیونکہ جو کام پیغمبروں سے نہیں ہو سکتا تھا وہ ''اساس'' امام کرتے تھے اور پیغمبروں میں سے اماموں کو بنانے کا اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے ہوا تھا۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اساس کا درجہ بڑا ہوتا ہے۔ پیغمبر اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں اور اس کے ذریعہ اللہ کی پہچان کراتے ہیں جبکہ ''اساس'' یعنی امام اپنی ذاتی طاقت سے بذاتِ خود ہدایت کرتے ہیں۔ اپنی پہچان آپ کرواتے ہیں اور ان کو کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ [3]

ان تصریحات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ محمد رسول اللہ کا جو مفہوم عام مسلمان سمجھتے ہیں، اسماعیلیوں کے ہاں یکسر مفقود ہے۔

کلمہ شہادت میں اثنا عشری شیعوں نے بھی ایک تیسرے جزء علي ولي الله کا اضافہ کرلیا۔ جس کے معنی ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ اللہ کے وصی ہیں۔ یعنی اللہ کا حکم تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد انہیں خلیفہ بنایا جاتا

---

[1] پمفلٹ شان امامت، ص ۲، مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے پاکستان

[2] ایضاً۔ مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے پاکستان کراچی

[3] مارگ ورشیکا حصہ ۱، ص ۶۸ از مشنری علی بھائی بابوانی منظور شدہ درسی کتاب برائے مذہبی نائٹ سکولز مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے ہند، بمبئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اسماعیلیوں نے جو اضافہ کیا وہ أن امير المؤمنين علي الله ہے جس کے معنی ہیں کہ ''علی اللہ ہیں'' یا ''علی اللہ سے ہیں۔''

ہم اپنے اس معنی کی تائید میں درج ذیل گنان پیش کرتے ہیں:

۱۔ ''اس وقت نبی محمد نے یہ بتلایا کہ بھائی فرشتو! آپ کو ایک بہت ہی اچھی بات بتلاتا ہوں (کہ جب علی پیدا ہوئے تو) انہوں نے اپنا تعارف مجھ کو خود ہی کرایا کہ وہی (علی) تو پوری کائنات کا خالق ہے۔ اس لیے علی کو صحیح اللہ کہیے، اس عقیدہ میں ذرہ برابر کمی نہ کریں۔''[1]

۲۔ ''اوّل ہی سے جو اللہ ہے، اسے علی کہیے۔''

''نبی نے اپنے شوہر (یعنی علی) کو پہچانا''[2] (نعوذ بالله من ذلك الهفوات)

۳۔ ''جب حضور اکرم ﷺ نے شاہ علی کا دیدار کیا تو سب سے اوّل ان کو صحیح اللہ پایا۔''[3]

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ علی تو صحیح اللہ ہیں اور دوسرے امام حاضر بھی اللہ کا مظہر ضرور ہیں۔ ان کا کلام، کلام اللہ سے بڑھ کر تو ہوسکتا ہے مگر کمزور نہیں ہوسکتا۔ اب خود ہی فیصلہ کر لیجیے کہ عام مسلمانوں کے کلمہ شہادت اور اسماعیلیوں کے کلمہ شہادت کے مفہوم میں کوئی قدرِ مشترک باقی رہ جاتی ہے؟

۲۔ نماز: دوسرا رکن اسلام:

کلمہ شہادت کے بعد اسلام کا دوسرا رُکن نماز ہے جس کی قرآن میں سات سو بار تکرار سے تاکید آئی ہے۔ پانچ وقت کی نماز مسجد میں جا کر باجماعت ادا کرنا ضروری ہے۔ اسماعیلی فرقہ اس وقت نماز کا تارک ہے اور اسے تسلیم نہیں کرتا۔ وہ صلوٰۃ کے معنی ''دعا'' کر کے اس شرعی تکلیف سے آزاد ہو گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں اسماعیلی تعلیمات کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ ''ہمارے نزدیک اس (لفظ صلوٰۃ) سے مراد وہ خاص عبادت ہے جو مقررہ اوقات پر کی جاتی ہے۔ مقررہ اوقات پر دُعا پڑھنا ہر مومن پر فرض ہے۔ قرآن پاک میں دعا کے لیے صلوٰۃ کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔''[4]

---

[1] گنان مومن چیتامنی از سید امام شاہ مجموعہ مقدس گنان، ص ۱۰۷، مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے ہند، بمبئی

[2] گنان مومن چیتامنی از سید امام شاہ، ص ۱۴۴، مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے ہند، بمبئی

[3] گنان مومن چیتامنی از سید امام شاہ، ص ۱۰۶، مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے ہند، بمبئی

[4] اسماعیلی تعلیمات حصہ نمبر ۴، ص ۱۰، مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے پاکستان، کراچی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق صلوٰۃ (دعا) مومن کی معراج ہے۔"[1]

مسجد کے بجائے جماعت خانہ:

اسماعیلی چونکہ نماز نہیں پڑھتے لہٰذا اپنی "دعا گاہ" کو مسجد بھی نہیں بلکہ "جماعت خانہ" کہتے ہیں۔ جبکہ دنیا بھر کے دیگر فرقوں سے تعلق رکھنے والے مسلمان اپنی عبادت گاہ کو مسجد ہی کہتے ہیں۔ اقتباس:

"یوں تو دعا کیسے بھی ادا کی جا سکتی ہے، لیکن بہتر یہی ہے کہ دعا پڑھنے کے لیے مومن مولا کے گھر یعنی "جماعت خانہ" جائے۔[2]

دُعا بھی روزانہ صرف دو بار فرض ہے!

یعنی صبح کی اور شام کی دعا۔ آج کل جو دعا جماعت خانوں میں پڑھی جاتی ہے، یہ حاضر امام شاہ کریم حسینی کی منظور شدہ ہے جو انہوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۷۰ء کو منظور[3] فرمائی۔ اس سے پہلے یہ فرقہ صلوٰۃ یا دعا کون سی اور کیسے پڑھتا تھا، وہ ہمیں معلوم نہیں۔

موجودہ منظور شدہ دعا کے چھ حصے ہیں۔ چھٹے حصہ میں اسماعیلی اماموں کا شجرہ ہے۔ ہر حصے کے خاتمہ پر سجدہ کیا جاتا ہے جس میں پڑھا جاتا ہے: "اللهم لک سجودي و طاعتي" جب سجدہ کیا جاتا ہے تو ہر جماعت خانہ میں سامنے حاضر امام کی قد آدم تصویر موجود ہوتی ہے جس کے مطلب کے وضاحت کی ہمیں ضرورت نہیں۔ مکھی اور کامڑیا (جماعت خانہ کے منتظمین وغیرہ) کا منہ چونکہ مومنوں یا دینداروں کی طرف ہوتا ہے، اس لیے ان کے لیے ان کے سامنے علیحدہ امام کی تصویر لگی ہوتی ہے۔ اب آپ خود فیصلہ کر لیجیے کہ نماز کے سلسلہ میں اسماعیلیوں اور عام مسلمانوں کے درمیان کیا قدرِ مشترک باقی رہ جاتی ہے؟

۳۔ زکوٰۃ: اسلام کا تیسرا اہم رُکن:

جس کا حکم قرآن میں تقریباً ستر بار آیا ہے۔ اس کا عام مفہوم یہ ہے کہ ہر غنی یا صاحب نصاب مسلمان ہر سال بعد اپنی بچت کا چالیسواں حصہ نکال کر اللہ کی راہ میں دے دیتا ہے۔ زکوٰۃ، انفرادی طور

---

[1] اسماعیلی تعلیمات حصہ نمبر ۴، ص ۱۱، مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے پاکستان، کراچی

[2] ایضاً

[3] مذہبی رسومات، ص ۱، ذیلی عنوان مقدس دعا بلیٹن مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے پاکستان، کراچی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر نکالی جائے یا اجتماعی طور پر اس کا کثیر حصہ محتاج و نادار افراد کو دیا جاتا ہے، گویا زکوٰۃ کے پیسہ کا بہاؤ امیر طبقہ سے غریب کی طرف ہوتا ہے۔

اسماعیلی فرقہ میں ایسی زکوٰۃ کا تصور تک نہیں۔ اس کے بجائے ان کے ہاں کا ہر دیندار اپنی آمدنی کا دسواں حصہ (دسوند) نکال کر اپنے امام حاضر کو پیش کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ پھر اسے امام حاضر کے علاوہ اپنے پیر کے لیے بھی آمدنی کا چالیسواں حصہ نکالنا ہوتا ہے اور اس کے علاوہ شکریت اور دوسری قسم کے نذرانے الگ ہیں۔ درج ذیل گیان ملاحظہ فرمایئے:

''ست گر جی (سچے گورو جی یعنی حاضر امام) کی خدمت ''دسوند'' دیتے رہیے۔

اور چالیسواں حصہ پیر کو دیتے رہیے اور بے شمار ''شکریت'' دیتے رہیے۔

جو خلوص کے ساتھ دسوند اور شکریت دیتے ہیں، ان کی جب آخری گھڑی آئے گی (یعنی موت کا وقت) تو یہ آپ (امام) کے پاس پہنچیں گے۔''[1]

اب دیکھیے زکوٰۃ اور دسوند میں درج ذیل بنیادی فرق ہیں:

۱۔ زکوٰۃ بچت پر لگتی ہے جبکہ ''دسوند'' آمدنی پر لگتی ہے۔

۲۔ زکوٰۃ کی شرح اڑھائی فیصد یا چالیسواں حصہ ہے جبکہ دسوند کی شرح تحریر میں دس فیصد اور عملاً ساڑھے بارہ فیصد ہوتی ہے یا آٹھواں حصہ ہوتی ہے۔

۳۔ زکوٰۃ صرف مالداروں پر لگتی ہے، جبکہ دسوند امیر و غریب سب کے لیے ہے۔

۴۔ زکوٰۃ میں زکوٰۃ ادا کرنے والے کی ضروریات کا لحاظ رکھا جاتا ہے، لیکن دسوند میں کچھ خیال نہیں رکھا جاتا۔

۵۔ زکوٰۃ کی رقم کا کثیر حصہ غریبوں کی جیب میں جاتا ہے جبکہ دسوند کی رقم امام حاضر (جو پہلے ہی امیر کبیر ہیں) کی جیب میں جاتی ہے۔

۶۔ زکوٰۃ باقی مال کو معمولی قسم کی لغزشوں سے پاک کرتی ہے۔ سود یا حرام کی کمائی زکوٰۃ کو پاک نہیں کر سکتی، لیکن دسوند ادا کرنے کے بعد بقایا مال خواہ کسی طریقے سے کمایا ہو پاک ہو جاتا ہے۔

اندریں حالات دسوند کو کسی حد تک انکم ٹیکس کا نام تو دیا جا سکتا ہے لیکن اس کا اسلامی فریضہ زکوٰۃ سے کوئی تعلق نہیں۔

---

[1] گنان مومن چیتامنی از سید امام شاہ، مجموعہ مقدس گنان، ص ۱۴۰، مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے ہند، بمبئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۔روزہ:اسلام کا چوتھا رُکن:

پورے ماہ رمضان کے روزے اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان پر فرض قرار دیے ہیں لیکن اسماعیلی اس فریضہ سے بھی آزاد ہیں۔اس کے عوض ان کے ہاں درج ذیل دو طرح کے روزے رکھے جاتے ہیں:

۱۔ جمعہ بیج (یعنی وہ جمعہ جو چاند کی پہلی کو آئے) کا روزہ

''جمعہ بیج تقریباً ہر چھ ماہ میں ایک مرتبہ آتی ہے اور ہر ایک دیندار کو یہ روزہ فرض ہونے کی بنا پر اسے عمل میں لانے کی کوشش کرنی چاہیے سوائے کسی ناگزیر وجہ یا بیماری کے۔''[1]

۲۔ چاند کے بعد ساتویں تاریخ کا روزہ

''۱۹۶۲ سے مولانا حاضر امام (شاہ کریم حسینی) کے فرمان کے مطابق اس روزے کو شاہ مولا کے روزے کا نام دیا گیا ہے۔اس روزے کے دن جماعت خانہ میں گنان شریف،فرمانِ مبارک اور کلام بولا اور پڑھا جائے۔''[2]

اب دیکھیے ہر ماہ میں ایک روزہ یا سال کے ۱۲ روزے تو موجودہ امام نے ۱۹۶۲ء سے فرض کیے، اس سے پہلے اسماعیلیوں پر صرف دو روزے یعنی جمعہ بیج کے روزے فرض تھے؟ یہ دو روزے کس امام نے اور کب فرض کیے تھے؟ یہ ہمیں معلوم نہیں۔نیز ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ماہ رمضان کے تیس روزے جو اللہ نے فرض کیے تھے،وہ کس امام نے اور کب معاف کر دیئے تھے؟

۵۔حج:اسلام کا پانچواں رُکن:

ہر صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں ایک بار بیت اللہ کا حج اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے۔اسماعیلی حضرات اس فریضہ سے بھی آزاد ہیں۔کوئی اسماعیلی کاروبار کی غرض سے یا از راہِ سیر وتفریح مکہ چلا جائے اور وہاں حج یا عمرہ کر لے تو اسے اس بات کی اجازت ہے۔حج یا عمرہ کو ایک فریضہ سمجھ کر کوئی اسماعیلی ارادتاً اور تکلفاً وہاں نہیں جاتا۔

---

[1] ہماری مقدس مذہبی رسومات، ص ۲۰ بلیٹن، اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے پاکستان، کراچی، ۲۱ مارچ ۱۹۷۲ء

[2] ایضاً

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ب: دیگر اسلامی شعائر

ارکانِ اسلام کے علاوہ کچھ ایسے اسلامی شعار بھی ہیں جنہیں مسلمانوں کے سب فرقے تسلیم کرتے ہیں مگر اسماعیلیوں نے ان میں یا تو نئی راہ نکال لی ہے یا بالکل متضاد روش اختیار کر رکھی ہے اور وہ درج ذیل ہیں:

ا۔ سلام اور سلام کا جواب:

مسلمانوں کے تمام فرقوں میں مسنون سلام و جواب السلام علیکم اور وعلیکم السلام ہے، لیکن اسماعیلی فرقہ اس مسئلہ میں متضاد روش اختیار کرتا ہے۔ ان کے ہاں سلام و جواب کو مندرجہ ذیل دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

ا۔ جب کوئی دیندار جماعت خانہ میں جائے تو کہتا ہے ''ہے زندہ؟'' دوسرے اسے جواب دیتے ہیں: ''قائم پایا'' [1]

دراصل اس سوال و جواب میں اسماعیلیوں کا اپنے امام کے متعلق حي قیوم ہونے کے عقیدہ کو بار بار دہرایا جاتا ہے۔ آنے والا پوچھتا ہے: کیا ہمارا امام زندہ ہے؟ اور جواب دینے والا کہتا ہے: ''ہم نے تو اسے قائم ہی پایا ہے۔'' اس طرح ہر آن مریدوں کی ذہن سازی کی مہم جاری رہتی ہے۔

۲۔ اور جماعت خانہ سے باہر جب کسی کو سلام کہنا ہو تو کہنے والا کہتا ہے ''یا علی مدد!'' اور جواب دینے والا کہتا ہے: ''مولا علی مدد'' ان کی درسی کتاب میں یہ مضمون یوں ادا کیا گیا ہے:

''یا علی مدد'' ہمارا اسلام ہے۔ ''مولا علی مدد'' سلام کا جواب ہے۔'' [2]

۲۔ نوروز اور سالِ نو:

مسلمانوں کا ہجری سال چاند سے تعلق رکھتا ہے اور یہ یکم محرم الحرام کو شروع ہوتا ہے۔ تاہم یہ مسلمانوں کا کوئی تہوار نہیں ہے۔ اسماعیلی اس مسئلہ میں بھی متضاد روش رکھتے ہیں۔ ان کا سال شمسی ہے۔ ۲۱؍ مارچ کو شروع ہوتا ہے اور اس دن اسماعیلی تہوار بھی مناتے ہیں۔ درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

---

[1] مذہبی رسومات، ص ا، بلیٹن مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے پاکستان، کراچی

[2] گلشن مالا (درسی کتاب برائے مذہبی نائٹ سکولز) سبق ۲، ص ۶، ۷ مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن ہند، بمبئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"نوروز کی خوشی منانا اسماعیلیوں کی ایک قدیم روایت ہے۔ اس کی سالانہ مجلس ۲۱ ر مارچ کو صبح صادق کے بعد ہر ایک جماعت خانے میں منعقد کی جائے۔ ۲۱ ر مارچ کو مذہبی نقطہ گاہ سے ہمارا نیا سال شروع ہوتا ہے۔"●

اب یہ تو ظاہر ہے کہ ۲۱ مارچ (نوروز) سے مجوسیوں اور سورج پرستوں کو تو عقیدت ہو سکتی ہے مسلمانوں کا اس سے کیا تعلق؟

۳۔ تہذیب مغرب سے دلدادگی:

یہ تو سب جانتے ہیں کہ مغربی تہذیب اسلامی تہذیب کی نقیض (ضد) ہے۔ اسماعیلیوں میں عورت کا پردہ نام کی کوئی چیز نہیں۔ جماعت خانوں میں البتہ عورتوں کے بیٹھنے کی الگ جگہ مقرر ہوتی ہے، لیکن کئی قسم کی مجالس میں عورتیں اور مرد اکٹھے ہوتے ہیں۔ حاضر امام اور آپ کے باپ دادا کا تہذیب مغرب سے دلدادگی کا یہ عالم ہے کہ حاضر امام کی والدہ لارڈ پرنس کی بڑی صاحبزادی ہیں۔ آپ نے برطانیہ، سوئٹزر لینڈ اور ہاورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر کے گریجوایٹ کی ڈگری لی ہے، لیکن دینی تعلیم کی شاید آپ کو ضرورت ہی نہ تھی۔ ہوسکتا ہے کہ زیر نورِ خدا کی طرح یہ دینی علم بھی ان اماموں میں نسلاً بعد نسل از خود ہی منتقل ہوتا رہتا ہے۔

امام حاضر کے دادا آغا خان سوم ریس کورس کے انتہائی شیدائی تھے اور ان کے بیشتر گھوڑوں نے بازی جیتی ہے۔ حاضر امام اور ان کے آباؤ اجداد کا لباس اور وضع قطع بھی تہذیب مغرب کی دلدادگی پر بڑی واضح دلیل ہے۔ علاوہ ازیں تمام جماعت خانوں میں امام حاضر کی قد آدم تصاویر کی موجودگی اور آپ کے پیروکاروں کا ان کے آگے سربسجود ہونا مستزاد ہے۔ غور فرمایئے ان تمام اُمور میں سے کوئی بات بھی اسلامی نقطہ نگاہ سے ایک مذہبی رہنما کے شایانِ شان ہوسکتی ہے؟

۴۔ اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے بجائے اخفا:

ہر مسلمان پر اسلامی تعلیمات کی اشاعت فرض ہے، قولاً بھی اور عملاً بھی۔ مسلمان جہاں بھی گئے وہاں مساجد تعمیر کیں، دینی مدارس قائم کیے اور علما نے اپنی تصانیف کے ذریعہ حتیٰ الوسع دینی تعلیم کی نشر

● مذہبی رسومات، ص ۱۹، ۲۰، بلیٹن مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے پاکستان، کراچی، ۲۱ مارچ ۱۹۷۲ء

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

واشاعت کو اپنا معمول بنایا مگر اسماعیلی فرقہ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اگر کہیں ان کے جماعت خانے ہیں بھی تو وہ عوام پر بند ہیں۔ ان کے مذہبی تعلیم کے مدارس صرف نائٹ سکولز ہیں جہاں غیر اسماعیلی بچوں کو داخل نہیں کیا جاتا۔ ان کی مذہبی کتابیں صرف اسماعیلیہ ایسوسی ایشنز ہی چھاپ سکتی ہیں جنہیں کوئی غیر اسماعیلی خرید بھی نہیں سکتا۔ اس سلسلہ میں ان کی کتاب ''ہماری مقدس مذہبی رسومات'' کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''جماعت خانے کے احاطے میں جماعت کی سہولت کے لیے اسماعیلیہ ایسوسی ایشن کی طرف سے مذہبی کتابیں خریدنے کا خاص بندوبست کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ کسی بھی شخص یا ادارے کو مذہبی کتاب جمع کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ کسی خاص حالات کے تحت اسماعیلیہ ایسوسی ایشن کی طرف سے اجازت لی گئی ہو۔'' ●

اسلام افشاء وتبلیغ کا دین ہے جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ کو ﴿بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ﴾ اور ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ کا حکم تھا۔ اس لحاظ سے اسماعیلی مذہب اسلام کے عین ضد ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس فرقہ کی کچھ تعلیمات ایسی بھی ہیں جنہیں یہ اوراق میں منتقل ہونے ہی نہیں دیتے بلکہ یہ راز ایسے ہیں جو سینہ بہ سینہ چلتے ہیں۔ جیسا کہ ابوعبداللہ شیعی کے متعلق پانچویں درسی کتاب میں لکھا ہے کہ

''حضرت امام رضی عبداللہ علیہ السلام (اسماعیلیوں کے دسویں امام) نے ابوعبداللہ کو لائق اور قابل آدمی دیکھ کر داعی ابن حوشب کے پاس تعلیم کی غرض سے یمن بھیج دیا۔ چنانچہ ان کے زیر تربیت ابوعبداللہ نے اسماعیلی مذہب کے راز سیکھے۔ جب اسماعیلی تعلیمات میں بالکل پختہ ہو گئے تو حضرت امام علیہ السلام کے حکم سے آپ کو داعی بنا کر مغرب (شمالی افریقہ) کی طرف بھیج دیا گیا۔'' ●

اسماعیلی راہبوں کو کیا راز سکھلائے جاتے تھے؟ یہ بات ان کے لٹریچر سے نہیں مل سکتی۔ اس فرقہ کا ایک عظیم داعی حسن بن صباح (م ۱۱۲۴ء/۵۱۸ھ) بھی تھا جس کے متعلق لکھا ہے کہ وہ

''حضرت امام مستنصر باللہ کے زمانے کے ایک عظیم داعی اور بہادر فدائی تھے۔ جنہوں نے قلعہ الموت فتح کیا تھا۔'' ●

● مذہبی رسومات، ص ۲۰ بلیٹن شائع کردہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے پاکستان، کراچی، ۲۱ مارچ ۱۹۷۲ء

● اسماعیلی تعلیمات حصہ نمبر ۵، ص ۳۷، مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے پاکستان، کراچی

● اسماعیلی تعلیمات حصہ ۳، ص ۲۳، مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے پاکستان، کراچی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اب اس عظیم داعی کے کردار سے کچھ نہ کچھ اُن خفیہ رازوں پر روشنی پڑ جاتی ہے۔اس داعی کا کردار یہ تھا کہ وہ

''ایک دہشت پسند اور خفیہ جماعت کا بانی تھا۔اس نے کوہ البرز میں واقع قلعہ اَلمُوت (اَلمُوط) کو فتح کیا، وہ اپنے مریدوں کو حشیش پلوا کر بے ہوش کر دیتا تھا۔پھر وہ انہیں اس فردوس میں پھراتا جو اس نے وادی الموت میں بنائی تھی۔اس بہشت میں اس نے بہت سی خوبصورت عورتیں رکھی ہوئی تھیں۔اس دہشت پسند جماعت کے ارکان کو فدائین کہا جاتا تھا اور ان فدائین سے مشہور ہستیوں کے قتل کرنے کا کام لیا جاتا اور اس کے عوض انہیں بہشت میں رہائش مہیا کی جاتی تھی۔اس کے جانشین صدیوں اپنے فدائیوں کے بل بوتے پر اپنے ملحدانہ خیالات کی نشر و اشاعت کرتے رہے۔وسطِ ایشیا کے بڑے بڑے حکمران ان سے لرزہ براندام رہتے تھے۔آخر ساتویں صدی ہجری میں ہلاکو خان نے قلعہ الموت کو فتح کیا اور ان کی پشت اور ملجاء وماویٰ کو تہس نہس کر کے ایک عالم کو ان کے مظالم سے رہائی دلائی۔'' ●

غالباً ایسے ہی کچھ راز ہوتے تھے جو اس فرقہ کے داعیوں کو سکھلائے جاتے تھے۔

حصہ دوم

اس حصہ میں چند ایسے اُمور کا ذکر کیا جائے گا جو اسماعیلی فرقہ میں تو روحِ رواں کی حیثیت رکھتے ہیں، مگر اسلام سے ان کا کچھ تعلق نہیں ہے۔اور یہ دو طرح کے ہیں:

(۱) عقائد سے متعلق اور (۲) عبادات وشعائر سے متعلق

الف: اسماعیلی عقائد

عقائد سے متعلق تین اُمور قابل ذکر ہیں:

(۱) امامت (۲) نورِ امامت (۳) شانِ امامت

ا۔امامت:

امامت کا عقیدہ صرف اسماعیلیوں میں ہی نہیں بلکہ شیعہ حضرات کے تمام فرقوں میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔قرآن کریم کی رو سے مسلمانوں کا امام صرف ان میں ان کا سب سے متقی شخص ہی ہو سکتا ہے

● ماخوذ از (۱) فیروز اللغات فارسی حصہ اول، ص ۳۶۶ (۲) انسائیکلوپیڈیا اُردو فیروز سنز اور (۳) دائرۃ المعارف الاسلامیہ مطبوعہ پنجاب یونی ورسٹی زیر عنوان 'حسن بن صباح'

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور تقویٰ کا نسلاً بعد نسل اولاد اور ان کی اولاد میں منتقل ہوتے چلے جانا عقلاً محال ہے۔ دورِ نبوی ﷺ سے پہلے کی پوری انسانی تاریخ میں صرف ایک مثال ایسی ملتی ہے جہاں چار پشتوں تک یہ سلسلہ رہا۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی تھے، پھر ان کے بیٹے اسحق علیہ السلام نبی ہوئے، پھر ان کے بیٹے یعقوب علیہ السلام نبی ہوئے اور پھر ان کے بیٹے یوسف علیہ السلام نبی ہوئے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔ اب اثنا عشری تو یہ سلسلہ بارہ اماموں تک چلا کر بارہویں امام کو غائب بتلاتے ہیں، جبکہ اسماعیلی (نزاری) اور بوہرے اس کو تاقیامت جاری رکھنے کے قائل ہیں۔ اس وقت نزاری اسماعیلیوں کے ۴۹ ویں امام شاہ کریم حسینی ہیں اور مستعلوی اسماعیلیوں یا بوہروں کے ۵۱ ویں امام ملا طاہر سیف الدین ہیں۔

اسماعیلی بھی ابتداءً کسی امام کے غائب ہونے اور پھر کسی وقت بطورِ امام مہدی اس کے ظاہر ہونے کے قائل تھے، جیسا کہ ان کا اپنے ساتویں امام محمد بن اسماعیل کے متعلق عقیدہ تھا اور اسی لیے اس فرقہ کو سبعیہ (یعنی سات اماموں والا) بھی کہتے ہیں جبکہ اثنا عشری اپنے اماموں کا سلسلہ چلا رہے تھے۔ پھر جب اثنا عشری نے اپنے بارہویں امام، امام مہدی کے غائب ہونے اور دوبارہ کسی وقت ظاہر ہونے کے عقیدہ کو اختیار کر لیا تو اسماعیلیوں کے عقیدہ میں غالباً رقابت کے طور پر ایک بنیادی تبدیلی یہ آئی کہ انہوں نے اپنے پہلے عقیدہ کو چھوڑ کر از سر نو امامت کے سلسلہ کو جاری کر دیا۔● جو آج تک جاری ہے۔

شیعانِ علی نے ابتدا ہی میں یہ تو طے کر لیا کہ امامت اولادِ علی رضی اللہ عنہ کا حق ہے مگر اس کی جزئیات میں بہت سے اختلافات واقع ہوئے، مثلاً امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہو یا صرف بنو فاطمہ رضی اللہ عنہا میں، کیسانی فرقہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد بن حنفیہ کو امام تسلیم کر لیا اور الگ فرقہ بن گیا۔ لیکن شیعہ کے باقی فرقے صرف بنو فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ہی امامت کا حقدار سمجھتے ہیں اور عجیب تر بات یہ ہے کہ اسماعیلی حضرت فاطمہ کے بڑے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو امامت سے خارج کر دیتے ہیں، جبکہ اثنا عشری دوسرا امام حضرت حسن رضی اللہ عنہ ہی کو تسلیم کرتے ہیں۔

نسلی امامت کے سلسلہ میں اس اختلاف کا بھی فیصلہ نہ ہو سکا کہ آیا یہ امامت صرف بڑے بیٹے کا حق ہے یا چھوٹا بھی امام بن سکتا ہے۔ اسماعیلیوں نے امام جعفر صادق رحمہ اللہ کے بڑے بیٹے کو امام تسلیم کیا حالانکہ وہ امام جعفر صادق (م ۱۴۸ھ) کی وفات سے پانچ سال پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔ اثنا عشری

● دائرۃ المعارف الاسلامیہ، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور، زیر عنوان 'اسماعیلیہ'

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کے چھوٹے بیٹے موسیٰ کاظم کو امام تسلیم کرتے ہیں پھر اسماعیلیوں میں سے بھی کچھ لوگ چھوٹے بیٹے کی امامت کے قائل ہو گئے۔ مستعلوی بوہرے اسی وجہ سے نزاریوں سے الگ ہوئے کہ انہوں نے مستنصر باللہ کے چھوٹے بیٹے مستعلی کو امام تسلیم کر لیا، جو اس وقت سلطان تھے اور بڑے بیٹے نزار اور ان کے بیٹے ان کی قید میں تھے۔

تیسرا اختلاف بعض اماموں کے مستور ہونے یا ان کو مستور کر دینے سے ہوا۔ مستور ہونے، پھر قیامت کے قریب ظاہر ہونے کا عقیدہ تقریباً سب شیعہ فرقوں میں پایا جاتا ہے۔ کسی فرقہ کے نزدیک تو حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی فوت نہیں ہوئے بلکہ بادلوں میں مستور ہیں۔ اسماعیل بھی مستور تھے، محمد بن اسماعیل بھی، اثنا عشری کے بارہویں امام مہدی بھی اور مستعلیوں کے امام طیب بھی۔ ایسے ہی اختلافات نے شیعوں کو بے شمار فرقوں میں تقسیم کر دیا۔

اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق امامت کو بطورِ حق نسلاً بعد نسل آگے منتقل کرنے کا عقیدہ سراسر اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اماموں کے معصوم ہونے اور ان کی غیر مشروط اطاعت کا عقیدہ معنوی طور پر عقیدۂ ختم نبوت کا نقیض (متضاد) ہے۔

۲۔ نورِ امامت:

نورِ امامت اسماعیلیوں کا برتر اُصول ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا نور حضرت علیؓ میں منتقل ہوا۔ وہ خدا کے اوتار تھے۔ پھر یہ نور نسلاً بعد نسل ان کے اماموں میں منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اسماعیلی اپنے امام حاضر کو حاضر ناظر سمجھتے ہوئے اس سے رفع حاجات اور مشکل کشائی نیز گریہ وزاری کی دعائیں حتیٰ کہ سجدہ بھی یہ سمجھ کر کرتے ہیں کہ ان کے امام میں اللہ کا نور منتقل ہو کر آ چکا ہے۔ لہٰذا ان کا حاضر امام خدا کا قائم مقام یا اوتار ہے۔

انتقالِ نور کے سلسلہ میں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ صرف بڑے بیٹے کی طرف ہی منتقل ہوتا ہے یا دوسرے کی طرف بھی ہو سکتا ہے؟ اگر یہ صرف بڑے بیٹے کی طرف ہی منتقل ہوتا ہے تو حضرت حسن کو اس نور سے کیوں محروم کیا جاتا ہے اور حضرت حسین میں یہ نور کیوں تسلیم کیا جاتا ہے؟ اور اگر یہ چھوٹے بیٹوں کی طرف بھی منتقل ہو سکتا ہے تو اثنا عشریوں کا کیا قصور ہے جنہوں نے بڑے بیٹے اسماعیل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی غیر موجودگی یا وفات کی وجہ سے چھوٹے بیٹے موسیٰ کاظم کو امام تسلیم کر لیا تھا یا بوہروں کا کیا قصور ہے جنہوں نے اس نور کو نزار کے بجائے مستعلی میں تسلیم کر لیا تھا۔

انتقالِ نور کے سلسلہ میں یہ بات بھی باعثِ تعجب ہے کہ ۱۱ر جولائی ۱۹۵۷ء کو آغا خان سوم سلطان محمد شاہ نے اپنے بڑے بیٹے پرنس علی خان اور چھوٹے بیٹے پرنس صدر الدین دونوں کی موجودگی میں اپنے پوتے یعنی پرنس علی خان کے بیٹے شاہ کریم حسینی کے امام حاضر ہونے کا اعلان کیا اور بیٹیوں کو امامت اور نورِ امامت سے محروم کر دیا۔ اس واقعہ سے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انتقالِ نور کا صرف امام حاضر کو ہی علم ہوتا ہے اور دوسروں کو اس وقت معلوم ہوتا ہے جب امام حاضر اعلان کرے۔ یہ اُصول بھی واقعات پر فٹ نہیں بیٹھتا۔ اس طرح تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ دونوں ہی امامت اور نورِ امامت سے محروم ہو جاتے ہیں کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات سے قبل کسی کی بھی امامت کا اعلان نہیں فرمایا تھا۔ اسی طرح جناب اسماعیل بھی اپنے بیٹے محمد کے امام ہونے کا اعلان نہ کر سکے تھے اور اس کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

بہر حال انتقالِ نور کے سلسلہ میں ان کے ہاں کوئی مستقل اصل نظر نہیں آتی۔ اسی بے ضابطگی کی وجہ سے اسماعیلی مذہب دورِ فاطمین سے لے کر آج تک تفرقہ وتشتت کا شکار ہو کر روبہ انحطاط چلا آ رہا ہے۔

۳۔ شانِ امامت:

ہم کلمہ طیبہ کے بیان میں ذکر کر آئے ہیں کہ اسماعیلیوں کے امام حاضر کا کلام یا فرامین مبارکہ درجہ میں کلام اللہ کے برابر یا اس سے بڑھ کر تو ہو سکتا ہے، اس سے کم تر نہیں ہو سکتا۔ ان کے نزدیک امام معصوم بھی ہوتا ہے اور کلام اللہ کا حقیقی علم صرف اسے ہی ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ دراصل شانِ رسالت اور ختم نبوت دونوں کا نقیض ہے۔

شانِ امامت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس سے ایسے ہی عاجزی وزاری سے دعا کی جانی چاہیے، مثلاً ان درج ذیل گریہ وزاری کی دعائیں ملاحظہ فرمائیے:

''یا نور مولانا شاہ کریم حسینی حاضر امام! چاند رات کے تمام ممبران کی اور حاضر جماعت کی کل مشکلات آسان کریں۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''یا مولانا حاضر امام! گت جماعت کے کل گناہ معاف کریں۔''
''یا مولانا حاضر امام! گت جماعت کو دسوند شکریت میں پورا رکھیں۔''
''یا مولانا حاضر امام! گت جماعت کو حقیقی سمجھ عطا فرمائیں۔''
''یا مولانا حاضر امام! گت جماعت کا ایمان سلامت رکھیں۔''
''یا مولانا حاضر امام! گت جماعت کو سکھی، سلامت آباد رکھیں۔''
''یا مولانا حاضر امام! گت جماعت کو اپنے گھر کی اور گت جماعت کی خدمت کرنے کی اعلیٰ توفیق دے۔''
''یا مولانا حاضر امام! گت جماعت کو عبادت، بندگی کرنے کی اعلیٰ ہمت بخشیں۔''
''یا مولانا حاضر امام! گت جماعت کو اپنا ظاہری، باطنی، نورانی دیدار نصیب کریں۔''
''یا مولانا حاضر امام! گت جماعت کی عرض و نیتی گریہ وزاری اپنے حضور پرنور میں قبول کریں۔''[1]

سو یہ ہے شانِ امامت...... بتلایئے یہ شان اللہ تعالیٰ سے کسی صورت کم ہے؟

ب: عبادات وشعائر

مندرجہ ذیل عبادات وشعائر فرقہ اسماعیلیہ میں تو موجود ہیں، لیکن اسلام سے ان کا کوئی تعلق نہیں:

ستاڑے ڈالنا:

ستاڑے اسماعیلیوں کی ایک مذہبی رسم ہے جس میں سات دن تک تسبیح پڑھی جاتی اور دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ اس رسم کو جماعت خانے میں اس وقت ادا کیا جاتا ہے جب ملک کو جنگ، سیلاب، زلزلے، قحط یا ایسی ہی کسی دوسری آفت کا سامنا ہو۔

اسی طرح اگر کسی مومن پر کوئی بُرا وقت آن پڑے تو ستاڑا ڈالا جاتا ہے اور پوری جماعت مل کر اس مشکل کے لیے دعائیں کرتی ہے۔ علاوہ ازیں روحانی بہبودی حاصل کرنے کے لیے ستاڑے ڈالے جاتے ہیں۔[2]

ستاڑے کی تسبیح کا طریقہ:

''دوسری دعا کے بعد یا علی، یا محمد، کی تسبیح پوری ہونے پر ایک وینتی کا پاٹھ (ایجی کرپا کرہے دکھ دارید

---

[1] مذہبی رسومات، ص۹ بلیٹن مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے پاکستان، کراچی، ۲۱ مارچ ۱۹۷۲ء
[2] اسماعیلی تعلیمات، حصہ نمبر۵، ص۲۶ مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے پاکستان، کراچی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نکاڑو) بولا جائے اور اس کے بعد مندرجہ ذیل تسبیح نکالی جائے: اللّٰہ الصمد (۱۱دانے) سبحان اللّٰہ (۱۱دانے) بی بی فاطمہ کی تسبیح اللّٰہ اکبر (۱۱دانے) سبحان اللّٰہ (۱۱دانے) الحمد للّٰہ (۱۱دانے) اس کے بعد جماعت کی گریہ وزاری کی دعائیں ہیں جس میں مندرجہ ذیل دعاؤں کا اضافہ کیا جائے:

یا نور مولانا شاہ کریم حسینی حاضر امام ستاڑے کی برکت سے گت جماعت کے کل گناہ معاف کریں۔ جماعت پر رحم کریں اور راضی ہوں۔ گت جماعت کی کل مشکلات، آفت اور بیماریاں دور کریں۔ گت جماعت کی نیک اُمیدیں پوری کریں۔'' [1]

یہ ستاڑے ڈالنا اتنی اہم عبادت ہے، جو سال میں چار دفعہ ضرور کرنی ہے۔ چھوٹے گاؤں میں کسی خاص حالت کے تحت کم تعداد میں ستاڑے ڈالے جاسکتے ہیں، تاہم سال میں ایک مرتبہ ستاڑا ڈالنا لازمی ہے۔ [2]

۲۔ نادی:

مؤمن جماعت خانہ میں جاتا ہے تو امام حاضر کی مہمانی کے طور پر کوئی نہ کوئی چیز پلیٹ میں رکھ کر ساتھ لے جاتا ہے اور مکھی کا مڑیا کے سامنے رکھی ہوئی تپائی پر (جسے وہ اپنی زبان میں پاٹ کہتے ہیں) رکھ دیتا ہے۔ پاٹ پر ایسی اشیاء کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ نیز یہ اشیاء جب تبرک کا مقدس درجہ حاصل کر چکتی ہیں تو ان کی جماعت خانہ میں بر سر عام بولی کر دی جاتی ہے۔ متبرک ہونے کی وجہ سے ان اشیاء کی قیمت میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی بولی یا نیلامی کا نام ان کی زبان میں ''نادی'' ہے۔ نادی سے یہ رقم ہر جماعت خانہ میں روزانہ ہزاروں تک جا پہنچتی ہے اور تہواروں کے دن تو اس آمدن میں اور بھی زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایسی تمام رقوم امام حاضر کے کھاتے میں جمع ہو جاتی ہیں اور اس طرح اسماعیلی روزانہ اپنے امام کی مہمانی کا حق ادا کرتے رہتے ہیں۔

۳۔ چھانٹے:

اگر عام پانی پر نادعلیًا والی مشہور مشرکانہ رباعی پڑھ کر تین بار اس پانی پر دم کیا جائے تو یہ پانی چھانٹے (یا چھینٹے مارنے) کے لیے تیار ہے۔ یہ چھانٹے'' (i) گناہوں کی معافی کے لیے (ii) دسوند میں بھول چوک کے لیے (iii) قیامت کے دن کی شفاعت کے لیے (iv) بیمار کے بستر پر شفا اور صحت کے

---

[1] مذہبی رسومات، ص ۱۵ بلیٹن مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے پاکستان، کراچی، مورخہ ۲۱ مارچ ۱۹۷۲ء

[2] مذہبی رسومات، ص ۱۵ بلیٹن مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے پاکستان، کراچی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیے (v) غسل میت کے بعد مغفرت کے لیے وغیرہ وغیرہ ڈالے جاتے ہیں۔ چھانٹے کی رسم کے وقت چھانٹے ڈالوانے والا ''بندہ گناہ گار گت بخشے شاہ پیر بخشے'' کہے۔ اس کے بعد چھانٹا ڈالنے والا شخص تین مرتبہ چھانٹا ڈالتے ہوئے ہر بار ''فرمان'' کہے اور اس وقت چھانٹا ڈلوانے والا ''یا علی، یا محمد'' کہے۔''[1]

اسماعیلیوں کی اس مذہبی رسم کی اہمیت ان مواقع سے بخوبی لگائی جا سکتی ہے جن پر ہم نے نمبر لگا دیے ہیں۔

۴۔ گناہوں کی معافی:

امام حاضر کی مہمانی کے بہت سے طریقے اسماعیلیوں میں رائج ہیں۔ پہلا تو وہی ہے جس کا ذکر نادی کے سلسلہ میں آ چکا ہے۔ اقتباسِ ذیل میں اس طریقہ کے علاوہ دوسرے بھی چند طریقوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

''جب یہ ممکن نہ رہا کہ امام الوقت مریدوں کے گھر جا کر ان کی دعوت قبول فرمائیں تو مریدوں نے امام کی مہمانی جماعت خانہ میں کرنی شروع کی۔ آج بھی مہمانی جماعت خانہ میں روزانہ پیش کی جاتی ہے۔ مرید اسے روزمرہ کی کھانے پینے کی اشیاء کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ عموماً تہواروں پر مہمانی جوش و خروش کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔

''مولانا حاضر امام کی تشریف آوری کے موقع پر بھی نہ صرف مرید اپنے خاندانوں کی جانب سے مہمانیاں پیش کرتے ہیں بلکہ اداروں کی جانب سے بھی مہمانیاں پیش کی جاتی ہیں۔ چنانچہ محبت کا یہ اظہار امام کی محبت حاصل کرنے کے لیے ہے۔''[2]

اب مریدوں نے امام کی محبت حاصل کرنے کے لیے یا اماموں نے ''محبت حاصل کرنے'' کے نام پر مریدوں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے جو طریقے وضع کیے ہیں، ان میں چند ایک کا ذکر تو اقتباس بالا میں آ چکا اور چند ایک یہ ہیں:

(i) پنج بارہ سال کی منڈلی (مجلس) میں شامل ہونے کا ہدیہ ۷۵ روپے تھا، اب گرانی کی وجہ سے شاید ریٹ بڑھ گیا ہے۔

---

[1] مذہبی رسومات، ص ۶ بلیٹن مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے پاکستان، کراچی، مورخہ ۲۱ مارچ ۱۹۷۲ء

[2] اسماعیلی تعلیمات، حصہ چہارم، ص ۱۶، ۱۷، مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے پاکستان، کراچی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ii) بیت المال کی منڈلی (مجلس) میں شامل ہونے کا ہدیہ ۲۸۰ روپے تھا، اب گرانی کی وجہ سے شاید ریٹ بڑھ گیا ہے۔

(iii) اور اگر یکمشت پانچ ہزار روپے ادا کر دیئے جائیں تو زندگی بھر کی مہمانی کا حق ادا ہو جاتا ہے اور ایسے آدمی کو امام سے اور امام کو ایسے آدمی سے بہت محبت ہوتی ہے اور اس کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ (لائف مجلس)

(iv) اور اگر کوئی بیس ہزار روپے یکمشت ادا کر دے تو اس کی محبت کے کیا کہنے۔ ایسا آدمی نور علیٰ نور کے درجہ پر فائز ہوتا ہے۔ گناہ سے بالکل پاک صاف ہو جاتا ہے اور مرتے ہی سیدھا جنت الفردوس میں جا پہنچتا ہے۔ بسا اوقات نوبیاہتا جوڑے یکمشت چالیس ہزار روپے ادا کر کے جنت میں سیٹیں کنفرم کرا لیتے ہیں۔

یہ اور اس قسم کے کئی نذرانے ہیں، مثلاً بیعت کرنے کے، نومولود کا نام رکھنے کے یا نوبیاہتا جوڑے پر ہاتھ رکھنے کے وغیرہ وغیرہ جن سے امام کی مہمانی اور محبت حاصل کی جاتی ہے اور یہ ایسے اُمور ہیں جن کا ذکر ان کے لٹریچر میں آنا محال ہے۔ غور فرمایئے، اسلام میں ایسی مہمانیوں اور رقوم لے کر گناہ سے معافی کے اعلان کر دینے کی کوئی گنجائش ہے؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقالہ:۱۲

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور متصوفین •

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے مختصر حالاتِ زندگی:

امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ کو (مطابق ۱۲۶۳ء) شام کے ایک گاؤں حران میں پیدا ہوئے۔ ساتویں پشت پر آپ کی لکڑ دادی کا نام تیمیہ تھا۔ اسی نسبت سے تیمیہ کی تمام اولاد ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کہلائی۔ آپ کا نام احمد، لقب تقی الدین اور کنیت ابوالعباس ہے، شجرہ نسب اس طرح ہے: تقی الدین ابو العباس احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام بن عبداللہ بن ابی القاسم بن محمد بن تیمیہ۔

پانچ برس کی عمر تک اپنے گاؤں حران میں قیام پذیر رہے اور ابتدائی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی۔ چھٹے سال آپ کے والد ماجد عبدالحلیم آپ کو اپنے ہمراہ دمشق لے گئے۔ آپ کے والد دمشق کے مدرسہ السکریہ میں شیخ الحدیث تھے، اسی مدرسہ میں امام صاحب کو حصولِ تعلیم کی غرض سے داخل کیا گیا۔ بلا کا حافظہ پایا تھا۔ لہٰذا سترہ سال کی عمر میں ہی تحصیل علم سے فراغت حاصل کر لی۔ آپ کے حافظہ کے متعلق کئی ایک واقعات مشہور ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ جب آپ کے حافظہ کا شہرہ ہوا تو حلب کے ایک شیخ محض اس غرض سے دمشق تشریف لائے کہ اس نوخیز طالب علم کے حافظہ کا امتحان کریں۔ چنانچہ وہ اس راستہ میں منتظر بیٹھ گئے، جس راستہ سے امام موصوف اپنے مدرسہ کو جایا کرتے تھے۔ شیخ موصوف نے آپ کو بلا کر کہا، بیٹے آپ کے پاس جو تختی ہے، اسے صاف تو کرو۔ تختی صاف ہونے پر شیخ نے امام صاحب کو اس تختی پر تیرہ حدیثیں لکھوا دیں۔ تختی بھر گئی تو شیخ موصوف کہنے لگے کہ بیٹا، اب انہیں پڑھ کر سُنا دو۔ آپ نے تختی پر ایک نظر ڈالی، پھر یہ تختی شیخ کے حوالے کر کے کہنے لگے کہ میں یہ ساری حدیثیں زبانی ہی سنا دیتا ہوں۔ چنانچہ آپ نے یہ سب حدیثیں فرفر سنا دیں۔ شیخ صاحب بہت متعجب ہوئے اور مزید توثیق کی خاطر تختی صاف کرا کے دوبارہ اتنی ہی احادیث مع اسناد لکھوا دیں۔ امام صاحب نے اب

• یہ مضمون ''حرمین'' اکتوبر، نومبر ۱۹۹۱ء میں طبع ہوا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی بار بھی ایک نظر ان احادیث پر ڈالی اور تختی شیخ کے ہاتھ میں تھما کر سب احادیث بمعہ اسناد زبانی سنا دیں۔ شیخ موصوف بہت حیران ہوئے۔ جو کچھ انہوں نے سنا تھا، اس سے بڑھ کر امام صاحب کو پایا اور سمجھ گئے کہ کسی دن یہ ہونہار طالب علم شہر علم پر آفتاب بن کر چمکنے والا ہے۔

اسی طرح کا دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک دن آپ کے گھر والوں نے تفریح کا پروگرام بنایا۔ والد بزرگوار نے آپ کو بھی اس تفریح کے پروگرام میں شامل ہونے کو کہا، لیکن آپ نے اسے تضیع وقت سمجھتے ہوئے ساتھ جانا پسند نہ کیا۔ گھر کے دوسرے لوگ چلے گئے اور جب شام کو واپس آئے تو اس پروگرام کی کامیابی پر مسرت کا اظہار کرنے لگے۔ آپ کے والد نے کہا، اگر تم ساتھ جاتے تو یقیناً لطف اندوز ہوتے۔ آپ نے فرمایا، میری اصل خوشی تحصیل علم میں ہے۔ اگر میں آپ کے ساتھ چلا جاتا تو یہ کتاب یاد نہ کر سکتا تھا۔ والد بزرگوار نے وہ کتاب آپ کے ہاتھ سے لے کر جستہ جستہ مقامات سے پوچھنا شروع کر دیا۔ اور جب آپ نے ہر ہر مقام سے آگے کی عبارت سنا دی تو انہوں نے کہا: بیٹا، اس واقعہ کا کسی اور سے ذکر نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ کسی کی نظر لگ جائے۔

ممکن ہے ان واقعات میں کچھ مبالغہ آرائی کا رنگ بھی شامل ہو، کیونکہ ایسے واقعات عموماً مشاہیر کی وفات کے بعد ہی لکھے جاتے ہیں۔ لیکن جب ہم آپ کی تصانیف کے داخلی امور کو بنظرِ غائر دیکھتے ہیں تو ایسے واقعات کی از خود تصدیق ہو جاتی ہے۔ آپ کو تحصیل علم کے بعد سترہ برس کی عمر میں ہی فتویٰ کی اجازت مل گئی تھی۔ جب بائیس برس کے ہوئے تو ۳۰ ذی الحجہ ۶۸۲ھ کو آپ کے والد ماجد انتقال کر گئے، اور آپ اپنے والد بزرگوار کی جگہ حکومت کی طرف سے مدرسہ السکریہ کے شیخ الحدیث مقرر ہوئے۔ ۲ محرم ۶۸۳ھ کو آپ نے افتتاحی درس دیا۔ چونکہ آپ کے حافظہ اور علم کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا، لہٰذا اطراف و جوانب کے علماء و فقہاء کثیر تعداد میں اس درس میں شریک ہوئے۔ آپ نے اس افتتاحی درس میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے تفسیری نکات اس انداز سے بیان کیے کہ سامعین حیران رہ گئے۔

افتاء، تدریس اور تبلیغ کے علاوہ آپ کا چوتھا کام ملکی سیاست میں زبانی اور عملی دونوں طرح سے حصہ لینا تھا، گویا آپ صرف اہل بزم ہی میں سے نہ تھے، اہل رزم میں سے بھی تھے۔ جب بغداد پر قبضہ کرنے کے بعد تاتاریوں نے شام اور مصر کا رُخ کیا۔ تو آپ نے اپنی پر جوش تقریروں کے ذریعہ لوگوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں جہاد کی رُوح کو بیدار کیا اور ان کے منجمد خون کو حرارت پہنچائی۔ پھر عملی طور پر بھی جہاد میں نہایت جرأت وشجاعت سے حصہ لیا، تا آنکہ تاتاریوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔

ساتویں صدی ہجری میں جس قدر شرک وبدعات کو فروغ ہوا، شاید ہی کسی دور میں ہوا ہوگا۔ لہٰذا آپ کو چوطرفہ لڑائی لڑنا پڑی۔ آپ کتاب وسنت کی اتباع میں اس قدر متشدد تھے کہ ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہٹنا گوارا نہ فرماتے تھے۔ جہاں کہیں بھی کتاب وسنت کے خلاف کوئی بات دیکھتے، نہایت جرأت و بے باکی سے حق کا برملا اظہار کر دیتے تھے۔ جن جن فرقوں، یا لوگوں سے آپ کو سابقہ پڑا، ان میں سے قابلِ ذکر یہ ہیں:

(۱) مبتدعین (۲) منطقیین، (۳) متصوفین، (۴) مقلدین، (۵) شیعہ، (۶) عیسائی اور یہودی۔ آپ علم وفضل کے لحاظ سے یگانہ روزگار تھے اور حکومت اور عوام میں آپ کی مقبولیت بھی تھی، تاہم جس بے باکی سے آپ نے مندرجہ بالا فرقوں کو اپنی تنقید کا ہدف بنایا تھا، اس کا لازمی نتیجہ یہی کچھ ہونا چاہیے تھا کہ آپ کی مقبولیت سے آپ کی مخالفت بھی زیادہ ہو۔ یہ کوئی نرالی بات بھی نہیں، دنیا کا دستور ہی یہ ہے کہ جب بھی کوئی دینی یا اصلاحی تحریک اٹھتی ہے تو جس قوت سے اُبھرتی ہے، اس سے زیادہ قوت کے ساتھ اس کی مخالفت ہوتی رہی ہے۔ دنیائے انسانیت میں انبیائے کرام علیہم السلام ایسا مصلح انسانیت اور کون ہوسکتا ہے؟ پھر یہ کیسی تلخ حقیقت ہے کہ اسی برگزیدہ گروہ کی سب سے زیادہ مخالفت ہوتی رہی ہے، اور انہی پاکباز ہستیوں کو سب سے زیادہ مصائب وآلام سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

آپ کے مخالفین نے آپ کو زندگی بھر پریشان کیا۔ آپ پر کفر کے فتوے بھی لگائے گئے، اور آپ کو دوبار قید میں بھجوانے میں بھی کامیاب ہوگئے۔ پہلی دفعہ دو سال (۷۰۷ھ تا ۷۰۹ھ) قید میں کاٹے۔ اور دوسری بار رجب ۷۲۵ھ میں قید میں ڈالے گئے، تو بالآخر تین سال بعد ذی قعدہ ۷۲۸ھ میں قید خانہ میں ہی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ قید خانہ میں بہت خوش رہے کیونکہ یہاں آپ کو سکون سے کام کرنے کا موقع ملا۔ آپ اپنے مخالفین کو دعائیں دیا کرتے تھے، جنہوں نے آپ کو قید میں بھجوانے کی کوششیں کی تھیں۔ جب قید میں بھی آپ نے اپنے مخالفین کا جواب لکھنا شروع کر دیا، تو انہوں نے سلطان سے شکایت کر کے آپ سے قلم دوات، کتابیں اور تحریریں بھی اٹھوا لیں، جو ساٹھ کتابوں اور ۱۷ کاغذات کے بستوں پر مشتمل تھیں۔ اس بات سے آپ کو بہت زیادہ صدمہ ہوا اور بالآخر آپ نے کوئلہ سے خطوط لکھنا شروع کر دیئے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اگر چہ آپ اپنے آپ کو امام احمد بن حنبل ؒ کی طرف منسوب فرماتے تھے، تاہم آپ میں مجتہد مطلق کے تمام اوصاف پائے جاتے تھے۔ آپ کے لاتعداد شاگردوں میں دو ایسے ہیں، جنہیں شہرت دوام حاصل ہوئی اور وہ ہیں، علامہ ابن قیم ؒ اور حافظ ابن کثیر ؒ۔

اب ہم اپنے موضوع زیر بحث کی طرف آتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ فنِ تصوف کب شروع ہوا، امام موصوف کے دور میں یہ فن کتنی منزلیں طے کر چکا تھا اور اس میں کون کون سی قباحتیں آ چکی تھیں؟

تصوف کا آغاز:

تصوف ہی کو قرآن مجید کی زبان میں رہبانیت کہا گیا ہے، جو بہت پہلے یہود و نصاریٰ میں پائی جاتی تھی اور جسے قرآن مجید نے مذموم قرار دیا ہے۔ رہبانیت یا تصوف کی سب سے اہم بنیاد ترک دنیا، یا دنیا کے علائق سے بے رغبتی ہے، اور اس بات کو شریعت مطہرہ نے پسند نہیں کیا۔ رہبان جنگل میں کوئی کٹیا بنا لیتے اور اس میں عبادت کیا کرتے تھے۔ نفلی عبادت میں کثرت اگر چہ تقرب الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے مگر اس کی بھی ایک حد مقرر کر دی گئی ہے۔ چنانچہ اس حد سے آگے گزر جانے سے تقرب الٰہی کے بجائے انسان اُلٹا معصیت الٰہی کا مرتکب قرار پاتا ہے۔ دورِ نبوی ﷺ کا مشہور واقعہ ہے کہ تین اشخاص [1] نے رسول اللہ ﷺ کی غیر موجودگی میں آپ ﷺ کے گھر کے دروازے پر حاضر ہو کر سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کی عبادت کے متعلق پوچھا۔ جب ان حضرات کو اس بارے میں بتلایا گیا تو انہوں نے گویا اس عبادت کو تھوڑا جانا اور کہنے لگے، کہاں ہم اور کہاں رسول اللہ ﷺ، جن کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف ہو چکے۔ لہٰذا ہمیں اس سے زیادہ عبادت کرنا چاہیے۔ چنانچہ ایک نے کہا میں ہمیشہ ساری رات قیام کیا کروں گا اور سوؤں گا نہیں۔ دوسرے نے کہا، میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور چھوڑوں گا نہیں۔ تیسرے نے کہا کہ میں زندگی بھر نکاح نہیں کروں گا۔ یہ حضرات ایسی گفتگو کرنے کے بعد چلے گئے۔ آپ ﷺ جب گھر تشریف لائے اور صورتِ حال سے آگاہی ہوئی تو آپ ﷺ نے انہیں بلا کر کہا: ''دیکھو! میں اللہ کا رسول ﷺ ہوں اور اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ جاننے والا اور اس سے زیادہ ڈرنے والا ہوں۔ میں رات کو قیام بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، نفلی روزے بھی رکھتا ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں۔ اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، یہی میرا طریقہ ہے۔ تو جس نے میرے طریقہ

[1] یہ تین اشخاص حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمرو بن عاص اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ بن مظعون تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے خلاف کیا، اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔'' (بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

اسی طرح کا دوسرا واقعہ یہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی شادی ہوئی تو آپ رضی اللہ عنہ شادی کے بعد بھی ساری ساری رات قیام میں گزار دیتے اور مسلسل روزے رکھتے چلے جاتے۔ آپ کے والد اور بیوی دونوں اس صورتِ حال سے بہت پریشان تھے۔ آخر باپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صورتِ حال بیان کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ کے ہاں تشریف لائے اور فرمایا: ''میں نے سنا ہے کہ تم ساری رات قیام کرتے ہو اور سوتے نہیں۔ روزے رکھتے چلے جاتے ہو اور چھوڑتے نہیں۔'' سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے ''ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''رات کو قیام بھی کر اور سو بھی۔ کیونکہ تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے، تیرے جسم کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔'' نیز فرمایا ''ایک ماہ میں تین روزے رکھ لیا کر، اللہ تعالیٰ دس گنا اجر دیتا ہے۔ گویا تمہارے پورے ماہ کے روزے ہو جائیں گے۔'' سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے۔ ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھ میں اس سے زیادہ طاقت ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''اچھا ایک دن روزہ رکھ اور دو دن چھوڑ دے (یعنی مہینہ میں دس روزے رکھ لیا کر!) سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے، ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھ میں اس سے زیادہ طاقت ہے،'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اچھا داؤد علیہ السلام کا روزہ رکھ، جو ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن چھوڑتے تھے۔ اور اگر دشمن سے سامنا ہو جاتا تو راہِ فرار اختیار نہیں کرتے تھے۔'' پھر فرمایا ''جس نے اس پر زیادتی کی، اس کا کوئی روزہ نہیں۔''[1] (بخاری. کتاب النکاح، باب ترغیب النکاح. نیز کتاب الصوم باب حق الاھل فی الصوم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

(اِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ وَلَنْ يُشَادَّ الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهٗ فَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاَبْشِرُوْا)

(بخاری، کتاب الایمان، باب الدین یسر)

''دین آسان ہے۔ اور جو کوئی دین میں سختی کرے گا، دین اس پر غالب آئے گا۔ لہٰذا تم درمیانی چال چلو، اس کے نزدیک رہو اور ثواب کی امید رکھ کر خوش رہو۔''

---

[1] یہی سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمرو جب بوڑھے ہو گئے تو باری کا روزہ رکھنے کی تاب نہ رہی۔ اس وقت کفِ افسوس ملتے تھے کہ کاش! میں رسول اللہ کی رخصت قبول کر لیتا۔ مگر چونکہ رسول اللہ سے عہد کر چکے تھے، لہٰذا اس کی صورت یہ سوچی کہ پانچ سات اکٹھے روزے چھوڑ دیتے۔ جب طاقت کچھ بحال ہو جاتی تو پھر اتنے ہی دن روزہ رکھ لیتے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رسول اللہ ﷺ نے غلوفی العبادت کی اس تحریک کو سختی سے بند کر دیا، لیکن ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ یہ بدعت پوری شدت کے ساتھ اسلام میں در آئی۔ چنانچہ آپ کو تذکروں میں ایسے الفاظ ملیں گے کہ فلاں بزرگ ہر روز ساری رات قیام فرماتے تھے اور ہر رات ہزار رکعت نفل پڑھتے تھے۔ فلاں بزرگ نے چالیس دن کا روزہ رکھا۔ فلاں بزرگ نے چالیس سال تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی۔ فلاں بزرگ ایک رات میں تین بار قرآن ختم کرتے تھے۔ فلاں فلاں بزرگ نے عمر بھر شادی نہیں کی۔ اور فلاں بزرگ ہمیشہ روزہ سے رہا کرتے تھے۔ وغیرہ!

گویا جن جن باتوں سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا تھا، اس طبقہ صوفیہ نے ایک ایک بات میں آپ ﷺ کا خلاف کیا۔

صوفیہ کے عقائد ونظریات:

طبقہ صوفیہ میں دوسری قسم کی قباحتیں وہ نظریات اور افعال ہیں، جن کا شریعت مطہرہ میں سراغ تک نہیں ملتا۔ ان میں سب سے زیادہ گمراہ کن نظریہ، نظریہ وحدت الوجود ہے، جس کی رُو سے کائنات کی ہر چیز اللہ ہی کا ایک حصہ قرار پاتی ہے۔ دوسری صدی ہجری کے آخر میں جب ہارون الرشید عباسی خلیفہ نے بیت الحکمت قائم کیا اور یونانی اور ہندی فلسفہ ویدانت کی کتابوں کے عربی تراجم کیے گئے تو اس دور میں یہ نظریہ اسلام میں در آیا تھا۔ ان ایام میں نفلی عبادات میں غلو کرنے والوں کو عباد اور زہاد کہا جاتا تھا۔ اسی قسم کے لوگوں میں یہ نظریہ وحدت الوجود اندر ہی اندر پرورش پاتا رہا، تا آنکہ محی الدین ابن عربی (م ۶۳۴ھ) نے ...... جو صوفیہ میں شیخ اکبر کے لقب سے معروف ہیں "فصوص الحکم" لکھ کر اس نظریہ کو مدون کیا اور فلسفہ کے رنگ میں پیش کیا۔ اس نظریہ کو آپ ملحدانہ کہیے یا کافرانہ یا مشرکانہ، بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے طبقہ صوفیہ کو اس نظریہ سے گہری عقیدت رہی ہے۔

دوسرا گمراہ کن نظریہ، نظریہ حلول ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بذات خود کسی بزرگ ہستی میں یوں داخل ہو جاتا ہے کہ اس ہستی سے خدائی افعال سرزد ہونے لگتے ہیں اور وہ ہستی خدائی قوت و قدرت اور اختیار کی مالک بن جاتی ہے۔ اسلام میں جس شخص نے سب سے پہلے اس نظریہ کے زیر اثر "انا الحق" کا نعرہ لگایا، وہ حسین بن منصور حلاج (م ۳۰۹ھ) تھا۔ یہ نعرہ چونکہ خالص کفر و شرک پر مبنی ہے،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لہٰذا حکومت وقت نے اس خدا کو پہلے سولی پر لٹکایا، لوگوں نے پتھر بھی مارے، بعد میں لاش کو جلا کر اس کی راکھ کو دریائے دجلہ میں بہا دیا گیا۔ بایں ہمہ ہمارے طبقہ صوفیہ کے بڑے بڑے اساطین حلاج کو معذور سمجھتے، اسے رب کا سچا عاشق قرار دیتے اور اس کی طرف سے پورا پورا دفاع کرتے آ رہے ہیں۔

اب ہم چند ایسے نظریات پیش کرتے ہیں جو مسلمان صوفیہ سے ہی تعلق رکھتے ہیں، اور شریعت مطہرہ کے خلاف ہیں۔ مثلاً:

۱۔ ولایت کا درجہ نبوت سے افضل ہے۔ یہ نظریہ صوفیہ کے شیخ اکبر نے پیش کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ:

مقام النبوة فی برزخ فُوَيقَ الرسول و دون الولی

''نبوت کا مقام درمیان میں ہے، رسول سے اوپر اور ولی سے نیچے۔''

گویا ابن عربی کے نزدیک سب سے بلند درجہ تو ولایت کا ہے، اس کے بعد درمیان میں نبوت کا اور سب سے نچلا درجہ رسالت کا ہے۔

۲۔ جب یہ طے ہو گیا کہ ولایت نبوت سے افضل ہے۔ تو شیخ اکبر نے دوسرا کام یہ کیا کہ ''خاتم الانبیاء'' کے مقابلہ میں ''خاتم الاولیاء'' کا منصب پیدا کیا، پھر اس منصب پر خود فائز ہو گیا اور کہا۔

اناختم الولایة دون شک لورث الھاشمی مع المسیح

''اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ختم الاولیاء ہوں، مجھے حضرت مسیح علیہ السلام کی ولایت (عامہ) کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولایت (خاصہ) بھی میراث میں ملی ہے۔''

۳۔ مسلمان صوفیاء کا تیسرا نظریہ یہ ہے کہ ''باطنی علوم ظاہری علوم سے افضل ہوتے ہیں۔'' ظاہری علم سے مراد شریعت اور باطنی علم سے مراد ان کے اسرار و رموز ہیں، جو بذریعہ علم لدنی سینہ بہ سینہ انہیں حاصل ہوتے ہیں۔ اس نظریہ کو یوں بھی پیش کیا جاتا ہے کہ سب سے کم درجہ پر شریعت ہے۔ اس کے بعد طریقت اور سب سے اوپر حقیقت یا معرفت ہے۔ طریقت اور حقیقت کا علم تو صوفیہ کے پاس ہوتا ہے اور شریعت کا علم علماء کے پاس۔ پھر اسی نظریہ سے ضمنی نتیجہ یہ بھی نکالا جاتا ہے کہ عابد عالم سے افضل ہوتا ہے۔

۴۔ چوتھا نظریہ ان کا باطنی سیاسی نظام ہے، جسے نظامِ خلافت کے مقابلہ پر وضع کر کے اسے ظاہری علوم حکومت سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ اس نظام کے مناصب یہ ہیں:

نجیب، ابدال، اوتاد، عمود، قطب، غوث

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان مناصب کی نشستوں کی تعداد مقرر ہے۔ایک وقت میں غوث صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ جب دنیا پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے،تو پہلے نجباء پر مشکل کشائی کی درخواست اہل دنیا کی طرف سے پیش کی جاتی ہے۔ اگر یہ مشکل کشائی نجباء کے بس کا روگ نہ ہو تو یہ درخواست ابدالوں کے ہاں بھیجی جاتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس، بالآخر یہ درخواست غوث تک Through Proper Channel جا پہنچتی ہے۔ غوث کی قوت و اختیارات چونکہ اللہ میاں سے کسی طرح کم نہیں ہوتے (انا اللہ) لہٰذا وہ ہر طرح کی مشکل کشائی فرما سکتا ہے۔ پھر اسی ظاہری نظام پر باطنی نظام کی فضیلت سے ایک ضمنی نتیجہ یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ جہاد بالسیف سے جہاد بالنفس افضل ہوتا ہے۔ پھر مزید یہ کہ جہاد بالنفس سے صوفیہ کی ریاضتیں مراد لے لی جاتی ہیں۔

۵۔ پانچواں نظریہ سالک کے مراحل سے متعلق ہے۔ سالک کو پہلے فنا فی الشیخ کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔ پھر فنا فی الرسول کی منزل آتی ہے،اور سب سے آخر میں فنا فی اللہ کی۔ یہ خالص ہندوانہ نظریہ ہے۔ ان کے ہاں ان مراحل کے نام آتما،مہاتما اور پرماتما ہیں۔

اعمال وافعال صوفیہ:

مذکورہ نظریات کے علاوہ صوفیہ کے کچھ افعال ایسے ہیں، جو خالصتاً شرک و بدعت سے متعلق ہیں، مثلاً:

مزارات کی تعمیر، مزارات پر چلہ کشی، کشفِ قبور کے وظیفے اور طریقے، مزارات پر نذر و نیاز چڑھانا اور اصحاب القبور کو حاجت روائی کے لیے پکارنا، مزارات پر مناسک حج کے سے افعال کی ادائیگی۔

اسی طرح غیر شرعی ریاضتیں اور ان کے مکروہ طریقے ہیں، جیسے دھوپ میں کھڑے رہنا، گلیوں اور بازاروں میں گھومنا پھرنا، جنگلوں میں سال ہا سال مارے مارے پھرنا، ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر یا کنوئیں میں الٹے لٹک کر دم کشی کی مشق کرنا، کیچڑ بدن پر مل لینا یا غلیظ اور مکروہ شکل بنائے رکھنا، اپنے لیے کوئی مخصوص لباس مقرر کر لینا وغیرہ...... ایسے سب طریقے مکروہ اور غیر شرعی ہیں۔

کرامات اور شعبدہ بازیاں بھی اسی قبیل سے ہیں...... اگرچہ صوفیہ کا سنجیدہ طبقہ کشف و کرامات کو ولایت کا معیار قرار نہیں دیتا، مگر یہ بات صرف زبانی دعوے کی حد تک درست قرار دی جا سکتی ہے۔ عملاً ہر دور میں اور ہر طبقہ میں کرامات ہی کے پیمانہ سے کسی کی ولایت کو ماپا جاتا رہا ہے۔ ان کرامات کی بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لاتعداد قسمیں ہیں۔ مثلاً دیدارِ الٰہی یا خدا کا مشاہدہ کرنا، قبر پر مراقبہ کرنے پر قبر کا پھٹ جانا اور صاحب قبر کا قبر سے برآمد ہو کر غیب کی باتیں بتلانا، اپنے پیر صاحب کے نام کی دہائی دینے سے پیر صاحب کا آ موجود ہونا اور بعض دفعہ حاجت روائی بھی کر دینا، ایک مقام سے دوسرے مقام تک آن کی آن پہنچ جانا، اشیائے خوردنی کا یکدم حاضر کر دینا، دل کی بات بتا دینا، مُردوں کو زندہ کر دینا، آگ میں کود جانا اور آگ کا اثر نہ کرنا، غرض سینکڑوں قسم کی کرامات یا ایسے ہی شعبدے اس طبقہ صوفیہ کے تذکروں میں موجود ہیں، جن کے سامنے انبیائے کرام کے معجزات بھی ہیچ نظر آنے لگتے ہیں۔

وجد و سماع بھی اس طبقۂ صوفیہ سے متعلق ہے، جسے ان فقیروں کی زبان میں حال کھیلنا کہتے ہیں۔ یعنی قوالی سننے پر بدمست ہو جانا اور عجیب وغریب حرکات کرنا۔ جب تک یہ لوگ بقائمی ہوش و حواس رہیں، ایسی حالت کو صحو کہتے ہیں۔ اور جب بدمست یا بے خود ہو جائیں، تو یہ حالت ''سُکر'' کہلاتی ہے۔ سُکر کی کیفیت یہ حضرات مصنوعی طریقوں سے خود پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک سُکر کی حالت صحو سے بہتر ہوتی ہے۔ پھر اس سکر کی حالت کی آڑ لے کر عجیب عجیب قسم کے کفر یہ کلمات زبان سے نکالتے رہتے ہیں۔ نیز اس سکر کے بہانے یہ لوگ اپنے آپ کو تکالیف شرعیہ کا مکلّف نہیں سمجھتے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے دور میں اس طبقہ صوفیہ میں مندرجہ بالا تمام قسم کی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں، لہٰذا اس محاذ پر بھی آپ کو پوری تندہی اور جاں فشانی سے کام کرنا پڑا۔ اس سلسلہ میں آپ نے درج ذیل طریقے اختیار فرمائے:

۱۔ اپنی تقریروں اور خطابات میں ان لوگوں کے عقائد و نظریات اور اعمال و افعال پر کڑی تنقید کی اور انہیں شریعت مطہرہ کی رو سے باطل ثابت کیا۔

۲۔ نجی ملاقاتیں...... اس سلسلہ میں کبھی تو آپ ان لوگوں کو سمجھانے کے لیے جامع دمشق میں آ جاتے تھے، کبھی کسی پیر فقیر کو اپنے ہاں بلا کر سمجھاتے اور کبھی کسی کے پاس خود جا کر!

۳۔ بذریعہ خط و کتابت...... ان لوگوں کو آپ نے نجی طور پر خطوط لکھ کر بھی سمجھانے کی کوشش کی اور ''الدین النصیحة'' کے تقاضے پورے کیے۔

۴۔ بذریعہ تحریر و تصنیف...... صوفیہ پر تنقید کے سلسلہ میں آپ نے درج ذیل رسائل یا کتب تصنیف فرمائیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۱) فی ابطلال وحدة الوجود ، (۲) الفرقان بین اولیاء الرحمان و اولیاء الشیطان ، (۳) کتاب التوسل و الوسیلة، (۴) لباس الفتوة و الخرقة عند الصوفیه، (۵) الصوفیه و الفقر

۵۔ آپ نے بعض دوسرے فرقوں کی طرح صوفیہ کے فرقہ رفاعیہ سے حکومتی سطح پر مناظرہ بھی کیا، جو بعد میں ضبطِ تحریر میں بھی لایا گیا۔ اس رسالہ کا نام ''مناظرہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ مع الرفاعیہ'' ہے۔

صوفیہ پر تنقید:

اب ہم آپ کی کتابوں سے چند ایسے اقتباسات پیش کریں گے، جن سے معلوم ہوگا کہ آپ نے ان متصوفین کے عقائد ونظریات اور اعمال وافعال پر کس انداز سے گرفت کی تھی۔

۱۔ نظریہ حلول اور حسین بن منصور حلاج م ۳۰۹ھ:

حسین بن منصور حلاج کے متعلق آپ لکھتے ہیں:

''کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حلاج فنا میں ڈوب گیا۔ وہ باطنی حقیقت سے معذور تھا مگر ظاہری طور پر اس کا قتل واجب تھا۔ کچھ دوسرے ایسے لوگ بھی ہیں جو اسے شہید، فنا فی اللہ، موحد اور محقق سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ شریعت کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے۔''

پھر واضح الفاظ میں لکھتے ہیں کہ:

''حلاج اپنے کفر کی وجہ سے قتل کیا گیا۔ وہ قرآن کا معارضہ کرتا تھا۔ جنید، عمرو بن عثمان مکی اور امیر یعقوب جیسے جلیل القدر مشائخ نے حلاج کی مذمت کی ہے۔ اگر کوئی شخص حلاج سے متعلق حسنِ ظن رکھتا ہے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ وہ اصل حالات سے آگاہ نہیں۔'' (مجموعہ رسائل الکبری، جلد۲، ص ۹۷ تا ۹۹)

قارئین کرام، کیا آپ جانتے ہیں کہ حلاج کے متعلق حسن ظن رکھنے والے یہ حضرات کون ہیں؟

......یہ ہیں:

(۱) علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش (م ۴۶۵ھ)، (۲) مولانا جلال الدین رومی، صاحب مثنوی (م ۶۷۳ھ)، (۳) پیرانِ پیر شیخ عبد القادر جیلانی (م ۵۶۱ھ)، (۴) نظام الدین اولیاء (م ۷۲۵ھ)۔ ان سب بزرگوں نے حلاج کی پوری پوری حمایت کی ہے اور اس کی طرف سے پورا دفاع بھی کیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔نظریہ وحدت الوجود:

اس نظریہ کے متعلق امام صاحب لکھتے ہیں کہ:

''شیخ کمال الدین ابن المراغی کو ابتداء میں تلمسانی (عفیف الدین تلمسانی، شیخ اکبر کا شاگردِ خاص) سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ ان سے ''فصوص الحکم'' پڑھنے لگے۔ اثناء درس میں کمال الدین نے ''فصوص الحکم'' کی بعض قابلِ اعتراض باتوں پر گرفت کی، اور کہا کہ یہ قرآن و حدیث کے صریح ارشادات کے خلاف ہیں۔ اس پر تلسمانی کو سخت غصہ آ گیا اور کہا: ''بار بار قرآن وحدیث کا کیا حوالہ دیتے ہیں؟ انہیں اٹھا کر دروازے سے باہر پھینکو اور یہاں صاف دل ہو کر آؤ تا کہ تمہیں خاص توحید ملے۔'' تلمسانی کی ان باتوں سے کمال الدین کے دل کو سخت ٹھیس لگی، وہ فوراً اس کی مجلس سے چلے آئے۔ تلمسانی کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں یہ بات عام لوگوں میں نہ پھیل جائے اور ان کے خلاف کوئی زبردست ہنگامہ نہ اٹھ کھڑا ہو، تو روتے ہوئے کمال الدین کے پاس آئے اور انہیں راضی کیا۔

یہی کمال الدین کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ شیخ تلمسانی نے کہا: قرآن میں توحید ہے کہاں؟ وہ تو پورے کا پورا شرک سے بھرا ہوا ہے۔ جو شخص اس کی اتباع کرے گا وہ کبھی توحید کے بلند مرتبے تک نہیں پہنچ سکتا۔

ایک مرتبہ شیخ کمال الدین احمد نے یہ اعتراض کیا کہ اگر عالم کی سب چیزیں ایک ہیں، جیسا کہ تمہارا عقیدہ ہے، تو پھر تمہارے نزدیک ایک جورو، بیٹی اور ایک اجنبی عورت میں کیا فرق ہے؟ تلمسانی نے جواب دیا: ''ہمارے ہاں تو کوئی فرق نہیں، چونکہ ان محجوبوں (یعنی علمائے شریعت) نے ان کو حرام قرار دیا ہے تو ہم بھی کہہ دیتے ہیں کہ یہ تم پر حرام ہیں، ورنہ ہم پر کوئی چیز حرام نہیں۔'' (امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ از کوکن عمری، ص: ۳۲۱)

آپ نے دیکھا کہ اس نظریہ وحدت الوجود کی زد کہاں کہاں تک جا پڑتی ہے۔ ایسی باتوں کو بھلا امام موصوف کیونکر برداشت کر سکتے تھے؟ آپ ابھی ۲۳/ ربیع الاول ۷۰۷ھ کو دو سال کی قید کاٹ کر رہا ہوئے تھے کہ اب ایسے دوستوں سے پالا پڑ گیا۔ آپ نے ۶/ شوال ۷۰۷ھ کو جمعہ کی نماز کے بعد حسبِ دستور ایک تقریر کی، جو عصر تک جاری رہی۔ اس تقریر میں جب وحدۃ الوجود اور دوسرے مسائل کا ذکر آیا تو آپ نے پورے زورِ بیان اور قوتِ استدلال کے ساتھ صوفیوں کے غلط عقائد و نظریات کی سخت تردید کی۔ ابنِ عربی، ابن الفارض، صدر الدین قونوی، ابن سبعین اور تلمسانی پر بے لاگ تنقید کی۔ اس کا نتیجہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ ہوا کہ صوفی لوگ بگڑ بیٹھے اور مسجد میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا پھر سلطان سے جا کر شکایت کی کہ ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ابن عربی جیسے صوفیہ کو برا بھلا کہہ رہے ہیں اور ان کی قدر و منزلت گھٹا رہے ہیں۔ سلطان نے قاضی القضاۃ بدر الدین جماعہ شافعی کو حکم دیا کہ وہ اس معاملہ کی تحقیق کریں۔ چنانچہ ۱۰ رشوال ۷۰۷ھ کو دار العدل میں ایک مجلس قائم ہوئی جس میں بہت سے علماء کو مدعو کیا گیا۔ ابنِ عطاء اللہ الاسکندرانی نے امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف الزامات لگائے اور عدالت سے انصاف کا مطالبہ کیا۔ امام موصوف نے ان الزامات کی ایک ایک کر کے پُرزور تردید کی۔ ہر ایک مسئلہ کے متعلق قرآن و حدیث کے اتنے واضح اور صاف دلائل پیش کیے کہ خود مدعی سے ان کا کوئی جواب نہیں بن سکا۔ (امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ایضاً ص ۳۴۳، ۳۴۵)

۳۔ قبروں سے متعلق کرامات:

کشفِ قبور کے ذریعہ جن عجائب کا ظہور ہوتا ہے، ان کے متعلق امام موصوف فرماتے ہیں کہ:

''قبر کو بُت بنانا شرک کی ابتدا ہے۔ اس لیے اس کے پاس بھی بعض لوگوں کو کبھی آوازیں سنائی دیتی ہیں، کچھ صورتیں دکھائی دیتی ہیں اور عجیب و غریب تصرف نظر آتا ہے، جسے وہ مردہ کی کرامت سمجھتے ہیں۔ مثلاً کبھی دکھائی دیتا ہے کہ قبر شق ہوگئی، مردہ باہر نکل آیا، باتیں کیں، معانقہ کیا۔ اس طرح کی چیزیں نبیوں اور ان کے علاوہ دوسروں کی قبروں پر بھی پیش آسکتی ہیں۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ یہ سب شیطان کی چالیں ہیں، جو آدمی کے بھیس میں ظاہر ہو کر مکر و فریب کا کرشمہ دکھاتا ہوا کہتا ہے کہ میں فلاں نبی یا فلاں شیخ ہوں۔ اس بارے میں متعدد واقعات مشہور ہیں۔ جاہل یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب صاحب قبر کی اور اس کی اپنی کرامات ہیں، لیکن مومن کامل جانتا ہے کہ وہ شیطان ہوتا ہے جو گمراہ کرنے کے لیے آتا ہے، ایسے اوقات میں قرآن کریم کی تلاوت اور بالخصوص آیت الکرسی پڑھنے سے ایسی شیطانی شعبدہ بازیاں از خود بھسم ہو جاتی ہیں۔ اور اگر یہ چیزیں بھسم ہو جائیں تو یقین جانیے کہ یہ شیطانی استدراج تھا۔ کیونکہ آیت الکرسی پڑھنے کا نقصان صرف شیطان ہی کو پہنچتا ہے۔'' (کتاب الوسیلہ، ص ۵۱، مترجم اردو)

۴۔ نداء لغیر اللہ:

اپنے شیخ کو مشکل کشائی یا حاجت روائی کے لیے پکارنے کے سلسلہ میں آپ فرماتے ہیں کہ:

''بعض لوگوں نے اپنے شیخ کی دہائی دی اور ان کو اس کی صورت نظر آگئی اور بعض دفعہ اس نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کوئی کام بھی کر دیا۔اس سے ان کا یہ عقیدہ ہوا کہ شیخ خود آئے، یا یہ کوئی فرشتہ تھا، جو ان کی صورت میں ظاہر ہوا اور یہ ان کی کرامت ہے۔اس سے ان کا مشرکانہ عقیدہ مزید راسخ ہو جاتا ہے۔ان کو معلوم نہیں کہ اس طرح کے معاملات تو شیاطین، بت پوجنے والوں کے ساتھ بھی کرتے رہتے ہیں۔وہ ان بت پرستوں کے سامنے اکثر حاضر ہوتے ہیں اور بعض غیبی باتیں ان کو بتلاتے ہیں اور ان کے بعض مطلب بھی پورے کر دیئے جاتے ہیں۔لیکن یہ سب امور دورِ اخیر کی پیداوار ہیں، جن کا قرونِ اولیٰ میں کوئی وجود نہ تھا۔'' (تفسیر سورۂ اخلاص، ص ۱۱۸)

ایک دوسرے مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ:

''یہ معاملہ صرف صالحین تک محدود نہیں، بلکہ ستارہ پرستوں کو بھی ایسے ہی احساسات اور فتوحات حاصل ہوتے ہیں۔جو لوگ کواکب سے دعا کرتے ہیں، ان پر ایسی ایسی صورتیں نازل ہوتی ہیں، جنہیں وہ کواکب کی روحانیت کہتے ہیں۔حالانکہ وہ شیطان ہوتا ہے، جو اس کے شرک کی وجہ سے اس کو گمراہ کرنے کے لیے نازل ہوتا ہے۔جیسے بعض اوقات شیاطین بتوں اور مورتیوں کے اندر گھس جاتے ہیں۔وہ بعض اوقات لوگوں سے باتیں کرتے ہیں اور بعض اوقات مجاوروں اور پوجا پاٹ کرنے والوں کو دکھائی دیتے ہیں، اور ایسے ہی دوسروں کو بھی دکھائی دیتے ہیں۔'' (کتاب النبوات، ص ۲۷۴ بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت، جلد۲، ص ۳۴۷)

۵۔کراماتِ شیطانی کی حقیقت:

شیطانی استدراجات پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:

''ان کفریات پر ایمان رکھنے والے کبھی ہوا میں اُڑتے ہیں۔شیطان یا رجال الغیب انہیں اٹھا لیتے اور مکہ وغیرہ دُور دراز ممالک تک اُڑا لے جاتے ہیں۔لوگ اسے کتنی ہی بڑی کرامت سمجھیں مگر حقیقتاً ایسا شخص زندیق اور کافر ہی ہوتا ہے۔نماز اور دوسرے فرائض سے انحراف وانکار کرتا ہے۔اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حرام ٹھہرائی ہوئی باتوں کو حلال قرار دیتا ہے اور ہر قسم کے مکروہات ومنکرات میں مشغول رہتا ہے۔شیطان ایسے لوگوں کے ساتھ محض ان کے کفر وفسق کی وجہ سے میل ملاپ رکھتے ہیں، جو ان میں مخفی طور پر پایا جاتا ہے۔لیکن جونہی وہ سچی توبہ کر کے اللہ اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے اور کتاب وسنت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے تمسک کرتے ہیں تو شیطان فوراً الگ ہو جاتے ہیں، اور اس قسم کے تمام شیطانی مکاشفات، حالات و تاثیرات کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ میں ایسے بہت سے لوگوں سے آشنا ہوں جو شام و مصر، حجاز اور یمن میں موجود ہیں۔ جزیرہ، عراق، خراسان اور روم میں ان کی تعداد اور بھی زیادہ ہے۔ پھر مشرکین اور اہلِ کتاب کے ملکوں میں بھی وہ بکثرت موجود ہیں، جو اس قسم کے شیطانی کرشموں کا شکار ہو رہے ہیں۔''

(الوسیلہ، اُردو، ص ۲۵۹)

۶۔ حضرت خضر کی رہنمائی:

طبقہ صوفیہ میں اس بزرگ کو بڑا خوش قسمت سمجھا جاتا ہے جسے حضرت خضر سے کسی نہ کسی طرح سے فیضان ہو جائے۔ طریقت کے سب سلسلے حضرت خضر کو پُر اسرار اور غیر فانی ہستی سمجھتے، نیز ہادیٔ طریقہ کی حیثیت سے ان کی تعظیم کرتے ہیں۔ اب انہی حضرت خضر کے سلسلہ میں امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا تبصرہ ملاحظہ فرمایئے۔ آپ لکھتے ہیں:

''نیز ان (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) میں سے کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خضر سے راہ و رسم رکھتا ہے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام والے خضر تو فوت ہو چکے۔ اور وہ خضر جو عام لوگوں کے پاس پوشیدہ طور پر تشریف لایا کرتے ہیں، دراصل شریر جن ہے، جو آدمی کا روپ دھار لیتا ہے۔ یا وہ خود دھوکہ باز انسان ہی ہوتا ہے جو جاہلوں کو بے وقوف بناتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ فرشتہ تو ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ فرشتے کذب بیانی نہیں کرتے۔ دروغ گوئی صرف جن و انس میں ہی ہے۔ مجھے خود ایسے لوگوں کا علم ہے جن کے پاس خضر آیا، جیسا کہ انہیں یقین تھا، لیکن حقیقتاً وہ جن تھا۔ مگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسے ضعیف العقیدہ نہ تھے کہ اس طرح کی جعل سازیوں میں آجاتے۔ اسی طرح ان میں کوئی ایسا نہ تھا جسے جن مکہ اور عرفات تک اڑا لے گئے ہوں اور بغیر تھکاوٹ حج ہو جائے۔ جیسا کہ بہت سے جاہل عابدوں پر ان کی یہ کرم نوازی ہوتی ہے۔ اور نہ ہی ان صحابہ رضی اللہ عنہم میں ایسے حضرات موجود تھے، جن کے پاس بعض لوگ دوسروں کا مال اور خوراک چُرا لاتے ہوں اور اسے کرامت سمجھا جاتا ہو۔'' (الوسیلہ اُردو، ص ۱۳۹۔۱۴۰)

اب ہم آپ کو یہ بتاتے ہیں کہ کن کن خوش قسمت صوفیہ کو حضرت خضر کی ملاقات نصیب ہوئی، یا انہوں نے ان سے فیضان حاصل کیا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۔ محمد علی ترمذی صاحب کو حضرت خضر قبرستان میں ملے تھے۔ پھر تین سال تک روزانہ قبرستان میں آ کرانہیں علم پڑھاتے رہے تھے۔ (مقربان حق، ص ۱۶۸)

۲۔ ابوبکر وراق صاحب کی بڑی مدت سے آرزو تھی کہ ان کی حضرت خضر سے ملاقات ہو، چنانچہ ایک دن قبرستان میں ہی ملاقات ہوگئی۔ (مقربان حق، ص ۲۰۷)

۳۔ سلسلہ چشت میں خواجہ ابو حذیفہ المرعشی (م ۲۰۲ھ) پہلے بزرگ ہیں، جن کی رہنمائی سے آپ کی ابراہیم بن ادہم تک رسائی ہوئی۔ (تاریخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۴۵)

۴۔ سلسلہ چشت ہی کے دوسرے خوش قسمت بزرگ دینوری (م ۲۹۷ھ) ہیں، جنہوں نے حضرت خضر کے اشارہ سے ہی بیعت کی تھی۔ (ایضاً، ص ۱۴۹)

۵۔ پیرانِ پیر کو حضرت خضر جنگل میں اس وقت ملے، جب آپ کو مسلسل روزہ رکھے چالیس دن گزر چکے تھے اور بھوک سے بیتاب ہو رہے تھے۔ حضرت خضر کے کہنے پر خدا سے کیا ہوا عہد پس پشت ڈال کر روزہ چھوڑ دیا تھا۔ (خزینۃ الاصفیاء ص ۱۵۰، مصنفہ غلام سرور قادری)

۶۔ حضرت خضر ہوا میں اڑتے جا رہے تھے کہ پیرانِ پیر نے اپنا کلام سنانے کے لیے انہیں ٹھہرا لیا۔ پھر تو وہ پیرانِ پیر کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ انہی کے ہو رہے۔ اب حضرت خضر کی ڈیوٹی یہ تھی کہ جب کوئی ولی یا ابدال فوت ہو جاتا، اس کی خبر پیران پیر کو دیتے پھر خواہ کسی چور یا کافر کو پیرانِ پیر ابدال بنانے کا ارادہ کرتے تو حضرت خضر اس متعلقہ شخص کو اس کے علاقہ سے اُٹھا کر پیش کر دیا کرتے تھے۔ (سیرت غوث الثقلین، ضیاء اللہ قادری، ص ۹۷، ۲۰۸)

۷۔ حضرت خضر قطب الدین بختیار کاکی کو خواجہ ابو حفص اویسی کے پاس لے گئے۔ استاد نے دستِ شفقت پھیر کر شاگرد سے فرمایا، ”بڑے صاحب نصیب ہو کہ حضرت خضر تمہیں میرے حوالہ فرما گئے ہیں۔“ (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۷۱)

۷۔ دیدارِ الٰہی:

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے مشاہدہ سے متعلق امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

”کچھ جاہل فقیر اور علماء ایسے بھی ہوتے ہیں جو شیطانی شعبدے دیکھ کر یہ یقین کر لیتے ہیں کہ ہم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے حالت بیداری میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے اور دلیل میں اپنا مشاہدہ پیش کرتے ہیں۔ہم انہیں کاذب نہیں کہتے، ان کا مشاہدہ ایسا ہی ہوتا ہے۔مگر ان کی غلطی یہ ہوتی ہے کہ وہ شیطان کو خدا سمجھ لیتے ہیں۔ اسی طرح بے علم عابد بعض اوقات رسول اللہ ﷺ کو، یا حضرت خضر کو، یا کسی برگزیدہ ہستی کو اپنی آنکھوں سے حالت بیداری میں دیکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔حالانکہ وہ شیطان ہی ہوتا ہے، جو مختلف شکلوں میں آ کر فریب دیتا ہے۔'' (الوسیلہ اُردو،ص ۵۵)

''اسی طرح بعض دفعہ ایک ہی بزرگ بیک وقت کئی گلیوں پر نظر آتا ہے، خواہ یہ بزرگ زندہ ہو یا مردہ۔نادان لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ واقعی یہ بزرگ اپنے جسم کے ساتھ ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔حالانکہ یہ شیاطین ہوتے ہیں، جو گمراہ کرنے کے لیے آتے ہیں۔ (ایضاً،ص ۶۰)

۸۔دور دراز مقام سے پیر کا پہنچنا:

امام صاحب شیطانی استدراجات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجھے اس قسم کے بہت سے واقعات معلوم ہیں۔چنانچہ میں نے خود ان لوگوں کو دیکھا ہے، جنہوں نے میری اور دوسرے بزرگوں کی، ہماری عدم موجودگی میں دہائی دی تھی۔ان کا بیان ہے کہ انہوں نے مجھے اور ان بزرگوں کو ہوا میں اُڑ کر آتے اور ان کی مشکل دُور کرتے دیکھا۔لیکن میں نے انہیں بتلا دیا کہ یہ سب شیطانی فریب کاریاں ہیں۔شیطان ہی میری یا دوسرے بزرگوں کی شکل میں آیا تھا، تاکہ غیر موجود یا فوت شدہ بزرگوں کے پکارنے میں ان کی حوصلہ افزائی کرے اور گمراہی کو اور زیادہ پکا کر دے۔اس قسم کے واقعات عیسائیوں کو بھی پیش آتے ہیں۔'' (الوسیلہ اُردو،ص ۲۵۶)

رفاعی فقیروں سے حکومتی سطح پر مناظرہ (۷۰۷ھ):

یہ لوگ شیخ احمد رفاعی، جو پیران پیر کے ہم عصر تھے، کے سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔شیخ احمد بذاتِ خود تو واقعی بزرگ تھے مگر سوڈیڑھ سو سال بعد ان کے پیروکاروں میں بہت سی خلافِ شریعت باتیں داخل ہو گئی تھیں۔ان فقیروں نے سیاہ لباس پہننا اور گلے میں لوہے کے کڑے یا طوق پہننا اپنا شعار بنا لیا تھا۔ ان کی معروف کرامات یہ تھیں کہ وہ آگ میں کود جاتے اور انگاروں سے کھیلتے، مگر آگ انہیں جلاتی نہ تھی۔اسی طرح یہ لوگ سانپوں سے بھی کھیلتے تھے۔ان لوگوں کے برحق ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھی کہ آگ ان پر اثر نہیں کرتی تھی۔ یہ لوگ نماز، روزہ اور دوسرے تمام شرعی احکام سے یکسر غافل تھے، لیکن اس کے باوجود اپنی کرامات کی وجہ سے عوام میں بہت مقبول تھے۔ اطراف و اکناف میں ان کے بے شمار معتقدین پھیل گئے تھے، حتیٰ کہ اکثر امرائے سلطنت پر بھی ان لوگوں کا خاصا اثر تھا۔

ان پیروں فقیروں کی یہ حالت دیکھ کر امام صاحب نے ببانگِ دہل یہ اعلان کر دیا کہ یہ لوگ محض شعبدہ باز اور رجال الغیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا ولی ہونا تو دور کی بات ہے، یہ تو مسلمان بھی نہیں کہلا سکتے۔ امام موصوف کی ان باتوں سے یہ لوگ بہت سیخ پا ہوئے اور حاکم وقت امیر افرم سے جا کر شکایت کی۔ امیر افرم نے فیصلہ کے لیے فریقین کو اپنے ہاں طلب کر لیا۔ رفاعی فقیروں پر امام موصوف کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ یہ لوگ تکالیف شرعیہ یعنی ارکانِ اسلام تک بجا نہیں لاتے، تو یہ مسلمان کیونکر کہلا سکتے ہیں۔

باطنی احوال کا سہارا:

اس اعتراض کے جواب میں رفاعی شیخ نے کہا کہ ہمارے کچھ باطنی امور و احوال ہیں، جن کو اہل ظاہر نہیں سمجھ سکتے۔ اس بات سے ان کے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ اس کے جواب میں امام صاحب نے کہا کہ:

''ظاہر و باطن، شریعت و طریقت، حقیقت و مجاز سب کچھ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹایا جائے گا۔ عام اس سے کہ وہ مشائخ ہوں یا فقیر، بادشاہ ہوں یا امراء، عالم ہوں یا قاضی۔ اس لیے کہ ساری مخلوق پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واجب ہے۔ یہ اہلِ باطن اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔'' (امام ابن تیمیہ، کوکن عمری، ص ۱۶۳)

وجد و حال:

اپنے دفاع کے سلسلہ میں امام صاحب نے صوفیہ کے وجد و حال پر کڑی تنقید کی۔ کیونکہ اس وجد و حال کو یہ لوگ تکالیف شرعیہ سے رخصت کا بہانہ بنایا کرتے ہیں۔ رفاعی شیخ نے اس تنقید کا جواب دیا کہ:

''یہ اقوال و افعال ہم سے اضطراراً سرزد ہوتے ہیں۔ ہم پر حال اور وجد طاری ہو جاتا ہے، جس کا روکنا ہمارے بس سے باہر ہے۔ جس طرح چھینک کا روکنا ہمارے اختیار میں نہیں ہوتا، اسی طرح ان کیفیات کا روکنا بھی بس سے باہر ہوتا ہے۔ اور یہ بھی چھینک کی طرح خدا کی طرف سے ہوتے ہیں۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کے جواب میں امام موصوف نے کہا کہ چھینک تو واقعی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے مگر یہ اقوال وافعال خبیثہ شیطان کی طرف سے ہیں۔ اللہ اور اس کا رسول ﷺ بھی ان کاموں سے منع فرماتا ہے۔ اور وہ جن باتوں سے ہمیں منع کر دیں، وہ کبھی محبوب نہیں ہو سکتیں۔ امام موصوف نے اس کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ کفر اور فسق کا صدور بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی سے ہوتا ہے، لیکن اسے کوئی شخص بھی جائز نہیں سمجھتا۔

رفاعی شیخ نے پوچھا: ''تو پھر اس اضطراری وجد وحال کو کیونکر روکا جا سکتا ہے؟'' امام موصوف نے فوراً جواب دیا، ''شرعی کوڑوں سے!'' اس پر امیر افرم ہنس پڑا۔ امام موصوف نے کہا۔ ''ہاں! پھر اگر شرعی کوڑوں سے بھی کام نہ چلے تو تلوارِ محمدی ﷺ سے۔'' یہ کہہ کر امام موصوف نے امیر افرم کے ہاتھ سے تلوار لے لی اور اسے ہوا میں لہراتے ہوئے کہا: ''یہ شخص (امیر افرم) رسول اللہ ﷺ کا ادنیٰ غلام ہے۔ اور یہ رسول اللہ ﷺ کی تلوار ہے۔ جو شخص بھی کتاب وسنت سے روگردانی کرے گا، اس کو موت کے گھاٹ اتارا جائے گا۔'' (ایضاً،ص ۱۶۵)

رفاعی صوفیہ کی حیثیت:

رفاعی فقیروں کی بے دینی پر حجت قائم کرتے ہوئے امام موصوف نے مزید وضاحت فرمائی کہ:

''ایک اسلامی سلطنت میں صرف تین فرقے ہو سکتے ہیں (۱) مسلمان، (۲) ذمی جیسے یہود ونصاریٰ یا دوسرے کافر۔ یہ لوگ اپنے مذہب کی ادائیگی کی حد تک آزاد ہوتے ہیں، (۳) مشرک، مرتد اور زندیق وغیرہ۔ یہ لوگ چوں کہ مسلمانوں میں شامل ہوتے ہیں، لیکن اپنے مشرکانہ عقائد اور بدعات، پھر ان نظریات کی علی الاعلان تبلیغ کی وجہ سے واجب القتل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی علاج نہیں۔ پہلے ان سے توبہ کرائی جائے گی۔ اگر باز نہ آئیں تو انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ جیسا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ ان تین فرقوں کے علاوہ ایک اسلامی مملکت میں کسی چوتھے فرقہ کی گنجائش نہیں۔'' (ایضاً،ص ۱۶۶)

آگ میں داخل ہونے کا مقابلہ:

رفاعی شیخ سے جب امام موصوف کے دلائل کا کچھ جواب بن نہ پڑا تو بالآخر اس نے وہی بات پیش کر دی، جس سے وہ جاہل عوام کو قائل کیا کرتے تھے۔ اور وہ بات یہ تھی کہ فریقین آگ میں داخل ہو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جائیں۔ جس کو آگ جلا دے، وہ جھوٹا سمجھا جائے گا اور جو آگ سے بچ کر نکل آئے گا، اسے حق پر تصور کیا جائے گا۔

اگرچہ شیخ رفائی کا یہ فیصلہ کچھ علمی نوعیت کا نہ تھا تاہم امام موصوف نے یہ بات بھی منظور فرمالی۔ مگر ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ فریقین آگ میں داخل ہونے سے پہلے سرکہ اور گرم پانی سے بدن کو خوب مل کر نہا لیں۔ امیر افرم نے اس کی وجہ دریافت کی تو امام موصوف نے کہا کہ یہ لوگ مینڈک کی چربی، نارنج کے اندرونی چھلکے اور طلق پتھر وغیرہ پیس کر اپنے بدن پر مل لیتے ہیں، جس کی وجہ سے آگ کا ان پر اثر نہیں ہوتا۔

امیر افرم نے امام صاحب سے پوچھا کہ ''اگر یہ لوگ غسل کرنے کی شرط مان جائیں، تو آپ آگ میں کودنے کو تیار ہیں؟ اس بات کا امام صاحب نے جو جواب دیا، وہ سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے، اور جو آپ کے اللہ تعالیٰ پر توکل، عزم راسخ اور ایمان کی پختگی کی ایک زندہ جاوید مثال ہے۔ آپ نے فرمایا:

''ہاں! میں نے اللہ تعالیٰ سے استخارہ کیا ہے اور میرے دل میں یہ بات ڈال دی گئی ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو میں بھی آگ میں کود جاؤں۔ اور اگر ایسا کروں گا تو یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے جانشینوں سے اس قسم کے خوارق عادت کا ظہور کئی مرتبہ ہو چکا ہے اور ہمیشہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ جب یہ لوگ اپنے رموز و اشارات اور خوارق عادت امور سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو باطل کرنا چاہتے ہیں تو ہم پر فرض ہے کہ اس کی حمایت میں اپنے جان و مال کی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو ضرور ایسی نشانیاں عطا فرمائے گا، جن سے ہم ان کے خوارق عادت کا بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں۔''

جب فرقہ رفاعیہ کے پیروں فقیروں نے امام موصوف کی شرط اور اس کے بعد امیر افرم کے سوال پر امام صاحب کا جواب سنا تو ان کے حوصلے پست ہو گئے اور کہا، اس معاملہ کو یہیں پر ختم کر دیا جائے۔ انہوں نے باقاعدہ صلح کی درخواست بھی پیش کی اور امام موصوف پر زیادتی کا اعتراف کر کے معافی بھی مانگ لی۔ نیز وعدہ کیا کہ آئندہ ہم بدعتوں کو چھوڑ کر شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کریں گے۔ (امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کوکن عمری، ص ۱۵۵۔۱۶۰)، (تاریخ دعوت و عزیمت، ابوالحسن علی ندوی، ج ۲، ص ۵۷)

❀......❀......❀

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقالہ:۱۴۳

طرزِ حکومت پر اسلامی نظریاتی کونسل کے سوالنامہ کا جواب

نوتشکیل شدہ اسلامی نظریاتی کونسل نے صدرِ مملکت کے کے استصواب پر مورخہ جون ۱۹۸۱ء کو ''اسلامی نظامِ مملکت متعلقہ عام انتخابات'' پر غور کیا اور اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً کونسل کے جو اجلاس منعقد ہوئے، ان میں اس موضوع پر تفصیلی اظہارِ خیال کے بعد بعض مقدمات بطور رہنما اصول طے کیے گئے۔ بعد ازاں اس سلسلہ میں حسب ذیل سوالات مرتب کیے گئے:

۱۔ اس وقت بالغ رائے دہی کو جو صورت دنیا میں رائج ہے، اسلامی نقطہ نظر سے قابلِ قبول ہے یا نہیں؟

۲۔ کیا غیر مسلموں پر بھی اس کا اطلاق ہوگا؟

۳۔ کیا عورتوں پر بھی اطلاق ہوگا؟

۴۔ از روئے اسلام عام حق رائے دہی پر کوئی پابندی عائد کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

۵۔ اگر پابندی عائد کی جاسکتی ہے تو وہ کیا پابندیاں ہوں گی؟

۶۔ منتخب کیے جانے والے افراد، اربابِ حل وعقد کے اوصاف اور شرائط اہلیت کیا ہوں گے؟

۷۔ رئیسِ مملکت کا طریقہ انتخاب کیا ہوگا؟

مندرجہ بالا سوالات پر غور کرنے کے بعد موضوع سے متعلق عام بحث کے دوران حسب ذیل اکیس نکات مرتب کیے گئے۔

۱۔ اسلامی ریاست کی غرض وغایت اور اس کے مقاصد

۲۔ بالغ رائے دہی

۳۔ ووٹر (رائے دہندگان) کی عمر

۴۔ عورتوں کا حق رائے دہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۵۔ غیر مسلموں کا حق رائے دہی

۶۔ مجلسِ شوریٰ کی حیثیت

۷۔ شرائطِ اہلیت مجلس شوریٰ

۸۔ پارٹی سسٹم اور انتخابات

۹۔ یک ایوانی مقنّنہ یا دو ایوانی مقنّنہ

۱۰۔ شرائط اہلیت صدر

۱۱۔ صدر کا انتخاب براہِ راست یا بالواسطہ؟

۱۲۔ شرائط نمائندگان

۱۳۔ شرائط رائے دہندگان

۱۴۔ نمائندگان کی عمر

۱۵۔ جداگانہ انتخاب

۱۶۔ انتخابی کالج (علاقہ واری، پیشہ ورانہ حلقہ رائے دہی)

۱۷۔ کیا صدر شوریٰ کے فیصلوں کا پابند ہو گا؟

۱۸۔ کیا صدر کی نامزدگی برائے انتخاب کے لیے کوئی ادارہ مختص کیا جائے؟

۱۹۔ صدر کا انتخاب ایک مخصوص مدت کے لیے ہو گا یا تاحیات؟

۲۰۔ نامزدگی صدر کے بعد انتخاب کا اختیار ایوان ہائے مرکزی و صوبائی کو ہو گا یا براہِ راست عوام کو ہو گا؟

۲۱۔ امیدوار کا خود اپنے آپ کو پیش کر کے اپنے لیے کنویسنگ کرنا۔

کونسل اپنی حد تک ان نکات پر غور و خوض کر چکی تھی، جن کو رپورٹ کی شکل میں مرتب کر کے دسمبر ۱۹۸۱ء میں پیش کرنا طے کیا گیا تھا کہ مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۸۱ء کو صدر صاحب نے کونسل کے ممبران سے خطاب کرتے ہوئے کونسل کو ہدایت کی کہ وہ اس مسئلہ میں اپنی سفارشات کو آخری شکل دینے سے پہلے ماہرین آئین، دانشور اور علماء حضرات سے بھی مشورہ کرے۔

چنانچہ کونسل نے اس سلسلہ میں علماء سے رابطہ قائم کیا اور ان کو یہ سوالنامہ مع نکات، پہنچانے کے ساتھ ساتھ ان سے یہ درخواست بھی کی کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی رائے کونسل کو ۳۱ جنوری ۱۹۸۲ء تک پہنچا دیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ سوالنامہ ادارہ ''محدث'' کو بھی موصول ہوا تھا، جس کے جواب میں مشہور محقق، اہل قلم مولانا عبد الرحمٰن کیلانی نے ان نکات پر کتاب وسنت کی روشنی میں انتہائی مفید اور سیر حاصل بحث کی۔ ہم نے یہ مسودہ کونسل کو اس کی متعینہ تاریخ تک روانہ کر دیا تھا اور اب قارئین کے استفادہ کے لیے انہیں ''محدث'' کے فکر ونظر کے صفحات میں بھی جگہ دے رہے ہیں...... فالحمد للہ علی ذلک

واضح رہے کہ یہ جوابات کتاب وسنت ہی کی روشنی میں لکھنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ (ادارہ)

ا۔ اسلامی ریاست کی غرض وغایت اور اس کے مقاصد:

اسلام میں سیاسی تنظیم ایک اخلاقی بنیاد رکھتی ہے۔ یہاں ریاست کا قیام اصل مقصود نہیں بلکہ یہ کسی دوسرے عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ مثلاً ایک غیر اسلامی ریاست کے قیام کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ پولیس اور عدالت کے ذریعہ امن بحال رکھا جائے، انتظامیہ کے ذریعہ کاروبارِ حکومت چلایا جائے اور فوج کے ذریعہ سرحدوں کی حفاظت کی جائے۔ ایک اسلامی ریاست یہ تمام ذمہ داریاں بھی پورا کرتی ہے اور یہ اس کا ثانوی فریضہ ہے، اس کے قیام کے اولین مقاصد یہ ہیں:

﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (سورۃ الحج:۴۱)

''وہ لوگ کہ جب ہم انہیں زمین میں حکومت عطا کریں تو وہ نماز قائم کرتے، زکوٰۃ ادا کرتے، نیک کاموں کا حکم کرتے اور برے کاموں سے روکتے ہیں۔''

مندرجہ بالا ارشاد ربانی میں نظامِ صلوٰۃ کو معاشرہ میں تقویٰ پیدا کرنے کے لیے، زکوٰۃ کو معاشی ناہمواریاں دور کرنے کے لیے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو معاشرہ سے فحاشی ختم کرنے، امن اور نظام عدل قائم کرنے، نیز معاشرہ کو اخلاقی بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے تجویز فرمایا گیا ہے۔

اب بعض دوسرے احکامِ قرآنی بھی ملحوظ رکھے جائیں تو مختصراً ایک اسلامی ریاست کے اغراض و مقاصد مندرجہ ذیل سامنے آتے ہیں:

ا۔ نماز اور زکوٰۃ کا نظام نافذ کیا جائے۔

۲۔ ملک سے ظلم وجور ختم کر کے اسلامی عدل وانصاف قائم کیا جائے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۔ فحاشی، بے حیائی اور بے ہودہ کاموں کی روک تھام کی جائے۔

۴۔ اور جو باتیں اس نظام میں رکاوٹ کا سبب بنتی ہیں ان کو دور کیا جائے اور اسی کا نام جہاد ہے۔

۵۔ اسلام کے پیغام کو دوسروں تک پہنچا کر انسانیت کی تعمیر اور عالمی نظامِ امن کے لیے تگ و دو کی جائے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے حکومت کے انتظام و انصرام کو وہ اہمیت نہیں دی جو اخلاقی اقدار کو دی ہے۔ یہی اخلاقی بنیاد اسلامی طرزِ حکومت کو دوسری تمام اقسام حکومت سے ممتاز کرتی ہے۔ بالفاظِ دیگر جو ریاست مندرجہ بالا امور کو بروئے کار نہیں لاتی۔ وہ اگرچہ نام کے لحاظ سے اسلامی ہو، وہ اسلامی کہلانے کے مستحق نہیں ہوتی۔

۲۔ بالغ رائے دہی

اسلامی نقطہ نظر سے بالغ رائے دہی کا تصور موجود جمہوری تصور سے یکسر مختلف ہے۔ اس اختلاف کے مختلف پہلو درج ذیل ہیں:

(الف) ووٹ حق ہے یا ذمہ داری؟

موجودہ تصور کے لحاظ سے ووٹ ایک حق ہے جسے آدمی جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ کسی دوسرے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس حقدار سے یہ پوچھے کہ تم نے اس حق کو کس چیز کی بنیاد قرار دے کر استعمال کیا؟ مثلاً کسی حلقہ میں دس امیدوار کھڑے ہیں۔ ایک ووٹر اپنی مرضی سے کسی ایک نمائندہ کو اپنا ووٹ دے دیتا ہے تو کوئی شخص اس سے یہ نہیں پوچھ سکتا کہ اس نے اپنا ووٹ اسے کیوں دیا ہے، لیکن اسلام اس رائے دہی کو ایک ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ نمائندہ کی اہلیت و صلاحیت بتلا کر ووٹر سے مطالبہ کرتا ہے کہ جس شخص میں وہ دیانتداری سے یہ صفات دیکھے اور ان صفات میں وہ دوسروں سے آگے ہو، صرف اسے ہی ووٹ دیا جائے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾ (سورۃ النساء:۵۸)

"اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اس کے مستحق کے حوالے کرو۔"

اور رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

(المستشار مؤتمن) (متفق علیہ) (ابن ماجہ، حدیث ۳۷۴۷)

"جس سے مشورہ طلب کیا جائے اسے امانتداری سے مشورہ دینا چاہیے۔"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ووٹر کی حیثیت بھی مستشار کی ہوتی ہے۔ وہ کسی ایک نمائندہ کو ووٹ دے کر اس بات کی عملی شہادت پیش کرتا ہے کہ واقعی وہی شخص اس امانت کی سپردگی کا اہل تھا۔ چونکہ اس لحاظ سے ووٹر کی دیانت کا امتحان ہوتا ہے لہٰذا یہ حق نہیں بلکہ ایک بھاری ذمہ داری بن جاتی ہے۔

(ب) ہر ووٹ کی یکساں قیمت:

موجودہ تصور رائے دہی میں ہر رائے کی قیمت یکساں قرار دی گئی ہے۔ یہ نظریہ بھی اسلامی نقطۂ نظر سے باطل ہے۔ ارشاد باری ہے:

﴿هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (سورۃ الزمر:۹)
''کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں؟''

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ﴾ (سورۃ الرعد:١٦)
''کیا نابینا اور بینا برابر ہیں۔''

اور رسول اکرم ﷺ نے جنگ بدر کے قیدیوں کے متعلق جب مجلس مشاورت قائم کی کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، اور اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہمنوا تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس رائے سے اختلاف کیا اور کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ ان سب کو تہ تیغ کر دیا جائے۔ چند صحابہ اس رائے کے بھی ہمنوا تھے۔ خود رسولِ اکرم ﷺ کی رائے بھی وہی تھی جو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تھی لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

(لِوِاجْتَمَعْتُمَا مَا عَصَيْتُكُمَا) (درمنثور، ج۳، ص۲۰۲)
''اگر تم دونوں اس رائے پر متفق ہو جاتے تو میں اس کے خلاف نہ کرتا۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی نظر میں ان دو اصحاب رضی اللہ عنہما کی رائے باقی صحابہ رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں زیادہ قدر و قیمت رکھتی تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ج) ہر بالغ کا حق رائے دہی:

موجودہ دور میں ہر بالغ کو یہ حق دیا جاتا ہے۔ اگر کسی بالغ کا نام فہرست رائے دہندگان میں چھپنے سے رہ جائے تو وہ قانونی طور پر اس پر گرفت کر سکتا اور اس حق کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے یہ تصور بھی یکسر باطل ہے کیونکہ قرآنِ کریم نے بے شمار مقامات پر معاشرہ کی اکثریت کو جاہل، ظالم اور فاسق قرار دیا ہے، جن سے رائے لینا یا ان آراء پر عمل پیرا ہونا ایک گمراہ کن امر ہے۔ ارشاد باری ہے:

﴿وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (سورۃ الانعام:۱۱۶)

''اے نبی ﷺ! اگر آپ لوگوں کی اکثریت کے پیچھے لگیں گے تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بہکا دیں گے۔''

اس آیت نے معاشرہ کی اکثریت کو حق رائے دہی سے خارج قرار دے دیا ہے۔

اب اگر عقلی لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی یہ ہر بالغ کے حق رائے دہی کا اصول باطل ثابت ہوتا ہے۔ اگر آپ اپنے کسی ذاتی معاملہ میں مشورہ کرنا چاہیں تو ہر کس و ناکس سے رائے نہیں لیتے۔ بلکہ صرف اس شخص کو مشورہ کا مستحق سمجھتے ہیں، جو معاملہ فہم اور سمجھدار ہو اور یہ تو ظاہر ہے کہ کسی بھی معاشرہ میں ذی شعور اور دانش مند طبقہ کی تعداد قلیل ہی ہوا کرتی ہے اور یہی لوگ فی الحقیقت رائے دینے کے اہل ہوتے ہیں۔ ارشاد باری ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا﴾ (سورۃ النساء:۵۸)

''اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اس کے اہل کے حوالے کرو۔''

اب اگر کسی ووٹر کو یہ شعور ہی نہ ہو کہ نمائندہ کی اہلیت کیا ہے تو اسے ووٹ یا رائے دینے کا حق کیونکر دیا جا سکتا ہے؟

یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین کے انتخاب میں موجودہ مقصود بالغ رائے دہی مفقود نظر آتا ہے۔

عموماً یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ عہدِ نبوی یا خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم میں براہِ راست یا بالواسطہ انتخاب کا کوئی باضابطہ نظام موجود نہ تھا، لہٰذا مدینہ میں موجود بزرگ صحابہ رضی اللہ عنہم ہی (جو تمام عرب قبائل کے نمائندہ کی حیثیت رکھتے تھے) خلیفہ کے انتخاب میں حصہ لیتے رہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ بات بھی حقیقت کے خلاف ہے۔ مسلمانوں کی باقاعدہ مردم شماری کا رواج تو رسول اکرم ﷺ کی زندگی میں پڑ چکا تھا جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث سے واضح ہے:

(عَنْ حَذَيْفَةَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اُكْتُبُوْا لِي مَنْ تَلَفَّظَ بِالْاِسْلَامِ مِنَ النَّاسِ. فَكَتَبْنَا لَهُ اَلْفًا وَ خَمْسَ مِائَةٍ) (بخاری)

''سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، ہمیں رسول ﷺ نے حکم دیا کہ ''ہر وہ شخص جس نے اسلام کا کلمہ پڑھا ہے ان کے نام لکھ کر مجھے دیئے جائیں۔'' سو ہم نے آپ ﷺ کے لیے فہرست تیار کی تو ایک ہزار پانچ سو ہوئے۔''

اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تو مردم شماری کا الگ محکمہ بھی قائم ہو گیا تھا۔ اگر بالغ رائے دہی فی الواقع کوئی پسندیدہ چیز تھی تو کسی بھی دور میں ان رجسٹروں سے کیوں نہ کام لیا گیا جبکہ انتخابی فہرستیں پہلے ہی موجود تھیں؟

(د) رائے دہی اور کثرت رائے:

موجودہ دور میں کسی امر کے فیصلہ کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ ہر ووٹر یا ممبر سے ووٹ لیا جائے، ان سب ووٹوں کی قیمت یکساں سمجھی جائے، بعد میں گنتی کی جائے، جس طرف ووٹ زیادہ ہوں اس کے حق میں فیصلہ کر دیا جائے۔ اب یہ معاملہ خواہ صدرِ مملکت کے انتخاب سے تعلق رکھتا ہو یا کسی اور عہدہ کے انتخاب سے، خواہ کسی انتظامی معاملہ سے تعلق رکھتا ہو یا قانون سازی سے، ہر جگہ یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے کثرتِ رائے سے فیصلہ کا اصول ایک ثانوی یا اضطراری حیثیت رکھتا ہے، صدرِ مملکت یا کسی دوسرے عہدیدار کے انتخاب کے وقت کثرتِ رائے کی بجائے اس شخص کی اہلیت کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ انتظامی امور اور ذیلی قانون سازی کے وقت ''دلیل کی تلاش'' کی جاتی ہے اور اس کی بہت سی مثالیں ہم اپنی کتاب ''خلافت و جمہوریت'' کے ''حصہ دوم'' میں پیش کر چکے ہیں۔

اب اگر کسی معاملہ کے دو یا دو سے زیادہ پہلو ہوں اور دلائل کا وزن ہر طرف یکساں ہو، یا کسی طرف کوئی بھی دلیل نہ ہو تو اس وقت کثرتِ رائے کے اصول پر فیصلہ کرنے کا سہارا لیا جاتا ہے۔ کثرتِ رائے سے فیصلہ کا فائدہ صرف یہ ہے کہ اس سے نزاع کا فیصلہ ہو جاتا ہے لیکن وضوحِ حق سے اس کا کچھ تعلق نہیں ہوتا، اس کی مثال بالکل ایسے ہی سمجھیے جیسے کسی نزاع کا فیصلہ قرعہ اندازی سے کرایا جاتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غیر مسلم اقوام کی مجبوری یہ ہے کہ ان کے پاس سرے سے دلیل یا اس کے ماخذ اپنی اصلی صورت میں موجود ہی نہیں یا وہ ان سے باغی ہو چکے ہیں لیکن مسلمانوں کے پاس بحمد اللہ کتاب وسنت اپنی اصلی شکل میں موجود ہیں اور یہی دلیل کے ماخذ ہیں۔ پھر مسلمان ان سے بحمد اللہ باغی بھی نہیں ہے۔ تو پھر آخر بالغ رائے دہی کے ذریعہ کثرتِ رائے پر فیصلہ کے اصولوں کو کیوں اپنایا جائے؟

(ھ) فیصلہ کے وقت میر مجلس کے اختیارات:

موجودہ دور میں فیصلہ کثرت رائے کے اصول پر ہوتا ہے۔ میر مجلس محض بے اختیار ہوتا ہے، یا زیادہ سے زیادہ اس کی رائے کی قیمت دو آراء کے برابر قرار دی جاتی ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے یہ اصول بھی غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم ﷺ کو مسلمانوں سے مشورہ کا حکم دیا تو فرمایا:

﴿وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ ''اور اپنے کاموں میں ان سے مشورہ لیجیے پھر جب کام کا عزم کرلیں تو اللہ پر بھروسہ رکھیے۔''

(سورۃ آل عمران: ۱۵۹)

اس آیت میں ''عزمت'' کے الفاظ سے یہ بالکل واضح ہے کہ آخری فیصلہ کا اختیار آپ ﷺ کو دیا گیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں فیصلہ میر مجلس کے بجائے کثرتِ رائے کی بنیاد پر درست ہوتا تو آیت مذکورہ کے الفاظ مندرجہ ذیل دو صورتوں میں سے کسی ایک طرح پر نازل ہونے چاہیے تھے:

وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمُوْا فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ

''ان مسلمانوں سے اپنے کام میں مشورہ کیجیے۔ پھر جب وہ کام کا عزم کرلیں تو اللہ پر بھروسہ کیجیے۔'' یا

وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ وَاتَّبِعْ أَكْثَرَهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ

''ان مسلمانوں سے اپنے کام میں مشورہ کیجیے، پھر کثرت رائے کو تسلیم کیجیے اور اللہ پر بھروسہ کر کے کام کر ڈالیے۔''

بلکہ اس سے آگے مجھے یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ اگر کثرتِ رائے ہی معیارِ حق ہوتا تو انبیاء علیہم السلام کی بعثت یا نزولِ وحی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ مشورہ میں اقرب الی الحق کی تلاش کی جاتی ہے۔ اب ایسی دلیل اگر اقلیت کے پاس ہو تو فیصلہ اسی کے مطابق ہونا چاہیے۔ جنگ بدر کے قیدیوں کے متعلق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آپ ﷺ نے مشورہ کے بعد فیصلہ اپنے طبعی رجحان اور کثرت رائے کے مطابق دیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت ہوئی کیونکہ ان حالات میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی رائے اقرب الی الحق تھی۔ اس واقعہ سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں:

۱۔ فیصلہ کے وقت اللہ کی منشا یا دلیل کی تلاش کرنا چاہیے، اسے کثرتِ رائے پر نہ چھوڑنا چاہیے۔

۲۔ اگر میر مجلس کسی وقت غلط فیصلہ بھی کر دے تو بھی اسی سے آخری فیصلہ کا اختیار چھینا نہیں جا سکتا۔

اقلیت تو درکنار اگر تمام تر کثرت کے مقابلہ میں صرف ایک آدمی کی رائے ہی اقرب الی الحق ہو تو میر مجلس اسی کے مطابق فیصلہ کرنے کا پورا اختیار رکھتا ہے۔ اس کی مثال سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کا مرتدین سے نپٹنا اور جیشِ اسامہ رضی اللہ عنہ کو روانہ کرنا ہے۔ جس کی تفصیل ہم مذکورہ بالا کتاب میں پیش کر چکے ہیں۔

۳۔ ووٹرز (رائے دہندگان) کی عمر

ووٹر کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں اِلا یہ کہ وہ بالغ ہو۔ کچھ آدمی جلد بالغ ہو جاتے ہیں۔ کچھ ذرا دیر سے ہوتے ہیں۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی عمر رسول اکرم ﷺ کی وفات کے وقت صرف تیرہ یا چودہ سال تھی۔ آپ ﷺ کی زندگی میں سیدنا عبد اللہ رضی اللہ عنہ رائے تو درکنار فتویٰ بھی دیا کرتے تھے۔ حکومتِ وقت اگر انتظامی امور کا لحاظ رکھتے ہوئے اور لوگوں کی عمرِ بلوغت کی اوسط کا لحاظ رکھتے ہوئے کوئی حد مقرر کر بھی دے تو اس میں چنداں مضائقہ نہیں۔

پھر جب انسان بڑھاپے کی وجہ سے حواس کھو بیٹھے اور ذہول کا شکار ہو جائے تو اس سے رائے لینے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ اگر ایسی صورت تا حین حیات واقع نہ ہو تو اس سے رائے لینے میں کوئی حرج نہیں۔

۴۔ عورتوں کا حق رائے دہی

یہ تو سب اہل علم خوب جانتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو سیاست و امارت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا ہے اور عورت و مرد کا دائرہ کار الگ الگ مقرر کر دیا ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے درمیان گھریلو کاموں کی سرانجام دہی کے سلسلہ میں جھگڑا پیدا ہوا تو رسولِ اکرم ﷺ نے یہی فیصلہ فرمایا تھا کہ گھر کے اندر کے کام تو فاطمہ رضی اللہ عنہا سرانجام دے اور گھر کے باہر کے کام علی رضی اللہ عنہ۔ عورتوں سے جہاد کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فرضیت کو بھی ساقط قرار دیا گیا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ایک استفسار کے جواب میں یہی فرمایا تھا کہ ''عورتوں کا جہاد حج ہے۔'' (بخاری) اہلِ فارس نے کسریٰ کی بیٹی پوران دخت کو، جو نوشیرواں کی بیٹی اور شیرویہ کی بہن تھی، اپنا بادشاہ بنا لیا، جب رسولِ اکرم ﷺ کو یہ خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ قوم کیسے فلاح پا سکتی ہے جس نے ایک عورت کو اپنا سربراہ بنا لیا ہے؟ (بخاری)

ایک دفعہ آپ ﷺ نے یوں بھی فرمایا کہ:

(إِذَا كَانَ أُمَرَاؤُكُمْ خِيَارُكُمْ وَأَغْنِيَاؤُكُمْ سُمَحَاءُكُمْ وَأُمُورُكُمْ شُورٰى بَيْنَكُمْ فَظَهْرُ الْأَرْضِ خَيْرٌ لَكُمْ مِنْ بَطْنِهَا وَ إِذَا كَانَ أُمَرَاؤُكُمْ شِرَارَكُمْ وَأَغْنِيَاؤُكُمْ بُخَلَاءَكُمْ وَأُمُورُكُمْ إِلٰى نِسَائِكُمْ فَبَطْنُ الْأَرْضِ خَيْرٌ لَكُمْ مِنْ ظَهْرِهَا) (ترمذی۔ ابواب الفتن، حدیث نمبر ۲۲۶۶)

''جب تمہارے حکمران اچھے لوگ ہوں اور تمہارے دولت مند سخی ہوں اور تمہارے معاملات باہمی مشورے سے طے پائیں تو تمہارے لیے زندگی موت سے بہتر ہے، مگر جب تمہارے حکمران بدکردار ہوں اور دولت مند بخیل ہوں اور تمہارے معاملات بیگمات کے حوالے ہوں تو تمہاری موت تمہاری زندگی سے بہتر ہے۔''

رسول کریم ﷺ کے ان سب ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے عورت کو سیاست و امارت کے میدان میں نکلنے کی اجازت نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں دورِ نبوی ﷺ یا خلفائے راشدین میں ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی کہ کسی عورت کو سربراہِ مملکت تو درکنار کسی کلیدی آسامی پر بھی فائز کیا گیا ہو، اور اس کی وجوہ درج ذیل ہیں:

۱۔ اسلام نے عائلی نظام پر بھرپور توجہ دی ہے، لہٰذا عورت کی اصل ذمہ داری، بال بچوں کی صحیح تربیت قرار دی گئی ہے۔

۲۔ عورت کو حمل اور وضع حمل، حیض اور نفاس کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان ایام میں اس کے احساسات و جذبات کا اعتدال پر رہنا ناممکن ہوتا ہے۔ وہ مہمات امور کی طرف توجہ دینے سے قاصر ہوتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۔ عورت فطری طور پر بھی انفعال پذیر واقع ہوئی ہے۔ وہ کسی اہم معاملہ میں اعتدال پر رہنے کی بجائے فوری اثر قبول کر جاتی ہے۔

۴۔ جسمانی ساخت کے لحاظ سے عورت مرد کی نسبت کمزور واقع ہوئی ہے۔ اس کی طبیعت، شجاعت اور تہور کی بجائے رحم و کرم کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے۔

اب مشکل یہ آن پڑی ہے کہ عہد حاضر نے ہر میدان میں عورت کو مرد کے برابر لا کھڑا کیا ہے۔ عورتوں کو زیادہ سے زیادہ حقوق دینے پر زور دیا جا رہا ہے اور ان کے عالمی سال اور ہفتے منائے جا رہے ہیں۔ ان کے حسن کی نمائش کے مقابلے برپا کیے جا رہے ہیں۔ کھیلوں کے میدان میں انہیں برابر کا شریک کیا جا رہا ہے۔ گھر کی چار دیواری کو ظالمانہ قید سے تشبیہ دے کر مخلوط ادارے قائم کیے جا رہے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عورت کو سیاسی لحاظ سے صرف ووٹ دینے کا ہی مساوی حق نہیں بخشا گیا بلکہ وہ ہر قسم کی کلیدی آسامی حتیٰ کہ صدرِ مملکت کی کرسی پر براجمان بھی ہو سکتی ہے۔

ان حالات میں ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا ہے کہ اسلام نے گھر سے باہر عورت کو کیا کچھ کرنے کی اجازت دی ہے؟

۱۔ عورت کام کاج کے سلسلے میں باہر جا سکتی ہے لیکن پردہ کے ساتھ۔ تبرجِ جاہلیت کی یہاں کوئی گنجائش نہیں۔

۲۔ اگر مردوں کی کمی ہو تو عورتوں کو میدانِ جہاد میں شریک بھی کیا جا سکتا ہے اور وہ خود بھی شریک ہو سکتی ہیں، لیکن ان کا کام زخمیوں کی مرہم پٹی، مریضوں کی تیمارداری، فوجیوں کے لیے خوراک کی تیاری اور سامان کی فراہمی تک ہی محدود رہے گا، وہ باقاعدہ لڑائی میں حصہ نہیں لیں گے۔ جیسا کہ غزوہ احد کے دوران بعض واقعات ملتے ہیں (بخاری) اگر مردوں کی کمی نہ ہو تو اس صورت میں عورت کی جہاد میں شمولیت کو ناپسند کیا گیا ہے۔ جنگ خیبر کے دوران از خود ہی چند عورتیں شریک سفر ہو گئیں۔ رسولِ اکرم ﷺ کو علم ہوا تو آپ ﷺ نے اس بات کو ناگوار محسوس فرمایا، انہیں بلا کر ان سے شرکت کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے کہا: ''ہم نے سوت کات کر کچھ رقم اکٹھی کی اور ہمارا ارادہ تھا کہ جہاد میں شامل ہو کر زخمیوں کی مرہم پٹی اور تیمارداری کریں گی۔'' آپ ﷺ نے انہیں واپس نہیں کیا بلکہ اموالِ غنیمت میں سے بھی تھوڑا بہت حصہ انہیں دے دیا۔ (ابوداؤد)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

3۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے دوران سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مشورہ لیا تھا۔ ایسے ہی کئی صحابہ رضی اللہ عنہم سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے دینی مسائل پوچھتے تھے اوران سے اپنے امور میں مشورہ بھی لیتے تھے، تاہم یہ یاد رہنا چاہیے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کسی وقت بھی مجلسِ شوریٰ کی ممبر نہیں بنائی گئی۔

4۔ عورتوں کے مخصوص معاملات میں ان کی رائے یا شہادت پر انحصار کیا جاسکتا ہے۔ بچہ کی پیدائش کے معاملہ میں دایہ کی شہادت کسی دوسرے مرد کے مقابلہ میں زیادہ وقیع سمجھی جائے گی۔

5۔ چھوٹے بچوں کی تربیت کا فریضہ عورت مرد کی نسبت بہتر طور پر سرانجام دے سکتی ہے۔

6۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے جنگ جمل میں ایک فریق کے طور پر حصہ لیا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ان کے متعلق فرمایا:

((فانکِ خرجتِ غاضبة لله ولرسوله تطلبين أمرا كان عليكِ موضوعا، ما بال النساء والحرب والاصلاح بين الناس))	''آپ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم (کے احکام یعنی قصاص سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ) کے لیے غضبناک ہوکر ایک ایسے معاملہ کے لیے نکلی ہیں جس کی ذمہ داری سے آپ سبکدوش تھیں۔ بھلا عورتوں کا جنگ اور لوگوں میں مصالحت سے کیا تعلق؟''
(الامامة والسياسة لابن قتيبة، ص ۷۰)	

گویا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بھی یہ بات بخوبی معلوم تھی کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا اس شمولیت سے مقصد سیاسی امور میں شرکت نہیں تھا بلکہ محض قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ کا مطالبہ تھا۔ اس کے باوجود سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس طرح گھر سے باہر نکلنے اور لڑائی میں حصہ لینے کو پسند نہیں فرمایا۔

اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جو اس جنگ میں غیر جانب دار تھے اور جنہیں خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک بخت کہہ کر پکارا تھا (بخاری، کتاب المناقب) کی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی جنگ میں شمولیت کے متعلق یہ رائے تھی:

(ان بيت عائشة خير لها من هودجها)	''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا گھر ان کے لیے ہودج سے بہتر تھا۔''
(حوالہ ایضاً، ص ۷۱)	

یہ ہیں وہ واقعات جن سے ہم زیادہ سے زیادہ عورتوں کے حقوق کی گنجائش نکال سکتے ہیں اور وہ ہمارے خیال میں یہ ہیں:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

1۔ انتخابِ امیر میں ووٹ کا حق تو اسلام نے سب مردوں کو بھی نہیں دیا، عورتوں کو کیسے دیا جا سکتا ہے؟

2۔ جن عورتوں میں مشورہ دینے کی صلاحیت موجود ہو؟ ان سے رائے لی جا سکتی ہے لیکن انہیں پولنگ سنٹر پر حاضر ہونے کی تکلیف نہیں دی جائے گی، بلکہ ان کے گھر پر ان سے مشورہ کا انتظام کیا جائے گا۔

3۔ ایسے ادارے جن کا تعلق عورتوں یا بچوں کے مسائل سے ہو، مثلاً ''بہود اطفال ونسواں'' کلی طور پر عورتوں کی تحویل میں دیے جا سکتے ہیں۔ جہاں وہ آپس میں انتخاب بھی کر سکتی ہیں۔ اسی طرح تعلیم کے لیے عورتوں کے الگ ہسپتال بھی بنائے جا سکتے ہیں خواہ یہ ادارے حکومت کی تحویل میں ہوں یا نجی طور پر کام کر رہے ہوں۔

4۔ کسی بھی میدان میں عورتوں اور مردوں کے اختلاط کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

ان نتائج کی روشنی میں ہمیں عورت کے ووٹ کے اس حق کی کوئی ضرورت نظر نہیں آتی، جو موجودہ انتخابات میں پائی جاتی ہے۔

عموماً یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں بھی کئی ایسی حکمران عورتیں ہیں جنہوں نے کاروبارِ حکومت کو نہایت خوبی سے سرانجام دیا ہے۔ مثال کے طور پر چاند بی بی، رضیہ سلطانہ اور نور جہاں کا نام لیا جاتا ہے اور نیز یہ کہ آج کل بھی کئی عورتیں سربراہِ مملکت ہیں اور اپنے کام بہت اچھی طرح ادا کر رہی ہیں۔ ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں میں بھی حکمرانی کی صلاحیت موجود ہے تو پھر ان کے حق کو کیونکر دبایا جا سکتا ہے؟

ہم یہ عرض کریں گے کہ ایسے واقعات کی تعداد دنیا کی تاریخ میں شاید ایک فی صد سے زیادہ نہ ہو گی اور انہیں مستثنیات میں شمار کیا جائے گا اور مستثنیات سے اصول نہیں بدلا کرتے ہیں، مثلاً یہ ایک اصول ہے کہ عورت جسمانی لحاظ سے مرد کی نسبت کمزور ہوتی ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض عورتیں ایسی طاقتور اور دلیر ہوتی ہیں جنہوں نے دو تین ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا اور ان پر غالب آ گئیں تو ایسے شاذ و نادر واقعات سے یہ اصول نہیں بدل سکتا کہ عورت جسمانی لحاظ سے مرد سے کمزور ہوتی ہے۔ بالکل یہی صورت عورت کی حکمرانی کی ہے۔ اسلام نے اصول بیان کر دیا ہے کہ عورت میں مہمات امور کے سرانجام دینے کی اہلیت نہیں ہوتی۔ کسی نابغہ (Genius) کا مستثنیات میں شمار ہو گا جس کا بالعموم لحاظ نہیں رکھا جاتا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہا عصرِ حاضر کے تقاضوں یا ان کے چڑھتے ہوئے سیلاب کا مسئلہ تو ہمارے خیال میں ایک مردِ مومن کو زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز کی پالیسی اختیار کرنے کی بجائے زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز کی پالیسی پر عمل پیرا ہونا چاہیے کیونکہ اس کے ایمان کا یہی تقاضا ہے۔

۵۔ غیر مسلموں کا حقِ رائے دہی

امورِ مملکت میں غیر مسلموں کو شریک کرنے یا انتخاب کے سلسلہ میں ووٹ کا حق دینے کی ہمارے خیال میں کوئی گنجائش نہیں۔

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا﴾ (آل عمران:۱۱۸)

''اے ایمان والو! اپنے سوا کسی دوسرے کو اپنا راز دار نہ بناؤ کیونکہ وہ تمہاری خرابی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔''

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ عَدُوِّى وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَآءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِٱلْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا۟ بِمَا جَآءَكُم مِّنَ ٱلْحَقِّ﴾ (الممتحنۃ:۱)

''اے ایمان والو! تم اپنے اور میرے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم انہیں دوستی کا پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ وہ (دین) حق سے، جو تمہارے پاس آیا، منکر ہیں۔''

ان آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان ریاست کی اسمبلی یا مجلسِ شوریٰ میں غیر مسلم ممبر نہیں ہوسکتا۔ ایک دوسرے مقام پر غیر مسلموں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا يَرْقُبُونَ فِى مُؤْمِنٍ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً ۚ وَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُعْتَدُونَ ○ فَإِن تَابُوا۟ وَأَقَامُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُا۟ ٱلزَّكَوٰةَ فَإِخْوَٰنُكُمْ فِى ٱلدِّينِ﴾ (التوبۃ:۱۰،۱۱)

''یہ لوگ کسی مومن کے حق میں نہ تو رشتہ داری کا پاس کرتے ہیں نہ عہد کا۔ یہ لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ پھر اگر یہ لوگ توبہ کر لیں اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ دین میں تمہارے بھائی ہیں۔''

چونکہ اسلامی ریاست ایک نظریاتی ریاست ہوتی ہے۔ لہٰذا ووٹر اور نمائندہ دونوں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہوں۔ پھر ایک اسلامی مملکت میں شہریت کے حقوق حاصل کرنے کے لیے صرف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمان کہلانا ہی کافی نہیں، بلکہ نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی بھی لازمی ہے۔ آیت مذکورہ بالا میں ایک اسلامی مملکت کے شہری کے فرائض کو واضح طور پر بیان فرمادیا گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک اسلامی مملکت میں نہ صرف یہ کہ غیر مسلم کو ووٹ دینے کا حق نہیں، بلکہ ایسے نام کے مسلمانوں کو بھی یہ حق نہیں دیا جاسکتا جو نماز اور روزہ کے پابند نہ ہوں۔ پھر جب ایک غیر مسلم کو ووٹ کا حق بھی نہیں تو وہ نمائندہ منتخب ہوکر اسمبلی یا مجلسِ شوریٰ میں کیونکر شامل کیا جاسکتا ہے؟

٦۔ مجلسِ شوریٰ کی حیثیت

مجلس شوریٰ دراصل ایک ایسا ادارہ ہے جو نئے پیش آمدہ مسائل پر غور وخوض کرنے میں امیر مملکت کا مشیر ہوتا ہے۔ الجھے ہوئے معاملات میں امیرِ مملکت کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس ادارہ کی طرف رجوع رکھے، پیش آمدہ مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ ہر شخص اس پر آزادی سے اپنی رائے دے سکے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اہل شوریٰ کو مخاطب کرتے ہوئے مجلسِ شوریٰ کے قیام کا مقصد یوں بیان فرمایا تھا:

انی لم ازعجکم الا ان تشرکوا فی امانتی فیما حملتُ من امورکم فانی واحد کاحدکم و لست اریدان تتبعوا ھذا الذی ھو ھوای (کتاب الخراج۔ امام ابو یوسف)

”میں نے تمہیں صرف اس لیے تکلیف دی ہے کہ تم میرے اس بارِ امانت میں شریک ہو جو تمہارے ہی امور سے متعلق ہیں۔ میں بھی تم ہی جیسا ایک فرد ہوں اور نہیں چاہتا کہ تم لوگ میری رائے یا خواہش کے پیچھے لگو۔“

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے۔

1۔ دورانِ مشورہ آزادی رائے کے لحاظ سے امیرِ مملکت اور مشیروں میں کوئی فرق نہیں ہوتا وہ سب ایک ہی سطح پر ہوتے ہیں۔

2۔ امیر مملکت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ جبراً اپنی رائے یا خواہش کو مشیروں پر ٹھونسے یا بغیر دلیل کے کوئی بات ان سے منوائے۔

3۔ امیر مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ مشیروں کو پوری آزادی سے اظہار رائے کا موقعہ دے چونکہ امیر کا انتخاب ﴿ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم﴾ کے اصول کے تحت ہوتا ہے لہٰذا مشیروں کی آراء اور دلائل کا موازنہ کرنے کے بعد اقرب الی الحق راستہ انتخاب کرنے کا حق امیر کو دیا گیا ہے۔ مجلس شوریٰ کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کام یہ نہیں ہوتا کہ ملک کے لیے قانون سازی کے فرائض انجام دے۔ قانون سازی کا حق تو صرف اللہ کو ہے اور وہ سب کتاب وسنت میں موجود ہے۔ اب شوریٰ کا کام فقط یہ رہ جاتا ہے کہ وہ شرعی قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں پیش آمدہ رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے ذیلی قوانین (Bye Laws) وضع کرے جو اصل قوانین شرعیہ کی حدود کے اندر رہوں۔ دورِ فاروقی میں جب ایران فتح ہوگیا تو یہ مسئلہ سامنے آیا کہ اہل ایران جو مجوسی یا آتش پرست تھے ان سے اہل کتاب کا سا سلوک کیا جائے یا مشرکین کا سا؟ مورخ بلاذری نے اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

(كان للمهاجرين مجلس في المسجد فكان عمر يجلس معهم فيه ويحدثهم عما يُنتَهى اليه من الامر الافاق فقال يوما. ما ادرى كيف اصنع المجوس)

''سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مہاجرین پر مشتمل مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک مجلس تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ بیٹھتے اور سلطنت کے اطراف سے آنے والی خبروں پر گفتگو کرتے۔ ایک دن فرمایا: مجھے یہ سمجھ نہیں آرہا کہ مجوسیوں کے ساتھ کیسے معاملہ کیا جائے؟

اس الجھن کی وجہ یہ تھی کہ اہل ایران گو بظاہر آتش پرست اور مشرک تھے مگر وہ ایک الہامی کتاب ''ژند'' کو بھی مانتے تھے۔ اس مجلس نے بالآخر انہیں اہل کتاب کا درجہ دینے کا فیصلہ کیا، اور ان پر جزیہ عائد کرکے انہیں ذمیوں کے سے پورے حقوق کی منظوری دے دی۔

شوریٰ کا کام محض ذیلی قوانین بنانا نہیں ہوتا بلکہ وہ خالص انتظامی امور میں صدرِ مملکت کی اپنی آراء سے رہنمائی کرتی ہے اور اس کو یہ حق ہے کہ اگر امیرِ مملکت اس سے مشورہ کیے بغیر کوئی ایسا کام کرتا ہے جو اس کی نظروں میں مستحسن نہیں تو اس سلسلہ میں از خود امیر کو مشورہ دے کر اس کی صحیح رہنمائی کرے۔

عراق پر لشکر کشی کے دوران سیدنا عمر رضی اللہ عنہ خود سپہ سالار بن کر روانہ ہو چکے تھے۔ مدینہ میں اپنا قائم مقام سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو مقرر کر دیا تھا۔ جب چشمہ صرار تک پہنچ گئے اور وہاں قیام فرمایا، تو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے، جو شوریٰ کے ایک ممبر تھے، حاضر ہو کر عرض کیا کہ ''مجھے آپ کا خود عراق کی طرف جانا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔''

اتنی سی بات پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جلسہ عظیم کا انعقاد کرکے اس میں یہ مسئلہ پیش کیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری کی وجہ سے فوج میں بڑا جوش پیدا ہو گیا تھا، لہٰذا کثرتِ رائے خلیفہ وقت کے ارادے کے موافق معلوم ہوئی۔ تو اب سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے، یہ بھی شوریٰ کے ممبر تھے، یہ اعتراض کر دیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ خلیفہ وقت کا مدینہ سے باہر جانا خطرہ سے خالی نہیں۔ اگر کسی دوسرے سالارِ لشکر کو جنگ میں ہزیمت ہو تو خلیفہ وقت اس کا بآسانی تدارک کر سکتے ہیں۔ لیکن خدانخواستہ خلیفہ وقت کو کوئی چشم زخم پہنچے تو پھر مسلمانوں کے کام کا سنبھلنا دشوار ہو جائے گا۔" اب یہ مسئلہ پھر شوریٰ میں پیش ہوا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ، یہ بھی شوریٰ کے ممبر تھے، کو مدینہ سے بلایا گیا اور تمام اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم سے، جو شوریٰ کے ممبر تھے مشورہ کیا گیا تو شوریٰ نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی رائے کو پسند کیا۔

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے دوبارہ اجتماع عام کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "میں خود تمہارے ساتھ جانے کو تیار تھا، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تمام صاحب الرائے میرا نہ جانے کو پسند کرتے ہیں، لہٰذا میں مجبور ہوں۔ (طبری، ج ۳، ص: ۴۸۰ تا ۴۸۲ کی تلخیص)

یہ واقعہ شوریٰ کی حیثیت پر پوری روشنی ڈالتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی اکثریت کی رائے پر اصحاب الرائے یا شوریٰ کے چند ممبروں کی رائے کو کتنی فوقیت حاصل ہے؟

شوریٰ کی حیثیت کو پورے طور پر اجاگر کرنے کا دوسرا واقعہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا انتخاب ہے، جو عام دباؤ کے تحت ہوا تھا جس میں اہل شوریٰ کے تھوڑے سے افراد نے حصہ لیا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہیں غنڈہ عناصر نے مجبور کر کے ان سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی جبری بیعت لی تھی۔ انتخاب میں اہل شوریٰ کی عدم شرکت ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دور میں حکومت کو استحکام نصیب نہ ہوا۔ جب بھی آپ رضی اللہ عنہ سے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کا مطالبہ کیا جاتا تو آپ رضی اللہ عنہ کہہ دیتے کہ جب تک مسلمان اپنے اس امرِ خلافت پر متحد نہ ہو جائیں، یہ مطالبہ کیونکر پورا کیا جا سکتا ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی اس حیثیت کا احساس ان حضرات کو بھی تھا جو آپ رضی اللہ عنہ کے قریبی رشتہ دار اور مصاحب تھے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ عاملین کو معزول کرنا چاہا تو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے انہیں مشورہ دیا کہ فی الحال ان عاملین کو معزول نہ کرنا چاہیے جس کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی کہ "ممکن ہے وہ لوگ آپ رضی اللہ عنہ کی خلافت ہی کو چیلنج کر دیں اور کہیں کہ یہ خلافت ہی شوریٰ کے بغیر حاصل ہوئی ہے۔" (طبری، ج ۴، ص: ۴۳۹)

۷۔ شرائط اہلیت مجلس شوریٰ

۸۔ شرائط اہلیت صدر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۹۔شرائط رائے دہندگان

۱۰۔شرائط نمائندگان

۱۱۔نمائندگان کی عمر

مندرجہ بالا نکات کی ترتیب ہمارے خیال میں یوں ہونی چاہیے۔(۱) شرائط یا اہلیت رائے دہندہ،(۲) شرائط اہلیت نمائندگان یا ممبر شوری،(۳) شرائط اہلیت صدر،(۴) نمائندگان کی عمر۔ ہم اسی ترتیب سے ان کے جوابات سپردِ قلم کریں گے۔

ا۔شرائط ووٹر یا رائے دہندہ:

ہم پہلے وضاحت سے بتلا چکے ہیں کہ ایک اسلامی مملکت کے امورِ ریاست وسیاست میں مشورہ دینے کے لیے کم از کم دو بنیادی شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

ا۔ یہ کہ وہ مسلمان ہو اور

۲۔ یہ کہ وہ نماز اور زکوٰۃ ادا کرتا ہو۔ یہ دو بنیادی شرائط پوری کرنے پر وہ مملکت کا شہری اور رائے دینے کا حقدار بن سکتا ہے۔ اب ان دو شرائط کے علاوہ باقی شرائط درج ذیل ہیں:

(الف) بصیرت: ارشادِ باری ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا﴾(النساء:۵۸) ”اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اس کے مستحق کے حوالے کرو۔“

تو یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ رائے دہندہ اسلامی نقطہ نظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی نشست یا منصب کے مختلف امیدواروں میں سے بہتر کا انتخاب کرسکتا ہو۔

(ب) امانت: ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

”المستشار مؤتمن“ (متفق علیہ) (ابن ماجہ: حدیث نمبر ۳۸۷۷)

یعنی جس سے مشورہ طلب کیا جائے، اسے امانتداری سے مشورہ دینا چاہیے ورنہ وہ اس امانت کی خیانت کا مرتکب ہوگا۔ اگر یہ مشورہ کوئی راز کی بات ہے تو اس کو ظاہر کرنا بھی خیانت ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اب سوال یہ ہے کہ کسی شخص کا مسلمان ہونا یا نماز اور زکوٰۃ ادا کرنا تو ہر ایک کو معلوم ہو سکتا ہے لیکن بصیرت یا امانت تو ایسی باطنی صفات ہیں جو بظاہر معلوم نہیں ہو سکتیں۔ پھر کسی مسلمان کے متعلق سوءِ ظن کرنا بھی ناجائز ہے۔ لہٰذا اسلامی نقطہ نظر سے زیادہ سے زیادہ یہی گنجائش دی جا سکتی ہے کہ ہم ہر بالغ اور عاقل کو صاحبِ بصیرت بھی تصور کر لیں اور امین بھی اور ہر اس عاقل، بالغ شہری مرد کو رائے دہی کا حق دے دیں جو مسلمان ہو اور نماز اور زکوٰۃ کا پابند ہو۔

یہ تو ایک ووٹر کی ایجابی اہلیتیں تھیں۔ اب کچھ ایسی نا اہلیتیں بھی ملاحظہ فرمائیے جن کی وجہ سے ووٹر کا حق رائے دہی سلب ہو جاتا ہے۔

یہ تو واضح ہے کہ ووٹ ایک عملی شہادت ہے جس کے ذریعہ ایک ووٹر اپنے قلبی اطمینان اور یقین کے ساتھ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ موجودہ امیدواروں میں سے فلاں امیدوار اس کے نزدیک اہل تر ہے۔ لہٰذا ہر وہ شخص جس کی شہادت از روئے اسلام نا قابل قبول ہو گی رائے دینے کا بھی نا اہل قرار پائے گا۔ اور ایسے اشخاص درج ذیل ہیں:

۱۔ فاسق کی شہادت:

ارشاد باری ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا﴾ (الحجرات:۶) ''اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو۔''

معلوم ہوا کہ فاسق کی شہادت معتبر نہیں ہے، لہٰذا کسی فاسق کو ووٹ کا اہل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

فاسق کی مختلف اقسام بیان کرتے ہوئے فقہاء نے مندرجہ ذیل قسم کے افراد کی شہادت کو نا قابل قبول قرار دیا ہے:

۱۔ نماز، روزہ وغیرہ کا تارک، ۲۔ یتیم کا مال کھانے والا، ۳۔ زانی، ۴۔ لواطت کا مرتکب، ۵۔ چور اور ڈاکو، ۶۔ ماں باپ کی حق تلفی کرنے والا، ۷۔ خائن اور خائنہ

۲۔ قاذف کی شہادت:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا﴾ (النور:۴)

''اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں پھر ان پر چار گواہ نہ لاسکیں تو ان کو اسی کوڑے مارو اور کبھی ان کی شہادت قبول نہ کرو۔''

۳۔ جھوٹی گواہی دینے والے کی شہادت:

جھوٹی گواہی دینا کبیرہ گناہ ہے جو ایمان کے منافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی ایک صفت یہ بھی بیان فرمائی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ﴾ (الفرقان:۷۲)

نبی اکرم ﷺ نے بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

(الاشراک بالله و عقوق الوالدين و قتل النفس و شهادة الزور)

''اللہ سے شرک کرنا، والدین کی نافرمانی، کسی کو قتل کرنا اور جھوٹی گواہی دینا۔''

(بخاری، کتاب الشہادات)

لہٰذا ایسا شخص جس کی جھوٹی گواہی ثابت ہو جائے آئندہ اس کی شہادت قابل قبول نہیں ہوتی۔

سیدنا معمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

(عن معمر ان رسول الله ﷺ ردّ شهادة رجل في كذبة كذبها) (القضاء لابی عبید)

''معمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کی گواہی مردود قرار دی جو پہلے کسی معاملہ میں جھوٹی گواہی دے چکا تھا۔''

جھوٹی گواہی دینا ایک قابلِ تعزیر جرم ہے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ایسے جھوٹے گواہوں کو کئی طرح کی سزائیں دیتے تھے۔ کبھی طویل عرصہ کے لیے مقید کیا جاتا، کبھی کوڑے لگائے جاتے اور کبھی سر مونڈ کر چہرہ پر سیاہی لگا دیتے اور یہ سب سزائیں جھوٹی شہادت کی مناسبت سے دی جاتی تھیں۔

۴۔ قریبی تعلقات داروں کی شہادت:

باپ کی گواہی بیٹے کے حق میں اور اسی طرح بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں، بیوی کی گواہی خاوند

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے حق میں اور اسی طرح خاوند کی گواہی بیوی کے حق میں، غلام کی گواہی آقا کے حق میں اور اسی طرح آقا کی گواہی غلام کے حق میں نا قابلِ قبول ہیں۔ (بیہقی)

آج بحمد اللہ غلامی کا دستور نہیں رہا جو عہد نبوی ﷺ میں تھا۔ تاہم موجودہ دور میں کسی کارخانہ یا فیکٹری کے مزدوروں کی تقریباً وہی حیثیت ہے جو اس دور میں نجی غلاموں کی تھی۔ لہٰذا ہم تصریحات بالا سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ کسی امیدوار کے حق میں اس کی بیوی، بیٹوں اور ملازموں یا مزدوروں کا ووٹ قابل قبول نہیں ہے۔

اب ہم عصر حاضر کا لحاظ رکھتے ہوئے مختصراً ایک نمائندہ کی اہلیت اور نا اہلیت کی شرائط بیان کرتے ہیں:

۱۔ ووٹر کے لیے مسلمان ہونا ضروری ہے۔

۲۔ عملی طور پر وہ نماز، زکوٰۃ اور روزہ کا پابند ہو ورنہ اسے رائے دینے کا کوئی حق نہ ہوگا۔

۳۔ اس کا نمائندہ سے قریبی تعلق نہ ہو جس کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔

۴۔ جس شخص کی جھوٹی گواہی پہلے ثابت ہو چکی ہو اسے بھی رائے دینے کا حق نہیں۔

۵۔ کسی اخلاقی جرم میں سزا یافتہ نہ ہو، نہ ہی کسی پر تہمت لگانے کا مرتکب ہو چکا ہو، بستہ الف یا ب سے تعلق نہ رکھتا ہو، بالفاظِ دیگر فاسق و فاجر نہ ہو بلکہ اچھی شہرت رکھنے والا ہو۔ بری شہرت کا فیصلہ دو معتبر شہادتوں کی بنا پر کیا جا سکتا ہے اور اس کی تحقیق کے لیے دوسرے ذرائع بھی اختیار کیے جا سکتے ہیں۔

۶۔ عاقل بالغ ہونے کے ساتھ کم از کم معمولی لکھنا پڑھنا بھی جانتا ہو۔ اتنی سیاسی سوجھ بوجھ بھی رکھتا ہو کہ نمائندہ یا حاکم کے لیے کن اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے۔

مندرجہ بالا شرائط کو ہم مزید اختصار سے بیان کرنا چاہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک ووٹر کے لیے مسلمان، بالغ، عاقل اور متقی ہونا ضروری ہے۔

ان تصریحات سے آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلامی نقطہ نظر سے پاکستان میں کتنے فیصد ایسے لوگ رہ جاتے ہیں جو صحیح معنوں میں رائے دہی کے مستحق سمجھے جا سکتے ہیں۔

شرائط اہلیت (نمائندہ برائے) مجلس شوریٰ

مجلس شوریٰ کے ممبروں کا کام مملکت کے داخلی اور خارجی امور کے متعلق صدر کو مشورہ دینا یا ذیلی قوانین بنانا ہے۔ ایسے مشورہ میں چونکہ کتاب و سنت کی مذکورہ حدود کے اندر رہ کر اقرب الی الحق راستہ کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تلاش ہوتی ہے لہٰذا اس شوریٰ کے ممبر کے لیے رائے دہندہ کی تمام شرائط پوری کرنے کے علاوہ مندرجہ ذیل دو شرائط کا پورا کرنا بھی ضروری ہے۔

۱۔ یہ کہ وہ کتاب وسنت کا عالم ہو اور

۲۔ کتاب وسنت سے استنباط یا نتائج اخذ کرنے کا ملکہ رکھتا ہو۔

یہ دونوں صفات مجلس شوریٰ کے ممبروں کے علاوہ عدلیہ اور انتظامیہ کے حکام کے لیے بھی ضروری ہیں۔ ارشادِ باری ہے:

﴿وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ﴾ (سورۃ النساء:۸۳)

''اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر پہنچتی ہے تو اسے مشہور کر دیتے ہیں اور اگر اس کو پیغمبر ﷺ اور اپنے حاکموں کے پاس پہنچاتے تو تحقیق کرنے والے اس کی تحقیق کر لیتے۔''

۳۔ صدر کی اہلیت:

اولی الامر سے مراد وہ حکامِ بالا ہیں جو کلیدی آسامیوں پر فائز ہوتے ہیں۔ خواہ یہ مقننہ (شوریٰ) سے تعلق رکھتے ہوں یا عدلیہ سے یا انتظامیہ سے۔ اہل شوریٰ کی صفات تو ہم بیان کر چکے ہیں۔ انتظامیہ کے اور بالخصوص فوج کے اولی الامر کے لیے کتاب وسنت کا عالم ہونے کے علاوہ صحت مند، مضبوط جسم کا مالک ہونا ضروری ہے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ﴾ (سورۃ البقرۃ:۲۴۷)

''اللہ تعالیٰ نے طالوت کو بادشاہت کے لیے منتخب کیا ہے اور اسے علم اور جسم (طاقت) میں وافر حصہ عطا فرمایا ہے۔''

اور عدلیہ کے اولی الامر کے لیے صاحبِ بصیرت ہونے کے علاوہ قوتِ فیصلہ کا مالک ہونا بھی ضروری ہے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ﴾ (سورۃ ص:۲۰)

''ہم نے داؤد (علیہ السلام) کو حکمت اور فیصلہ کن بات کرنے کی صلاحیت دی۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عدلیہ کے اولی الامر کے لیے چند اور شرائط بھی ضروری ہیں، مثلاً وہ حلیم محتاط اور حق وانصاف کے معاملہ میں مضبوط ہونا چاہیے لیکن اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔

اب دیکھیے، صدر کا ان تینوں طرح کی صفات سے مجملاً متصف ہونا ضروری ہے۔ ایسے انسان تو کم ہی ہوتے ہیں جو ہر لحاظ سے جامع صفات ہوں، تاہم صدارت کا مستحق وہی شخص ہو سکتا ہے جس میں مندرجہ بالا صفات زیادہ سے زیادہ پائی جاتی ہوں۔

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ ایک ایسی جامع صفت ہے جس کا رائے دہندہ، نمائندہ، اولی الامر اور صدر سب میں پایا جانا ضروری ہے۔ تقویٰ سے مراد ہر معاملے میں عند اللہ مسؤلیت کا تصور ہے اور یہ تصور ہر معاملے میں اور ہر مقام پر انسان کی راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ متقی شخص مشیر ہو تو غلط مشورہ نہیں دے سکتا۔ قاضی ہو تو غلط فیصلہ نہیں کر سکتا اور افسر ہو تو ظلم و جور نہیں کر سکتا۔ پھر تقویٰ کے بھی مختلف درجات ہیں۔ لہٰذا اگر محض تقویٰ کی بنیاد پر ہی اولی الامر اور صدر کا انتخاب کیا جائے تو ہمارے خیال میں یہ بھی درست ہوگا۔ ارشادِ باری ہے:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ ''اللہ کے نزدیک تم میں سے معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔''

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(رَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ اللَّهِ) ''اصل دانائی خدا کا خوف ہے۔''

بالفاظِ دیگر ووٹر یا رائے دہندہ صرف متقی شخص ہو سکتا ہے اور اولی الامر وہ اشخاص ہوں گے جو تقویٰ کے بلند مقام پر ہوں گے اور صدر وہ شخص ہوگا جو تقویٰ میں ان سب سے بڑھ کر ہوگا۔

۴۔ نمائندگان کی عمر:

نمائندہ اور اسی طرح دوسرے اولی الامر کے لیے پختہ عقل (Matured) ہونا ضروری ہے۔ قرآن کریم کی ایک آیت سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ انسان چالیس سال کی عمر تک پہنچ کر پختہ عقل ہوتا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً﴾ (الاحقاف:۱۵) ''یہاں تک کہ جب انسان بھرپور جوان ہوتا اور چالیس سال کی عمر کو پہنچتا ہے۔''

اور اس رائے کی عملی شہادت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بالعموم نبوت چالیس سال یا اس کے بعد ہی عطا ہوئی، اسی طرح خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم میں کوئی بھی ایسا نہیں کہ جب وہ منصبِ خلافت پر فائز ہوا ہو تو اس کی عمر چالیس برس سے کم ہو۔

تاہم چالیس سال کی شرط ایسی نہیں جس کا استثناء نہ ہو۔ اصل شرط پختہ عقل ہونا ہے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز جب خلیفہ منتخب ہوئے تو آپ کی عمر ۳۷ سال تھی اور جب شہید ہوئے تو ۳۹ سال کے تھے، حالانکہ ان کا شمار خلفائے راشدین میں ہوتا ہے۔ جس طرح بلوغت حالات، زمانہ اور علاقہ کے تحت الگ الگ ہے اسی طرح پختہ عقل ہونے کی عمریں بھی الگ ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح بعض انسان پیدائشی طور پر ذہین ہوتے ہیں وہ چھوٹی عمر میں ہی ایسے پختہ عقل ہوتے ہیں کہ بڑے بزرگ ان کی باتوں سے دنگ رہ جاتے ہیں۔

ان حالات میں محض عمر کی قید لگانا مشکل ہے اور اگر کوئی شرط عائد کرنا ہی ہو تو ہمارے خیال میں چالیس سال کی شرط ہی بہتر ہے۔

۱۱۔ صدر کا انتخاب براہِ راست ہو یا بالواسطہ؟

۱۸۔ کیا صدر کی نامزدگی برائے انتخاب کے لیے کوئی ادارہ مختص کیا جائے؟

صدر کے براہِ راست انتخاب، جسے آج کی زبان میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخاب کہا جاتا ہے، کی کوئی مثال ہمیں تاریخِ اسلام میں نہیں ملتی۔ جو اصحاب خلیفہ منتخب ہوئے یا نامزد کیے گئے، سب اہل شوریٰ سے تعلق رکھتے تھے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شوریٰ کے معزز رکن تھے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیقی میں شوریٰ کے معزز رکن رہے، جنہیں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نامزد کیا تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے دوران جن چھ حضرات کا انتخابی بورڈ بنا کر فرمایا کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بنا لیا جائے، یہ سب اصحاب مجلس شوریٰ کے ارکان تھے۔ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد باغی گروہ نے جن تین حضرات کو خلافت کا مستحق سمجھا، یعنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ، یہ بھی اہل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شوری تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب باغی عنصر نے عوام کو ساتھ ملا کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لیے مجبور کر دیا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''یہ اہل شوری اور اہلِ بدر کا کام ہے جسے وہ منتخب کریں وہی خلیفہ ہوگا۔ ہم جمع ہوں گے اور اس معاملہ پر غور کریں گے۔'' (ابن قتیبہ، الامامۃ والسیاستہ، ج ۱، ص ۱۴۱)

تصریحاتِ بالا سے دو باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ خلفائے راشدین کے آخری دور تک براہِ راست انتخابِ خلیفہ کا کوئی تصور موجود نہیں تھا، بلکہ انتخابِ صدر کا کام صرف مجلس شوری کے ذمہ تھا۔

۲۔ مجلس شوری اپنے میں سے ہی کسی ایک کو خلیفہ منتخب کرتی تھی۔ مجلس شوری سے باہر خلیفہ کا انتخاب کبھی عمل میں نہیں آیا۔

ان حقائق کی روشنی میں ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی نقطہ نظر سے بالواسطہ انتخاب ہی صحیح صورت ہے۔

۱۷۔ کیا صدر شوریٰ کے فیصلوں کا پابند ہوگا؟

ہم پہلے بالغ رائے دہی کی شق نمبر ۵ ''فیصلہ کے وقت میر مجلس کے اختیارات'' کے تحت تفصیل سے لکھ آئے ہیں کہ میرِ مجلس یا صدر شوری سے مشورہ کرنے کا پابند ضرور ہے لیکن وہ فیصلہ میں کثرتِ آراء کا پابند نہیں۔ اگر وہ مناسب سمجھتا ہو تو تمام شوریٰ کے متفقہ فیصلہ کے خلاف بھی فیصلہ دے سکتا ہے۔ جیسا کہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جیشِ اسامہ رضی اللہ عنہ اور مانعین زکوٰۃ کے سلسلہ میں کیا۔ اس سلسلہ میں جمہوریت نوازوں کی طرف سے جتنے اعتراض کیے جاتے ہیں ان کا جائزہ ہم اپنی کتاب ''خلافت و جمہوریت'' کے صفحہ ۱۴۵ تا صفحہ ۱۵۵ میں بڑی تفصیل سے پیش کر چکے ہیں۔ ممکن ہے بعض حضرات صدر کے اس اختیار کو ڈکٹیٹر شپ (آمریت) کا نام دیں۔ لیکن یہ بات حقیقت کے خلاف ہے۔ صدر بھی دلیل کے بغیر اپنی مرضی کو دوسروں پر ٹھونس نہیں سکتا۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بھرے مجمعے میں مانعین زکوٰۃ سے جہاد کے لیے یہ دلیل پیش کی تھی:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ان اللہ لم یفرق بین الصلوٰۃ والزکوۃ ثم جمعھما) ''اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ میں کوئی فرق نہیں فرمایا، بلکہ دونوں کو اکٹھا ہی ذکر کیا ہے۔''

(کنز العمال، ج:۳،ص۱۴۲)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عراق کی زمینوں کو قومی تحویل میں لینے کا ارادہ کیا تو جب تک قرآن سے دلیل سمجھ میں نہیں آئی، آپ رضی اللہ عنہ معترضین کے ہاتھوں سخت بے چین رہے۔ اس کی تفصیل بھی ہم مذکورہ کتاب کے صفحہ ۱۳۸ تا ۱۴۱ پر پیش کر چکے ہیں۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے ایک عام شخص بھی دلیل سے صدر کے کسی حکم کو چیلنج کر سکتا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ کے دوران لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ حق مہر زیادہ نہ باندھا کریں اور اس کی حد چار سو درہم مقرر کی تو ایک عورت اٹھ کر کہنے لگی ''تم یہ پابندی لگانے والے کون ہوتے ہو، جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَّاٰتَیۡتُمۡ اِحۡدٰهُنَّ قِنۡطَارًا﴾ (النساء:۲۰) ''اگرچہ تم ان عورتوں میں کسی ایک کو خزانہ بھر بھی (بطورِ حق مہر) دے چکے ہو۔''

یہ بات سن کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بے ساختہ پکار اُٹھے ''یا اللہ! مجھے معاف فرما، ہر شخص عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ فقیہ ہے۔'' پھر منبر پر چڑھے اور کہا: ''لوگو! میں نے تمہیں چار سو درہم سے زیادہ حق مہر مقرر کرنے سے روکا تھا۔ میں اپنی رائے واپس لیتا ہوں۔ تم میں سے جو جتنا چاہے مہر میں دے۔''

یہی وہ فرق ہے جو خلافت کو آمریت سے ممتاز کرتا ہے۔ آمر بغیر کسی دلیل کے محض اپنی مرضی سے شوریٰ یا مشیروں کی رائے کو رد کر سکتا ہے لیکن خلافت میں یہ بات ممکن نہیں۔ اسی طرح ایک آمر اپنی کسی پالیسی یا حکم پر تنقید برداشت نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ دلیل سے ہو یا بلا دلیل، جبکہ خلافت میں تنقید کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے موجودہ دستور نے بھی، جو خالص جمہوری قدروں پر ترتیب دیا گیا ہے، سربراہِ مملکت کو مشورہ قبول کرنے کا پابند قرار نہیں دیا ہے۔ یہاں ہم ''تحریک آزادی و دستورِ پاکستان'' مؤلف فاروق اختر نجیب کے چوتھے ایڈیشن سے چند اقتباس پیش کرتے ہیں:

۱۔ ''وزراء کا کام حکومت کی پالیسی کی تشکیل میں صدر کو مشورے دینا ہے۔ اس سلسلہ میں صدر جب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چاہے ان سے مشورہ طلب کرسکتا ہے مگر وہ ان کے مشورے کو قبول کرنے کا پابند نہیں۔'' (ص:۴۴۴)

۲۔ ''صدر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور اس کے مشورے سے دوسرے ججوں کا تقرر کرتا ہے اسی طرح وہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور متعلقہ صوبہ کے گورنر کے مشورہ سے ہائی کورٹوں کے چیف جسٹس......اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس، متعلقہ صوبہ کے گورنر اور متعلقہ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کے مشورہ سے ہائیکورٹ کے ججوں کا تقرر کرتا ہے۔ گویا متذکرہ افراد سے وہ صرف مشورہ کرنے کا پابند ہے، اس مشورہ کو قبول کرنے کا پابند نہیں۔'' (ص:۴۴۴)

بعینہ ایک اسلامی مملکت کا صدر اہم معاملات میں شوریٰ سے مشورہ کرنے کا پابند ضرور ہے مگر ان کا مشورہ قبول کرنے کا پابند نہیں۔ تمام شوریٰ کے دلائل سننے کے بعد آخری فیصلہ کا اختیار صدر ہی کو حاصل ہے۔

۱۸۔ صدر کی نامزدگی برائے انتخاب کے لیے مختص ادارہ

نامزدگی صدر کے بعد انتخاب کا اختیار

ہمارے خیال میں شوریٰ ہی وہ ادارہ ہے جسے صدر کی نامزدگی کا حق دیا گیا ہے۔ خلیفہ کے انتخاب کے وقت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خلافت کے لیے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کا نام پیش کیا۔ یہ تینوں حضرات شوریٰ کے ممبر تھے۔ پھر جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں خلیفہ بننے کو ناپسند کیا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نام پیش کیا پھر بیعت بھی کرلی۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صدر کو نامزد کرنے اور پھر اسے منتخب کرنے کا کام دراصل اسی شورائی ادارہ کی ذمہ داری ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لیے جب مجبور کیا گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے بھی یہی جواب دیا تھا کہ ''خلیفہ کا انتخاب دراصل اہل شوریٰ اور اہلِ بدر کا کام ہے۔'' اور یہ تو ظاہر ہے کہ انتخاب سے پہلے نامزدگی ضروری ہوتی ہے۔

اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ اسی شوریٰ میں سے چند اہل افراد کی ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جیسا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے صدر کی نامزدگی اور انتخاب کے لیے ایک چھ رکنی کمیٹی تشکیل دی تھی۔

اور اس کی تیسری صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ صدر کے انتخاب کا کام سابقہ صدر کی کابینہ کے سپرد کر دیا جائے۔ ہمارے اس خیال پر موجودہ دور میں دو قسم کے اعتراضات وارد ہوسکتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۔ اگر کابینہ کو یہ حق دیا جائے تو سابقہ صدر جس پارٹی سے تعلق رکھتا ہے وہی پارٹی ہمیشہ کے لیے ملک پر مسلط ہو جائے گی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے شوری میں جس سے صدر اپنی کابینہ کو نامزد کرتا ہے، حزب اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ نہ ہی کسی ایسی پارٹی کی گنجائش ہے جس کے نظریات اسلام سے متصادم ہوں۔ اگر یہ دو باتیں ختم ہو جائیں تو کابینہ کو صدر نامزد کرنے کا کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا۔

۲۔ جمہوری ملک میں کوئی سرکاری ملازم اس وقت تک اپنا نام صدارت یا اسمبلی کے لیے پیش نہیں کر سکتا جب تک وہ ملازمت سے استعفیٰ نہ دے دے۔ بعد میں وہ خواہ منتخب ہو یا نہ ہو، لیکن اسلام میں ایسی کوئی پابندی نہیں۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو نامزد کیا۔ جبکہ آپ مجلس شوری کے رکن بھی تھے اور منصب قضاء پر مامور بھی تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت فرمایا کہ اگر ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ زندہ ہوتے تو میں انہیں خلافت کے لیے نامزد کر دیتا۔ سیدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ مجلس شوری کے رکن بھی تھے اور دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیت المال کے انچارج بھی چلے آ رہے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کی نامزدگی اور انتخاب کے لیے جو چھ رکنی کمیٹی مقرر کی اس میں ایک سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ شوری کے ممبر بھی تھے اور عہدہ قضا پر بھی مامور تھے۔ ان واقعات سے ظاہر ہے کہ سرکاری ملازمین ملازمت کے دوران صدارت کے لیے نامزد کیے جا سکتے ہیں لہٰذا اگر صدر کی نامزدگی کا کام کابینہ ہی کے سپرد کر دیا جائے تو بھی ہمارے خیال میں چنداں مضائقہ نہیں۔

۱۹۔ صدارت کے لیے مدت

جمہوری ممالک میں پارلیمنٹ کی ممبرشپ اور ملک کی صدارت ایک سیاسی حق ہے۔ کچھ حضرات تو یہ ''حق'' وصول کر لیتے ہیں اب باقی ''حقدار'' اس انتظار میں رہتے ہیں کہ انہیں یہ حق کب نصیب ہوتا ہے۔ ان ''باقی حقداروں'' کی دادرسی کے لیے منصب کی مدت معین کرنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اسلام میں شوری کی ممبرشپ یا مملکت کی صدارت ایک عظیم ذمہ داری ہے۔ ان لوگوں کو خدا کے سامنے جواب دہی کے تصور کو سامنے رکھ کر اپنا فریضہ سرانجام دینا ہوتا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جس قدر ایثار اور جانکاہ کوششوں سے اسلام کی خدمت کی، وہ سب جانتے ہیں، لیکن اس کے باوجود آپ رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت یہ فرمایا تھا کہ ''خلافت کے مقدمہ میں برابر برابر پر چھوڑ دیا جاؤں تو میں یہ غنیمت سمجھتا ہوں، نہ مجھے ثواب ملے نہ عذاب ہو۔'' (بخاری، کتاب الاحکام، باب الاستخلاف)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھر کسی نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ''اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو خلافت کے لیے نامزد کر دیجیے'' آپ رضی اللہ عنہ نے ناراضی کا اظہار فرمایا اور کہنے والے کو سخت سست کہا اور فرمایا:

''اگر یہ حکومت اچھی چیز تھی تو اس کا مزہ ہم نے چکھ لیا اور اگر یہ بری چیز تھی تو عمر کے خاندان کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ کل کو خدا کے سامنے ان میں سے صرف ایک ہی آدمی سے حساب لیا جائے۔''
(طبری، ج ۴، ص ۲۲۷، ۲۲۸)

غور فرمایئے اگر کسی شخص کو صحیح معنوں میں اس ذمہ داری کا احساس ہو تو وہ کسی منصب کی آرزو کر سکتا ہے؟ کون اس بات پر تیار ہو گا کہ سابقہ ذمہ دار کو سبکدوش کر کے اس ذمہ داری کا بوجھ خود اٹھا لے؟ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں صدارت کے لیے کوئی مدت مقرر نہیں، وہ تاحینِ حیات صدر رہے گا۔ خلفائے راشدین کے دور میں ہمیں تعین مدت کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ تعیینِ مدت کی ضرورت صرف اسی صورت میں پیش آتی ہے جب احساسِ ذمہ داری ختم ہو جائے اور منصب کو ایک حق سمجھ لیا جائے۔

۸۔ پارٹی سسٹم اور انتخابات

اس موضوع کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل نکات کو ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے:

۱۔ ایک اسلامی مملکت میں بنیادی طور پر دو ہی قسم کی پارٹیاں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ جو اسلامی نظریات کی حامل اور اس کے فروغ کے لیے کوشاں ہو۔ یہ پارٹی ''حزب اللہ'' ہے اور دوسری وہ جو اسلام دشمن ہو، خواہ وہ غیر مسلموں پر مشتمل ہو یا ایسے مسلمانوں پر جو اسلامی نظریات سے متضاد نظریات رکھتے ہوں۔ قرآن کی اصطلاح میں یہ پارٹی ''حزب الشیطان'' ہے۔

۲۔ حزب الشیطان نہ انتخاب میں حصہ لے سکتی ہے اور نہ کاروبارِ حکومت میں۔

۳۔ حزب اللہ میں بھی اسلامی احکام کے نفاذ اور ملک کا نظم و نسق چلانے کے سلسلے میں فروعی اختلافات ہو سکتے ہیں اور ایک سے زیادہ پارٹیاں وجود میں آ سکتی ہیں، تاہم یہ چند ایک ہی ہو سکتی ہیں۔

۴۔ صدرِ مملکت کا انتخاب اگر اسی طرح ضروری ہو تو اس کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ یہ جماعتیں خود صدارت کے لیے اپنے نمائندوں کے نام پیش کریں اور ان کی اہلیت اور تجربہ سے متعلق کنویسنگ کرنا ناجائز ہے۔ نیز ان کی موجودہ املاک کا اعلان بھی کر دیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان کے سامنے اس منصب سے دنیوی مال و متاع سمیٹنا مقصود نہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۵۔ انتخاب کے لیے ایک دن مقرر کر دیا جائے اور سپریم کورٹ کا چیف جسٹس عارضی طور پر صدر کے فرائض سرانجام دے اور الیکشن کرائے۔

۶۔ الیکشن میں صرف وہ اشخاص حصہ لیں جو ووٹر کی شرائط پوری کرتے ہیں جن کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

۷۔ جس پارٹی کا امیدوار سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرے گا وہی صدر منتخب ہوگا۔

مجلسِ شوریٰ اور کابینہ کی تشکیل: فرض کیجیے کہ الیکشن میں چار جماعتوں نے حصہ لیا ہے تو اب منتخب شدہ صدر ان چاروں جماعتوں کے حاصل کردہ ووٹوں کی نسبت سے اپنی شوریٰ اور اسی طرح اپنی کابینہ تشکیل دے گا اور اس کابینہ کی شکل مخلوط ہرگز نہ ہوگی بلکہ یہ ایک قومی کابینہ ہوگی جس کے تمام وزراء قرآنی ارشاد کے مطابق ایک بنیان مرصوص کی طرح کام کریں گے۔ ایسی ہی کابینہ کو بعد میں ہونے والے صدر کے انتخاب کا حق دیا جا سکتا ہے۔

۹۔ یک دیوانی مقنّنہ یا دو ایوانی مقنّنہ؟

دورِ نبوی یا دورِ خلفائے راشدین میں بعض معاملات تو ایک ہی مجلس میں حل ہو جاتے تھے اور بعض معاملات کے فیصلہ کے لیے کئی کئی مجالس منعقد کرنا پڑتیں اور بعض اوقات یہ مجالس پہلے اصحاب سے مختلف دوسرے اصحاب پر مشتمل ہوتی تھیں۔ طاعون زدہ علاقوں میں داخل ہونے، یا وہاں سے نکلنے کے متعلق سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے مہاجرین اولین کو بلا کر ان سے مشورہ کیا پھر انصار کو بلا کر ان سے مشورہ کیا پھر بزرگ قریشی مہاجرین کو بلا کر ان سے مشورہ کیا اور انہی کی رائے پر آپ رضی اللہ عنہ نے فیصلہ دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے دو ایوانی مقنّنہ کی بھی گنجائش ہے تاہم یہ ضروری بھی نہیں۔

۲۱۔ امیدوار کا خود کو پیش کرنا اور کنویسنگ کرنا

اسلامی نقطہ نظر سے امارت یا اور کوئی منصب طلب کرنا، یا اس کی آرزو کرنا یا اس کے لیے کنویسنگ کرنا ایک مذموم فعل ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے مذکورہ کتاب، ص ۳۱ تا ۳۳ اور صفحہ ۱۰۸، ۱۱۳)

❀.....❀.....❀

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقالہ:۱۴

یونین سازی کے شرعی اُصول[1]

تمہید:

اسلامی قانون کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ تو وہ ہے جو منزل من اللہ ہے اور کتاب وسنت پر مشتمل ہے۔ یہ حصہ پائیدار اور غیر متبدّل (Rigid) ہے۔ یہی اسلامی شریعت ہے جو تا قیامت اسی طرح برقرار رہے گی کسی شخص یا کسی ادارے کو، خواہ یہ ادارہ کسی مسلمان ملک کی قومی اسمبلی ہی کیوں نہ ہو، اس حصہ میں تغیر وتبدل یا ترمیم وتنسیخ کا کچھ بھی اختیار نہیں۔ اصطلاحی زبان میں اس حصہ کو منصوص کہا جاتا ہے۔ اسلامی قانون میں پائیداری اور استحکام اسی حصہ کی بنا پر قائم ودائم ہے۔

اسلامی قانون کا دوسرا حصہ قابل تغیر وتبدل (Flexible) ہے اور زمانہ کے تقاضوں کے مطابق تغیر وتبدل کا اثر قبول کر لیتا ہے۔ زمانہ کے تقاضے چونکہ ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اس حصہ میں اثر پذیری کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ یہ بھی دراصل کتاب وسنت ہی سے ماخوذ ہوتا ہے۔ اسلامی فقہ اسی حصہ کا محسوس مظہر ہے۔ جو کتاب وسنت میں اجتہاد اور قیاس واستنباط کے ذریعہ معرضِ وجود میں آئی ہے۔ اس حصہ کے متبدل ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ مدون شدہ اسلامی فقہیں چار ہیں اور اگر ان میں فقہ جعفریہ کو بھی شامل کر لیا جائے تو پانچ بن جاتی ہیں جبکہ شریعت، جو کتاب وسنت پر مشتمل ہے۔ صرف ایک ہے۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اُمت مسلمہ زمانہ کے تقاضوں کے مطابق بوقت ضرورت کوئی نئی فقہ بھی مدون کر سکتی ہے۔ اور جزوی طور پر تو جدید مسائل میں ایسا ہوتا بھی رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ اصطلاحی زبان میں اس حصہ کو منصوص کے مقابلہ پر مسکوت عنہ کہا جاتا ہے۔

مسکوت عنہ کا مطلب یہ ہے کہ زیر بحث مسئلہ میں کتاب وسنت میں کوئی نص (واضح حکم) موجود نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں ایسی نصوص کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے جو اس مسئلہ سے قریب قریب یا اس سے ملتی جلتی ہوں یا اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال سکتی ہوں۔ ایسی ہی نصوص میں غور وفکر کے بعد اس نئے مسئلہ

---

[1] یہ مضمون سہ ماہی مجلّہ ''منہاج'' اپریل تا جولائی ۱۹۸۹ء میں طبع ہوا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں شرعی حکم لگایا جاتا ہے اور نصوص سے دلائل مہیا کیے جاتے ہیں۔ ہمارا موضوع بھی اسی دوسرے حصہ سے تعلق رکھتا ہے۔

تعارف موضوع اور یونین سازی کے مقاصد:

دنیا بھر میں آج کل کئی قسم کی یونینیں (Unions) رائج ہیں۔ جنہیں تین بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مزدور یونین، ٹریڈ یونین اور طلبہ یونین۔ یونین سازی کا مقصد اپنے مزعومہ فریق مقابل سے اپنے حقوق کو تسلیم کروانا اور ان کا تحفظ ہوتا ہے۔ مثلاً لیبر (Labour) یا مزدور یونین کے عموماً تین بڑے بڑے مقاصد ہوتے ہیں۔

۱۔ ان کے اوقات کار کا مناسب تعین ہو اور مستقل یا عارضی چھٹیوں کے حقوق کا تعین ہو۔

۲۔ ان کے مالک یا صنعت کار اور کارخانہ داران کا معاشی استحصال نہ کریں اور ان کی محنت کا مناسب معاوضہ دیں۔

۳۔ ہر آن بڑھتی ہوئی گرانی سے نپٹنے کے لیے ان کی تنخواہوں میں اسی تناسب سے اضافہ کیا جاتا ہے۔

ٹریڈ (Trade) یا پیشہ ورانہ یونین کا مقصد یا تو اپنی فروختنی یا کرایہ کی اشیاء کے نرخوں کا تعین ہوتا ہے جیسے خیمہ ساز اور کراکری والے دکاندار سب مل کر اپنا مشترکہ نرخ نامہ شائع کر دیتے ہیں یا پھر ان کی محنت کے نرخ کا تعین ہوتا ہے جیسے مثلاً باربر (حجام) سب مل کر یہ طے کر لیتے ہیں کہ آئندہ سے حجامت یا غسل کے یہی نرخ گاہکوں سے وصول کیے جائیں گے۔

طلبہ یونین کا اصل مقصد تو سکول یا کالج کی انتظامیہ کے ناجائز دباؤ سے اپنے آپ کو نجات دلانا ہے۔ مگر ہمارے ہاں بدقسمتی سے ایسی یونینیں سیاست میں ملوث ہو کر سیاسی دھڑوں میں بٹ گئی ہیں۔ جسے کسی صورت مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ان اقسام میں سے سب سے اہم چونکہ مزدور یونین ہے لہٰذا ہمارا روئے سخن صرف اسی حد تک محدود رہے گا۔ اگرچہ آج کل کی حکومتوں نے ان کے لیے بہت سے قوانین بھی بنا دیے ہیں اور مزدور عدالتیں (Labour Court) بھی قائم کر دی ہیں۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ محض قانون کے بل بوتے پر مسائل حل نہیں ہوا کرتے۔ یہ شریعت اسلامیہ کا ہی خاصہ ہے کہ اس نے مسائل کے حل کا دارومدار قانون سے زیادہ اخلاقیات پر رکھا ہے اور یہی چیز مسائل کے حل کی بہترین صورت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔شریعت اسلامیہ معاشرہ کے ہر ہر فرد میں تقویٰ پیدا کرتی، انہیں خود غرضی سے اجتناب کی ترغیب دیتی اور ایثار و مروّت جیسے بہترین اخلاق کا سبق دیتی ہے۔جس سے تنازعاتی مسائل اور فریقین میں باہمی چپقلش پیدا ہی نہیں ہوتی اور اگر پیدا ہو جائے تو ان سے عہدہ برآ ہونے کی جلد از جلد کوئی صورت نکل آتی ہے۔اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے ہم یہاں دورِ نبوی ﷺ کا ایک واقعہ پیش کرتے ہیں۔

ایک دفعہ آپ ﷺ کے پاس دو آدمی آئے جن کا کسی چیز کی ملکیت کے بارے میں جھگڑا تھا ان میں سے ہر ایک اس بات کا مدعی تھا کہ یہ چیز اس کی ہے اور اسے ورثہ میں ملی ہے۔مگر گواہ کسی کے پاس بھی نہیں تھے۔آپ ﷺ نے فرمایا:''اگر میں نے کسی کے حق میں اس کے بھائی کے حق کا فیصلہ کر دیا تو وہ سمجھ لے کہ میں اسے آگ کا ٹکڑا دے رہا ہوں۔'' اس نصیحت اور وعید کا فریقین پر اتنا اثر ہوا کہ وہ دونوں اپنے اپنے حق سے دستبردار ہو گئے اور ہر ایک کہنے لگا کہ ''یا رسول اللہ ﷺ! میرا حق میرے بھائی کو دیجیے'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ تو ناممکن ہے کہ یہ چیز دونوں میں سے کسی کی بھی ملکیت نہ ہو۔لہٰذا اسے برابر برابر تقسیم کر دو اور بذریعہ قرعہ اندازی ایک ایک حصہ لے لو اور ہر شخص دوسرے سے کہہ دے کہ میں نے اسے اپنے بھائی کے لیے حلال کر دیا ہے اور وہ اس سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔'' (ابو داؤد۔ کتاب الاقضیہ، باب فی قضاء القاضی اذا اخطأ)

مزدور کے حقوق و فرائض:

موجودہ دور صنعتی دور ہے۔ایک کارخانہ دار سینکڑوں مزدور اپنے ہاں ملازم یا اُجرت پر رکھتا ہے اور تاحدِ امکان ان سے معاشی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔لیکن دورِ نبوی صنعتی نہیں بلکہ غلامی کا دور تھا۔ وہاں بھی یہی صورتِ حال تھی کہ جو شخص جس قدر مالدار ہوتا اسی نسبت سے اپنے غلاموں کی تعداد میں اضافہ کر کے ان سے فائدہ اٹھاتا اور ان کا معاشی استحصال کرتا تھا جس کی صورت یہ بھی تھی کہ وہ غلام روزانہ اتنے پیسے تو مالک کو دیا کرے گا۔باقی جو کچھ اس کمائی سے بچے گا وہ اسی کا ہو گا اور یہ تو واضح ہے کہ آج کے مزدور سے اس دَور کے غلام کی حالت زیادہ ابتر تھی۔حتیٰ کہ غلام اور لونڈیوں کی برسرِ عام خرید و فروخت بھی ہوتی تھی اور یہ راہ و رسم صرف ملک عرب تک ہی محدود نہ تھی بلکہ دنیا بھر میں اس طرح کی غلامی کا دَور دَورہ تھا۔آج کا مزدور جب چاہے اپنی ملازمت چھوڑ سکتا ہے لیکن اس دور میں کسی غلام کے بھاگ جانے کے بھی تمام راستے بند کر دیئے گئے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ بات ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ اسلام نے غلاموں کی آزادی کے لیے کیا کچھ اقدامات کیے اور اسے یکسر کیوں ممنوع قرار نہ دیا۔ ہم سردست یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اسلام نے آقا و مزدور کے درمیان تعلقات کی خوشگواری کے لیے کیا کچھ اقدامات کیے اور وہ درج ذیل ہیں:

ا۔ حقوق

آقا اور غلام، مالک اور مزدور، زمیندار یا جاگیردار، کسان یا مزارع، مالک مکان اور کرایہ دار، ان سب انواع میں قدر مشترک یہ پائی جاتی ہے کہ آقا یا مالک اپنے آپ کو برتر اور فریق ثانی کو کمتر مخلوق سمجھتا ہے۔ یہی تصور اسے فریق ثانی پر طرح طرح کی زیادتیوں پر دلیر بنا دیتا ہے اور جب تک یہ تصور موجود ہے، ان طبقوں میں تعلقات کی خوشگواری ناممکن ہوتی ہے۔ اسلام نے اسی برتری کے تصور پر کاری ضرب لگائی اور ان کے حقوق کو متعین کیا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(اِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ اَيْدِيْكُمْ فَمَنْ كَانَ اَخُوْهُ تَحْتَ يَدِهٖ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَاْكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَلَا تُكَلِّفُوْهُمْ مَّا يَغْلِبُهُمْ فَاِنْ كَلَّفْتُمُوْهُمْ فَاَعِيْنُوْهُمْ) (بخاری۔ کتاب الایمان۔ باب المعاصی من امر الجاھلیۃ)

”تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں۔ لہٰذا تم میں سے جس کے قبضے میں اس کا کوئی بھائی ہو تو اس کو ویسا ہی کھلائے اور پہنائے، جیسا وہ خود کھاتا اور پہنتا ہے اور اس کو کوئی ایسا کام کرنے کو نہ کہے جس کو وہ کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو اور کبھی اسے ایسا کام کرنے کو کہے تو خود بھی اس کا ہاتھ بٹائے۔

اس ارشادِ نبوی ﷺ سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

ا۔ معاشرتی مساوات اور آقائی کے تصور کا خاتمہ:

فریق ثانی ہرگز کہتر مخلوق نہیں۔ بلکہ وہ معاشی لحاظ سے آقا و مالک کے برابر کا درجہ رکھتے ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مزدور و مالک آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ لہٰذا آقا یا مالک کو اپنے غلام یا مزدور کے ساتھ صرف برابری کا نہیں بلکہ بھائیوں کا سا سلوک کرنا چاہیے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔معاشی استحصال کی ممانعت:

ارشادِ نبوی ﷺ یہ ہے کہ مالک جو کچھ کھاتا اور پہنتا ہے۔ وہی کچھ اپنے مزدور کو کھانے اور پہننے کو دے۔ جس سے از خود یہ اصول مستنبط ہوتا ہے کہ نہ تو آقا یا مالک کو عیاشانہ اور امیرانہ زندگی بسر کرنے کی اجازت ہے اور نہ ہی مزدور کو صرف اتنا ہی معاوضہ دینے کی جس سے وہ بمشکل اپنی زندگی کو برقرار رکھ سکے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ مالک اپنی خوراک و پوشاک کو اس سطح تک نیچے لائے۔ جس سطح تک وہ مزدور کی خوراک و پوشاک کی سطح کو بلند کر سکتا ہو۔ تاکہ آقا کی معاشی برتری کا تصور ختم ہو سکے اور مزدور کا بھی معاشی استحصال نہ ہو۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس حدیث میں ارشاد تو غلام سے متعلق ہے جو صرف اپنی ذات میں غلام ہوتا تھا۔ آج بھی اس کا اطلاق ان گھریلو ملازموں پر ہوگا جو گھر کا کام کاج کرتے ہیں۔ تاہم بھائی چارہ کے رشتہ کا لحاظ رکھتے ہوئے درست طور پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مالک کو اپنے مزدور کو اتنا معاوضہ ضرور دینا چاہیے کہ اگر وہ عیال دار ہے تو معروف طریقہ پر اس کی گزر بسر ہو سکے۔

۳۔تکلیف مالا یطاق کی ممانعت:

تیسری بات آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمائی کہ مزدور کو ایسا کام کرنے کو نہ کہے جس کی وہ استطاعت نہ رکھتا ہو۔ یہیں سے مزدور کے اوقات کار کی تعیین کا اصول مستنبط ہوتا ہے کہ ایک عام انسان ایک دن میں یا ایک ہفتہ میں کس حد تک یا کتنے گھنٹے کام کر سکتا ہے جو اس کی صحت پر اثر انداز نہ ہو۔ استطاعت کا یہی مفہوم ہے نیز بیماری کی صورت میں کام سے چھٹی یا رخصت بھی اسی ضمن میں آتی ہے۔

علاوہ ازیں ہر انسان طبعی طور پر تفریح کا بھی دلدادہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اپنے لواحقین کی شادی غمی میں شمولیت بھی اس کی ایک اہم ضرورت بلکہ مجبوری ہے۔ لہٰذا ایسے موقعوں پر مزدور کو چھٹی نہ دینا بھی تکلیف مالا یطاق اور استطاعت کے منافی ہوگا۔ یہیں سے اس کی اتفاقی اور اضطراری چھٹیوں کے جواز کا اصول بھی مستنبط ہوتا ہے۔

۴۔زائد محنت کا معاوضہ:

چوتھی بات آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمائی کہ اگر مزدور سے کوئی ایسا کام کرانا ضروری ہو جس کی وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

استطاعت نہیں رکھتا۔ تو خود بھی اس معاملہ میں اس کی مدد کرے۔ اس سے دو اصول مستنبط ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر وہ کام ایک عام انسان کے بجائے دو یا تین آدمی مل کر ہی کر سکتے ہیں۔ تو خود بھی اس میں مزدور کا ہاتھ بٹائے اور یہ بلند تر درجہ ہے تا کہ اس کی بالادستی اور برتری کے تصور کا بھی کسی حد تک علاج ہو سکے اور ایسا نہیں کر سکتا تو کم از کم اتنا ضرور کرے کہ اس کے ساتھ حسب ضرورت ایک دو آدمی مزید لگا دے۔

اور دوسرا اصول یہ نکلتا ہے کہ مزدور کے دن بھر کام کرنے کے بعد بھی اگر کام کی نوعیت کا تقاضا یہی ہو کہ وہ بہر صورت اسی دن سرانجام پائے تو اس پر دوسرا مزدور لگائے یا اگر پہلا مزدور کام کرنے پر رضا مند اور اتنی استطاعت رکھتا ہو کہ وہ کام کو جاری رکھ کر سرانجام دے سکے تو اسے اس کا الگ معاوضہ ملنا چاہیے۔ یہ معاوضہ کتنا ہو؟ برابر ہو یا زیادہ یا دگنا، یہ بات فریقین کے باہمی سمجھوتہ سے طے ہو سکتی ہے۔ تاہم مزدور کو اس کے زائد وقتِ کار (Over Time) کا معاوضہ ضرور ملنا چاہیے۔

مندرجہ بالا حدیث چونکہ اس موضوع پر جامع ہے لہٰذا اس کا ذکر پہلے کر دیا گیا۔ ورنہ ان حقوق کے متعلق انفرادی طور پر قرآن کریم میں بھی بہت سے ارشادات و دلائل مل جاتے ہیں۔ نکاح کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے جس میں انسان ضرور اپنے کفو کی تلاش کرتا ہے۔ کفو کا معنی یہ ہے کہ جس عورت یا مرد سے نکاح مطلوب ہے، اس کا مرتبہ معاشرتی یا معاشی اعتبار سے دوسرے کے برابر یا تقریباً برابر ہو۔ ایسے ہی مواقع کے لیے اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ارشاد فرمایا:

﴿وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ﴾ (۲۵:۴)

"تم میں سے جو شخص کسی خاندانی عورت سے (بوجہ زیادتی اخراجات) نکاح کی استطاعت نہ رکھتا ہو، اسے چاہیے کہ تمہاری ان کنیزوں میں سے کسی سے نکاح کرے جو تمہارے قبضہ میں ہیں۔ اللہ تمہارے ایمان کا حال خوب جانتا ہے۔ تم سب ایک ہی طبقہ کے لوگ ہو۔"

اس آیت کے آخری حصے بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ نے غلام اور آزاد یا غلام اور آقا کے درمیان معاشرتی امتیاز کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے۔

خود رسول اکرم ﷺ نے اپنی پھوپھی زاد بہن سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کی شادی بحکم الٰہی اپنے غلام زید بن حارثہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے کردی تھی اور یہ واقعہ قرآن میں تفصیل سے مذکور ہے۔اس واقعہ سے تین مقاصد مطلوب تھے۔

۱۔ آزاد یا آقا قسم کے لوگوں کی معاشرتی برتری کا خاتمہ۔

۲۔ غلام اور غلامی کی نفسیات میں تدریجی تبدیلی کہ وہ اپنے آپ کو ایک کمتر مخلوق سمجھنے کے بجائے معاشرہ کے ذمہ دار افراد تصور کریں۔

۳۔ معاشرہ کے عام رواج کے خلاف یہ شرعی ضابطہ کہ متبنٰی حقیقی بیٹے کی جگہ نہیں لے سکتا۔نہ ازروئے حرمت وحلت نکاح اور نہ ہی ازروئے وراثت۔

یہ اسی تعلیم کا اعجاز تھا کہ ایک دفعہ جب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو گھوڑے پر سوار اور اس کے غلام کو پیچھے پیدل چلتے دیکھا تو اس گھڑ سوار سے فرمایا:''اپنے غلام کو بھی اپنے پیچھے گھوڑے پر سوار کر لو۔کیونکہ وہ تمہارا بھائی ہے اور وہ بھی ویسی ہی روح رکھتا ہے جیسی تم رکھتے ہو۔''(جدید ذہن کے شبہات،ص ۶۵)

یہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''تم میں سے کوئی شخص (اپنے غلام کے بارے میں) یہ نہ کہے کہ!یہ میرا غلام اور یہ میری لونڈی ہے۔اس کے بجائے اسے یوں کہنا چاہیے کہ یہ میرا خادم اور یہ میری خادمہ ہے۔''(حوالہ ایضاً)

اور عجیب تر معاملہ یہ ہے کہ بعض مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کو آزاد مردوں سے بھی بلند مرتبہ عطا فرمایا۔بشرطیکہ وہ اس کے اہل ہوں۔مثلاً غزوۂ موتہ کے موقعہ پر آپ نے اپنے غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار مقرر فرمایا۔اسی طرح اپنی وفات سے قبل جو لشکر آپ نے ترتیب دیا اس کا سپہ سالار حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا۔حالانکہ ان لشکروں میں اکابرین صحابہ بھی موجود تھے۔مسلمانوں کے دل میں صرف یہ خیال ہی پیدا نہ ہوا بلکہ بعض مسلمانوں کی زبان پر بھی یہ شکوہ آ گیا۔جس کا آپ نے شافی دوافی جواب دے کر انہیں مطمئن کر دیا۔

اسلام نے غلام کو معاشرتی لحاظ سے اتنا بلند تر درجہ عطا فرما دیا کہ وہ مسلمانوں کا بادشاہ بھی بن سکتا ہے۔ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(اِنْ اُمِّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ مُجَدَّعٌ یَقُوْدُکُمْ بِکِتَابِ اللّٰہِ فَاسْمَعُوْا لَہٗ وَاَطِیْعُوْا)
(مسلم۔کتاب الامارۃ۔باب اطاعۃ الامراء)

''اگر تم پر نکٹا غلام امیر بنا دیا جائے تو جب تک وہ تمہیں شریعت کے مطابق چلاتا ہے، اس کی بات سنو اور اس کا حکم مانو۔''

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اسلامی حکومت میں کئی غلام بادشاہ ہو گزرے ہیں اور ہندوستان میں تو غلام خاندان مدتوں حکومت کرتا رہا ہے۔

اسی تربیت کا یہ اثر تھا کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں بھی سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو (جو آزاد شدہ غلام تھے) سیدنا بلال کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

غلاموں سے حسن سلوک کے متعلق بھی قرآن میں واضح ہدایت موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں حسنِ سلوک کے مستحق افراد کا ذکر فرمایا تو اس میں غلاموں کا بھی ذکر کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰکِیْنِ وَ الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ وَ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ﴾ (النساء:٣٦)

''اپنے والدین سے بھی حسن سلوک سے پیش آؤ اور قرابت داروں یتیموں، مسکینوں، رشتہ دار ہمسائے، اجنبی ہمسائے، پہلو کے ساتھی، مسافر اور لونڈی غلام سب سے اچھا سلوک کرو۔''

ایک اور مقام پر مومنوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا﴾ (الدھر:٨)

''اور اس بات کے باوجود کہ انہیں خود کھانے کی خواہش (حاجت) ہوتی ہے وہ فقیروں، یتیموں اور اسیروں کو کھانا کھلاتے ہیں۔''

اور اسیران جنگی قیدیوں کو کہتے ہیں جو غلام بنا لیے جاتے ہیں۔ انہیں کھلانے پلانے کی اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی تاکید فرمائی جیسا کہ مسکینوں اور یتیموں کے لیے فرمائی ہے۔ اس تاکید کا بعض مسلمانوں پر اس قدر اثر ہوا کہ خود تو کھجوریں کھا کر پیٹ بھر لیتے مگر غلاموں کو گندم کی روٹی کھلاتے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔حقوق کا تحفظ

ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ آج کے مزدور سے دورِ نبوی ﷺ کے غلاموں کا مرتبہ معاشرتی لحاظ سے فروتر تھا۔اس دَور میں رسول اللہ ﷺ نے انسانیت کے بنیادی حقوق (یعنی جان و مال اورعزت کے تحفظ) میں آزاد اور غلام کے درمیان کوئی امتیاز روا نہیں رکھا۔ پہلے اب تک جو کچھ بیان ہوا وہ اجتماعی احکام وارشادات تھے۔اب ہم اس سلسلہ میں چند انفرادی واقعات کا ذکر کریں گے۔

ا۔مزدور کی عزتِ نفس:

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ جس پایہ کے صحابہ تھے وہ سب جانتے ہیں۔آپ السابقون الاولون میں سے ہیں۔رسول اللہ ﷺ کو آپ سے خصوصی محبت اور پیار تھا۔آپ انتہا درجہ کے قناعت پسند اور زائد از ضرورت مال اپنے پاس رکھنا حرام سمجھتے تھے۔حضرت معرور بیان کرتے ہیں کہ میں رِبذہ میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ملا۔وہ ایک جوڑا پہنے ہوئے تھے اور ان کا غلام بھی ویسا ہی جوڑا پہنے ہوئے تھا۔ میں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے جواب دیا کہ ''میں نے ایک شخص ● سے گالی گلوچ کی اور اس کو ماں کی گالی دی۔تو آنحضرت ﷺ نے مجھ سے فرمایا:

(یَا اَبَاذَرٍ عَیَّرْتَهٗ بِاُمِّهٖ اِنَّکَ امْرَءٌ فِیْکَ امْرُ الْجَاهِلِیَّةِ) (بخاری۔کتاب الایمان،باب المعاصی من امر الجاهلیة)	''اے ابوذر! تو نے اسے (حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو) اس کی ماں سے عار دلائی ہے۔تو ایسا شخص ہے جس میں ابھی تک جاہلیت کا اثر باقی ہے۔''

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے غلاموں کے متعلق وہی کچھ ارشاد فرمایا جو ہم ابتدا میں درج شدہ حدیث میں بیان کر چکے ہیں غور فرمایئے کہ عزت نفس کے حق کی اس قدر پاسداری، اور وہ بھی غلاموں اور مزدوروں کے لیے، اسلامی معاشرہ کے علاوہ کسی اور معاشرہ میں مل سکتی ہے؟

● یہ شخص سیدنا بلال تھے اور سیدنا ابوذر نے جو ماں کی گالی دی وہ صرف یہ تھی کہ انہوں نے کہا تھا: اے کالی ماں کے کالے بیٹے اور جب رسول اللہ نے عتاب فرمایا تو آپ نے سیدنا بلال سے معافی مانگی اور اپنا گال زمین پر رکھ کر کہنے لگے کہ اس وقت تک گال نہ اُٹھاؤں گا جب تک بلال اپنے پاؤں سے نہ روندیں۔(وحید الزمان)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔مالک کوظلم وزیادتی کی سزا:

ایک دفعہ ایک فریادی روتا چلاتا دربارِ نبوی ﷺ میں آیا اور عرض کی: ''یارسول اللہ ﷺ! میں ایک غلام ہوں۔ میرے مالک نے مجھے ایک لونڈی کا بوسہ لینے کی پاداش میں خصّی کر دیا ہے۔ آپ ﷺ نے مالک کو بلایا لیکن وہ حاضر نہ ہوا۔ اس پر آپ ﷺ نے یک طرفہ فیصلہ دے دیا اور فرمایا: اِذْهَبْ اَنْتَ حُرٌّ (جا تو آزاد ہے) اس غلام نے عرض کی کہ اگر میرے مالک نے مجھے پکڑ کر دوبارہ غلام بنالیا تو پھر میری مدد کون کرے گا؟ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ (یعنی ہر مسلمان پر تمہاری مدد کرنا فرض ہے۔ گویا مسلم معاشرہ یا حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس معاملہ میں تمہارے مدد کرے) (ابن ماجہ۔ کتاب الدیات)

اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ اس دَور میں غلام کو مار پیٹ تو درکنار خصّی تک کر دینا مالک کا حق سمجھا جاتا تھا۔

۲۔ اگر کوئی غلام بھاگنے کی کوشش کرتا تو تمام معاشرہ مالک کی حمایت کرتا اور غلام کو پکڑ کر اس مالک کے حوالے کرنے میں مد ہوتا تھا۔

۳۔ اسلام نے غلاموں کو مارنے یا اس طرح ظلم کرنے پر مالک کے لیے یہ سزا تجویز فرمائی کہ ایسے مالک کے مالکانہ حقوق کا ہی خاتمہ کر دیا اور ایسے غلاموں کے لیے آزادی کی سند عطا فرمائی۔

بعد میں صحابہ کرام میں یہ دستور چل نکلا کہ اگر کوئی شخص اپنے غلام کو مارتا پیٹتا تو دوسرا صحابی اسے برملا کہہ دیتا کہ اب اسے آزاد کر دو۔ چنانچہ دورِ صحابہ میں اس طور پر بھی غلاموں کی کثیر تعداد کو آزادی ملی۔ اسے کہتے ہیں عزت کی حفاظت۔

۳۔معاشی حقوق کا تحفظ:

اب معاشی حقوق کی طرف آیئے۔ اس دَور میں غلاموں کا کوئی مالی حق تھا ہی نہیں۔ البتہ مزدوروں کے حقوق کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد بہت مشہور ہے جو یہ ہے کہ:

(اُعْطُوا الْاَجِیْرَ الْاَجْرَ قَبْلَ اَنْ یَّجِفَّ عَرَقُهٗ) ''مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی مزدوری ادا کر دو۔''

جس طرح غلام یا مزدور اپنے آقا کا زیردست ہوتا ہے۔ اسی طرح عورت بھی مالی حقوق کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاملہ میں اپنے خاوند کی زیردست ہوتی ہے۔ دورِ نبوی ﷺ کا واقعہ ہے کہ ہند رضی اللہ عنہا بنت عتبہ بن ربیعہ زوجہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے یہ شکایت کی کہ:

(اِنَّ اَبَا سُفْيَانَ رَجُلٌ مِّسِيكٌ فهل عَلَيَّ حَرَجٌ اَنْ اُطْعِمَ مِنَ الَّذِي لَهُ عِيَالَنَا؟ قَالَ لَا اَرَاهُ اِلَّا بِالْمَعْرُوْفِ)

(بخاری۔کتاب المناقب۔باب ذکر هند بنت عتبة)

''ابوسفیان بڑا بخیل آدمی ہے۔ اگر میں اس کے مال سے بال بچوں پر خرچ کرنے کے لیے لے لوں تو مجھ پر کچھ گناہ تو نہ ہوگا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں سمجھتا ہوں اس میں کچھ گناہ نہیں مگر یہ خرچ لینا معروف طریق پر ہونا چاہیے۔''

اس حدیث سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ اگر مالک مزدور کو معروف کے مطابق (یعنی واجبی) معاوضہ نہیں دیتا۔ تو یہ مقدمہ عدالت سے لے جایا جاسکتا ہے۔

۲۔ اگر مزدور کی بات درست ثابت ہو تو عدالت مداخلت کر کے زیردست کا حق دلوانے کا اختیار رکھتی ہے۔

مزدور کے مالی حقوق سے متعلق دورِ فاروقی کا یہ واقعہ نہایت اہم ہے کہ سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ بن ابی بلتعہ کے چند غلاموں نے کسی شخص کا اونٹ چوری کیا اور اسے ذبح کر کے کھا گئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ہاں مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے ان غلاموں کے ہاتھ قطع کرنے کا فیصلہ دے دیا۔ بعد میں آپ کو یہ خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان غلاموں نے بھوک سے مجبور ہر کر اضطراری طور پر یہ حرکت کی ہو۔ یہ خیال آہستہ آہستہ یقین کی صورت اختیار کر گیا۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے ان غلاموں کی سزا موقوف کر دی اور ان کے مالک حاطب بن ابی بلتعہ کو بلا کر سخت تنبیہ کی کہ تم اپنے غلاموں کو بھوکا رکھتے ہو جس کی وجہ سے انہوں نے اونٹ چوری کیا۔ اگر آئندہ ایسی شکایت پیدا ہوئی تو میں ان کے بجائے تمہیں سزا دوں گا۔ (اسلامی ریاست، ص۱۸۲۔ بحوالہ المغنی لابن قدامہ، ۱۰:۲۸۸۱)

اس واقعہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جو مالک اپنے ماتحتوں کے حقوق کی ادائیگی نہیں کرتا۔ حکومت اسے حقوق کی ادائیگی پر مجبور کر سکتی ہے اور عدم ادائیگی کی صورت میں اسے سزا بھی دے سکتی ہے۔

۴۔ قصاص میں مساوات:

جہاں تک جان کی حفاظت اور اس کے حق کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں ارشادِ نبوی ﷺ نہایت واضح ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''جو شخص ہمارے کسی غلام کو قتل کرے گا، وہ اس کے بدلتے میں قتل کیا جائے گا، جو اس کی ناک کاٹے گا، اس کی ناک کاٹی جائے گی اور جو اس کو خصّی کرے گا، اس کو خصّی بھی کرا دیا جائے گا۔''
(بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابوداؤد، بحوالہ جدید ذہن کے شبہات ترجمہ **الشبهات حول الاسلام** از سید قطب شہید، ص ٦٣)

آج کا مالک اپنے ملازم، مزدور یا کسان کو قتل کرنے یا اسے مجروح بنانے کا تو اختیار نہیں رکھتا۔ مگر اس کی عزت اور مالی حقوق پر ڈاکہ ڈال سکتا ہے۔ غور فرمایئے اگر وہ ان احکامِ شریعت کا خیال رکھے تو اس پر کسی قسم کی زیادتی کر سکتا ہے؟ یا اگر وہ فی الواقع اپنے مزدور یا ملازم کو اپنا بھائی سمجھے، تو ان میں کاروباری منافرت پیدا ہو سکتی ہے؟

۳۔ تصویر کا دوسرا رخ: مزدور کی ذمہ داریاں

اسلام نے اگر مالک و مزدور کی معاشرتی سطح کو برابر کرنے، مالک کو مزدور کی عزتِ نفس کا خیال رکھنے، اس کے مالی حقوق کی نگہداشت اور استحصال سے ممانعت اور معاوضہ کی بروقت ادائیگی کے لیے احکامات صادر فرمائے ہیں تو دوسری طرف اس مزدور یا ملازم طبقہ کے لیے بھی کچھ احکام و ارشادات موجود ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

ا۔ مالک کا احترام:

آقا و غلام، مالک و مزدور اور ملازم کی معاشرتی سطح برابر کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اسلام نے فرق مراتب کو ہی ختم کر دیا ہے۔ مراتب کا فرق بہرحال بدستور باقی رہے گا۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ والدین اور اولاد کی معاشرتی سطح تو پہلے ہی ایک ہوتی ہے۔ پھر والدین کو اپنی اولاد سے حسنِ سلوک کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب والدین اور اولاد ہر لحاظ سے ایک سطح پر آ گئے ہیں، بلکہ دوسری طرف اسلام نے اولاد کو اپنے والدین کے ادب و احترام، ان کی خدمت اور ان سے حسن سلوک کی انتہائی تاکید فرمائی۔ یہی صورت حال ہمارے زیر بحث مسئلہ میں بھی ہے۔ فرق مراتب کا لحاظ رکھنے سے متعلق اسلام نے ایک عام اصول دیا ہے جو یہ ہے کہ:

(مَنْ لَّمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا وَيَرْحَمْ صَغِيْرَنَا فَلَيْسَ مِنَّا) ''جس شخص نے ہمارے بڑے کی عزت نہ کی یا جس نے ہمارے چھوٹے پر شفقت نہ کی تو ایسے لوگوں کا ہم سے کچھ تعلق نہیں۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور یہ تو واضح ہے کہ آقا و غلام یا مالک و مزدور میں پہلے طبقہ آقا و مالک کا مرتبہ بلند ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر آقا و مالک کو اپنے غلام یا ملازم یا مزدور سے حسنِ سلوک اور ان پر شفقت کرنے کا حکم ہے۔ تو دوسرے طبقہ پر بھی لازم ہے کہ اپنے آقا و مالک کی عزت و توقیر کا خیال رکھے۔ مالک اگر مزدور کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہے تو مزدور بھی اپنے مالک کو بڑا بھائی سمجھ کر اس سے اچھا سلوک کرے اور اس کی عزت و تکریم کرے۔

۲۔ مالک کے احسان کا اعتراف:

اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر انسان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ﴾ ''میرا بھی شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا بھی۔''

(لقمان:۱۴)

اور دوسرے مقام پر اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾ (بنی اسرائیل:۲۴) ''اور (انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنے والدین کے حق میں دعا کرتے ہوئے) کہے کہ اے میرے رب میرے والدین پر رحم فرما کیونکہ انہوں نے بچپن میں میری تربیت کی۔''

اب دیکھیے کہ حقیقی رب تو اللہ تعالیٰ ہے جس کا ابتدا میں ذکر ہوا۔ پھر دوسرے نمبر پر تربیت کنندگان والدین ہیں۔ جن کا بعد میں ذکر ہوا۔ اسی ترتیب سے شکریہ بھی ادا کیا جانا چاہیے۔ پہلے اللہ تعالیٰ کا پھر والدین کا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بعد والدین تربیت کے لیے واسطہ بنے ہیں۔

اب اس سے آگے چلیے۔ تیسرے نمبر پر مالک مزدور وغیرہ کی تربیت کا واسطہ بنتا ہے۔ جس سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ملازم یا مزدور کو اللہ تعالیٰ اور والدین کے بعد اسی ترتیب سے مالک کا شکریہ بھی ادا کرتے رہنا چاہیے اور اس کا یہ احسان سمجھنا چاہیے کہ اس کے واسطہ سے اسے روزی مل رہی ہے۔

واضح رہے کہ شکر کا لفظ کسی احسان کے صلہ کے طور پر ہی استعمال ہوتا ہے۔

(كُلُّكُم رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ فَالْإِمَامُ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰى اَهْلِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ وَالْمَرْاَةُ رَاعِيَةٌ ''تم میں سے ہر کوئی مختار و نگران ہے۔ تو جو چیز کسی کے حلقہ اختیار میں ہے اس کے متعلق وہ ذمہ دار اور مسئول ہے، بادشاہ نگران ہے اور اس سے باز پرس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عَلٰی بَیْتِ زَوْجِھَا وَھِیَ مَسْئُوْلَۃٌ وَالْعَبْدُ رَاعٍ عَلٰی مَالِ سَیِّدِہٖ وَھُوَ مَسْئُوْلٌ اَلَا کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ) (بخاری۔کتاب النکاح۔باب قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا)(حدیث نمبر ۵۱۸۸)

ہو گی۔اور ہر شخص اپنے گھر والوں پر نگران ہے وہ بھی عند اللہ مسئول ہے اور عورت اپنے خاوند کے گھر کی محافظ ہے۔اس سے بھی باز پرس ہو گی۔ غلام اور مزدور اپنے مالک کے مال کا نگران ہے۔ اس سے بھی اس کی باز پرس ہو گی۔یاد رکھو! تم میں سے ہر کوئی نگران و محافظ ہے اور ہر ایک سے قیامت کے دن باز پرس ہو گی۔''

اس حدیث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو مزدور اپنے مالک کا خیر خواہ نہیں اور اسے کسی نہ کسی طرح نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے خواہ یہ نقصان اوقاتِ کار میں غیر حاضر رہنے سے ہو یا کام چوری سے یا املاک کو خرد برد کرنے یا نقصان پہنچانے سے ہو یا کسی دوسرے ذریعہ سے ہو تو بھی وہ اسی طرح خائن اور مجرم ہے۔جس طرح ایک بیوی اپنے میاں کا مال خرد بُرد کرنے پر خائن اور مجرم ٹھہرتی ہے اور قیامت کے دن ایسے لوگوں سے پوری پوری باز پرس ہو گی۔

۴۔کام چوری اور سینہ زوری سے اجتناب:

جس طرح طے شدہ معاوضہ کے مقابلہ میں کام چوری گناہ اور زیادتی کا کام ہے۔بالکل اسی طرح محنت کے مقابلہ میں مالک سے زیادہ اجرت کا مطالبہ کرنا اور اسے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے پر مجبور کرنا بھی زیادتی ہے۔دور فاروقی کا ایک واقعہ ہے کہ سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا ایک غلام ابولؤلؤ فیروز نامی تھا۔جو ایک ماہر صناع تھا۔اس نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اپنا مقدمہ پیش کیا کہ میرے مالک (سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ) نے مجھ پر یومیہ ادائیگی زیادہ عائد کر رکھی ہے آپ کم کرا دیجیے۔سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ تمہاری یومیہ ادائیگی کیا ہے؟اس نے جواب دیا: ''دو درہم روزانہ'' پھر آپ نے پوچھا کہ ''تم کیا کچھ کام جانتے ہو؟'' اس نے کہا ''نجاری،نقاشی اور آہن گری'' آپ نے فرمایا: تمہاری مہارت کے مقابلہ میں یہ ادائیگی کچھ زیادہ نہیں۔اور اس کا مقدمہ خارج کر دیا۔(الفاروق،شبلی نعمانی،ص ۷۱ ،مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور)

اگرچہ مذکورہ واقعہ میں مہارت کے مقابلہ میں کم ادائیگی کرنے کا مطالبہ ہے اور ہمارا مسئلہ محنت کے مقابلہ میں زیادہ اجرت کا مطالبہ ہے لیکن ماحصل دونوں کا ایک ہے اور دونوں میں عدوان کا پہلو پایا جاتا ہے۔جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے کہ:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿لَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (المائدہ:۲) ''گناہ اور زیادتی کے کام پر ہرگز ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو۔''

لیکن اتفاق کی بات یہ ہے کہ یونین کا مقصد اور اتحاد ہی اس بات پر ہوتا ہے کہ کام تو کم سے کم کیا جائے اور مالک سے سینہ زوری کے ذریعہ معاوضہ زیادہ وصول کیا جائے۔

مالک ومزدور کے تنازعہ کا مستقل علاج:

ان تمام تر تصریحات کا ماحصل یہ ہے کہ اگر مزدور یونین کا مقصد اپنی محنت کے مقابلہ میں جائز حد تک اپنے حقوق کا مطالبہ ہو۔ تو بالکل درست اور جائز ہے لیکن اگر یونین سازی کا مقصد کام چوری اور سینہ زوری ہو کہ اس اتحاد اور ہڑتالوں کے ذریعہ مالک کو اس بات پر مجبور کر دیا جائے کہ ان کا معاوضہ بڑھائے اور انہیں ملازمت سے جواب بھی نہ دے سکے۔ تو ایسی یونین سازی کی اسلام قطعاً اجازت نہیں دیتا اور ایسا اتحاد نیکی کے بجائے بدی پر اتحاد سمجھا جائے گا۔

موجودہ دَور کی حکومتوں نے مزدوروں کی اس زیادتی کے مقابلہ میں مالکوں کو تالہ بندی (Lock Out) کا حق دیا ہے، جس کے ذریعہ وہ ملازموں اور مزدوروں کو کچھ عرصہ کے لیے بے روزگار بنا سکتا یا پریشان کر سکتا ہے مگر اس سے بھی مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ فریقین میں مقدمہ بازی کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جس میں کبھی مزدور جیت جاتے ہیں، اور کبھی مالک۔ تاہم فریقین میں جو باہمی کشیدگی باقی رہ جاتی ہے وہ باہمی تعلقات کی خوش گواری میں رکاوٹ بنی رہتی ہے۔ جس سے صنعت اور کاروبار سخت متاثر ہوتا ہے اور بعض دفعہ تو صنعت کار یہ دھندا ہی ختم کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، محض قانون کے بل بوتے پر مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ مزید مسائل پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا اصل حل وہی ہے جو اسلام نے اختیار کیا ہے۔ یعنی مسائل کے حل کا زیادہ تر انحصار اخلاقیات پر رکھا ہے۔ وہ قانون کا سہارا صرف اس وقت لیتا ہے جبکہ دونوں علی الاعلان مقابلہ پر آ جائیں جبکہ اخلاق کی پاکیزگی اور عمدگی کے لیے تقویٰ کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی تعلیمات کو عام کر کے اور لوگوں کو ان کا پابند بنا کر ان میں تقویٰ پیدا کیا جائے۔ جو ہر طرح کے دنیوی اور اُخروی مسائل کا واحد حل ہے۔ اگر لوگوں میں تقویٰ پیدا ہو جائے تو یونین سازی جیسے مسائل جو محض فروعی مسائل کی حیثیت رکھتے ہیں، از خود حل ہوتے چلے جائیں گے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فتویٰ:۱

نمازِ تراویح سے متعلق چند مسائل

مولانا منظور احمد سلفی میر پور خاص سے لکھتے ہیں:

درج ذیل سوالات کے جوابات کتاب وسنت کی روشنی میں لکھ کر عنداللہ ماجور ہوں۔

۱۔ کیا نمازِ تراویح رسول اللہ ﷺ سے مہینہ بھر پڑھنا ثابت ہے؟

۲۔ اگر آپ ﷺ سے پڑھنا ثابت نہیں ہے (سوائے تین دن کے) تو ہم مہینہ بھر کیوں پڑھتے ہیں؟

۳۔ کیا مہینہ بھر پڑھنے کا حکم سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دیا ہے؟ اگر یہ حکم عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ہے، تو کیا آپ رضی اللہ عنہ بھی اس پر تاحیات قائم رہے یا اس مسئلہ سے آپ رضی اللہ عنہ نے رجوع فرما لیا تھا؟

۴۔ کیا اس وقت بھی ایسے صحابہ رضی اللہ عنہم موجود تھے، جنہوں نے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فیصلے کے خلاف تین دن تراویح پڑھنا روا رکھا ہو اور ہمیشہ اس پر کاربند رہے ہو؟

۵۔ اب امت مسلمہ کے لیے کیا حکم ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل کرے یا سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر؟

والسلام

الجواب بعون الوھاب والیہ المرجع والمآب اُقول وباللہ التوفیق:

آپ نے اپنے بعض سوالات کا خود ہی جواب بھی دے دیا ہے۔ بہرحال جو باتیں ابھی تک قابل ذکر ہیں، ان سے پہلے درج ذیل حدیث ملاحظہ کر لینا مفید رہے گا:

(عن عبد الرحمن بن عبد القاری قال خرجت مع عمر بن الخطاب لیلة فی رمضان الی المسجد فاذا الناس أوزاع متفرقون یصلی الرجل لنفسه و یصلی الرجل

''سیدنا عبدالرحمان بن القاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، میں رمضان کی ایک رات سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ مسجد کی طرف نکلا۔ اس وقت لوگ مختلف حالتوں میں (نماز پڑھ رہے) تھے۔ کوئی تو اکیلے پڑھ رہا تھا اور کوئی چند آدمیوں کی معیت میں نماز

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فیصلی بصلاته الرهط قال عمر: اِنی أری لو جمعت هولاء علیٰ قارئ واحد لکان أمثل ثم عزم فجمعهم علیٰ ابی بن کعب ثم خرجت معه لیلة أخری والناس یصلون بصلوٰة قارئهم قال عمر: نعم البدعة هذه والتی ینامون عنها أفضل من التی یقومون یرید آخر اللیل و کان الناس یقومون أوله) (صحیح بخاری، کتاب صلوٰۃ التراویح، حدیث نمبر ۲۰۱۰)

پڑھ رہا تھا (یعنی ان کی امامت کرا رہا تھا) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''میں دیکھتا ہوں کہ اگر ان سب کو ایک امام پر جمع کر دوں تو یہ بہت اچھی بات ہوگی۔'' پھر یہ ارادہ کر کے آپ رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو ان کا امام بنا دیا۔ دوسری رات دوبارہ جب میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ (مسجد کی طرف) نکلا، تو لوگ اپنے امام (ابی بن کعب رضی اللہ عنہ) کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ (یہ دیکھ کر) کہنے لگے: ''یہ نئی شکل (یعنی ایک جماعت) کیسی اچھی بات ہے (تاہم) رات کے جس حصہ میں لوگ سو رہتے ہیں، وہ اس حصہ سے بہتر ہے، جس میں یہ قیام کرتے ہیں۔'' (راوی کہتے ہیں) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی اس سے مراد یہ تھی کہ رات کا آخری حصہ (قیام کے لیے بہتر ہے) جبکہ یہ لوگ رات کے اوّل حصہ میں قیام کرتے ہیں۔''

اس حدیث سے درج ذیل امور کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد، اگرچہ مختلف صورتوں میں (یعنی الگ الگ یا باجماعت) تاہم بہرحال اس نماز کا اہتمام کرتے تھے۔

۲۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے متفرق (الگ الگ یا ٹولیوں میں) نماز پڑھنے سے، باجماعت نماز پڑھنے کو بہتر خیال فرمایا۔

۳۔ درحقیقت یہ (باجماعت نماز ادا کرنا) بھی سنت نبوی کی اتباع تھی۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا کی تھی۔ لہٰذا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ کوئی نیا حکم یا فیصلہ نہیں تھا۔

۴۔ نماز تراویح باجماعت پڑھنے کی یہ مستحسن صورت صرف ان نمازیوں کے لیے تھی، جو مسجد میں یہ نماز رات کے پہلے حصہ میں ادا کرنا چاہتے تھے۔ ورنہ اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم یہ نماز رات کے آخری حصہ میں اپنے اپنے گھروں میں ادا کرتے تھے۔ خود اس حدیث کے راوی عبدالرحمان بن عبد اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایسے ہی صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے تھے جو اس نماز میں شامل نہ ہوتے تھے۔ تبھی تو یہ دونوں حضرات اس وقت مسجد گئے جب جماعت ہو رہی تھی اور اس جماعت کو دیکھ کر ہی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ تبصرہ فرمایا تھا، ''نعم البدعة هذه '' پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول (کہ رات کے جس حصہ میں لوگ سورہتے ہیں، وہ اس حصہ سے بہتر ہے، جس میں یہ قیام کرتے ہیں) سے بھی ظاہر ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ اس نماز کا رات کے آخری حصہ میں پڑھنا بہتر خیال فرماتے تھے۔

۵۔ واضح رہے کہ یہاں لفظ ''بدعت'' سے اصطلاح بدعت مراد نہیں ہے۔ کیونکہ نماز تراویح کی جماعت تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کروائی تھی۔ گویا اس کی بنیاد سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر تھی۔ لہٰذا یہاں بدعت سے مراد صرف وہ نئی شکل ہے جس کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے از سر نو جاری کر کے اس سنت کا احیاء کیا تھا۔

اب ہم مستفسر کے سوالات کا بالترتیب جواب دیتے ہیں:

۱۔ قیام اللیل، صلوٰۃ اللیل، قیام رمضان، صلوٰۃ تہجد۔ یہ سب ایک ہی نماز کے مختلف نام ہیں کہ مہینہ بھر تو کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اس کا التزام فرمایا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعات سے زائد نہیں ہوتی تھی۔ اس سے جہاں نماز تراویح آٹھ رکعت، تین وتر سنت ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ رمضان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز، صلوٰۃ تہجد سے کوئی الگ نماز نہ تھی۔ ورنہ رمضان میں اور غیر رمضان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز کی یہ تعداد رکعات یکساں نہ ہوتی۔ رمضان چونکہ ذکر و قیام کا خصوصی مہینہ ہے اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نماز کا اہتمام سب مسلمانوں کے لیے بھی ضروری سمجھا اور ان کی سہولت کے لیے یہ نماز رات کے اوّل حصہ میں ان کو پڑھائی۔ چنانچہ قیام رمضان، صلوٰۃ تہجد یا نمازِ تراویح وغیرہ ایک ہی نماز کے مختلف نام ہیں، لہٰذا یہ سوال کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا مہینہ بھر پڑھنا ثابت ہے؟ بے معنی ہو جاتا ہے۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نماز ہمیشہ پڑھی ہے۔

۲۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تو یہ نماز ہمیشہ پڑھی، البتہ رمضان میں تین دن، صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی با جماعت پڑھائی۔ اس پر یہ سوال کہ ''پھر ہم مہینہ بھر کیوں پڑھیں؟'' تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا بہر حال مہینہ بھر یہ نماز پڑھانے کی تھی۔ اس کے باوجود اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن سے زائد نہیں پڑھائی، تو اس کی وجہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی بیان فرما دی:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(وَلٰکنی خشیت أن تفترض علیکم فتعجزوا عنھا) (صحیح بخاری، کتاب صلاۃ التراویح، حدیث نمبر۲۰۱۲) ''اللہ رب العزت کے ہاں یہ عمل انتہائی پسندیدہ ہونے کی بناء پر (میں ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ تم پر فرض نہ ہوجائے اور تم (اس کی ادائیگی سے) عاجز رہ جاؤ۔''

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اگر اس کے فرض ہو جانے کا ڈر آپ ﷺ کو نہ ہوتا تو آپ ﷺ مہینہ بھر یہ نماز پڑھاتے۔ لہٰذا جب یہ وجہ زائل ہوگئی تو اس کے بعد آپ ﷺ کی تمنا کے پیش نظر، مہینہ بھر اس نماز کا ادا کرنا سنت ہے۔

۳۔ جب یہ طے ہوگیا کہ مہینہ بھر اس نماز کا پڑھنا سنت ہے، تو یہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا کوئی الگ حکم نہیں ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کے اس سے رجوع کر لینے کا کوئی سوال پیدا ہوتا۔

۴۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ، سنت سے ہٹ کر نہ تھا۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم اس سے اختلاف کیوں کرتے؟ وہ نبی ﷺ کی سنت کو بخوبی سمجھتے تھے اور آپ ﷺ کی اس تمنا سے واقف کہ اگر اس کے فرض ہو جانے کا ڈر آپ ﷺ کو نہ ہوتا تو آپ ﷺ مہینہ بھر اسے پڑھاتے۔ تبھی تو وہ مختلف صورتوں میں یہ نماز بہرحال ادا کر رہے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اگر اسے باجماعت کی شکل دے دی تو یہ بھی از سرِ نو سنت کا احیاء ہی تھا۔

۵۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ سنت رسول ﷺ پر مبنی ہے۔ لہٰذا امت مسلمہ کو اس سنت پر عمل کرتے ہوئے مہینہ بھر یہ نماز باجماعت پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ہاں جو کوئی رات کے آخری حصہ میں پڑھنا چاہے تو وہ الگ بھی پڑھ سکتا ہے۔ آپ ﷺ نے اس نماز کی بڑی ترغیب دلائی ہے۔ بلکہ یہاں تک فرمایا:

(من قام رمضان ایمانا واحتسابا غفر لہ ما تقدم من ذنبہ) ''جس نے ایمان کی حالت میں اپنے نفس کا محاسبہ کرتے ہوئے رمضان میں قیام کیا تو اس کے سارے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔''

ھذا ما عندی واللہ أعلم بالصواب.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فتویٰ:۲

تطلیق ثلاثہ کے سلسلہ میں ایک سوال اور اُس کا جواب

جناب محمد سمیع الدین صاحب کراچی سے لکھتے ہیں:

''ایک عام غلط فہمی ہے، ''حرمین'' کے ذریعے دور فرمائیے، ممنون ہوں گا۔

ایک شخص کسی وجہ سے اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے، لیکن ایک ماہ بعد (ایامِ عدت ہی میں) رجوع کر لیتا ہے۔ تقریباً ایک سال بعد پھر کچھ ان بن ہو جاتی ہے اور طلاق دے بیٹھتا ہے، لیکن چھ ماہ بعد (ایامِ عدت کے بعد) اس سے تجدید نکاح کر لیتا ہے۔ پھر کئی سال اچھے گزار کر طلاق کی نوبت آ جاتی ہے۔

بہت سے علماء سے رجوع کرنے پر معلوم ہوا کہ تین طلاقیں ہو چکیں، اور تیسری بار کی طلاق، طلاقِ مغلظہ ہے۔ چند متبحّر علماء کا کہنا ہے کہ طلاق کے بعد رجوع یا نکاح، طلاق کو باطل کر دیتا ہے اور مطلقہ پہلے ہی کی طرح بیوی بن جاتی ہے۔ طلاق نکاح کو فوراً باطل نہیں کرتی، جبکہ نکاح یا رجوع طلاق کو فوراً باطل کر دیتا ہے۔ رجوع یا نکاح کے بعد دی گئی طلاق جمع نہیں رہتی، بلکہ باطل ہو جاتی ہے اور مطلقہ بالکل پہلے ہی کی طرح اس کی بیوی ہو جاتی ہے۔ ایامِ عدت میں رجوع کا مطلب تو یہ ہوا کہ طلاق پوری طرح موثر نہیں ہوئی تھی کہ بغیر نکاح کے ہی (رجوع کرنے پر) وہ اس کی بیوی بن جاتی ہے، جبکہ ایامِ عدت کے بعد نکاح کا مطلب یہ ہوا کہ ایک غیر عورت کی طرح معاملہ ہوا کہ نکاح اور مہر وغیرہ کی نوبت آئی، کیا پھر بھی وہ طلاق جمع رہے گی، اور آئندہ اس کا شمار ہو گا؟ کیا قرآن وحدیث سے یا دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس کی کوئی مثال ملتی ہے؟

بعض علماء نے کوئی جواب نہ دیا، بعض جگہوں سے متضاد جوابات آئے، جن میں عقلی و نقلی کوئی دلیل نہیں۔ فقہ حنفی کی کتب تو اوٹ پٹانگ باتوں سے بھری پڑی ہیں، جیسے ایک مجلس کی تین طلاقیں بھی ان کے یہاں تین ہی تسلیم کر لی جاتی ہیں۔ برائے مہربانی کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ کیا منسوخ شدہ طلاق بھی جمع رہتی ہے؟ یعنی ایک طلاق کی صورت میں ایامِ عدت گزارنے کے بعد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اگر نکاح کر لیا تو پہلی طلاق جمع رہے گی اور جب کبھی دوبارہ طلاق دے گا تو یہ طلاق کیا دوسری شمار ہوگی؟

نیز ایک عالمِ دین طلاقِ مغلظہ کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ تیسری طلاق اس معنی میں مغلظہ ہے کہ اس سے ایامِ عدت میں پہلی دو طلاقوں کی طرح رجوع نہیں کر سکتے، البتہ جب ایامِ عدت گزر جائیں گے تو وہ عورت بالکل غیر عورت کی طرح ہوگئی، اب اس سے بھی نکاح کیا جاسکتا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟ اس کی بھی وضاحت فرمادیں۔ جزاکم اللہ!''

الجواب بعون اللہ الوھاب!

۱۔ محترم سائل نے سوال کرنے میں معاملہ کو الجھا دیا ہے۔ جو کچھ میں سمجھا، ان کا ایک سوال تو یہ ہے کہ آیا رجوع طلاق کو باطل کر دیتا ہے یا نہیں؟ (اس سوال میں نکاح کی بات نہ کرنی چاہیے) تو اس کا جواب یہ ہے کہ رجوع طلاق کو باطل نہیں کرتا، بلکہ وہ طلاق شمار ہوگی۔ اس کی نقلی دلیل وہ حدیث ہے، جسے امام بخاری رحمہ اللہ کتاب الطلاق کی ابتدا ہی میں اس کے پہلے باب:

(اِذَا طُلِّقَتِ الْحَائِضُ يُعْتَدُّ بِذَالِكَ الطَّلَاقِ) یعنی ''جب کوئی اپنی حائضہ بیوی کو طلاق دے دے تو وہ طلاق محسوب ہوگی یا نہیں؟''

کے تحت لائے ہیں۔ اور یہ اس کتاب الطلاق کی تیسری حدیث ہے، جس میں یہ مذکور ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دے دی تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ان سے کہیے کہ رجوع کر لیں۔ الحدیث، اسی حدیث کے آخر میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے یہ پوچھا گیا، ''آیا وہ طلاق شمار ہوئی تھی یا نہیں؟'' تو انہوں نے جواب دیا کہ ''ہاں ہوئی تھی!''

یہ طلاق سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے حیض کی حالت میں دی تھی، جبکہ حیض کی حالت میں طلاق منع ہے۔ تو جب حیض کی حالت میں غیر مسنون طریق پر دی گئی طلاق شمار ہوگی تو مسنون طریق پر دی گئی طلاق کیوں شمار نہ ہوگی؟

اور عقلی جواب یہ ہے کہ اگر طلاق شمار ہی نہ ہو تو رجوع کا کیا سوال ہے؟ اور یہ طلاق، طلاق کیوں ہے؟

۲۔ دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ عدت کا پورا عرصہ مطلقہ عورت اپنے خاوند کی زوجیت میں ہوتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ لہٰذا سوال نامہ کے یہ الفاظ کہ ''طلاق پوری طرح موثر نہیں ہوئی تھی، اور بغیر نکاح کے ہی (رجوع کرنے پر) وہ اس کی بیوی بن جاتی ہے۔'' بالکل بے معنی ہیں۔ رجعی طلاقوں کی عدت کے دوران رجوع سے پہلے بھی وہ اس کی بیوی ہی ہوتی ہے اور رجوع کے بعد بھی بیوی ہوتی ہے، رجوع کرنا یا نہ کرنا اس کی زوجیت پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ اس عدت کے دوران عورت کی رضا مندی کے بغیر بھی مرد کو حقِ رجوع حاصل ہوتا ہے، اور اس کی دلیل قرآن کریم کے درج ذیل الفاظ ہیں:

﴿فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ﴾ (الطلاق:۱) ''جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے لیے طلاق دو اور عدت کو شمار کرتے رہو''

اور یہ خطاب مردوں کو ہے، عورتوں کو نہیں۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ مطلقہ عورت خاوند کی زوجیت میں ہو۔ ورنہ غیر عورت کی عدت گننے کا کسی کو کیا حق حاصل ہے؟

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ جس عورت کو تین طلاقیں دے دی جائیں اور عدت گزر جائے تو وہ عورت بالکل غیر عورت کی طرح نہیں کہ اس سے نکاح کیا جا سکے۔ جیسا کہ سوال کی آخری سطور میں ہے کہ:

''البتہ جب ایامِ عدت گزر جائیں تو وہ عورت بالکل غیر عورت کی طرح ہو گئی، اب اس سے بھی نکاح کیا جا سکتا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟''

ایسی عورت بالکل غیر عورت کی طرح نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ ایسی عورت ہوتی ہے جسے اس کا خاوند تین طلاقیں دے چکا ہے۔ اور یہ اب اس پر حلال نہیں ہو سکتی؟ تا آنکہ یہ عورت اپنی رضا مندی سے (بغیر حیلہ جوئی کے) کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے پھر وہ مرد اپنی رضا مندی سے کسی وقت اسے طلاق دے دے یا مر جائے تو اس صورت میں ہی یہ عورت عدت گزارنے کے بعد اپنے پہلے خاوند پر حلال ہو سکتی ہے۔ اور اس پر دلیل سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳۰ ہے:

﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ﴾

۴۔ اور چوتھی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر مرد نے اپنی مطلقہ بیوی سے دوبارہ نکاح کر لیا تو آیا پہلے نکاح کے دوران دی گئی طلاقیں محسوب ہوں گی یا نہیں؟ .... بالفاظِ دیگر کیا وہ جمع رہتی ہیں یا باطل ہو چکی ہوتی ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے نکاح کے دوران دی ہوئی طلاق یا طلاقیں محسوب نہیں ہوں گی۔ اس نکاح کے بعد مرد کو اسی طرح تین طلاقیں دینے کا حق حاصل ہو گا، جس طرح پہلے نکاح کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وقت تھا۔ کیونکہ یہی بات نکاح وطلاق کے متعلق بتلائے ہوئے شرعی قوانین کے مطابق ہے۔ اور جو لوگ پہلے نکاح کی بھی طلاقیں شمار کرنے بیٹھ جاتے ہیں تو اس کا بارِ ثبوت ان پر ہے، ہم پر نہیں .... ہم آخر کیوں ایسی باتوں کا سراغ لگائیں یا ان کے دلائل تلاش کریں، جو شرعاً اور عقلاً دونوں طرح سے غلط معلوم ہوتی ہیں؟

یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی منشا یہ ہے کہ جو مرد و عورت ایک دفعہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے ہیں حتیٰ الامکان ان میں جدائی بذریعہ طلاق کی نوبت نہ آئے۔ اسی وجہ سے باہمی تنازعہ کی صورت میں فریقین سے ثالثی سمجھوتہ کا حکم دیا گیا، حیض کی حالت میں طلاق کو ممنوع قرار دیا گیا، طلاقیں ایک کی بجائے تین مقرر ہوئیں، وقفہ وقفہ پر۔ عدت کے دوران بیوی کو ایامِ عدت خاوند کے گھر پر گزارنے کا حکم دیا گیا اور اس دوران نان ونفقہ اور سکنیٰ کا بار خاوند پر ڈالا گیا، تاکہ کسی وقت بھی میاں بیوی کو مل بیٹھنے کا موقع میسر آتا رہے اور ازدواجی تعلق میں اللہ تعالیٰ نے ایسی تاثیر رکھ دی ہے کہ بعض دفعہ میاں بیوی کے تنازعات اس ذریعہ سے از خود ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن فقہ حنفی والوں کا مزاج اس سے مختلف نظر آتا ہے وہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین شمار کر لیتے ہیں اور اگر کوئی محض بیوی کو ڈاک میں طلاق بھیج دے، خواہ عورت اپنے میکے بیٹھی ہو تو ان میں مفاہمت کی صورت نہیں سوچتے۔ البتہ ایسی طلاقوں کو مؤثر قرار دے دیتے ہیں۔ اس کے برعکس جہاں کتاب وسنت کی روشنی میں فی الواقع جدائی کی نوبت آجاتی ہے، یعنی طلاقِ بائنہ، تو اس وقت انہیں فریقین میں شارٹ کٹ یعنی حلالہ کا نکاح بھلا معلوم ہونے لگتا ہے......... حالانکہ ایسا نکاح حرام ہے اور رسول اللہ ﷺ نے حلالہ نکالنے والے اور نکلوانے والے، دونوں کو ملعون قرار دیا ہے۔

هذا ما عندي والله اعلم بالصواب.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فتویٰ:۳۰

انسانی پیدائش کے لیے مصنوعی تخم ریزی

ٹیسٹ ٹیوب بے بی

لادین معاشروں سے جو طریقے درآمد ہوتے ہیں ان کو بلاحیل وحجت ''ترقی'' کے نام پر اپنانے کے آزادانہ طرزِ عمل کی حوصلہ افزائی تو نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ دورِ حاضر میں مادہ پرستی کے فروغ نے ایمان واخلاق کی اقدار کا دیوالیہ نکال دیا ہے۔ تاہم رب العالمین کی شریعت میں ہر نوع کی ایجادات اور تبدیلیوں کے لیے مکمل ہدایات موجود ہیں، جو اس کے کمال ودوام کا ثبوت بھی ہیں۔

اسی قسم کے مسائل میں ایک اہم مسئلہ ''ٹیسٹ ٹیوب بے بی'' کا ہے جس پر مجمع البحوث الاسلامیہ (مصر) اور مجمع فقہ اسلامی مکہ مکرمہ کے بھی اجتماعات منعقد ہوتے رہے ہیں۔ پاکستان کی نظریاتی کونسل بھی اس پر غور کر رہی ہے۔ مجلس التحقیق الاسلامی نے اسی سلسلہ کے ایک سوال نامے کے سلسلہ میں علماء کا خصوصی اجلاس بلایا جس میں مولانا کیلانی نے بھی اپنا مقالہ پیش کیا جو انہوں نے تبادلہ خیالات کے بعد نئی صورت میں ترتیب دیا ہے۔ چنانچہ زیر بحث مسئلہ کی بعض صورتیں جائز ہیں۔ بعض محض ایک تکلف اور بے فائدہ کہ جن سے بہ ظاہر بے اولاد لوگوں کی بااولاد ہونے کی خواہش پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ حالانکہ درحقیقت ایسا نہیں ہے...... اور بعض صورتیں ناجائز بلکہ حرام اور ایک مسلم معاشرہ کے لیے انتہائی خطرناک نتائج کی حامل ہیں۔ تفصیل سوال وجواب کی صورت میں ہدیہ قارئین ہے۔ (مدیر)

جناب نور احمد صاحب، مصطفیٰ آباد۔ لاہور سے لکھتے ہیں:

''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ...... بعد!

جناب کی خدمت میں گزارش ہے کہ درج ذیل مسائل میں شریعت مطہرہ کا حکم مدلل ومفصل بیان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فرمائیں......ان مسائل کی وضاحت روزنامہ ''جنگ'' لاہور 25 مئی کی ایک خبر کے سلسلے میں مطلوب ہے، جس کا عنوان تھا کہ ''اب پاکستان میں بھی ٹیسٹ ٹیوب بے بی پیدا کی جائے گی۔''

ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی پیدائش کا طریقہ یہ ہے کہ: عورت اور مرد دونوں سے جرثومے حاصل کیے جاتے ہیں، جنہیں اصطلاح میں Eggs اور Sperms کہتے ہیں۔ ان کو ایک ٹیوب میں 12 ہفتے رکھا جاتا ہے، جس میں کہ وہ تمام لوازمات (Ingredients) پائے جاتے ہیں جو کہ رحمِ مادر (Womb) میں ہوتے ہیں۔ پھر ان جرثوموں کو غیر فطری طریقے سے (بذریعہ انجکشن) رحم مادر میں داخل کیا جاتا ہے۔ اور یوں نو ماہ بعد بچے کی پیدائش عمل میں آتی ہے۔

یہ عمل حسب ذیل صورتوں میں انجام پاتا ہے:

۱۔ وہ عورت جو بچے کی پیدائش کے عمل سے خود کو محفوظ رکھنا چاہتی ہے تو ایسی عورت اور اس کے شوہر کے جرثومے کسی دوسری خواہشمند عورت کے رحم میں داخل کیے جاتے ہیں۔ اس کے عوض وہ خواہشمند عورت خطیر رقم بطورِ معاوضہ لیتی ہے اور نو ماہ بعد وہ بچہ ان کے حوالے کر دیتی ہے جن کے جرثومے ہوتے ہیں۔

۲۔ جو عورت بانجھ ہوتی ہے اس سے جرثومے اور پھر اس کے شوہر کے جرثومے حاصل کیے جاتے ہیں۔ اور پھر دوبارہ 12 ہفتے بعد اس بانجھ عورت کے رحم (Womb) میں داخل کر دیئے جاتے ہیں۔

۳۔ عورت سے یہ جرثومے ایک معمولی آپریشن کے ذریعے حاصل کیے جاتے ہیں جبکہ مرد سے یہ جرثومے بھی غیر فطری طریقے یعنی جلق کے ذریعے حاصل کیے جاتے ہیں یا پھر عزل کے ذریعے۔

اس ضمن میں حسب ذیل سوالات ابھرتے ہیں:

۱۔ اس طریقہ کار کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۲۔ کیا یہ جدید تحقیق فطری عمل کے مطابق ہے یا فطرت سے بغاوت؟

۳۔ اس طریقہ سے پیدا ہونے والی نسلوں کی قانونی و شرعی حیثیت کیا ہوگی اور نسب کس کا ہوگا؟

۴۔ کیا بانجھ میاں بیوی اس کے ذریعے اولاد حاصل کر سکتے ہیں جبکہ جرثومے (Eggs, Sperms) ان دونوں کے اپنے ہی ہوتے ہیں؟

۵۔ جس عورت کے رحم میں یہ جرثومے داخل کیے جاتے ہیں کیا اس کے لیے جائز ہے کہ اپنا رحم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاوضہ کے لیے کسی دوسرے کی اولاد کے لیے دے دے؟ نیز پیدائش کے بعد اس عورت کا نومولود سے کس قسم کا رشتہ ہوگا؟ جبکہ اس نومولود کی پرورش اس عورت کے خون سے ہوتی ہے۔

۶۔ اس ایجاد کے معاشرتی اور اخلاقی نظام پر کیا اثرات پڑ سکتے ہیں؟

آپ سے گزارش ہے کہ مندرجہ بالا اہم مسائل کے بارے میں شریعت اسلامیہ کا موقف مکمل تفصیل سے مدلل طور پر واضح فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ جزاکم اللہ..... والسلام"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون الوہاب

بشرطِ صحت مہیا کردہ معلومات مستفسر صاحب کے سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

ا۔ پہلے سوال کہ..... "اس طریقہ کار کی شرعی حیثیت کیا ہے"...... کا جواب یہ ہے کہ یہ محض طریقہ کار ہی نہیں بلکہ ایک طریقہ علاج بھی ہے (خصوصاً بانجھ میاں بیوی کے اولاد پیدا ہونے کے سلسلہ میں) لہٰذا ضرورت کے وقت اس کی شرعی حیثیت وہی کچھ ہے جو عام سائنسی ایجادات کی ہوتی ہے۔ جیسے ریڈیو، ٹیلی ویژن، لاؤڈ سپیکر وغیرہ۔ یہ چیزیں بذات خود نہ اچھی ہیں نہ بری، بلکہ درجہ اباحت میں ہوتی ہیں۔ اگر ان چیزوں کا استعمال بھلائی کے کاموں میں یا شریعت کی منشاء کے مطابق کیا جائے تو یہی چیزیں خیر ہیں، جائز اور درست ہیں۔ اور اگر یہی چیزیں برے کاموں یا برائی کی نشر و اشاعت یعنی شریعت کی منشاء کے خلاف استعمال کی جائیں تو یہی اشیاء عین شر اور ناجائز قرار پائیں گی۔

۲۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ "کیا یہ جدید تحقیق فطری عمل کے مطابق ہے یا فطرت کے خلاف بغاوت ہے؟"

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ جدید تحقیق فطری عمل کے مطابق نہیں ہے لیکن ہم اسے فطرت کے خلاف بغاوت بھی قرار نہیں دے سکتے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ اس طریقہ علاج یا طریقہ کار میں کچھ نہ کچھ خیر کا پہلو بھی موجود ہے۔ ہمارے روزمرہ کے مسائل میں سے کئی ایسے مسائل ایسے ہیں جنہیں ہم فطرت کے مطابق نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً آپریشن کے ذریعے بچے کی پیدائش، بچے کو اپنی حقیقی ماں کے بجائے دوسری انا سے دودھ پلوانا۔ یا بچے کی تربیت گائے یا بکری کے دودھ یا ڈبے کے خشک دودھ سے کرنا۔ اسی طرح سچھنے لگوانا (فصد)، آپریشن اور چیر پھاڑ بھی فطری عمل کے مطابق نہیں۔ لیکن ان تمام امور کو کسی نے فطرت کے خلاف بغاوت قرار نہیں دیا۔ اور حسب حال مثال یہ ہے کہ جس جوڑے کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہاں اولاد نہ ہوتی ہو تو ڈاکٹر صاحبان زوجین میں سے ہر ایک کا مادہ تولید مصنوعی اور غیر فطری طریقوں سے حاصل کر کے یہ ٹیسٹ کرتے ہیں کہ میاں کے مادہ میں نقص واقع ہوا ہے یا بیوی کے مادہ میں۔ اس طریق کار پر بھی کبھی کسی نے یہ اعتراض نہیں کہ کہ یہ فطرت کے خلاف بغاوت ہے۔ ان مثالوں سے البتہ یہ اصول ضرور مستنبط ہوتا ہے کہ ہر ایسا طریقِ کار یا طریق علاج، جو شریعت کے خلاف نہ ہو، وہ شرعاً مباح اور جائز ہوگا۔

۳۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ اس طریقہ سے پیدا ہونے والی نسل کی قانونی اور شرعی حیثیت کیا ہوگی، اور نسب کس کا ہوگا؟

اس سوال کا جواب دراصل اس طریق کار کے مختلف قسم کے استعمال پر منحصر ہے۔ ان اقسام میں سے دو کی طرف تو مستفسر صاحب نے سوال نمبر 4 اور 5 کے تحت وضاحت کر دی ہے، باقی کچھ اور اقسام بھی ہیں۔ لہٰذا اس سوال کا جواب اگلے سوالات کے جوابات میں ازخود آ جائے گا۔

۴۔ چوتھا سوال یہ ہے کہ ''کیا بانجھ میاں بیوی اس کے ذریعہ اولاد حاصل کر سکتے ہیں، جبکہ جرثومے ان دونوں کے اپنے ہی ہوتے ہیں؟''

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر اس طریق کار سے بانجھ میاں بیوی کے ہاں اولاد ہو جائے تو یہ چیز ان دونوں میاں بیوی کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ اور سائنس کی یہ ایجاد بنی نوع انسان کے لیے ایک نوید مسرت ہے۔ عورت کے بانجھ پن کی وجہ سے جہاں اس کے علاج پر کثیر اخراجات اٹھتے ہیں وہاں بہت سے دوسرے تلخ معاشرتی مسائل بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً دوسری شادی کی ضرورت، پہلی بیوی کی طلاق یا اسے معلق رکھنا، بیویوں کی آپس میں رقابت اور اس سے میاں کی زندگی کا ناخوشگوار ہونا اور بعض دفعہ خاوند کے خلاف دونوں بیویوں کی مشترکہ محاذ آرائی، بانجھ عورت کا اپنے آپ کو ایک حقیر اور کمتر مخلوق سمجھنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسے مسائل ہیں جن سے اس طریق کار کی بدولت نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

اس طریق کار سے اگر بانجھ میاں بیوی کے ہاں اولاد پیدا ہو جاتی ہے، تو ان دونوں کی اپنی ہی ہوتی ہے، لہٰذا نسب یا وراثت کا کوئی نیا مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔

۵۔ پانچواں سوال یہ ہے کہ ''جس عورت کے رحم میں یہ جرثومے داخل کیے جاتے ہیں کیا اس کے لیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جائز ہے کہ وہ اپنا رحم معاوضہ پر کسی دوسرے کی اولاد کے لیے دے دے؟ نیز پیدائش کے بعد اس عورت کا نومولود سے کس قسم کا رشتہ ہوگا، جبکہ اس نومولود کی پرورش اس عورت کے خون سے ہوئی ہے؟''

مستفسر صاحب کے پورے سوال نامہ میں، ہماری نظر میں یہی سوال سب سے زیادہ اہم ہے۔ لہٰذا اس کا جواب ہم ذرا وضاحت سے دیں گے۔

عربی زبان اور اسی طرح قرآن کریم میں لفظ ''ماں'' کے لیے دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ایک ''والدۃ'' اور دوسرے ''اُم'' لغوی لحاظ سے لفظ ''والدۃ'' کا اطلاق صرف اس عورت پر ہوگا جو بچہ جنتی ہے۔ بالفاظ دیگر نومولود کی والدہ وہ عورت ہے جس نے اس کو جنا ہے، نہ کہ وہ جس کا جرثومہ یا بیضہ تھا۔

ماں کے لیے دوسرا لفظ ''اُم'' ہے۔ جو والدۃ سے وسیع تر مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی حقیقی والدہ کے لیے بھی اور دادی، پڑدادی، نانی، پڑنانی وغیرہ کے لیے بھی۔ اس لفظ کے اور بھی بہت سے معانی ہیں جن سے ہمیں سرِدست سروکار نہیں۔ فی الحال ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ''اُم'' کا لفظ بھی اس عورت کے لیے استعمال فرمایا ہے جس نے بچہ جنا ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ﴾ ''اور ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے انہیں جنا ہے۔''
(سورۃ المجادلۃ:۲)

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا﴾ ''اس (یعنی انسان) کی ماں نے اسے مشقت سے پیٹ میں اٹھائے رکھا اور مشقت ہی سے جنا''
(سورۃ الأحقاف:۱۵)

پہلی آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ماں وہ ہے جو بچہ جنتی ہے اور دوسری آیت میں تو مزید صراحت آ گئی کہ ماں وہ ہے جو حمل کو پیٹ میں رکھتی اور پھر اسے جنتی ہے۔

ان آیات سے معلوم ہو گیا کہ نومولود کی ماں حقیقتاً وہی ہے جس نے اسے جنا ہے نہ وہ کہ جس کا جرثومہ تھا۔ اب اس صورت حال پر شرعی احکام کے اطلاق کو سمجھنے کی سہولت کے مدنظر ہم ذیل میں ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

فرض کیجیے کہ زید اور اس کی بیوی جمیلہ۔ ہندہ نامی ایک عورت کا رحم معاوضۃً لے رہے ہیں۔ ہندہ کے خاوند کا نام عمر ہے اور اس طریق کار کی بدولت ہندہ کے ہاں جو بچہ پیدا ہوا ہے۔ اس کا نام بکر ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اب شرعی نقطہ نظر سے صورت مسئلہ یہ ہوگی کہ:

1۔قرآن کریم کی رو سے بکر ہندہ کا بیٹا ہے جس نے اسے رحم میں اٹھائے رکھا اور جنا ہے۔

2۔بکر کے نسب سے مشابہ دو طرح کے واقعات دورِ نبوی میں ملتے ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بھائی عتبہ نے مرتے وقت اپنے بھائی سعد رضی اللہ عنہ کو یہ وصیت کی کہ زمعہ (ام المؤمنین سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا کا باپ) کی لونڈی کا بیٹا عبدالرحمٰن میرے نطفہ سے ہے۔لہٰذا تم اس کو لے لینا۔ چنانچہ سعد رضی اللہ عنہ جب بچہ کو لینے گئے تو زمعہ کا بیٹا عبد کہنے لگا کہ یہ میرا بھائی ہے اور میرے باپ کی لونڈی کا بچہ ہے۔ آخر دونوں لڑتے جھگڑتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مقدمہ سن کر فرمایا:

(الولد للفراش وللعاهر الحجر) "بچہ تو اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا (یعنی زمعہ کا) اور زانی کے لیے پتھر ہیں۔"

(صحیح بخاری۔کتاب البیوع۔حدیث نمبر ۲۰۵۳)

اور ساتھ ہی اپنی بیوی سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

(احتجبي منه يا سودة لما راى من شبه لعتبة) "سودہ رضی اللہ عنہا! اس سے پردہ کیا کرو۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ اس بچہ کی صورت عتبہ سے ملتی تھی۔"

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ باوجود یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عبدالرحمٰن (بچہ) کی شکل وصورت سے یہ معلوم ہو گیا تھا، کہ وہ عتبہ کا ہی بیٹا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو زمعہ کا بیٹا قرار دیا، جس کی لونڈی نے اسے جنا تھا۔ اس لحاظ سے مذکورہ بالا مثال میں (بکر) نومولود (ہندہ) جس نے اسے جنا ہے، کے خاوند عمر کا بیٹا قرار پائے گا نہ کہ زید کا جس کا جرثومہ تھا یا جس پر نومولود کی شکل وصورت اور عادات واطوار کا انحصار ہوگا۔

دوسرا واقعہ مسجدِ نبوی میں عویمر عجلانی اور اس کی بیوی کے درمیان لعان کے ذریعہ جدائی کا ہے۔ ابن شہاب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد یہی مشہور ہو گیا کہ جہاں میاں بیوی نے لعان کیا دونوں میں جدائی ہو گئی۔ اگر عورت پیٹ سے ہوتی تو اس کا بچہ اپنی ماں کا بیٹا کہلاتا ہے۔ پھر لعان کرنے والی عورت میں یہ قاعدہ بھی جاری ہوا کہ وہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے حصوں کے موافق اپنے بچے کی وارث ہوگی اور بچہ اس کا وارث ہوگا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لعان کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ''دیکھتے رہو اگر بچہ لال لال، پست قد پیدا ہو تو تب میں گمان کروں گا کہ عورت سچی اور مرد نے جھوٹی تہمت باندھی اور اگر بچہ سانولے رنگ کا، بڑی آنکھ والا اور بڑے چوتڑوں والا پیدا ہو تو میں گمان کروں گا کہ مرد سچا ہے۔'' جب بچہ پیدا ہوا تو اس سے بھی زیادہ بد شکل تھا، یعنی اس مرد کی صورت پر تھا جس سے عورت کو تہمت لگائی گئی تھی۔ (بخاری، کتاب الطلاق باب التلاعن فی المسجد)

اب دیکھیے اس واقعہ میں قانوناً بچہ سے لاتعلق ہونے کی بناء پر، نسب باپ کی طرف نہیں بلکہ ماں کی طرف ہوگا۔ وراثت کا تعلق بھی ماں ہی سے ہے۔

اب مسئلہ متعلقہ پر نگاہ ڈالیے۔ رحم معاوضہ پر دینے کی شکل میں اگرچہ ہمیں یقینی طور پر معلوم ہے کہ یہ نطفہ زید کا ہے لیکن پہلی مثال کے مطابق قانوناً بچہ زید کا نہیں ہوگا، بلکہ نومولود (بکر) عمر کا بیٹا ہی قرار پائے گا۔ لہٰذا یہ سارا سلسلہ محض تکلف اور بے فائدہ ہوگا۔

3۔ زید اور اس کی بیوی جمیلہ زنا کی پوری تعریف صادق نہ آنے کی بناء پر زانی اور زانیہ تو شمار نہ ہوں گے اور نہ ہی ان پر حد لگائی جائے گی۔ البتہ گنہگار ضرور ہیں۔ حسب ارشاد نبوی ﷺ:

(لا یحل لامریءٍ یؤمن باللہ والیوم الآخر أن یسقي ماءہ زرع غیرہ) ''کسی شخص کے لیے جو اللہ اور یوم الآخرت پر ایمان رکھتا ہے، یہ حلال نہیں کہ وہ کسی غیر کی کھیتی کو پانی دے۔''

(ابوداؤد۔ کتاب النکاح۔ حدیث نمبر ۲۱۵۸)

اور یہ تو واضح ہے کہ ہندہ عمر کی کھیتی ہے، زید اور جمیلہ دونوں نے مل کر غیر (عمر) کی کھیتی میں تخم ریزی یا آبیاری کی ہے لہٰذا یہ ناجائز ہے۔

4۔ اگر زید اور جمیلہ بکر کو اپنے ہاں لا کر اس کی تربیت کرتے ہیں تو بکر کی حیثیت محض متبنّٰی کی ہوگی۔ کیونکہ شرعی نقطہ نظر سے ان دونوں کے جز ثوے ہونے کے باوجود، بکر نہ جمیلہ کا بیٹا ہے اور نہ زید کا۔

5۔ بکر، عمر اور ہندہ کے ترکہ کا حصہ رسدی وارث ہے، اور وہ اس کے وارث ہیں۔ بلحاظِ احکامِ وراثت بھی بکر سے زید اور جمیلہ کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔

6۔ چھٹا سوال یہ ہے کہ ''اس ایجاد کے معاشرتی اور اخلاقی نظام پر کیا اثرات پڑ سکتے ہیں؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر اس ایجاد کا ضرورت (جیسے بانجھ عورت کے ہاں اولاد کی ضرورت ہے) کے بجائے خواہشات کی تکمیل کے لیے آزادانہ استعمال کیا جائے تو معاشرتی اور اخلاقی نظام میں ایسی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو اسلامی تعلیمات کی عین ضد ہیں۔ اسلام اپنی منکوحہ بیوی کے علاوہ سفاحت کے تمام طریقوں کو باطل اور حرام قرار دیتا ہے اور اس حکمت عملی سے درج ذیل مقاصد حاصل ہوتے ہیں:

(۱) تحفظِ نسب (۲) عائلی نظام کی پائیداری (۳) شکوک وشبہات سے پاک نظامِ وراثت اور (۴) فحاشی کا سدِ باب۔ اب اگر اس طریق کار کا آزادانہ استعمال کیا جائے تو مندرجہ بالا تمام مقاصد میں سخت گڑبڑ واقع ہو جائے گی اور اسلام کے معاشرتی اور اخلاقی نظام کی چولیں تک ہل جائیں گی۔

جہاں تک مستفسر صاحب کے سوالات کا تعلق تھا تو ان کا جواب ہو چکا۔ اب ایک اور بات جس کی طرف مستفسر صاحب نے توجہ دلائی ہے وہ یہ ہے کہ عورت کے جرثومے بذریعہ معمولی آپریشن حاصل کیے جاتے ہیں۔ یہ غیر فطری طریق ہے۔ مرد کے جرثومے جلق یا عزل کے ذریعے حاصل کیے جاتے ہیں، یہ بھی غیر فطری طریق ہے۔ پھر مرد اور عورت کا ملا ہوا نطفہ 12 ہفتے بعد جو رحمِ مادر میں بذریعہ انجکشن داخل کیا جاتا ہے تو یہ بھی غیر فطری طریق ہے۔ ایسے تمام غیر فطری طریقوں کی طرف توجہ مبذول کرانے سے مستفسر صاحب کا رجحان یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایسے طریق کار کو حرام ہی قرار دیا جانا چاہیے۔ اس بات کی چند مثالوں کے ذریعے سوال نمبر 2 کے تحت وضاحت کی جا چکی ہے کہ محض طریق کار یا طریق علاج کا غیر فطری ہونا اس کو حرام قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اور اس کا اظہار ہمارے فقہائے کرام کی اس قسم کی بحثوں سے بھی ہوتا ہے کہ اگر کوئی عورت کسی بھی طریقے سے اپنے خاوند کا نطفہ اپنے رحم میں داخل کر لے تو اس صورت میں خاوند سے نسب ثابت ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی کنیز اپنے آقا کے نطفے کو رحم میں داخل کر لیتی ہے اور حمل کے بعد بچہ پیدا ہو جاتا ہے، تو اس کا نسب آقا سے چلے گا اور وہ ''ام الولد'' قرار پائے گی، اگرچہ ملاپ کا فطری طریق صرف زوجین کا جنسی وجسمانی اتصال ہے۔

دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ مستفسر صاحب نے اس غیر فطری تخم ریزی کی صرف دو قسمیں بیان کی ہیں۔ جبکہ اس کی اور بھی کئی قسمیں ہیں۔ اور اس کے طریق کار بھی الگ الگ ہیں۔ ایک طریق تو داخلی ہے، یعنی پچکاری کے ذریعے مرد کے نطفہ کو عورت کے رحم میں داخل کرنا (Artificial Insemination)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور دوسرا خارجی، یعنی زوجین کے جرثوموں کا ٹیسٹ ٹیوب میں ملاپ کرنا، جسے (In vitro ertilisation) کہتے ہیں۔ مستفسر صاحب نے جو سوالات لکھے ہیں وہ اسی طریق کار سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب ان دونوں طریقوں کو اور مختلف صورتوں کو ملانے سے بہت سی اقسام بن جاتی ہیں۔ مثلاً:

۱۔ کسی بیماری یا عارضہ کی وجہ سے زوجین مباشرت صحیح طور پر کر ہی نہیں سکتے۔ یا بیوی اس کی محتمل نہیں ہوسکتی۔ تو مرد کا نطفہ بذریعہ پچکاری یا انجکشن (طریق اول) عورت کے رحم میں داخل کر دیا جائے۔ یہ صورت جائز اور درست ہے۔ اس سے نہ نسب میں فرق پڑتا ہے نہ وراثت کے احکام متاثر ہوتے ہیں۔

۲۔ اگر کسی وجہ سے مندرجہ بالا طریق ممکن نہ ہو تو طریق نمبر 2 یعنی ٹیسٹ ٹیوب والا طریق اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ بھی جائز اور درست ہے۔ بشرطیکہ جرثومے زوجین کے اپنے ہوں۔ اور اس کی وضاحت سوال نمبر 4 کے تحت آ چکی ہے۔

۳۔ ایک مرد کی دو یا دو سے زائد بیویاں ہیں۔ جن میں سے کوئی ایک بانجھ ہے۔ اس بانجھ عورت کا بیضہ حاصل کر کے ٹیسٹ ٹیوب میں مرد کا نطفہ شامل کر کے کسی تندرست بیوی کے رحم میں یہ نطفہ امشاج رکھ دیا جائے۔ یا اس کے برعکس یعنی اگر بانجھ عورت کے بیضہ یعنی جرثومہ میں نقص ہے تو وہ کسی دوسری بیوی کا جرثومہ لے کر یہی طریق کار استعمال کر کے بانجھ عورت کے رحم میں رکھ دیا جائے۔ اس طریق کار میں کچھ قباحت نہیں۔ اس کا نسب تو بہرحال باپ سے ہی چلے گا۔ لیکن وراثت کا تعلق اس ماں سے ہوگا جس نے اسے جنا ہے۔

ان تینوں صورتوں کے علاوہ باقی جتنی بھی شکلیں بنتی ہیں (اور وہ بہت سی بن جاتی ہیں) سب قطعی طور پر حرام ہیں۔ مثلاً عورت تو تندرست ہے مگر مرد بیمار ہے۔ اب وہ اپنے خاوند کی مرضی سے اپنا بیضہ دیتی اور ٹیوب میں کسی غیر مرد کا نطفہ ملاپ کروا کر اس کو اپنے رحم میں رکھ لیتی ہے، یا کسی غیر مرد کا نطفہ پچکاری کے ذریعہ یا کسی دوسرے غیر فطری ذریعہ سے اپنے رحم میں ڈال یا ڈلوا لیتی ہے۔ تو یہ سب صورتیں حرام ہیں۔

اسی طرح اگر کوئی عورت اپنا رحم عاریتاً یا معاوضتاً دینے پر آمادہ ہو جائے۔ تو تخم ریزی اور خواہشات کی تکمیل کی بیسیوں شکلیں نکل آتی ہیں۔ جو سب حرام ہیں۔ اگر اس قسم کی حرام کاری کی ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دفعہ راہ کھل گئی تو یہ اتھاہ گہرائیوں تک پہنچ کر ہی دم لے گی۔ جس کی تباہ کاریوں اور ہولناک نتائج کا ہم سرِ دست تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا حکومت کو چاہیے کہ ایسی تمام ناجائز صورتوں کو قانوناً بند کر دے۔ رہی جائز صورتیں تو ان کا استعمال بھی صرف مجبوری کی صورتوں میں اور نہایت محتاط طریقہ سے ہونا چاہیے۔ ورنہ جائز صورتوں کے آزادانہ استعمال سے بھی یہ خطرہ لاحق ہو سکتا ہے اس طرح آہستہ آہستہ ناجائز صورتوں کی بھی کہیں راہ نہ کھل جائے۔

هذا ما عندي والله اعلم بالصواب

۱۔ کہا جا سکتا ہے کہ اگر محض جرثومے کی بناء پر مرد کو والد کہا جا سکتا ہے تو اسی بناء پر عورت کو والدہ کیوں نہیں کہا جا سکتا؟...... بالفاظِ دیگر اگر لغوی معنی کا اعتبار کیا جائے تو اس لحاظ سے تو ہم زید کو بھی والد نہیں کہہ سکتے۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ از روئے لغت مرد فی الواقع جننے والا یا والد نہیں ہوتا۔ اسے شوہر یا صاحب نطفہ ہونے کی حیثیت سے ہی والد کہا جاتا ہے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن عورت کی جسمانی ساخت ہی چونکہ جننے کے لیے بنائی گئی ہے۔ لہٰذا اس کی طرف ولادت کی نسبت حقیقی ہوتی ہے۔ اس کی طرف مجازی نسبت درست نہیں ہوگی۔

۲۔ اسی سلسلہ کے ایک فتویٰ میں شیخ الازہر نے اسے زنا قرار دیا ہے اور اسی بناء پر بعض علماء نے اس پر حد جاری کرنے کا فتویٰ دیا ہے، جو درست نہیں۔ کیونکہ زنا کی تعریف صرف ادخال واستدخال نطفہ نہیں ہے، بلکہ جنسی ملاپ وغیرہ بھی ضروری ہے۔

۳۔ رابطہ عالمِ اسلام مکہ مکرمہ میں مجمع فقہ اسلامی نے بھی اپنے متعدد اجلاسوں میں غور وفکر کر کے متذکرہ بالا تین صورتوں کے جواز کا میلان دیا ہے۔ تاہم اسی اجلاس میں سعودی عرب کے متدین اور محتاط علماء نے ''جواز'' کی بجائے ''توقف'' کا رویہ اختیار کیا ہے، جس میں سعودی عرب کے مفتی اعظم سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز بھی ہیں۔ متذکرہ بالا تینوں صورتوں میں بھی آراء مختلف ہیں۔ لہٰذا ایسی گنجائش ضروری علاج ہی کی بناء پر نکالی جا سکتی ہے۔ چنانچہ تیسری صورت جس میں ایک مرد کی دو بیویوں کا باہمی ایسا معاملہ کہ ایک سے نطفہ امشاج دوسرے کے رحم میں پرورش پائے، بے جواز نظر آتا ہے، جبکہ بچہ پھر بھی اس کا ہوگا جس نے جنم دیا۔ یہ علاج نہیں بلکہ حصول اولاد کی خواہش ہے جو پھر بھی پوری نہ ہو سکی۔ (مدیر)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۔ ہندوؤں میں ایسی صورتِ حال کا حل ان کا مشہور مسئلہ ''نیوگ'' ہے۔ نیوگ یہ ہوتا ہے کہ ایسا بیمار خاوند اپنی بیوی کو کسی مندر کے ایسے پروہت کے پاس لے جاتا ہے جس کی اسی غرض کے لیے تربیت کی جاتی ہے۔ یہ میاں بیوی اس پروہت کو نذرانہ گزارتے ہیں۔ پھر میاں بیوی کو اسکے پاس چھوڑ جاتا ہے، تا کہ وہ پروہت اس عورت سے ہمبستری کرے۔ اس طرح عورت کے ہاں جو بچہ پیدا ہوتا ہے وہ نسبی لحاظ سے بھی میاں کا بچہ ہی متصور ہوتا ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے بھینسوں کی بہتر نسل کشی کے لیے سانڈ پالے جاتے ہیں۔ پھر جس طرح سانڈ کا مالک بھینس سے ملاپ کی اجرت وصول کرتا ہے۔ بعض جاہل صوفیاء میں ''نوراتا'' کا تصور یہیں سے آیا ہے کہ اسی غرض سے نوراتوں کے لیے بیوی درویش کے پاس چھوڑ دی جاتی ہے، جو واضح زنا کے باوصف نذرانہ کے نام پر صریح حرام کمائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے موجب تو ایسی کمائی جانوروں میں بھی منع ہے۔ اسے کسب الفحل کہتے ہیں یعنی نر سے جفتی کرانے کی کمائی۔

۵۔ اس کے برعکس اسلام میں ایسی صورت حال کا حل یہ ہے کہ عورت اگر ایسے بیمار مرد کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہے تو فبہا، ورنہ مرد کو چاہیے کہ اسے طلاق دے دے اور اگر مرد طلاق نہیں دیتا، تو عورت بذریعہ عدالت طلاق لے سکتی ہے۔ بعد ازاں وہ کسی تندرست مرد سے شادی کرے۔

❁......❁......❁

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فتویٰ: ۴۴

نابالغ لڑکے اور لڑکی کا نکاح

جناب ایس ایم۔ رضا شاہ (۴۴، راوی بلاک علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور) نے ایک طویل خط ادارہ محدث کو ارسال کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''السلام علیکم! آپ کے مؤقر ماہنامہ محدث (ستمبر، اکتوبر 1986ء) میں ''نکاح وطلاق وغیرہ کے چند مسائل'' کے عنوان کے تحت مولانا سعید مجتبیٰ السعیدی نے ایک سوال کہ ''بلوغت سے قبل جو نکاح کیا جائے، کیا یہ نکاح شرعی طور پر جائز ہوگا یا نہیں؟'' کے جواب میں فرمایا ہے کہ ''صغر سنی میں بلوغت سے قبل جو نکاح کیا جائے، شرعاً واقع ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ لڑکی بلوغت کے بعد اس نکاح پر رضامندی کا اظہار کر دے۔''

نیز مولانا عبدالرحمٰن کیلانی نے ''بچپن کی شادی'' کے عنوان کے تحت (شمارہ اگست 1986ء) میں فرمایا ہے کہ:

''قرآن ہی سے بچپن کی شادی کا جواز یوں ثابت ہوتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالّٰٓـِٔیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُھُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْھُرٍ وَّالّٰٓـِٔیْ لَمْ یَحِضْنَ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُھُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَھُنَّ﴾ (سورۃ الطلاق:۴)

''اور تمہاری مطلقہ عورتیں، جو حیض سے ناامید ہو چکی ہوں، اگر تمہیں (ان کی عدت کے بارے میں) شک ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے۔ اور ان کی بھی جنہیں ابھی حیض شروع ہی نہیں ہوا اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔''

اب دیکھیے آیت بالا میں بوڑھی، جوان اور بچی سب طرح کی عورتوں کا ذکر ہے۔ بوڑھی اور بچی کی عدت تین ماہ ہے اور جوان (یعنی بالغ جو قابل اولاد ہو) کی عدت، اگر اسے حمل ہے، تو وضع حمل تک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ عدت کا سوال طلاق کے بعد ہی پیدا ہو سکتا ہے اور طلاق کا نکاح کے بعد، گویا نابالغ کا نکاح بھی از روئے قرآن جائز ہے۔

قبل ازیں ایک مشہور عالم بھی (ترجمان القرآن ماہ اکتوبر 1969ء) میں اس مؤقف کا اظہار کر چکے ہیں کہ ایسی لڑکی جسے ابھی حیض آنا شروع نہ ہوا ہو، اس سے نہ صرف نکاح کر دینا جائز ہے، بلکہ شوہر کا اس کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔

تو اس ضمن میں گزارش یہ ہے کہ چونکہ محدث بھی بالا مندرجات سے متفق نظر آتا ہے، لہٰذا آپ اس پر روشنی ڈالیں کہ قرآن سے یہ استدلال اس کی معنوی تحریف میں نہیں آتا؟ اوّلاً تو یہ دیکھیے کہ آیت میں لفظ ''نساء'' کا معنی ''بچی'' کیا جا سکتا ہے؟ قرآن کریم میں متعدد بار اس لفظ کا استعمال آیا ہے، کیا خود اللہ رب العزت نے اسے ''بچی'' کے معنوں میں استعمال کیا ہے؟ مولانا کیلانی صاحب نے ترجمہ کیا ہے ''اور ان کی بھی جنہیں ابھی حیض شروع ہی نہیں ہوا'' سوال یہ ہے کہ ''لم یحضن'' کا یہ ترجمہ کس قاعدے کی رو سے کیا گیا ہے؟ آپ لفظ ''ابھی'' سے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اس سے مراد نابالغ ہے۔ حالانکہ ''نساء'' کے لفظ سے یہ ثابت ہے کہ یہ وہ بالغ عورتیں ہیں جن کی عمر تو ایسی ہو کہ انہیں بالعموم حیض آیا کرتا ہے، لیکن کسی عارضہ کے باعث انہیں حیض نہیں آیا۔ تو اس صورت میں عدت کا شمار مہینوں سے ہوگا۔ بہر حال اردو میں قرآن کریم کے متعدد ترجموں میں آیت کا ترجمہ کم وبیش انہی الفاظ میں آیا ہے کہ جن عورتوں کو کسی عارضہ کے سبب حیض نہ آیا ہو۔

جناب کیلانی صاحب نے اپنے مخالف کے اس حوالہ پر کہ ''دین کا فیصلہ یہ ہے کہ نکاح کی عمر ہی بلوغت کی عمر ہے۔ (سورۃ النساء) اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ حالانکہ بات تو بالکل صاف ہے کہ یتیموں کے جو مال سرپرستوں کے پاس امانت رکھے جاتے ہیں، ان کی واپسی کے سلسلے میں تم یتیموں کو اس وقت تک آزماتے رہو، جب تک کہ وہ نکاح کی عمر کو نہ پہنچ جائیں۔ ﴿وَابْتَلُوا الْيَتَامٰى حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ﴾ آیت سے بالکل واضح ہے کہ قرآن کی رو سے نکاح کا وقت وہ ہے جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچیں یعنی لڑکے اور لڑکیوں کی یہ عمر نکاح کی عمر نہیں بلکہ عمر کا ایک حصہ ہے، جس سے گزرتے ہوئے وہ نکاح کی عمر کو پہنچتے ہیں۔ سورۃ نساء کی آیت مذکورہ قابل توجہ ہے۔ جب قرآن کی رو سے مردوں اور عورتوں کے نکاح کی شرط ان کا بالغ ہونا ہے، تو ثابت ہوتا ہے کہ نابالغ بچیوں کا نکاح قرآن کے منشاء کے خلاف ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں تو کہتا ہوں کہ فریقین میں اگر کوئی فریق نابالغ ہے اور اس کا نکاح کر دیا جائے تو وہ نکاح ہوتا ہی نہیں ہے۔ نکاح کو ﴿مِیثَاقاً غَلِیظًا﴾ (النساء:۲۱) یعنی ''پختہ معاہدہ'' قرار دیا گیا ہے اور معاہدہ کے لیے ضروری ہے کہ فریقین بالغ ہوں۔ ایل۔ ایل۔ بی کی تیاری میں ہم نے (Law Contract) کے تحت پڑھا تھا کہ معاہدہ ہوتا ہی بالغ افراد کے درمیان ہے۔ نکاح کی تشریح لفظ ''عقدۃ النکاح'' میں موجود ہے۔ ''عقد'' کا معنی ''گرہ'' بھی ہے اور ''وعدہ'' بھی۔ ''عقود'' اس کی جمع ہے۔ ﴿یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اَوْفُوا بِالْعُقُوْدِ﴾ کہ ''ایمان والو، وعدے وفا کیا کرو'' ظاہر ہے کہ یہ حکم بالغ مرد و عورت کو دیا جا رہا ہے، نابالغ بچی کو نہیں۔ جو نہ عہد نکاح کو سمجھے نہ وفائے عہد سے واقف ہو۔ عقد نکاح وہ وعدہ ہے، جس سے ازدواجی زندگی شروع ہوتی ہے اور فریقین اپنی اپنی ذمہ داریوں کے لیے پابند کیے جاتے ہیں۔ عورتوں کو ﴿وَقَرْنَ فِیْ بُیُوتِکُنَّ﴾ کی رو سے گھریلو ذمہ داریوں کو نبھانا ہے، جبکہ مرد بروئے آیت ﴿الرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ عورتوں کی ضروریات زندگی کے کفیل ہیں۔ ''عقد'' ایک وعدہ ہے جو عرف عام میں ایجاب و قبول کے مصداق ہے۔ عورت اپنی تمام نسوانی خدمات پیش کرتی ہے اور مرد قبول کرتا ہے۔ اب بتائیے کہ اگر فریقین کی یہ حالت ہے کہ لڑکا نابالغ ہے، نہ اولاد پیدا کرنے کے قابل، نہ روزی کمانے کے لائق، تو کس سے وعدہ لیا جائے گا کہ بیوی کی ضروریات زندگی پوری کرے گا؟ اسی طرح اگر لڑکی نابالغ ہے، نہ گھر کا کام کرنے کے قابل ہے، نہ اولاد پیدا کرنے کے قابل، تو کس سے عقد ہوگا؟ کس سے وعدہ لیا جائے کہ گھر کا کام کاج اور اولاد پیدا کر کے اس کی صحیح تربیت اور پرورش کے فرائض سرانجام دے گی؟ عقد نکاح حقیقت پر مبنی ہوتا ہے یہ کوئی ڈرامہ نہیں ہے نہ ہی گڑیوں کا کھیل۔ اگر کسی پانچویں جماعت کے لڑکے کو گورنمنٹ ہاؤس لے جا کر جج کے عہدے کا حلف اس سے اٹھوایا جائے کہ وہ اس فرض کو نہایت دیانتداری سے ادا کرے، تو جس طرح وہ لڑکا جج نہیں ہوتا، اسی طرح اگر کسی نابالغ لڑکے یا لڑکی سے نکاح کا عہد کرایا گیا تو نہ لڑکا شوہر ہوتا ہے نہ لڑکی بیوی۔ قرآن کی رو سے جب وہ نکاح کو پہنچے ہی نہیں تو نابالغی کا نکاح، نکاح ہی نہیں۔

پھر ہمارے فقہاء کہتے ہیں کہ نابالغ لڑکی، بالغ ہونے پر اگر نکاح کو رد کر دے تو فسخ ہو جاتا ہے، تو پھر وہ نکاح کیسا تھا؟ اس کی کیا حیثیت تھی؟ قرآن کریم نے مردوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ﴿نِسَآءُ کُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ﴾ (۲:۲۲۳) ''تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں''۔ کھیتی چونکہ پیداوار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لیے ہوتی ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ لڑکی جب تک بالغ نہ ہو، کھیتی نہیں کہلا سکتی۔ بالغ ہو کر پیداوار کے قابل ہو جائے تو کھیتی ہو گی اور تب اس کے نکاح کا سوال پیدا ہو گا۔ پھر ایک اور بات بھی قابل غور ہے، کہ وہ ایسے مرد کے سپرد کی جائے گی جو اولاد پیدا کرنے کے قابل ہو، یعنی بالغ ہو، کھیتی کا لفظ عورت کے لیے لایا گیا ہے، جو بالغ اور اولاد پیدا کرنے کے قابل ہوتی ہے، نابالغ بچی کے لیے نہیں آیا۔ جو پھل ابھی پکا ہی نہیں، اسے آپ توڑ کر کھانے کے لیے کیسے موزوں سمجھیں گے؟

پھر طبی نقطہ نظر سے بھی نابالغ بچی قابل مجامعت نہیں۔ اس سے خلوت ضرر انگیز ہے اور کئی جسمانی عوارض کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ آپ کسی ماہر گائناکالوجسٹ سے استفسار کیجیے، امید ہے آپ محدث کے بیک ٹائٹل پر تحریر کردہ اعلانات کی روشنی میں کہ ''علوم جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار، انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں۔'' اپنے اعلیٰ خیالات سے مستفید فرمائیں گے۔ بہتر ہو گا اگر میرا عریضہ بھی ساتھ ہی شائع کر دیں تا کہ قارئین دونوں نقطہ نظر سے آگاہ ہو سکیں۔ والسلام!

الجواب بعون الوہاب

ا۔ نکاح کی عمر:

احکام واصول شرعیہ میں یہ حکمت ملحوظ رکھی گئی ہے کہ عام حالات میں ان اصول واحکام کا اطلاق عام مسلمانوں پر ہو سکے۔ تاہم انسانوں کی مختلف استعداد اور مختلف صورت احوال کا لحاظ رکھتے ہوئے شریعت مطہرہ نے مستثنیات کا حل بھی پیش فرما دیا ہے۔ ایسے مستثنیات، محض جواز یا رخصت کے درجہ پر ہوتے ہیں، اصولی احکام کے درجہ پر نہیں۔ یہ مستثنیات کئی طرح کے ہو سکتے ہیں، مثلاً:

(الف) بعض دفعہ یہ مستثنیات حالات سے مشروط ہوتے ہیں۔ جیسے نماز کے لیے اصولی طور پر تو پانی سے وضو کرنے کا حکم ہے لیکن اگر پانی نہ مل سکے، یا پانی تو دستیاب ہو، مگر کسی بیماری کی وجہ سے اس کا استعمال نقصان دہ ہو، یا کوئی دیگر ایسا قوی مانع موجود ہو، جس کی وجہ سے نمازی پانی کے استعمال پر قادر نہ ہو تو مٹی سے تیمم کر سکتا ہے۔ ایسے حالات میں تیمّم کرنا رخصت یا جواز ہے۔

(ب) اصل حکم یہ ہے کہ ہر بالغ مسلمان رمضان کے روزے رکھے۔ اب پیر فرتوت یا ایسا مریض، جس کا مرض لاعلاج شکل اختیار کر چکا ہو، کفارہ دے سکتا ہے۔ کفارہ کی ادائیگی رخصت ہے اور جواز کے درجہ پر ہے، کوئی اصل یا حکم نہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ج) حالت اضطرار میں محرمات تک بھی حلال ہو جاتے ہیں۔اس حالت میں مردار کھالینا رخصت یا اجازت ہی رہے گا، اصولی حکم نہیں بن سکتا۔

غرض اس طرح بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، ہر معاملہ میں ہمیں یہ تمیز کر لینی چاہیے کہ اصولی حکم کیا ہے، اور رخصت کیا؟ اوران دونوں کو آپس میں گڈمڈ نہ کرنا چاہیے۔

اب مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ اصولی طور پر نکاح کی عمر کیا ہے؟ تو اس کے متعلق ہم واشگاف لفظوں میں یہ کہیں گے کہ نکاح کی اصل عمر بلوغت ہی ہے۔ جو اختلاف ہے وہ یہ ہے کہ آیا اس اصول میں کچھ مستثنیات بھی ہیں یا نہیں؟ بالفاظ دیگر یہ سوال یوں ہوگا کہ آیا بلوغت سے قبل بچپن میں بھی نکاح جائز ہے یا نہیں؟

مستثنیات کی تلاش وتحقیق کے لیے ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ نکاح کے مقاصد کیا ہیں؟ شاہ صاحب موصوف کے نزدیک نکاح کا مقصد صرف حصول اولاد ہے۔ لہٰذا ان کے سارے دلائل کا محور یہی ہونا چاہیے کہ نکاح کی عمر حقیقتاً بلوغت ہی ہے، اس سے پہلے چونکہ یہ مقصد پورا نہیں ہوسکتا لہٰذا قبل از بلوغت نکاح بھی جائز نہیں ہوتا۔

لیکن ہمارے نزدیک نکاح کے مقاصد اور بھی ہیں، صرف حصول اولاد نہیں۔ نکاح کا اصل مقصد جس کے لیے اسلام نے نکاح کا حکم دیا ہے۔ فحاشی، بے حیائی اور زنا سے اجتناب، مرد وعورت دونوں کی عفیف زندگی اور اس طرح پاک وصاف اور ستھرے معاشرے کا قیام ہے۔ اسی لیے کتاب وسنت میں والدین کو بلوغت کے فوراً بعد نکاح کردینے کا حکم دیا گیا ہے۔ رہی حصول اولاد کی بات، تو یہ اصل مقصد نہیں بلکہ ایک اہم مقصد کا ثمرہ ہے اور جو انسان کے اپنے بس کی بات ہے ہی نہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک بالغ جوڑے کی شادی کردی جائے اور تا زیست ان کے ہاں اولاد نہ ہو تو اس پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ نکاح بلا مقصد ہے۔ اگرچہ ایسے واقعات کی تعداد 5 فیصد سے زیادہ نہیں تاہم اس سے انکار بھی ممکن نہیں۔

نکاح کا دوسرا مقصد، قریبی رشتہ داروں میں قرابت کے تعلق کو برقرار رکھنا اور مودت کو بڑھانا ہے۔ تیسرا مقصد دینی اخوت کا قیام اور اس میں اضافہ ہے۔ غرضیکہ نکاح ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ کئی طرح کے دینی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی فوائد حاصل ہوتے ہیں اور بعض دفعہ ایسے مقاصد، حصول اولاد سے بھی زیادہ اہمیت اختیار کرجاتے ہیں۔ آپ ذرا جناب رسول اکرم ﷺ کی زندگی پر نظر ڈالیے کہ آپ نے کتنے نکاح کیے؟ کس عمر میں کیے؟ کس عمر کی عورتوں سے کیے اور کس کس مقصد کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحت کیے؟ تو یہ حقیقت از خود منکشف ہو جائے گی کہ نکاح کا مقصد محض جنسی خواہشات کی تکمیل یا حصول اولاد ہی نہیں ہوتا بلکہ اس سے بلند تر مقاصد بھی ہو سکتے ہیں۔

اب جبکہ نکاح کے مقاصد ہی میں تنوع پیدا ہو گیا تو ضروری ہے کہ نکاح کی عمر بلوغت میں بھی استثناء موجود ہو۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ اگرچہ اصولی طور پر نکاح کی عمر بلوغت ہے تاہم یہ ہر عمر میں جائز ہے اور جائز ہونا بھی چاہیے۔ اس لحاظ سے اگر ایک طرف نابالغ بچی کا نکاح لڑکے، جوان اور بوڑھے سے جائز ہے تو دوسری طرف ایک لڑکے کا نکاح اپنے سے بہت بڑی عمر کی عورت، مطلقہ بلکہ دو تین بار کی مطلقہ عورت سے بھی جائز ہے۔

www.KitaboSunnat.com

۲۔ معنوی تحریف:

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جب ''بچی'' کے لیے قرآن میں ''نساء'' کا لفظ کہیں بھی استعمال نہیں ہوا، تو پھر جس آیت زیر بحث (الطلاق:۴) میں ''نساء'' کے لفظ سے خطاب ہے، اس میں بچیوں کو کیوں شامل کر کے نابالغ لڑکی کے نکاح کا جواز ثابت کیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص ''نساء'' میں خواہ مخواہ بچیوں کو شامل کر کے بچی کے نکاح کو درست سمجھتا ہے تو اسے قرآن کی معنوی تحریف کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

اس ضمن میں ہم صرف اسی قدر عرض کریں گے کہ جس طرح عورتوں اور مردوں کے مشترکہ مجمع یا گروہ کے لیے خطاب کے وقت جمع مذکر کے صیغے اور ضمائر ہی استعمال کیے جاتے ہیں اور یہ خصوصیت صرف عربی زبان کی ہی نہیں، بلکہ ہر ملک میں اور ہر زبان میں یہی دستور ہے، بالکل اسی طرح اگر کسی ایسے اجتماع یا گروہ کو خطاب کیا جائے جس میں بچیاں، جوان اور بوڑھی ہر طرح کی عورتیں موجود ہوں تو ان کے لیے ''نساء'' کا لفظ ہی استعمال ہوگا۔ آیت زیر بحث میں چونکہ ہر طرح کی عورتوں کی عدت کا ذکر ہے، لہٰذا یہاں لفظ ''نساء'' آیا اور یہی آنا چاہیے تھا۔ ہم شاہ صاحب سے پوچھتے ہیں کہ اگر انہیں ایسے مجمع کو خطاب کرنا پڑے جس میں بچیاں، جوان اور بوڑھیاں سب اس نسبت سے ہی موجود ہوں جس نسبت سے معاشرہ میں موجود ہیں، تو وہ ایسے مجمع سے خطاب کے لیے کون سا لفظ استعمال کریں گے؟

معنوی تحریف کے سلسلہ میں شاہ صاحب کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ''لم یحضن'' کا ترجمہ ''جنہیں ابھی حیض شروع ہی نہیں ہوا'' گرامر کے کس قاعدہ کی رُو سے ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جب مضارع پر ''لم'' داخل ہو تو دو طرح کے معنوی تغیر کا سبب بنتا ہے۔ ایک تو مضارع کو ماضی میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بدل دیتا ہے۔ دوسرے منفی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس لحاظ سے جو ترجمہ ہم نے پیش کیا تھا، وہ درست ہے اور ہم اپنی تائید میں درج ذیل شواہد بھی پیش کرتے ہیں:

ترجمہ:۱ شاہ رفیع الدین صاحب۔ ''اور وہ جو نہیں حائض ہوئیں''

ترجمہ:۲ فتح الحمید۔ ''اور جن کو ابھی حیض نہیں آنے لگا''

ترجمہ:۳ تفہیم القرآن۔ ''اور یہی حکم ان کا ہے جنہیں ابھی حیض نہ آیا ہو''

ترجمہ:۴ کنز الایمان (احمد رضا خاں صاحب)۔ ''اور ان کی جنہیں ابھی حیض نہ آیا''

ہمارے خیال میں ہمارے ترجمہ کی تائید میں اتنے شواہد کافی ہیں۔ تاہم عند الطلب ان میں کافی حد تک اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

اب جناب شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

''اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جن کی عمر تو ایسی ہو کہ انہیں بالعموم حیض آیا کرتا ہے لیکن کسی عارضہ کے باعث حیض نہیں آتا، تو اس صورت میں عدت کا شمار مہینوں سے ہو گا۔ بہر حال اردو میں قرآن مجید کے متواتر ترجموں میں اس آیت کا ترجمہ کم وبیش انہی الفاظ میں آیا ہے کہ جن عورتوں کو کسی عارضہ کے سبب حیض نہ آیا ہو۔''

شاہ صاحب کے اس ترجمہ پر ہمیں دو اعتراض ہیں۔ پہلا یہ کہ ان کے موقف کے مطابق نکاح کی عمر بلوغت ہے اور بلوغت کی عمر کی علامت لڑکے کے لیے احتلام اور لڑکی کے لیے حیض کا آنا ہے۔ اب اگر کسی لڑکی کو تادیر حیض ہی نہیں آتا۔ خواہ یہ کسی عارضہ کے باعث ہی ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ نہ وہ بالغہ کہلا سکتی ہے اور نہ ہی اس کا نکاح ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس کی طلاق یا عدت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؟ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے ایسی عورتوں کی بھی عدت کا ذکر کر دیا ہے۔ چلیے شاہ صاحب کے بقول کہ ''انہیں کسی عارضہ کے باعث حیض نہیں آیا'' تو کیا ان کا نکاح ناجائز ہو گا؟ حالانکہ قرآن مجید نے اگر ان کی عدت کا ذکر کیا ہے تو یہ عدت طلاق کے بعد اور طلاق نکاح کے بعد ہی واقع ہوتی ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ حیض آئے بغیر یا حیض آنے سے پہلے بھی عورت کا نکاح ہو سکتا ہے۔

اور ہمارا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ شاہ صاحب نے فرمایا ہے کہ ان کے متعین کردہ معانی متعدد اردو تراجم میں موجود ہیں۔ لیکن ان ''متعدد اردو تراجم'' میں سے حوالہ کسی ایک کا بھی نہیں دیا، لہٰذا یہ بے دلیل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بات ہوئی۔ شاہ صاحب کے اس بیان میں حقیقت صرف اس قدر ہے کہ حیض نہ آنے کی چار مختلف صورتوں میں سے ایک صورت یہ بھی ہے۔ اور وہ چار صورتیں یہ ہیں:

۱۔ کم سنی کی وجہ سے حیض نہ آنا۔

۲۔ کسی عارضہ کی وجہ سے کافی عمر تک حیض نہ آنا۔

۳۔ ساری عمر ہی حیض نہ آنا۔

۴۔ بڑھاپے کی وجہ سے حیض کا بند ہو جانا۔

ان چار صورتوں میں آخری صورت کا تو قرآن نے الگ سے ذکر کر دیا ہے۔ باقی تینوں صورتوں ''لم یحضن'' کے حکم میں شامل ہیں یعنی ان تینوں قسم کی عورتوں کا نکاح بھی ہو سکتا ہے اور طلاق بھی۔ اور ان کی عدت تین ماہ ہی ہوگی۔ اس تفسیری عموم کے باوجود چونکہ قرآن کے الفاظ کا ترجمہ وہی ہے جو ہم نے پیش کیا ہے۔ لہٰذا ان تین صورتیں میں سے بھی ترجیحی صورت وہی پہلی متصور ہوگی جس کی رو سے نابالغ بچیوں کا نکاح جائز قرار پاتا ہے۔

۳۔ عقدِ نکاح اور بلوغت:

آپ فرماتے ہیں کہ عقد نکاح میں ایجاب وقبول شرط لازم ہے، اور یہ ایجاب قبول اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ فریقین میں سے ہر ایک بالغ ہو۔ نیز فرمایا کہ:

''عقد نکاح حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ کوئی ڈرامہ یا گڑیوں کا کھیل تو نہیں ہوتا۔ اگر کسی پانچویں جماعت کے لڑکے کو گورنمنٹ ہاؤس لے جا کر جج کے عہدے کا حلف اٹھوایا جائے کہ وہ اس فرض کو نہایت دیانتداری سے ادا کرے گا تو جس طرح وہ لڑکا جج نہیں ہوتا، اسی طرح اگر کسی نابالغ لڑکے یا لڑکی سے نکاح کا عہد کرایا گیا تو نہ لڑکا شوہر ہوتا ہے نہ لڑکی بیوی۔ قرآن کی رو سے وہ نکاح کی عمر کو پہنچے ہی نہیں تو نابالغی کا نکاح نکاح ہی نہیں۔''

اس اقتباس کے آخری جملے کا جواب تو ہم دے چکے ہیں۔ اب آپ کی پیش کردہ مثال کی طرف آیئے، تو یہ مثال قیاس مع الفارق ہے اور کئی وجوہ کی بنا پر غلط۔ مثلاً:

۱۔ مشاہدہ یہ ہے کہ پانچویں جماعت میں پڑھنے والے بچوں میں سے ایک فیصد بھی ایسے نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتے جو بعد میں جج کے عہدہ پر فائز ہوں۔ لیکن بچپن کی شادیاں اکثر کامیاب ہی ثابت ہوتی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان میں سے ایک فیصد ہی شادیاں ہوتی ہیں جو کامیاب نہیں رہتیں، تو بے جا نہ ہوگا۔ دورِ نبوی ﷺ پر نظر ڈالیے۔ ان دنوں بچپن کی شادی کا رواج عام تھا۔ لیکن سارے دورِ نبوی میں عدالت نبوی میں صرف ایک مقدمہ ایسا آیا، جس میں لڑکی نے بلوغت کے بعد اپنے ولی کے نکاح پر ناراضامندی کا اظہار کیا تو آپ نے اس عورت کو (نکاح کے باقی رکھنے یا فسخ کرنے کا) اختیار دے دیا۔ اس پر اس نے یہ کہا کہ ''میں اپنے باپ کے کیے ہوئے نکاح کو باقی رکھتی ہوں۔ اس سوال سے میرا مقصود صرف یہ تھا کہ عورتوں کو علم ہو جائے، نکاح کے معاملہ میں (ان کی مرضی کے بغیر ان کے) آباء کو کوئی حق نہیں۔

۲۔ عملی لحاظ سے یہ مثال اس لیے غلط ہے کہ بچپن کی شادی کی صورت میں ایجاب یا قبول، لڑکی یا لڑکا خود نہیں کرتے، نہ ہی ان سے کروایا جاتا ہے۔ بلکہ ان کے والدین یا ولی کیا کرتے ہیں۔ حلف وفاداری کا عمل صرف اصالتاً ہی وقوع پذیر ہو سکتا ہے، جبکہ ایجاب وقبول کی ذمہ داریاں ولایتاً بھی تسلیم کر لی جاتی ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک نابالغ بچی کا نکاح ہو رہا ہو، تو اسی سے نکاح پر رضامندی کے لیے صاد کرایا جائے (ایجاب) نابالغ بچے سے حق مہر اور نان ونفقہ کی ذمہ داریوں کا اقرار بھی اس نابالغ سے کروایا جائے (قبول) بلکہ لڑکے کا والد، جو ایسی ذمہ داری قبول کرتا ہے، تو وہ اس کو پوری ذمہ داری کے ساتھ نباہتا بھی ہے۔ تا آنکہ لڑکا بالغ اور برسر روزگار ہو کر اپنی ذمہ داری خود سنبھالنے کے قابل ہو جاتا، اور پھر اسے سنبھال بھی لیتا ہے۔ یہی صورت حال لڑکی کے والد یا ولی کی بھی ہوتی ہے۔

اب دیکھنے کی بات صرف یہ رہ جاتی ہے کہ عقود و معاہدات میں ولایت کو قرآن کریم نے تسلیم کیا ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب ہمیں قرآن مجید سے اثبات میں ملتا ہے۔ شاہ صاحب تو معاہدہ کے لیے صرف بلوغت کو شرط قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ معاہدہ کے لیے بالغ ہونے کے علاوہ عاقل ہونا بھی لازمی شرط ہے۔ اب یا تو ایسے نابالغ اور نادان افراد کو ایسے تمام حقوق سے محروم کر دیجیے جن کی حفاظت معاہدات وعقود کے ذریعہ ہی ناممکن ہے یا پھر معاہدات میں ولایت کو تسلیم کر لیجیے۔ لین دین کے معاہدات میں جہاں کتابت کا حکم دیا گیا ہے وہاں ایسی صورتوں کا حل بھی اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿فَاِنْ كَانَ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ سَفِیْهًا اَوْ ضَعِیْفًا اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ هُوَ فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ﴾

''پھر وہ شخص جس کے ذمہ حق (قرض) ہے۔ بے سمجھ یا کمزور ہے یا وہ طاقت نہیں رکھتا کہ خود لکھوائے تو اس کا ولی انصاف سے لکھوا دے۔''

(سورۃ البقرۃ:۲۸۲)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین صورتوں میں ولی کو معاہدہ کے فریق کا مختار بنا دیا ہے۔

۱۔ نادان ہو۔

۲۔ ضعیف ہو۔

یاد رہے کہ قرآن میں ضعیف کا لفظ چھوٹے بچے کے لیے بھی آیا ہے، جیسے فرمایا:

﴿وَ لَهٗ ذُرِّیَّةٌ ضُعَفَآءُ﴾ یعنی ''اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں''

(سورۃ البقرۃ:۲۶۶)

۳۔ املاء کروانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو۔

نابالغ میں یہ تینوں باتیں بیک وقت پائی جاتی ہیں۔ چہ جائیکہ بروئے قرآن صرف ایک پر بھی ولی کو حق ولایت تفویض کیا جاسکتا ہے۔ اب اگر نابالغ کی طرف سے لین دین کے معاملات میں اس کا ولی مختار ہوسکتا ہے تو معاہدہ نکاح میں کیوں نہیں ہوسکتا۔ نادان، نابالغ اور املاء نہ کرا سکنے والے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ معاہدات، عقود اور دیگر ایسے اہم معاملات میں ولی مقرر کرے، اور ولی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے مفادات کی پوری پوری حفاظت کرے۔ گویا ان تین صورتوں میں سے صرف ایک صورت موجود ہونے کی بناء پر بھی ولی مقرر کرنے کا حق قرآن مجید نے دیا ہے، تو نابالغ، جس میں تینوں صورتیں بیک وقت پائی جاتی ہیں، یعنی ناپختہ عقل، کم سنی اور املاء نہ کرا سکنا، تو اسے معاہدہ نکاح میں ولی مقرر کرنے کا یہ حق کیوں حاصل نہیں ہوسکتا؟ چنانچہ ولی اس کے ہمہ پہلو مفادات کا نگران ہوتا ہے۔ پھر نابالغ ہونے کی بناء پر نکاح ناجائز کیوں ہوا؟

معاہدات وعقود کے سلسلے میں شاہ صاحب نے ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ:

''اگر لڑکی نابالغ ہے، نہ گھر کا کام کرنے کے قابل ہے نہ اولاد پیدا کرنے کے قابل تو کس سے عقد ہوگا؟''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۔ بچپن کے نکاح کی حیثیت:

شاہ صاحب نے بچپن کے نکاح کے ابطال پر یہ دلیل پیش فرمائی ہے کہ:

''ہمارے فقہاء کہتے ہیں کہ نابالغ لڑکی، بالغ ہونے پر اگر نکاح کو رڈ کر دے تو وہ فسخ ہو جاتا ہے۔ تو پھر وہ نکاح کیسا تھا؟ اس کی حیثیت کیا تھی؟

۵۔ کم سنی کے نکاح کے جواز پر قرآن مجید سے دوسری دلیل:

اگر چہ دورِ نبوی میں بچپن کے نکاح کا رواج عام تھا، تاہم رخصتی اسی وقت ہوتی تھی جب عورت بالغ ہو جاتی تھی۔ پھر بعض دفعہ یوں بھی ہوتا کہ رخصتی یا بالفاظ دیگر مجامعت سے قبل ہی طلاق کی بھی نوبت آجاتی۔ ایسی ہی صورت سے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَ اِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ وَ قَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ فَرِيۡضَةً فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ﴾

(سورۃ البقرۃ:۲۳۷)

''اور اگر تم اپنی ایسی بیبیوں کو طلاق دو، جن سے تم نے صحبت نہ کی ہو اور حق مہر مقرر کر چکے ہو، تو مقررہ رقم کا نصف دینا ہوگا۔''

اب سوچیے کہ اگر جوان مرد اور جوان عورت کا نکاح اور ساتھ ہی ساتھ رخصتی بھی کر دی جائے تو کیا ایسی صورت پیش آسکتی ہے کہ شب زفاف کی مجامعت سے پہلے ہی طلاق واقعہ ہو جائے؟ لیکن اسکے باوجود مجامعت سے پیشتر طلاق کا وقوع پذیر ہونا ایک ایسی حقیقت ہے، جسے قرآن نے بطور حقیقت تسلیم کر کے ایسی صورت میں حق مہر کی ادائیگی کے متعلق فیصلہ بھی دے دیا ہے۔ ایسی طلاق کی صورت ہمارے خیال میں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ نکاح تو بچپن میں ہو چکا ہو لیکن رخصتی کو بلوغت تک کے لیے روک دیا گیا ہو۔ اس وقفہ کے دوران خاندانی رقابتوں یا دوسرے تنازعات کی بناء پر لڑکے کو طلاق دینے کے لیے مجبور کیا جائے یا وہ از خود اسی وجہ سے یا ناپسندیدگی کی بناء پر طلاق دے دے۔ گویا ہمارے نزدیک قرآن کا مجامعت سے پہلے طلاق کی حقیقت کو تسلیم کر لینا ہی بچپن کے نکاح کے جواز کی دوسری دلیل ہے اور اگر شاہ صاحب یہ کہیں کہ بالغ مرد و عورت کے نکاح میں بھی ایسی صورت پیش آسکتی ہے کہ مجامعت سے قبل طلاق واقعہ ہو جائے، تو یہی صورت نابالغ بچی کے نکاح میں بالاولی داخل ہے اور قرآنی حکم کا عموم اس صورت کو مانع نہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۶۔مجامعت قبل از بلوغت:

ہم ایک دفعہ پھر شاہ صاحب کے یہ الفاظ سامنے لاتے ہیں کہ ''جو پھل ابھی پکا ہی نہیں، اسے آپ توڑ کر کھانے کے لیے کیسے موزوں سمجھیں گے؟'' اس کے جواب میں ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ رواج یہ تھا کہ بچپن میں نکاح تو کر دیا جاتا تھا۔لیکن رخصتی عموماً بلوغت کے بعد ہی ہوا کرتی تھی۔ ہمارے ہاں عربوں کے ایسے نکاح کا مقام منگنی نے لے لیا اور رخصتی کا مقام شادی (نکاح + رخصتی) نے۔گویا جس طرح ہمارے ہاں بعض دفعہ منگنیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ان کے ہاں طلاق کے ذریعہ ایسے قصے ختم کیے جاتے تھے۔اندریں صورت حال نابالغ بچی سے مجامعت کا سوال کم ہی پیدا ہوتا ہے۔اس بات کی وضاحت بھی لاحاصل ہے کہ نابالغ بچی سے مجامعت اس کی صحت پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہے،ہمیں کسی گائنا کالوجسٹ سے پوچھنے کی ضرورت تو تب ہی ہو سکتی ہے، جب کسی کو اس کے نقصانات سے انکار یا اختلاف ہو۔ان سب باتوں کے باوجود اگر کبھی ایسا اتفاق ہو جائے کہ کوئی شوہر اپنی کمسن زوجہ سے مجامعت کر بیٹھے تو اس کے اس فعل کو زیادہ سے زیادہ ناپسندیدہ ہی کہا جا سکتا ہے، اسے گنہگار نہیں کہہ سکتے۔کیونکہ اس کی بیوی کا نقصان اس کا اپنا ہی نقصان ہے۔ بیوی کی صحت خراب ہو گی تو اس کے علاج معالجہ کے اخراجات بھی اسے ہی برداشت کرنا پڑیں گے اور تیمارداری کی ڈیوٹی بھی سرانجام دینا ہو گی۔ گویا نقصان دونوں کا ہو گا اگرچہ اس کی نوعیت الگ الگ ہو گی۔

پھر بعض دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ عورت ہوتی تو بالغ یا جوان ہے، مگر صحت کی خرابی یا کمزوری کی وجہ سے اس سے مجامعت کرنا اس کی بیماری میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔اب اگر یہ بیمار بیوی، سوکن کو برداشت کرنے سے یہی بہتر سمجھے کہ شوہر اس سے مجامعت کرے، یا مرد، عورت سے وفاداری، یا معاشی تنگی کی بناء پر دوسری عورت گھر میں لانے پر آمادہ نہ ہو تو ایسی صورت میں آپ کیا علاج تجویز فرمائیں گے؟ یہ مسئلہ دراصل ایسا لاینحل بن جاتا ہے کہ میاں بیوی باہمی رضامندی یا مشاورت سے ہی اس کا کوئی حل سوچ سکتے ہیں اور وہی حل سب سے بہتر ہوتا ہے۔ اگر بیمار بیوی، اور اسی طرح کمسن بیوی، اپنے شوہر کو مجامعت کی اجازت دیتی یا اس پر رضامند ہو جاتی ہے تو اس پر دوسروں کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔پھر یہ بھی مشاہدہ کی بات ہے کہ ایسے خاوند اپنی بیویوں کا پوری ہمدردی سے علاج کرانے کے علاوہ ان پر اپنی جان بھی چھڑکتے ہیں۔گویا اگر عورت شوہر کی محبت کی خاطر اپنی صحت کی قربانی دیتی ہے تو مرد بھی ایسی وفاشعار بیوی کے ممکن حد تک قدردان ہوتے ہیں۔لہٰذا میاں بیوی کے معاملات جیسے بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوں۔ ان کو وہ خود ہی باہمی رضامندی اور مشاورت سے بہتر طور پر حل کر سکتے ہیں۔ اور ایسا ہی حل بہتر ہوتا ہے، اگرچہ وہ دوسرے لوگوں کو کسی ایک فریق کے حق میں ضرر انگیز معلوم ہوتا ہے، بہر حال جس طرح مجامعت قبل از بلوغت نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے، اسی طرح بعد از بلوغت بھی اس کا ضرر رساں ہونا ناممکنات میں سے نہیں۔ لہٰذا یہ بات بھی نابالغی کے نکاح کے ناجائز ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی۔

۷۔ کم سنی کے نکاح کی مخالفت کی اصل وجہ:

ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ نکاح کے حکم اور ترغیب کا سب سے اہم مقصد فحاشی و بے حیائی سے پاک ایک پاکیزہ معاشرہ کا قیام ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے تمام بے شوہر عورتوں خواہ وہ کنواری ہوں یا مطلقہ ہوں یا بیوہ ہوں، کے نکاح کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح ہر بے زن مرد کے لیے بھی نکاح کرنے اور معاشرہ کو ایسے نکاح کا اہتمام کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس لحاظ سے اگر ہم کمسنی کے نکاح پر غور کریں، تو یہ حصول مقصد کے سلسلہ میں ضرر رساں ہونے کی بہ نسبت مفید ہی نظر آتا ہے۔ اسی لیے شرعی نقطہ نظر سے کمسنی کا نکاح جائز قرار پاتا ہے۔

ہمارے جو دوست نکاح کی عمر 'بلوغت' پر زور دیتے ہیں اور اس سے پہلے کمسنی کے نکاح کو ناجائز قرار دیتے ہیں، ان کا مقصد معاشرہ کا عفاف ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ وہ دراصل یورپی تہذیب سے متاثر ہو کر ایسا پرچار کرتے ہیں۔ انگلستان کے مشہور معیشت دان ''مالتھس'' نے ملک کی خوشحالی کے لیے آبادی کی روک تھام کو لازمی قرار دیا تھا۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی تھی کہ مردوں اور عورتوں کی شادیاں دیر سے کی جائیں، تاکہ بچے کم پیدا ہوں۔ اسی نظریے سے متاثر ہو کر ہمارے پڑھے لکھے گھرانوں میں پچیس پچیس، تیس تیس سال تک شادی نہیں ہوتی، حالانکہ اس سے معاشرہ میں کافی خرابیاں پیدا ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ بایں ہمہ یہ لوگ بلوغت کی عمر کے بعد بھی دس بارہ سال شادی نہ ہونے پر اس لیے خاموش رہتے ہیں کہ یہ تاخیر ان کے نظریہ ''چھوٹا کنبہ خوشحال گھرانہ'' کے لیے مفید ثابت ہوتی ہے اور اسی لیے یہ بچپن کی شادی کی مخالفت بھی کرتے ہیں، اور سہارا قرآن کا لیتے ہیں۔ ورنہ اگر یہ لوگ قرآن مجید سے مخلص ہوتے تو پھر جو لوگ بلوغت کے بعد بھی تادیر شادی نہیں کرتے، ان کے خلاف بھی ضرور آواز اٹھاتے، کہ قرآن مجید صاف ستھرے اور پاکیزہ معاشرے کے قیام کا حکم تو دیتا ہے ''چھوٹا کنبہ خوشحال گھرانہ'' کا پرچار نہیں کرتا۔

هذا ما عندي والله اعلم بالصواب.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فتویٰ:۵

حلال وحرام

لاہور سے جناب شفیق الرحمان لکھتے ہیں: مکرمی۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

سبزیات، فصلات وباغات کو تو انسانی فضلہ کی ''خوراک'' دے کر اس کا بدل، استحالہ (Metamorphism) بطور سبزی، اناج، پھل وغیرہ کھانا جائز ہے۔کیا اسی طرح سے:

ا۔ ماکول اللحم جانوروں کو حرام وخبائث پر مشتمل خوراک کھلا کر ان کی پرورش کرنا، ان کی فربہی حاصل کرنا اورانہیں کھانا جائز ہے؟ پولٹری فارم میں استعمال ہونے والی پولٹری فیڈ (مرغیوں کی خوراک) کا غالب حصہ مردار پر مشتمل ہوتا۔مثلاً کوئی بھینس (خصوصاً کسی مرض سے) مرگئی۔اس کی کھال اتاری اور باقی تمام میت کو کسی نہ کسی طرح پیس کر کچھ اور چیزیں، جن میں بساندوالی مچھلی کا چورا (Fish Meal) اور مذبحہ سے حاصل شدہ کثیر مقدار میں دم مسفوح کے لوتھڑے (Blood Meal) بھی شامل ہیں، اناج میں ملا کر اسے بطور مرغیوں کی خوراک کے استعمال کرتے ہیں۔مرغیوں کی خوراک سے مخصوص بُو بھی اسی وجہ سے آتی ہے۔اس کے علاوہ پولٹری فارمنگ میں اور بہت سے کام ایسے کیے جاتے ہیں مثلاً ''ہوائی'' انڈے، چونچیں کاٹنا وغیرہ۔جن کا جواز محل نظر معلوم ہوتا ہے۔یادرہے کہ ماکول اللحم انواع حیوانات میں سے پولٹری (مرغی، بطخ) ہی ایسی واحد نوع حیوان ہے جسے نجی شعبہ میں بڑی کامیابی اور وسعت سے اپنایا جاتا ہے۔غیر ممالک میں تو گندگی کے ڈھیروں پر مکھیوں کی بہت زیادہ افزائش کرکے ان کے لاروے اور یہ خود مکھیاں بطور لحمیاتی اور بڑھوتری والی خوراک کے مختلف عمر کے چوزوں کو کھلائی جاتی ہیں۔

براہ کرم وضاحت فرمائیں کہ ان حالات میں پاکستان میں فارم کی مرغیوں کا گوشت کھانا نیز پولٹری فارم کی ملازمت کرنا کیسا ہے؟ کیا انہیں بھی مندرجہ بالا نباتات پر قیاس کرکے کھاتے رہنا درست ہے؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ آم کی اعلیٰ نسل وزیادہ پیداوار حاصل کرنے کے لیے، مذبحہ کے دم مسفوح کو مصرف میں لانے کا شرعی حکم کیا ہے؟ بینوا توجروا

شفیق الرحمٰن وٹرنری آفیسر

متعلم ایم۔ایس۔سی (آنرز۔میڈیسن)

الجواب بعون اللہ الوہاب:

اس سوالنامہ میں سائل نے خود ہی ایک بنیاد فراہم کی اور اسے شرعاً درست قرار دیا ہے، پھر اسی بنیاد پر چند سوال اٹھائے ہیں، سائل کی فراہم کردہ بنیاد یہ ہے کہ:

''سبزیات، فصلات اور باغات کو انسانی فضلہ کی خوراک دے کر اس کا بدل، استحالہ بطور سبزی، اناج، پھل وغیرہ کھانا جائز ہے۔''

...............''تو کیا اس طرح آم کی اعلیٰ نسل یا زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے لیے مذبحہ کے دم مسفوح کو مصرف میں لانا درست ہے؟''

اب دیکھیے یہ سوال دراصل یوں بنتا ہے کہ باغات کو انسانی فضلہ دے کر پھل حاصل کرنا تو شرعاً درست ہے، مگر کیا آم کی اعلیٰ یا زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے لیے دم مسفوح کا استعمال بھی درست ہے؟ گویا بنیاد میں اگر باغات کا لفظ آیا ہے تو سوال میں آم کا ہے اور بنیاد میں انسانی فضلہ کا ذکر ہے تو سوال میں دم مسفوح کا۔ ہمارے خیال میں باغات اور آم میں فتویٰ کے لحاظ سے چنداں فرق نہیں پڑتا۔ رہا انسانی فضلہ اور دم مسفوح کا تقابل، اگرچہ یہ دونوں اشیاء انسانی خوراک کے لحاظ سے حرام ہیں مگر اس حرمت کا اطلاق نہ زمین کے لیے ہوسکتا ہے اور نہ باغات یا آم کے درخت پر۔ کیونکہ یہ اشیاء کسی شرع کی مکلف نہیں ہیں اور انسانی فضلہ اور دم مسفوح میں فرق یہ ہے کہ دم مسفوح کی نسبت انسانی فضلہ زیادہ نجس، ناپاک اور بدبودار ہوتا ہے، لہٰذا اگر زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے لیے انسانی فضلہ کو استعمال میں لانا شرعاً درست ہے تو دم مسفوح کا استعمال، بدرجہ اولیٰ درست ہونا چاہیے۔

اب ہم سائل کے پہلے سوال کی طرف آتے ہیں، جو دراصل ایک سوال نہیں بلکہ کئی سوالوں کا مجموعہ ہے۔ سہولت تفہیم کی خاطر ہم انہیں شق الف، ب، ج کی صورت میں پیش کرتے ہیں:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(الف) سوال کے پہلے حصہ کی عبارت یوں بنے گی کہ:

''سبزیات، فصلات و باغات کو تو انسانی فضلہ کی خوراک دے کر اس کا بدل (استحالہ) بطور سبزی، اناج اور پھل وغیرہ کھانا جائز ہے، تو کیا اسی طرح سے ماکول اللحم جانوروں کو حرام وخبائث پر مشتمل خوراک کھلا کر ان کی پرورش کرنا اور انہیں کھانا جائز ہے؟ کیا انہیں بھی ان نباتات پر قیاس کر کے کھاتے رہنا درست ہے؟''

اب دیکھیے مٹی کا کھانا تو حرام ہے تاہم یہ ایک پاک چیز ہے، ناپاک نہیں۔ پھر یہ دیکھیے کہ کوئی بھی حرام یا ناپاک اور نجس چیز، جو کچھ عرصہ سطح زمین پر پڑی رہے یا زمین میں دفن کر دی جائے تو وہ مٹی میں مل کر مٹی ہی بن جاتی ہے۔ اور جب مٹی بن جاتی ہے تو اس صورت میں یہ چیز، مثلاً انسانی فضلہ، ناپاک نہیں رہتا بلکہ مٹی کے حکم میں داخل ہو جاتا ہے۔ ذرا اس تعفن کو ذہن میں لائیے جو انسانی فضلہ کے زمین پر پڑنے پھر پانی کے شامل ہونے اور پھر اوپر سے سورج کی گرمی پڑنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن جب ایسی نجس و ناپاک چیز کے اجزاء زمین میں مل کر مٹی بن جاتے ہیں تو اسی مٹی سے استنجا کرنا بھی درست ہوتا ہے یعنی وہی مٹی جو انسانی فضلہ کے بدل میں بنی تھی، اب پھر انسانی فضلہ کی نجاست دور کرنے کے کام بھی آنے لگتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اب اس پر مٹی ہی کے احکام صادر ہوں گے۔ بالکل اسی طرح ماکول اللحم جانور خواہ کتنی ہی نجس و ناپاک یا حرام چیز کھا جائیں، جب ایسی غذا کے اجزا، ماکول اللحم جانور کے گوشت پوست میں بدل جائیں گے تو ان پر ماکول اللحم جانور کے احکام صادر ہوں گے۔ ان کا گوشت اور ہر ایک کھانے کے قابل حصہ بالکل حلال وطیب قرار پائے گا۔ خواہ یہ جانور پہلے غلاظت اور دم مسفوح ہی کھاتا رہا ہو اور اس حرام یا خبیث خوراک کا جس سے اس ماکول اللحم جانور کا گوشت پوست بنا ہے، قطعاً خیال نہ کیا جائے گا۔ پھر جس طرح ہمیں یہ سوچنے کی ضرورت نہیں کہ انسانی فضلہ یا مردار جب مٹی کی شکل اختیار کرتا ہے تو یہ تبدیلی طبعی ہوتی ہے یا کیمیائی، اسی طرح ہمیں یہ سوچنے کی بھی قطعاً ضرورت نہیں کہ ماکول اللحم جانور کا گوشت جن حرام یا ناپاک چیز سے بنا ہے تو آیا یہ تبدیلی طبعی ہے یا کیمیائی؟ یہ تبدیلی جیسی بھی تھی، جب یہ غذا ماکول اللحم جانور کے گوشت پوست میں تبدیل ہو گئی، تو اس کا کھانا اور کھاتے رہنا شرعاً بالکل درست ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ب) دوسرا جزوی سوال یہ ہے کہ:

''یاد رہے کہ ماکول اللحم حیوانات میں پولٹری (مرغی، بطخ) ہی ایسی واحد نوع حیوان ہے جسے نجی شعبہ میں بڑی کامیابی اور وسعت سے اپنایا جاتا ہے۔ غیر ممالک میں تو گندگی کے ڈھیروں پر مکھیوں کی بہت زیادہ افزائش کرکے ان کے لاروے اور یہ خود مکھیاں بطور لحمیاتی اور بڑھوتری والی خوراک کے مختلف عمر کے چوزوں کو کھلائی جاتی ہیں۔ ان حالات میں پاکستان میں فارم کی مرغیوں کا گوشت کھانا کیسا ہے؟ نیز پولٹری فارم کی ملازمت کرنا کیسا ہے۔''

اب دیکھیے کہ دور نبوی ﷺ میں جب شریعت نازل ہو رہی تھی، اس وقت کی مرغیاں بھی غلاظت کھا جایا کرتی تھیں اور دم مسفوح کو بھی نہ چھوڑتی تھیں۔ اس کے باوجود شریعت نے مرغی کو ماکول اللحم جانور قرار دیا ہے۔ کسی صحابی رضی اللہ عنہ کو کبھی یہ خیال نہ آیا کہ غلاظت کھا جانے والا جانور حلال کیسے ہو گیا؟ اس صورت میں اور اس صورت میں جو سائل نے بیان فرمائی ہے، اگر کچھ فرق ہے تو یہ کہ دور نبوی ﷺ کی مرغیاں غلاظت یا دم مسفوح خود کھاتی تھیں اور آج کے پولٹری فارم میں انہیں یہ غذا قصداً کھلائی جاتی ہے۔ یا اس دور میں جو کچھ وہ کھاتی تھیں وہ تھوڑی مقدار میں ہوتا تھا، لیکن آج انہیں زیادہ مقدار میں ایسی خوراک کھلائی جاتی ہے، تاہم اس قسم کی حرام اور گندی خوراک سے گوشت بن جانے کے بعد جیسے مرغیاں اس دور میں حلال تھیں، آج بھی اسی قاعدہ کے مطابق ضرور حلال ہونی چاہئیں۔ کسی مسلمان کو شریعت مطہرہ نے ہرگز اس بات کا مکلّف نہیں ٹھہرایا کہ وہ یہ بھی ملحوظ رکھا کرے کہ ماکول اللحم جانوروں کا گوشت جس غذا سے بنا تھا، وہ کیسی تھیں؟ وہ پاک اور حلال تھی یا حرام اور گندی؟ کیونکہ شرعی تکلیفات کے مکلّف تو صرف جن وانس ہیں۔ باقی اشیاء مثلاً زمین، درخت یا کسی ماکول اللحم جانور کے متعلق یہ خیال کرنا کہ اس کی غذا حلال تھی یا حرام؟ ایک بے معنی سی بات ہے۔ لہٰذا ہمارے نزدیک نہ تو پولٹری فارم کی مرغیوں کا گوشت کھانے میں شرعاً کوئی قباحت ہے اور نہ ہی پولٹری فارمنگ کی ملازمت کرنے میں۔

(ج) سائل کا تیسرا جزوی سوال یہ ہے کہ:

''اس کے علاوہ پولٹری فارمنگ میں اور بہت سے ایسے کام کیے جاتے ہیں مثلاً ہوائی انڈے، چونچیں کاٹنا وغیرہ جن کا جواز محل نظر معلوم ہوتا ہے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہوائی انڈے حاصل کرنا بھی دراصل زیادہ خوراک حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ پھر اگر زمین کو انسانی فضلہ یا مصنوعی کھادوں کی خوراک دے کر اس سے زیادہ یا اعلیٰ قسم کی پیداوار حاصل کرنا جائز ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ درختوں اور ماکول اللحم جانوروں کو مصنوعی خوراک دے کر یا مصنوعی طریقے عمل میں لاکر، ان سے زیادہ خوراک حاصل کرنا ناجائز ہو۔ ہمارے خیال میں پیوند کاری کے ذریعہ اچھی اور بہتر خوراک یا پھل حاصل کرنا، جانوروں سے ہوائی انڈے حاصل کرنا اور نسل کشی کے ذریعے عمدہ جانوروں کی افزائش نسل کرنا یہ سب کچھ جائز ہے۔ کیونکہ ان میں سے کوئی چیز بھی شرعاً مکلّف نہیں ہے۔ ہاں یہی نسل کشی کا عمل جب انسان کی نوع پر کیا جائے گا، خواہ یہ اولاد حاصل کرنے کے لیے ہو یا زیادہ بہتر اولاد حاصل کرنے کے لیے، تو یہ سب کچھ ناجائز اور قطعی حرام ہوگا۔ کیونکہ انسان شرعی لحاظ سے ایک مکلّف مخلوق ہے۔

دور نبوی ﷺ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پیوند کاری کے ذریعہ بہتر اور زیادہ کھجور حاصل کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذاتی رائے کی بناء پر صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس پیوند کاری سے منع کیا تو اس حال میں پھل ناقص بھی آیا اور کم بھی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب یہ صورت حال رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

(أنتم أعلم بأمور دنياكم) ''تم اپنے دنیا کے معاملات بہتر جانتے ہو۔''

چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے آئندہ سے پھر پیوند کاری کا عمل شروع کر دیا۔

اسی طرح دور نبوی ﷺ میں نسل کشی کا عمل بھی ہوتا تھا۔ آپ ﷺ نے نسل کشی سے قطعاً منع نہیں فرمایا۔ البتہ کسب الفحل سے ضرور منع فرمایا ہے یعنی اچھی قسم کا نر رکھنے والے کے پاس اگر کوئی شخص ملاپ کے لیے مادہ لائے، تو نر کا مالک مادہ کے مالک سے ملاپ کی اجرت وصول نہ کرے۔ رسول اللہ ﷺ کا صرف ایسی کمائی سے منع فرمانا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ نسل کشی کا عمل فی نفسہ جائز ہے۔

رہا چونچیں کاٹنے کا عمل تو یہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ لحمیاتی خوراک کثیر مقدار میں کھلانے سے جانوروں میں دوسرے جانوروں کو چونچیں مارنے اور کاٹ کھانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اس کا علاج یہ سوچا گیا ہے کہ چونچ کے نچلے جبڑے کا کچھ حصہ کاٹ دیا جاتا ہے۔ یہ عمل بھی شرعاً ناجائز نہیں قرار پا سکتا۔ اگر کسی جانور کو کسی مصلحت کی خاطر خصی کر دینا یا داغنا جائز ہے، تو کسی دوسرے جانور کا کسی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مصلحت کی خاطر چونچ کا نچلا حصہ کاٹ دینا بھی جائز ہوسکتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ چیز خلق اللہ کی تغییر میں شامل نہیں، کیونکہ اس طرح چونچ کاٹنے کا عمل کسی کو نظر نہیں آتا، نہ اس میں خوبصورتی کا کچھ تعلق ہے اور اس عمل میں شرک کا کوئی ادنی سا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا، جس سے قرآن کریم نے منع فرمایا ہے۔

چند مزید وضاحتیں:

جہاں تک سائل کے سوالات اور ان کے جوابات کا تعلق تھا وہ تو ہو چکے۔ اب میں قارئین کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ ایسے سوالات عموماً حد سے زیادہ احتیاط کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایسی احتیاط جس کے لیے مسلمان ہرگز مکلف نہیں ہوتے۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب السوال باسماء اللہ میں مذکور درج ذیل حدیث ملاحظہ فرمائیے:

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا'': یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہاں چند ایسے آدمی ہیں کہ ابھی ابھی ان کا شرک کا زمانہ گزرا ہے۔ وہ ہمارے پاس کٹا ہوا گوشت (بیچنے) کو لاتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ انہوں نے اس پر اللہ کا نام لیا یا نہیں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم خود اللہ کا نام لے کر کھا لیا کرو۔''

اب دیکھیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سائلین سے یہ نہیں فرمایا کہ یہ حلال حرام کا معاملہ ہے، کوئی معمولی بات نہیں۔ لہٰذا اس بات کی پوری تحقیق کر کے کھانا چاہیے۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشتباہ کے بجائے اباحت کے پہلو کو ملحوظ رکھا اور مزید تسلی کے لیے خود اللہ کا نام لینے کا حکم دیا۔

اب دور فاروقی کا ایک واقعہ بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔ خود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ سفر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک تالاب کے قریب اترے۔ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ (فاتح مصر) بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے لوگوں سے پوچھا: ''اس تالاب سے درندے تو پانی نہیں پیتے؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو اشارے سے روک دیا کہ نہ بتانا'' اس سے دو اصول ثابت ہوئے۔ ایک یہ اصل چیز اباحت ہے دوسرے یہ کہ اگر کسی چیز کی ظاہری حالت صحیح ہے تو اس کی حلت وحرمت کے سلسلہ میں غیر ضروری تفحص اور جستجو کے ہم مکلّف نہیں ہیں۔ یہ واقعہ ''الفاروق'' از شبلی نعمانی (مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز) صفحہ 35 پر ہے۔

حلت وحرمت کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ زمین، درخت یا ماکول اللحم جانوروں کا قصہ تو دور کی بات ہے، خود انسانوں کی دنیا میں جو تکالیف شرعیہ کے مکلّف ہیں، ایک شخص کی حرام کی کمائی اگر جائز

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طریقے سے دوسرے کی طرف منتقل ہو جائے، تو دوسرے آدمی کے لیے وہ حلال ہوگی۔ فقہی زبان سے اسے یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ''ہاتھ کی تبدیلی سے احکام بدل جاتے ہیں'' اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک آدمی سودی کاروبار کرتا ہے۔ اب کوئی دوسرا آدمی اس کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کر کے اس کی قیمت اس سے وصول کرتا ہے، تو اس آدمی کو خواہ یہ بات معلوم ہو کہ یہ شخص سودی کاروبار کرتا ہے، تب بھی وہ رقم اس دوسرے آدمی کے لیے حلال متصور ہوگی کیونکہ اس نے اسے جائز ذریعہ سے حاصل کیا ہے اور دین کے اصول لوگوں کو مشکلات میں ڈالنے کے لیے نہیں بلکہ ان کے معاملات میں آسانی پیدا کرنے کے لیے ہیں۔

احتیاط میں اس درجہ غلو کا وجود دور صحابہ رضی اللہ عنہم میں تو نہیں تھا۔ بعد کے ادوار میں زُہاد وعُباد قسم کے لوگوں میں ایسی احتیاط کا آغاز ہوا۔ پھر طبقہ صوفیہ نے اسے پروان چڑھایا اور تذکرہ نگاروں نے اس قسم کے واقعات میں خوب خوب رنگ بھرا چنانچہ تذکرہ نگار نے حضرت سفیان ثوری کے متعلق لکھا ہے کہ:

''جب کوئی آپ کی دعوت کرتا تو رد نہ کرتے لیکن روٹی اپنے گھر سے لے جاتے اور وہی کھاتے۔ صاحب خانہ کی دریافت پر فرماتے، تجھے اپنی روٹی کا حال معلوم ہے مگر مجھے معلوم نہیں کہ حلال مال سے ہے یا حرام سے؟ تیرے بلانے سے آ گیا مگر روٹی اپنی کھاؤں گا۔''

حضرت سفیان ثوری کے متعلق ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ اپنی روٹی ساتھ لے جا کر میزبان کے پاس یہ روٹی کھا کر اس کا یوں جی بہلاتے ہوں گے، تاہم تذکرہ نگاروں کے ہاں کسی کی بزرگی کے جو پیمانے ہیں، ان کے مطابق انہوں نے ایسا واقعہ حضرت سفیان ثوری کے نام بھی جڑ دیا۔ تذکرہ نگار حقیقت نگاری سے ذرا پرہیز ہی بہتر سمجھتے ہیں۔

اسی تذکرہ نگار نے احمد بن حرب کے متعلق درج ذیل واقعہ لکھا ہے:

''نقل ہے کہ ایک بار آپ کی والدہ نے مرغ ذبح کر کے کہا کہ یہ میرے گھر کا پالا ہوا مرغ ہے۔ اس میں کچھ شک وشبہ نہیں، اسے کھاؤ۔ آپ نے کہا یہ وہی مرغ تو ہے جو ایک روز ہمسائے کے کوٹھے پر چلا گیا اور وہاں سے دانے کھا آیا تھا۔ یہ میرے لیے حلال نہیں۔

احمد بن حرب کے متعلق یہ واقعہ اس لحاظ سے قابل تسلیم بھی ہے کہ اس دور میں اس قسم کا غلو طبقہ صوفیہ میں داخل ہو چکا تھا۔ مگر سوچنے کی بات ہے کہ اگر حلال وحرام کا یہ معیار قائم کیا جائے تو دنیا میں کوئی بھی چیز حلال ثابت کی جا سکتی ہے؟ اس معیار کے مطابق تو بڑے سے بڑے زاہد اور صوفی کی زندگی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں بھی شبہ کے بیسیوں پہلو نکل آتے ہیں۔ پھر ایک بزرگ ایسے بھی ہو گزرے ہیں، جنہوں نے ایک دفعہ مرغی کو غلاظت کھاتے دیکھ لیا تو قسم کھالی کہ آئندہ مرغی کا گوشت نہ کھایا کریں گے۔ ایسے ہی محتاط قسم کے صوفیہ کے متعلق امام ابن القیم تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

امام ابن القیم کا فتویٰ:

''یا اتنا صوفی و پرہیزگار بنا پھرے کہ عام مسلمانوں کا کھانا کھانا ہی ترک کردے کہ مبادا اس کے اندر حرام و مشتبہ مال چلا جائے۔ بعض علم سے کورے اور جاہل صوفیہ و زہاد پر تو اس بیہودہ ورع و پرہیز گاری کا جنون اس قدر سوار ہوا کہ اسلامی شہروں کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز تک کو حرام و مشتبہ سمجھ کر ٹال دیتے اور نہ کھاتے مگر عیسائی شہروں سے آئی ہوئی چیزوں کو حلال وطیب سمجھ کر ڈکار جاتے۔ تو دیکھیے ان جاہل صوفیوں کو جہل مفرط اور غالیانہ زہد نے ہی اہل اسلام سے بدظن کردیا اور عیسائیوں کے حق میں حسن ظن اور خوش فہمی کا بیج بو یا نعوذ باللہ۔''

اس تبصرہ میں امام موصوف نے ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے جو یہ ہے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں میں غلو کی حد تک احتیاط کرنے والے صوفی بعض دفعہ کسی بڑی غلطی یا بڑے جرم میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس کا انہیں کبھی بھولے سے خیال بھی نہیں آیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فتویٰ:۶

زکوٰۃ وعشر کے چند مسائل اور اُن کے جوابات

سید نور حسین شاہ کیلیانوالہ سے لکھتے ہیں:

''محترمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

نظامِ عشر کی وضاحت چاہتا ہوں، مندرجہ ذیل مسائل کو پیشِ نظر رکھ کر جوابِ باصواب سے آگاہ فرمائیں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء

۱۔ گندم چاول وغیرہ جو اجناس ہیں، ان کی کل پیداوار کا $\frac{1}{20}$ دینا ہے یا کہ تیل، کھاد کا خرچہ اور وہ مزدوری، جو کہ فصل کی کٹائی کے وقت مزدوروں کو دی جاتی ہے، علیحدہ کرکے؟ واضح رہے کہ گندم کی کٹائی کے وقت مزدور مزدوری لیتا ہے، بعد میں تھریشر مشین والا بھی مزدوری لیتا ہے۔ اسی طرح چاول کی فصل کی کٹائی کے وقت یا تو مزدور مزدوری لیتا ہے اور یا کمبائن مشین والا...... کیا یہ مزدوریاں ادا کرکے باقی میں سے عشر ادا کیا جائے گا یا کل فصل پر؟

۲۔ گنا کی فصل پر تیل کھاد کا خرچہ الگ ہوتا ہے، بعد میں اس کی کٹائی، صفائی، لوڈ کروانے اور مل تک پہنچانے کا خرچہ الگ ہوتا ہے۔ وضاحت فرمائیں کہ کون سا خرچ منہا کرکے عشر ادا کیا جائے گا یا کل فصل کا عشر ادا کرنا ہوگا؟

۳۔ چارے کی فصل ایک تو وہ ہے جو اپنے جانوروں کے لیے بوئی جاتی ہے، اگر کچھ بچ جائے تو فروخت بھی کر دی جاتی ہے۔ کیا اس تمام فصل کا عشر ادا کرنا ہے، یا محض فروخت ہونے والی کا، یا کسی کا بھی نہیں؟

دوسری چارے کی فصل وہ ہے جو پہلے دن ہی بیچنے کی نیت سے کاشت کی جاتی ہے۔ اس پر بھی اخراجات اٹھتے ہیں، کیا اس کل کا عشر ادا کرنا ہوگا یا خرچہ منہا کرکے؟

۴۔ اسی طرح سبزیاں کچھ لوگ صرف اپنی ضرورت کی خاطر کاشت کرتے ہیں، اگر گنجائش ہو تو بیچ بھی لیتے ہیں۔ جبکہ کچھ لوگ کاروباری لحاظ سے صرف بیچنے کی خاطر کاشت کرتے ہیں۔ اسے منڈی تک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لے جانے کے لیے اس کی مزدوری، محصول اور آڑھت وغیرہ بھی ادا کرنا پڑتی ہے۔ ان کی زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں، اگر ادا ہوگی تو کتنی؟

۵۔ کیا وہ کاشتکار، جس کی اپنی ملکیتی زمین بھی ہے اور ساتھ ہی وہ کسی سے حصے یا ٹھیکے پر بھی لے لیتا ہے، ساری زمین کی فصل کی زکوٰۃ ادا کرے گا یا صرف اپنی زمین کی فصل پر؟

والسلام

الجواب بعون اللہ الوھاب:

سائل کے سوالات کے نمبروار جواب دینے کے بجائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند ایسے اصول ذکر کر دیے جائیں جن کی روشنی میں زکوٰۃ وعشر سے متعلق جملہ مسائل ان شاءاللہ حل ہو جائیں گے۔ یہ اصول درج ذیل ہیں:

۱۔ زکوٰۃ وعشر کی شرح میں شریعت مطہرہ نے جو مصلحت پیش نظر رکھی ہے وہ یہ ہے کہ محنت کم ہو تو شرح زکوٰۃ زیادہ ہوتی ہے۔ اور محنت زیادہ ہو تو شرح زکوٰۃ علی الترتیب کم ہوتی جاتی ہے۔ رکاز میں شرح زکوٰۃ ۲۰ فیصد یا پانچواں حصہ ہے۔ رکاز سے مراد دفینہ یا کوئی مدفون خزانہ ہے۔ پھر اس میں وہ اموال بھی شامل ہوتے جاتے ہیں جو بلامحنت حلال طریقہ سے ہاتھ لگ جائیں۔ مثلاً کسی شخص کو کسی ایسی میت کے ورثہ میں حصہ ملے جس کی اسے قطعاً توقع نہ تھی، یا کوئی گری پڑی چیز مل جائے جس کا مالک تلاش کے باوجود نہ مل سکے۔

دوسرے نمبر پر بارانی زمین یا ایسی زمین ہے جو نہروں یا دریاؤں وغیرہ کے قرب وجوار میں واقع ہو اور وہاں آب پاشی کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔ ایسی زمین کی پیداوار کی شرح $\frac{1}{10}$ یا دس فیصد ہے، حالانکہ ایسی زمین میں کسان کو ہل بھی چلانا پڑتا ہے اور کٹائی بھی کرنا پڑتی ہے۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ وہ یہ محنت خود کرے یا اجرت دے کر کسی دوسرے سے کروائے۔

تیسرے نمبر پر چاہی زمین ہے جس میں آبپاشی کی محنت یا خرچہ بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ آب پاشی خواہ کنوئیں سے ہو یا نہروں سے یا ٹیوب ویل کے ذریعہ۔ اب اس قسم کی پیداوار پر چونکہ محنت یا اخراجات بڑھ جاتے ہیں، اس لیے اس کی شرح زکوٰۃ بھی بارانی سے نصف رہ جاتی ہے، یعنی $\frac{1}{20}$ یا پانچ فیصد۔ اسے بھی عرف عام میں عشر ہی کہہ دیا جاتا ہے، حالانکہ یہ شرح عشر کا نصف ہوتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چوتھے نمبر پر اموال اور بچتوں پر زکوٰۃ ہے۔ ان پر چونکہ محنت اور خرچ اور بھی زیادہ ہوتا ہے، لہٰذا اس کی شرح مزید آدھی یعنی $\frac{1}{40}$ یا $2\frac{1}{2}$% رہ جاتی ہے۔ مندرجہ بالا تصریح سے سائل کا یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ پیداوار پر اٹھنے والے مصارف زکوٰۃ سے وضع نہیں کیے جائیں گے۔ پہلے لوگ یہ مختلف قسم کی محنت خود کرلیا کرتے تھے، آج کے دور میں پیداوار کی افزائش کی بناء پر انہیں محنت کے بجائے اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

۲۔ دوسری قابلِ وضاحت بات یہ ہے کہ ہر محل نصاب پیداوار کا ایک مقررہ نصاب ہے۔ مثلاً گندم اور چاول وغیرہ کا نصاب پانچ وسق ہے جو ہمارے حساب سے اندازاً ۲۰ من بنتے ہیں، اور یہ کاشتکار کے گھر کا خرچ ہی سمجھا جائے گا۔ اگر فصل اس سے کم ہو تو زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی، اور اگر زیادہ ہو تو پھر ساری فصل پر زکوٰۃ عائد ہوگی۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ جو فصل صرف اپنی ذاتی ضرورت کے لیے کاشت کی جائے، مثلاً چارہ کی فصل جو اپنے ہی مویشیوں کے لیے بوئی جائے تو اس پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی۔ زکوٰۃ صرف اس فصل پر ہو گی جو قابلِ فروخت ہو یا اس نیت سے بوئی جائے۔

۴۔ چوتھی بات یہ ہے کہ پیداوار کی زکوٰۃ کا وقت وہ ہوتا ہے جب کٹائی ہو جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ﴾ (الانعام:۱۴۲) ''اور پیداوار سے اللہ کا حق پیداوار کی کٹائی کے دن ادا کرو۔''

لہٰذا جب کٹائی ہو جائے، اس وقت زکوٰۃ کا حساب کرلیا جائے گا۔ پھر اسے منڈی تک پہنچانے یا گنے کی فصل کو مزید صاف کرانے اور مل پر لے جانے کا جو خرچہ ہوگا، زکوٰۃ کے اموال کا خرچہ اسی زکوٰۃ کے مال پر پڑے گا، یعنی پیداوار کے بیسویں حصے پر جتنے اخراجات اٹھیں گے، وہ اسی زکوٰۃ کے مال سے وضع کیے جائیں گے (جبکہ زکوٰۃ کے علاوہ مال کے اخراجات کاشتکار خود برداشت کرے گا)

۵۔ پانچویں بات یہ ہے کہ زکوٰۃ صرف ان پھلوں اور سبزیوں پر ہے جو سٹور کیے جاسکتے ہیں، مثلاً کھجور اور انگور پر زکوٰۃ کی تفصیل کتب احادیث سے ملتی ہے۔ انگور کشمش اور منقیٰ کی شکل پر سٹور کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ایسے تمام پھل آجاتے ہیں جنھیں خشک یا سٹور کیا جاسکتا ہے۔ اور ایسے ہی وہ سبزیاں بھی جو جلد خراب نہیں ہوتی، مثلاً آلو، لہسن، پیاز وغیرہ۔ اور جو سبزیاں جلد خراب ہو جاتی ہیں، ان پر اکثر علماء کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نزدیک پیداواری زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی، بلکہ تجارتی زکوٰۃ عائد ہوگی، یعنی سال میں صرف ایک دفعہ بچت پر زکوٰۃ بحساب ۲ ½ % ہوگی۔

۶۔ چھٹی بات یہ ہے کہ حصہ یا ٹھیکہ پر لی ہوئی زمین کا حساب اسی طرح ہوگا جس طرح بکریوں کے ریوڑ کے خلیط (شرکاء) زکوٰۃ ادا کرنے میں حصہ دار ہوتے ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک کسان نے کسی زمیندار سے زمین ⅓ کی شرط پر لے رکھی ہے، یعنی تیسرا حصہ فصل مالک زمین کی اور باقی ⅔ حصہ کاشتکار کی، تو کل فصل پر زکوٰۃ کا تیسرا حصہ مالک زمین ادا کرے گا اور ⅔ حصہ کسان۔ اسی طرح اگر کسی نے ۵۰۰۰ روپے سالانہ ٹھیکہ پر زمین لے رکھی ہے تو زمین کی پورے سال کی پیداوار میں سے مالکِ زمین صرف پانچ ہزار کی زکوٰۃ کی ادائیگی کا پابند ہے، باقی پوری زکوٰۃ کاشتکار کے ذمہ ہوگی۔

هذا ما عندي والله اعلم بالصواب.

❀......❀......❀

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فتویٰ: ۷ تا ۱۰

چار متفرق فتاویٰ

۱۔ ''حسبنا کتاب اللہ''

۲۔ قربانی کی شرعی حیثیت

۳۔ بنات النبی ﷺ

۴۔ شرح زکوٰۃ

راولپنڈی سے عبدالمنان صاحب لکھتے ہیں:

''چند سوالات کے جوابات مطلوب ہیں، اُمید ہے آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں میری اور میرے ساتھیوں کی تشفی فرمائیں گے۔''

سوالات یہ ہیں:

۱۔ آیا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: ''حسبنا کتاب اللہ؟ ......'' میرا ایمان ہے کہ قرآن مجید کو حدیث کے بغیر سمجھنا گمراہی ہے، پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمان کا کیا مطلب ہے؟

۲۔ منکرین حدیث نے سورۃ الکوثر میں (وانحر) کا مطلب سینہ پر ہاتھ باندھنا لکھا ہے، ان کا کہنا ہے کہ اگر ''قربانی'' مطلب لیا جائے تو قرآن کی رو سے قربانی فرض ہے۔ حالانکہ یہ سنت ہے۔ اصل مطلب کیا ہے؟

۳۔ ایک سوال شیعہ کی طرف سے کیا جاتا ہے کہ اگر رسول پاک ﷺ کی بیٹیاں ایک سے زیادہ تھیں تو پھر آپ ﷺ نے ان کی فضیلت میں کچھ کہا کیوں نہیں، جبکہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں بہت سی فضیلتیں آپ ﷺ نے بیان فرمائی ہیں؟

۴۔ پرویزی کہتے ہیں: زکوٰۃ کی شرح کے بارے میں قرآنی حکم یہ ہے کہ:

﴿وَ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ...﴾ ''ضرورت سے زائد سب کچھ خرچ کردو۔''

(البقرہ: ۲۱۹)

یہ کہاں تک درست ہے؟

جزاکم اللہ...... والسلام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جوابات:

ا۔ حسبنا کتاب اللہ:

رسول اللہ ﷺ نے مرض الموت میں جب موجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے قلم و دوات لانے کو کہا، تو اس موقع پر فی الواقع سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ کہا تھا: ''حسبنا کتاب اللّٰہ'' اور یہ واقعہ ''قرطاس'' صرف صحیح بخاری ہی میں نہیں، دیگر کتب صحاح میں بھی موجود ہے۔

منکرین حدیث اور بالخصوص پرویز عموماً یہ کہا کرتے ہیں کہ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی نے آپؐ کے مرض الموت میں ''حسبنا کتاب اللّٰہ'' کہہ کر احادیث رسول اللہ ﷺ سے بے نیازی کا اظہار فرمایا تھا تو پھر ان احادیث کی ضرورت بھی کیا باقی رہ جاتی ہے؟

اس سلسلہ میں میرا ایک طویل مضمون ''حسبنا کتاب اللّٰہ'' کے عنوان سے محدث مارچ ۱۹۸۴ء میں چھپ چکا ہے، اسے ملاحظہ فرمالیجیے، سردست چند اشارات پر اکتفا کروں گا:

(الف) کتاب اللہ سے مراد وحی منزل من اللہ (شریعت) ہے۔ خواہ یہ وحی، وحی جلی ہو یا وحی خفی۔ بالفاظ دیگر کتاب اللہ کا اطلاق کتاب و سنت دونوں پر ہوتا ہے۔ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بھی جب یہ الفاظ کہے تھے تو اس سے مراد یہ دونوں چیزیں تھیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا: ''یا رسول اللہ ﷺ! میں آپ کو قسم دے کر کہتا ہوں کہ ہمارا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کر دیجیے'' اب دوسرا فریق، جو پہلے سے کچھ زیادہ سمجھدار تھا، کہنے لگا کہ ''ہاں یا رسول اللہ ﷺ! ہمارا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق فرمایئے اور بات کرنے کی مجھے اجازت دیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا بیان کر۔ اس نے کہا: ''میرا بیٹا اس شخص (فریق ثانی) کے پاس نوکر تھا اور اُس نے اِس شخص کی بیوی سے زنا کیا ہے۔ میں نے سو بکریاں اور ایک غلام دے کر اپنے بیٹے کو چھڑا لیا۔ اس کے بعد میں نے کئی عالموں سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ تیرے بیٹے کے لیے سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے، اور اس شخص کی بیوی کے لیے ''رجم'' ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

والذی نفسی بیدہ لا قضین بینکما بکتاب اللہ عزوجل و ذکرہ المائۃ شاۃ والخادم ردعلیک و علی ابنک جلد مائۃ و تغریب عام، واغد یا أنیس علی امرأۃ ھذا فان اعترفت فارجمھا فغدا علیھا فاعترفت فرجمھا۔

(صحیح بخاری۔ کتاب المحاربین، حدیث نمبر ۶۸۲۸)

''اس رب کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اور جس کا ذکر بلند ہے، میں تم دونوں کے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ سو بکریاں اور غلام (جو تو نے دیے) تجھے واپس ہوں گے اور تیرے بیٹے کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے اور اے انیس رضی اللہ عنہ! کل صبح اس عورت کے پاس جاؤ، اگر وہ زنا کا اعتراف کرے تو اسے رجم کر دو۔'' چنانچہ انیس رضی اللہ عنہ صبح اس عورت کے پاس گئے، اس نے اعتراف کر لیا تو انیس رضی اللہ عنہ نے اسے رجم کر دیا۔''

رجم کا حکم قرآن مجید میں موجود نہیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کا حکم دینے سے قبل اللہ کی قسم کھا کر فرمایا کہ میں تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا، پھر رجم کا حکم بھی دیا۔ معلوم ہوا کہ کتاب اللہ سے مراد صرف قرآن کریم نہیں، بلکہ احادیث بھی اس میں داخل ہیں، لہٰذا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک کتاب اللہ سے مراد تمام تر وحی منزل من اللہ یعنی شریعت تھی نہ کہ صرف قرآن کریم۔

کتاب اللہ سے جو کچھ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مراد لیا کرتے تھے اس کے متعلق امام بخاری نے ایک باب باندھا ہے، جس کا عنوان یہ ہے:

(باب المکاتب و مالا یحل من الشروط التی تخالف کتاب اللہ و قال جابر بن عبد اللہ فی المکاتب شروطھم بینھم و قال ابن عمر أو عمر: کل شرط خالف کتاب اللہ فھو باطل و إن اشترط مائۃ شرط.)

''مکاتب کا بیان اور ان شرطوں کا بیان، جو جائز نہیں اور کتاب اللہ کے مخالف ہیں، اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے ایسی شرطوں کے بارے میں کہا اور ابن عمر رضی اللہ عنہ یا عمر رضی اللہ عنہ نے بھی کہ ''ہر وہ شرط جو کتاب اللہ کے خلاف ہو وہ باطل ہے، خواہ ایسی سو شرطیں باندھی جائیں۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اگر کتاب اللہ سے مراد صرف قرآن کریم لیا جائے، تو قرآن کریم میں تو مکاتبت کی کوئی شرط مذکور ہی نہیں۔ پھر مخالفت یا موافقت کیسی؟ البتہ ایسی شرائط چونکہ سنت رسول اللہ ﷺ میں مذکور ہیں، لہٰذا یہاں کتاب اللہ سے مراد سنت رسول ﷺ ہی لیا جاسکتا ہے۔

اب خود ہی دیکھ لیجیے کہ ان واضح دلائل کے بعد منکرین حدیث کے اس اعتراض کی کیا حقیقت باقی رہ جاتی ہے؟

(ب) کتاب اللہ میں قرآن وحدیث دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں۔ تاہم شریعت کے عملی نمونہ، سنت کی اہمیت کو مزید اجاگر کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے کتاب اللہ کے ساتھ اپنی سنت کا الگ بھی ذکر فرمایا۔

(ج) قرآن کریم کتاب اللہ بھی ہے اور کلام اللہ بھی۔ جب کہ سنت رسول اللہ ﷺ پر کتاب اللہ کا اطلاق تو ہوسکتا ہے، کلام اللہ کا نہیں ہوسکتا۔

۲۔ قربانی کی شرعی حیثیت:

قربانی کی شرعی حیثیت سے انکار بھی منکرین حدیث کا مرغوب موضوع ہے۔ ''النحر'' لغوی لحاظ سے سینہ کے اوپر کے حصہ کو کہتے ہیں۔ اور ''نحر النھار او الشھر'' دن یا مہینہ کے ابتدائی حصہ کو (المنجد صفحہ ۷۹۴) اس لحاظ سے بعض مفسرین نے ''فصل لربک'' کی مناسبت سے ''وانحر'' کے معنی سینہ کے اوپر ہاتھ باندھنے کے بھی کیے ہیں، اور اوّل وقتوں میں نماز ادا کرنے کے بھی۔

پھر ''منحر'' کے معنی گلے میں زخم لگانے یا ذبح کرنے کی جگہ کے بھی ہیں۔ اور ''انتحر'' بمعنی خودکشی کرنا اور ''نحیر'' ذبح کیے ہوئے جانور کو کہتے ہیں۔ (المنجد صفحہ ۷۹۴) سورۃ الکوثر کی عطا کی مناسبت ہے ''وانحر'' کے معنی قربانی کرنا زیادہ راجح اور انسب ہے۔ جیسے کہ ایک دوسری آیت......:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (سورۃ الانعام:۱۶۲)

''بے شک میری نماز اور میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔''

......سے بھی اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہی یہ بات کہ قرآن کریم میں حکم آ جانے کے بعد قربانی سنت کیوں ہے اور فرض کیوں نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں بصیغہ امر مذکور بھی احکام فرض نہیں ہیں۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے:

﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (سورۃ الجمعہ:۱۰)

''جب نماز (نماز جمعہ) ہو چکے تو (کاروبار وغیرہ کے لیے) زمین میں پھیل جاؤ۔ اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔''

اس سے قبل کی آیات میں یہ پابندی لگائی گئی ہے کہ جب نماز جمعہ کے لیے پکارا جائے تو کاروبار وغیرہ چھوڑ کر اللہ کے ذکر کی طرف دوڑتے چلے آؤ۔

﴿اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ﴾ (سورۃ الجمعہ:۹)

چنانچہ اب یہ پابندی اٹھائی جارہی ہے کہ جب فرض ادا ہو گیا تو مساجد میں بیٹھ رہنا کوئی ضروری نہیں۔ بلکہ چاہو تو اب کاروبار وغیرہ کر سکتے ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک اختیاری امر ہے۔ حالانکہ قرآنی حکم ''فانتشروا'' بصیغہ امر ہے۔ لیکن اگر اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ نماز جمعہ کے بعد بہر حال کاروبار وغیرہ کرنا فرض ہے اور اگرچہ کام کچھ بھی نہ ہو، تاہم جھوٹ موٹ کا کوئی کام کرنے کا بھی اب نماز جمعہ ادا کرنے والا مکلّف ہے۔ تا کہ قرآنی حکم پورا ہو سکے تو قرآن مجید کا یہ مقصود نہیں ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں ہے:

﴿وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ......﴾ (سورۃ المائدہ:۲)

''پھر جب تم (احرام کھول کر) حلال ہو جاؤ تو شکار کر لو۔''

یہاں بھی ''فاصطادوا'' بصیغہ امر مذکور ہونے کے باوجود اختیار امر ہے۔ یعنی حلال ہونے کے بعد اگر تم چاہو تو شکار کر سکتے ہو۔ کیونکہ احرام کی حالت میں شکار کھیلنے پر پابندی ہے۔ لیکن جب احرام کھول دیا تو پابندی ختم ہو گئی۔ اب چاہو تو شکار کر سکتے ہو چاہو تو نہ کرو۔ لہٰذا یہاں بھی قرآن مجید کا مقصود ہرگز یہ نہیں کہ حلال ہونے کے بعد شکار کرنا بہر حال ضروری ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ تکلیفی احکام کی پانچ قسمیں ہیں:

(۱) فرض (۲) واجب (۳) سنت (۴) مستحب (۵) مباح۔ قرآن کریم میں پانچوں قسم کے احکام پائے جاتے ہیں، لیکن قرآن کریم مجمل ہے اس لیے اس کے کسی حکم کے فرض، واجب وغیرہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہونے کی تفصیل سنت میں ہے۔ چنانچہ سورۃ الکوثر میں ''وانحر'' (اور قربانی کیجیے) اگر چہ بصیغہ امر قرآن مجید میں مذکور ہے، لیکن اس کی تعیین سنت نے کی ہے کہ قربانی فرض نہیں، بلکہ سنت مؤکدہ ہے۔

منکرین حدیث بیچارے عجیب مخمصے کا شکار ہیں، سنت سے انکاری بھی ہیں، لیکن جب سنت کے بغیر قرآن مجید کو سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے تو چیخنا چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ بالکل وہی صورت حال ہے کہ:

﴿وَ مَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰی وَ یَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِیْرًا﴾ (سورۃ النسا:۱۱۵)

''جس نے ہدایت کی تبیین کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ کی نا فرمانی کی اور مومنوں کی راہ کے علاوہ کوئی دوسری راہ اختیار کر لی تو ہم اسے ادھر ہی پھیر دیں گے جدھر کا اس نے رخ کر لیا ہے اور ہم اسے جہنم میں بھی داخل کریں گے جو بہت ہی بُری جگہ ہے۔''

۳۔بنات الرسول ﷺ:

شیعہ حضرات کا اعتراض دو وجوہ کی بنا پر غلط ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ کسی فضیلت بیان نہ ہونے کی وجہ سے اس کے وجود کی نفی نہیں ہو جاتی۔ رسول اللہ ﷺ کی بیٹیوں کا ذکر قرآن کریم کی درج ذیل آیت میں ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾

''اے نبیؐ، اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دیجیے''

(سورۃ الاحزاب:۵۹)

مندرجہ آیت کے اس ٹکڑے سے تین باتوں پر روشنی پڑتی ہے:

(الف) بنات، بنت کی جمع ہے جس کا اطلاق تین یا تین سے زیادہ تعداد پر ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ مفروضہ خود قرآن کریم کی رُو سے غلط ہے کہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے علاوہ رسول اللہ کی کوئی بیٹی نہ تھی۔

(ب) بنات کے لفظ سے آپ ﷺ کی روحانی بیٹیاں یا قوم کی بیٹیاں بھی مراد نہیں لی جا سکتیں، کیونکہ ''نساء المؤمنین'' کا الگ ذکر بھی آ گیا ہے۔

(ج) بنات سے آپ ﷺ کی ازواج مطہرات کی پچھلگ بیٹیاں بھی مراد نہیں لی جا سکتیں۔ کیونکہ ان کے لیے قرآن مجید نے الگ لفظ ''ربائب'' استعمال کیا ہے۔ لہٰذا یہ احتمال بھی ختم ہوا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اب رہی بات دوسری بیٹیوں کے عدم بیان فضیلت کی، تو یہ بھی غلط ہے۔ آپ ﷺ کی چاروں بیٹیاں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہوئیں اور علی الترتیب ان کے اسمائے مبارک، سن ولادت و وفات درج ذیل ہیں:

۱۔ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا ۱۰ سال قبل نبوت ولادت ہوئی جبکہ آپ ﷺ کی عمر ۳۰ سال تھی۔
وفات ۸ھ بعمر ۳۱ سال

۲۔ سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا ۷ سال قبل نبوت ولادت ہوئی جبکہ آپ ﷺ کی عمر ۳۳ سال تھی۔
وفات ۲ھ بعمر ۲۱ سال

۳۔ سیدہ اُم کلثوم رضی اللہ عنہا ۴ سال قبل نبوت ولادت ہوئی جبکہ آپ ﷺ کی عمر ۳۶ سال تھی۔
وفات ۹ھ بعمر ۲۵ سال

۴۔ سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا ۱ سال قبل نبوت ولادت ہوئی جبکہ آپ ﷺ کی عمر ۴۱ سال تھی۔
وفات ۱۱ھ بعمر ۲۳ سال

اب سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے علاوہ باقی بیٹیوں کے مناقب ملاحظہ فرمایئے:

سیدہ زینب رضی اللہ عنہا:

سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کی منقبت میں آپ ﷺ نے فرمایا:

(هي أفضل بناتي أصيبت في) ''یہ میری بیٹیوں میں افضل ہے۔ جس نے میری وجہ سے تکلیف اٹھائی۔''

چنانچہ آپ رضی اللہ عنہا تو ایمان لے آئیں۔ مگر آپ رضی اللہ عنہا کے خاوند ابو العاص اس وقت ایمان نہ لائے تاہم انہوں نے سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو مدینہ ہجرت کرنے کی اجازت دے دی تھی اور اس بات کے لیے رسول اللہ ﷺ، ابو العاص کے مشکور تھے۔ ابو العاص، سیدہ زینب رضی اللہ عنہا سے چھ سال بعد مدینہ آکر ایمان لائے۔ تو حضور ﷺ نے اس سابقہ نکاح کو بحال رکھا۔ یہ چھ سال کا عرصہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے لیے خاصی پریشانی کا سبب بنا رہا، لیکن پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ ﷺ نے سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کی یہ منقبت بیان فرمائی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا:

حاکم نے درج ذیل حدیث آپ رضی اللہ عنہا کی منقبت میں روایت کی ہے:

''انهما ألاوّل من هاجر بعد لوط و ابراهيم.''

''حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد یہ پہلے لوگ ہیں (سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ) جنہوں نے راہ خدا میں ہجرت کی ہے۔''

جنگ بدر کے موقعہ پر آپ رضی اللہ عنہا سخت بیمار تھیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی عیادت کے لیے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو جنگ بدر میں شمولیت سے روک دیا۔ لیکن اس کے باوجود اموال غنیمت سے آپ رضی اللہ عنہ کا باقاعدہ حصہ نکالا۔

سیدہ اُم کلثوم رضی اللہ عنہا:

سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا نے 2 ہجری میں انتقال فرمایا تو 3 ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا:

''یہ جبریل ہیں، جو کہہ رہے ہیں: اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ میں اپنی دوسری بیٹی تجھ سے بیاہ دوں۔''

جن دنوں سیدہ رقیہ کا انتقال ہوا، انہی دنوں سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا بنت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی بیوہ ہو گئیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے اپنی بیٹی حفصہ رضی اللہ عنہا کا ذکر کیا تو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اس طرف چنداں توجہ نہ کی۔ اس پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے رنج کا اظہار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ألا أدل عثمان علىٰ من هو خير به منها و أدلها علىٰ من هو خير لها من عثمان''

(یہ واقعہ بخاری کتاب النکاح۔ باب عرض الانسان ابنته ...... الخ میں باختلاف الفاظ موجود ہے۔)

کہ ''کیا میں عثمان رضی اللہ عنہ کو ایسا رشتہ نہ بتاؤں جو اس کے لیے حفصہ رضی اللہ عنہا سے بہتر ہے اور حفصہ رضی اللہ عنہا کے لیے ایسا رشتہ نہ بتاؤں جو اس کے لیے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے بہتر ہے۔''

اس ارشاد کے مطابق سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے، اور سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کا نکاح خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا۔ یہ درست ہے کہ سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے مناقب دوسری بیٹیوں سے زیادہ مذکور ہوئے ہیں۔ لیکن اس کی کئی دوسری وجوہ ہیں۔ مثلاً

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۔ آپ رضی اللہ عنہا عمر میں سب سے چھوٹی تھیں اور چھوٹے بچے والدین کو عموماً زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔

۲۔ سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے آخری دن تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود رہیں۔ ان کا گھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں سے نزدیک تھا اور آخری وقت میں بھی آپ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھیں۔

۳۔ آپ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کا نسبتاً زیادہ موقعہ ملا ہے۔ آڑے وقتوں میں آپ رضی اللہ عنہا نے پدر بزرگوار کی خدمت کی۔

۴۔ آپ رضی اللہ عنہا کے بطن سے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔ جو تاریخ اسلام میں بلند مقام رکھتے ہیں۔

ان سب باتوں کے باوجود یہ کہنا غلط ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بیٹیوں کی منقبت بیان ہی نہیں فرمائی۔

۴۔ شرح زکوٰۃ:

پرویزیوں کے اس سوال کا جواب میں ''ترجمان الحدیث'' نومبر ۱۹۸۳ء صفحہ ۲۵، ۲۶ پر ''پرویزی دین اور زکوٰۃ'' کے ذیلی عنوان کے تحت تفصیل سے دے چکا ہوں۔ سر دست چند باتیں ملخصاً حاضر خدمت ہیں:

۱۔ پرویزی حضرات کہنے کو تو فی الواقع یہی بات کہتے ہیں کہ ضرورت سے زائد سب کچھ ''انفاق فی سبیل اللہ'' کے ضمن آتا ہے اور اسے دے دینا چاہیے۔ لیکن ان کا عمل اس کے بالکل مخالف ہے۔ جب ضیاء الحق کی حکومت نے زکوٰۃ آرڈی نینس نافذ کیا، تو ان حضرات اور بالخصوص غلام احمد پرویز نے چالیسواں حصہ زکوٰۃ ادا کرنے سے بھی قرآنی فقہ کے نام پر جس طرح فرار کی راہیں اختیار کی ہیں، ان کی تفصیل محولہ بالا مضمون میں ملاحظہ فرمائیے۔

۲۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کی یہ تشریح پرویزیوں کا محض زکوٰۃ سے بچنے کا ایک بہانہ ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ کسی بھی پرویزی کے متعلق تحقیق فرمائیے کہ کیا فی الواقع وہ ''ضرورت سے زائد سب کچھ'' دین کی راہ میں خرچ کر رہا ہے؟ کیا ان کے بینک بیلنس نہیں ہیں؟ اور اگر ہیں تو یہ بینک بیلنس سب ضرورت سے زائد ہی ہوتے ہیں۔ یہی صورت دوسری جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ کی ہے، جو اپنے ذاتی مصرف میں نہ ہو۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۔ پرویزی حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ جب قرآنی حکومت قائم ہوگی تو پھر وہ اپنا ضرورت سے زائد مال اس حکومت کو ادا کیا کریں گے۔ یہ بات بمصداق ''نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی'' زکوٰۃ سے بچنے کا ایک زبردست حیلہ ہے۔ کیونکہ اس کی مجوزہ قرآنی حکومت ابتدائے اسلام سے لے کر آج تک کہیں قائم نہیں ہوئی اور نہ آئندہ تا قیامت ایسی قرآنی حکومت کے قائم ہونے کا امکان ہے۔ خواہ ہزاروں پرویز پیدا ہوتے رہیں۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ حضرات کسی وقت کمیونزم کو ہی قرآنی حکومت کا نام دے لیں، تو اس صورت میں ''ضرورت سے زائد بھی اور ضرورت کے اندر بھی'' یہ حکومت زبردستی ان سے چھین لے گی اور اپنی مرضی سے کچھ دینا دلانا ان کے اپنے بس میں نہ رہے گا۔

۴۔ ایتائے زکوٰۃ کے معاملہ میں پرویزی حضرات سخت تضاد کا شکار ہیں۔ ایک طرف تو ان کا موقف یہ ہے کہ زکوٰۃ کی کوئی شرح اسلام نے مقرر نہیں کی۔ بلکہ یہ ایک ٹیکس ہے اور اسلامی حکومت اپنی ضرورت کے مطابق اس شرح میں کمی بیشی کر سکتی ہے۔ دوسرا موقف یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنی ضرورت سے زائد سب کچھ اسلامی حکومت کے حوالے کر دیں اور تیسرا موقف یہ ہے کہ ایتائے زکوٰۃ کا حکم عام مسلمانوں کے لیے ہے ہی نہیں بلکہ یہ حکم قرآنی حکومت کے لیے ہے۔ یعنی جب عام مسلمان اپنا سب کچھ ضرورت سے زائد قرآنی حکومت کے حوالے کر دیں گے، تو قرآنی حکومت ''ایتائے زکوٰۃ'' پر عمل کرے یعنی عوام کو سامان تربیت (یہی ان کے نزدیک زکوٰۃ کا معنی ہے) روٹی، کپڑا اور مکان وغیرہ مہیا کرے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایتائے زکوٰۃ کا یہی مفہوم ہو، جو ان کا تیسرا اور آخری موقف ہے اور جسے قرآنی نظام ربوبیت میں تفصیل سے پیش کیا گیا ہے، تو اسے ٹیکس کیسے کہا جا سکتا ہے اور اس کی شرح کیونکر زیر بحث آ سکتی ہے؟

هذا ما عندي والله اعلم بالصواب.

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ کی مقبولِ عام مطبوعات

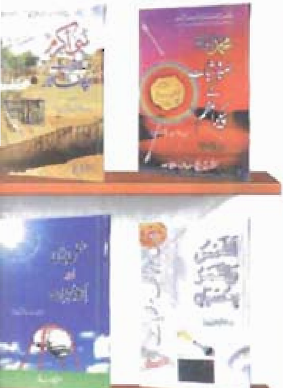

- تیسیر القرآن
- نبیِ اکرم ﷺ بحیثیت سپہ سالار
- عقل پرستی اور انکارِ معجزات
- مترادفات القرآن
- محمد رسول اللہ ﷺ صبر وثبات کے پیکرِ اعظم
- الشمس والقمر بحسبان
- آئینۂ پرویزیت
- خلافت وجمہوریت
- شریعت وطریقت
- روح، عذابِ قبر اور سماعِ موتی
- اسلام میں لین دین کے احکامات
- ایک مجلس کی تین طلاقیں اور ان کا شرعی حل
- اسلام میں دولت فاضلہ کے مصارف

مکتبۃ السلام سٹریٹ نمبر ۲۰ وسن پورہ لاہور